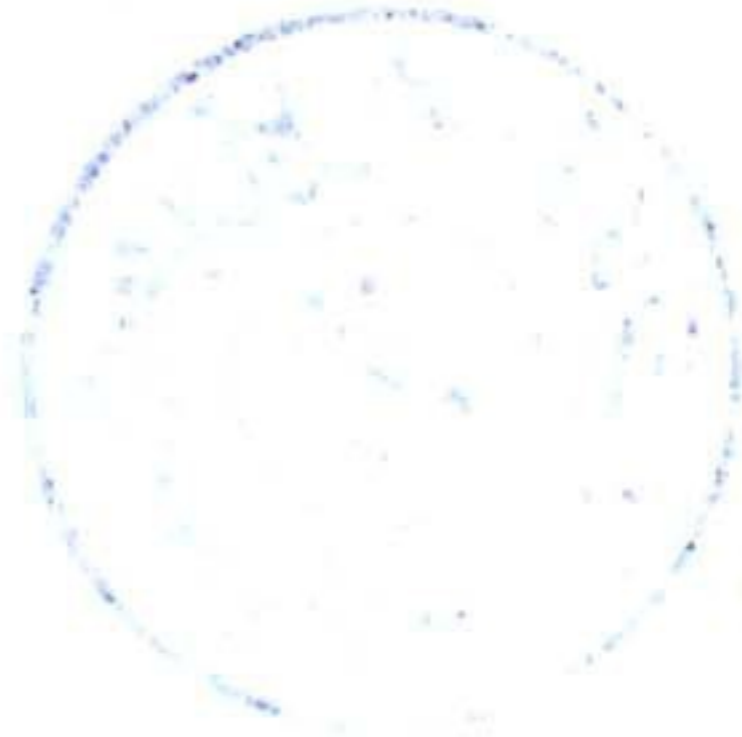


مِلّتائِ کی ادنیٰ و تہذیبی زندگی میں صوفیاء کرام کا حصہ

ڈاکٹر روبینہ ترین



3806



9086

ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیاء کرام کا حصہ

ڈاکٹر روبینہ ترین

ادارہ تالیف و ترجمہ

بہار الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

باہتمام: بیکن بکس • گلشت ملتان

3806

87053

~~3806~~

جملہ حقوق بحق بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

طبع اول _____ ۱۹۸۹ء

تعداد _____ ۵۰۰

مطبع : _____ شرکت پرنٹنگ پریس

۴۳۔ نسبت روڈ۔ لاہور۔

قیمت _____ ۲۰۰ روپے

9282



انتساب

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کے نام

Handwritten number 10000



Faint handwritten text, possibly a signature or date.

فہرست

	پہلا باب	ملتان
۱۷	۱- ملتان کی قدامت و اہمیت اور سیاسی تاریخ	
۱۹	ملتان کے قدیم نام اور ان کا جائزہ	
۲۵	عربوں اور اہل ہند کے روابط قبل از اسلام	
۲۹	عرب و ہند تعلقات عہد رسالت میں	
۳۱	ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کا آغاز	
۳۲	محمد بن قاسم کی آمد	
۳۸	محمود غزنوی کا حملہ	
۴۲	صوفیاء اور بزرگوں کا ورود سرزمین پاک و ہند میں	
۴۶	ب - ملتان کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا جائزہ سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں	۴۸
۴۸	ملتان اہم تہذیبی مرکز	
۴۹	یونانی اور چینی سیاح	
۵۰	ہجج نامہ کی روایت	
۵۱	عرب سیاحوں کے بیانات	
۶۰	یورپی سیاحوں کے حوالے	
۶۸	موسس لال کاشمیری کا بیان	
۷۰	ملتان کی مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کا مجموعی جائزہ	
۷۲	ج - سرزمین ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل	
۷۶	زبان کی تشکیل کا عمل ما قبل از اسلام	

۷۸	مسلمانوں کی آمد اور اثرات زبان پر
۸۱	زبانِ اُردو کی تشکیل کا عمل
۸۸	کتابیات
۹۲	باب دوم - دسویں صدی ہجری تک کے صوفیاء کا احوال
۹۳	مُلتان اور بنو سامہ
۹۳	مُلتان اور قرامطہ
۹۷	صوفیاء کا دورِ مُلتان میں
۹۸	دسویں صدی ہجری تک کے صوفیاء کا احوال
۲۲۵	کتابیات
۲۵۳	باب سوم - مُلتان کے صوفیاء
۲۵۴	دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء اکرام - پس منظر
۲۵۸	صوفیائے کرام کا احوال
۳۷۷	صوفیاء کی تعلیمات
۳۷۸	زبان کے تال میل میں صوفیاء کا حصہ
۳۸۱	اُردو زبان و ادب کی ترویج میں صوفیاء کرام کی خدمات
۳۸۴	مُلتان کے صوفیاء - تہذیب اور زبان و ادب پر ان کے اثرات
۳۹۲	خواجہ غلام فرید
۴۷۶	کتابیات
۴۸۳	باب چہارم - مُلتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ - مجرعی جائزہ -
۴۸۴	۱ - مُلتان کے فنونِ لطیفہ و عقیدہ پر صوفیائے کرام کے اثرات کا جائزہ
۵۱۸	ب - مُلتان کی تعلیمی، تدریسی اور علمی زندگی پر صوفیاء کے اثرات
۵۶۰	حرفِ آخر
۵۶۲	کتابیات

ادارہ تالیف و ترجمہ

بہار الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

پیش لفظ

جامعات میں ہونے والی تحقیق، تدریس اور پرودان چڑھنے والے خیالات معاشرے کی اجتماعی شخصیت کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی ان کے فکری اور تہذیبی اثرات سے ہی ہوتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ بہار الدین زکریا یونیورسٹی نے اپنی کم عمری اور قلیل وسائل کے باوجود ملک کی جامعات میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا ہے، جس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنی یونیورسٹی کو مدینۃ الاولیاء ملتان کی صدیوں پرانی عملی روایت سے وابستہ و منسلک رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سرزمین ملتان میں رشد و ہدایت کا جو سلسلہ صوفیائے کرام نے شروع کیا تھا اس نے نہ صرف ملتان بلکہ برصغیر کے لوگوں کی مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی زندگی میں عظیم انقلاب سے ہم کنار کیا۔ ماضی کے ایسے سرمائے کو کھنگالنا، ان مثبت اقدار کے احیاء کے لئے ضروری ہے جو نئی نسل کی داخل شخصیت کو شکست و ریخت سے محفوظ کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ پورے معاشرے کے جسد اجتماعی میں سرایت کر جانے والی تشکیک کا مداوا ہو سکے، ہم نے کوشش کی کہ ان بزرگان دین کی ان بابرکت کاوشوں کو سامنے لایا جائے جس پر ابھی بہت سا تحقیقی کام ہونا باقی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے شعبہ اردو میں ۱۹۸۲ء میں ایک ریسرچ پراجیکٹ بعنوان "سرزمین ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ" تیار کیا گیا۔ اس کی ریسرچ سکا لروڈ بینہ ترین تھیں اور اس پراجیکٹ کے نگران جناب ڈاکٹر اسے بی اشرف چیمبرین، شعبہ اردو تھے، یہ ریسرچ پراجیکٹ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلام آباد نے منظور کیا، تین حصوں پر مشتمل تھا اور اس کی تکمیل تین برسوں میں ہوئی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کو ملتان کے دو نامور عالموں کا بھی تعاون حاصل ہوا۔ ایک علامہ عتیق فکری مرحوم (اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں گلے دے) اور دوسرے ڈاکٹر مہر عبدالحی (جنہیں خدائے بزرگ و بزرگ عمر خضر عطا کریں)۔

بزرگان دین کے بارے میں تحقیق کا راستہ بڑی احتیاط سے طے کرنا پڑتا ہے، ایک طرف تو ان کے ملفوظات اور علمی سرچشموں تک آج کے ہر طالب علم کی رسائی آسان نہیں، دوسرے عربی اور فارسی کی مطلوبہ استعداد رکھنے والے ایسے طالب علموں کی تعداد میں بھی کمی ہو رہی ہے جو علم الکلام، فلسفہ، تاریخ اور دیگر معاشرتی علوم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ تحقیق کے جدید طریق کار سے بھی آشنا ہوں، تیسرے یہ کہ اب تک ان بزرگان دین کے بعض پہلوؤں پر تو بطور خاص اور تواتر و تسلسل کے ساتھ نگاہ ڈالی گئی، مگر کچھ پہلوؤں (تہذیبی، ثقافتی، نفسیاتی، لسانی اور ادبی) پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی، جب کہ اس تحقیقی منصوبے میں نظر انداز ہونے والے گوشوں میں سے بعض گوشے اجاگر کرنے کو مدد بنایا گیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ارباب فکر و نظر ہماری اس تصنیف کو نہ صرف بہ نظر استحسان دیکھیں گے بلکہ ہمیں اس تصنیف اور آئندہ تصانیف کے بارے میں مفید مشورے بھی دیں گے۔

بہار الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان نے اس نوعیت کے دوسرے مقالوں کی اشاعت کے انتظام کے لئے "اردو تالیف و ترجمہ" کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کر دیا ہے، جو ایسے منصوبوں کی اہمیت کے پیش نظر انہیں بھی کتابی شکل دینے کے لئے پوری توجہ دے رہا ہے۔ امید ہے کہ یونیورسٹی اپنے ان تحقیقی و تصنیفی کارناموں سے ملتان کے صدیوں پر محیط علم و دانش کے موتیوں کی شیرازہ بندی کرنے اور تلاش و جستجو کی منزلیں طے کرنے اور فکر و نظر کے نئے معیار قائم کرنے میں اپنا فعال کردار ادا کرے گی اور اس شہر بے مثال کے علمی شخص، تہذیبی مقام اور علم دوستی کی روایات کو متعارف کرنے کا ایک معتبر حوالہ بنے گی۔

مجھے امید ہے کہ اہل فکر و دانش یونیورسٹی کے ایسے علمی کاموں پر ضرور نقد و نظر فرمائیں گے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے بھی نوازیں گے۔ یقیناً ایسے مشورے اور جوصلہ افزائی کے کلمات ہماری ہمت بڑھائیں گے اور معیاری تصانیف و تخلیق میں ہماری جدوجہد کو با معنی اور بار آور کریں گے اور ہمارے ان مقاصد میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے جو ہم جامعہ بہار الدین زکریا کو مستقبل کی ایک بہترین یونیورسٹی بنانے کے لئے رکھتے ہیں اور اس کی تعمیر جدید شعور اور قدیم رفیع الشان روایات پر رکھنا چاہتے ہیں

(پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر رومانوی)

وائس چانسلر

بہار الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

دیباچہ

(از مصنف)

بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک بہت بڑی تاریخی اور تہذیبی صداقت کا بلیغ اشارہ کیا تھا، جب انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان تو اسی روز قائم ہو گیا تھا جس روز برصغیر میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ قبول اسلام دستِ تیغ پر نہیں، کسی خدا رسیدہ بندگ کے دستِ حق پرست پر ہوا تھا۔ چنانچہ حقیقتاً قیام پاکستان کا جواز ان صوفیائے کرام نے فراہم کیا جو برصغیر کے طول و عرض میں اپنے معتقدات اور معاملات کی شمعِ روشن لے کر پھیرے اور اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی تبلیغِ محبت اور عقیدت کے ساتھ کی۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان ایسی نظریاتی ریاست کے معتقدات اور معاملات کے تہذیبی ڈھانچے کا بنیادی محرک کہ صوفیائے کرام کی تعلیمات ہیں جو ایک طرف تو قرآن و حدیث اور سنت کے جوہرِ ملکوتی کی امین ہیں تو دوسری طرف اجتماعی سطح پر لکھ سکھ میں شرکت کی قوت اور زندگی کرنے کے باحوصلہ رویوں کے تعین میں ممد ثابت ہوئیں۔ اس لئے پاکستان کی فکری، تہذیبی اور ادبی تاریخ کا محور صوفیائے کرام کی شخصیات اور تعلیمات ہیں اور پاکستانی قوم کی فکری و نظری بھجائی اور اساس کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس مقدس سرچشمے اور ماخذ کے اثرات کو متعین کیا جائے جو صوفیائے کرام کا مرہونِ منت ہے۔

بہا سالین زکریا یونیورسٹی خود ایک بہت بڑے صوفی بزرگ کے نام نامی سے منسوب ہے اور پھر ملتان ایک طرف تو سندھ اور پنجاب کا تہذیبی سنگم ہے تو دوسری طرف بے پناہ تاریخی فکری اور ادبی صلاحیتوں کا گہوارہ اور مرکز بھی رہا ہے۔ اس لئے میں نے جب اس موضوع پر کام کرنے کا ارادہ کیا تو میرے پیش نظر محض سعادت کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ ٹھوس تہذیبی، تاریخی اور ادبی حثیت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

مٹان اور گرد و نواح میں بے شمار صوفیائے کرام کے مقابر اور مزارات ہیں جو بلا مبالغہ لاکھوں نہیں کر ڈوں بندگانِ خدا کے لئے رشد و ہدایت اور نکر و نظر کے مراکز ہیں۔ ان بندگانِ گرامی کے روحانی کمالات کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان بزرگوں نے شاگردوں کو دینی تعلیم اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کے مشن کے لئے فکری، نظری اور عملی تربیت بھی دی۔ عملی تربیت کے سلسلے میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ان بزرگانِ کرام نے مبلغانِ گرامی کو فنِ تعمیر کاشی گری، نقاشی، خطاطی، کوزہ گری، قالین بانی، جلد سازی جیسے فنون مفیدہ بھی سکھائے اور شہ سواری، پہلوانی، کشتی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی عملی تعلیم بھی دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات سے معاشرے کی باطنی تربیت اور ترقی کے لئے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اس لئے ان تمام عظیم ماخذات اور محرکات کی تحقیق کسی ایک علاقے کے لئے نہیں بلکہ ملکی اور قومی سطح پر افادیت کی حامل ہے۔ میرے پیش نظر یہی مقاصد تھے جن کے تحت میں نے اس منصوبے پر کام کرنے کا عزم کیا کام مشکل بھی تھا اور حوصلہ شکن بھی لیکن عزم و استقامت کے جذبے بھی مجھے نہیں صوفیاء کی زندگی کی ریاضت سے حاصل ہوئے اور میں نے سفر کا آغاز کر دیا۔ میری خوش نصیبی کہ موجودہ وائس چانسلر جناب محمد نذیر رومانی کو یہ منصوبہ پسند آیا اور انہوں نے نہ صرف زبانی حوصلہ افزائی کی بلکہ میرے لئے اس پراجیکٹ کی منظوری کا ذمہ بھی لیا اور بہ نفس نفیس پراجیکٹ کی تیاری میں مدد بھی فرمائی پھر اس پراجیکٹ کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر پی، ایچ، ڈی کے لئے رجسٹر کر لے کا صائب مشورہ بھی انہوں نے خود دیا اور اس طرح میں نے اس موضوع کو پی، ایچ، ڈی کے لئے بھی منتخب کر لیا اور کام شروع کر دیا۔

تصرف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو کتب اور مضامین میری نظر سے گذرے ہیں ان میں سے ماسوائے چند ایک کے باقی سب کے سب تحقیقی نقطہ نظر سے تشنہ اور نا کافی ہیں۔ حوالہ جات موجود نہیں ہیں۔ کشف و کرامات کے واقعات پر زیادہ زور دیا گیا ہے بعید از عقل اور اس موضوع پر ماورائے شعور چیزیں دل کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ سنین میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس موضوع پر زیادہ تر چیزیں ان لوگوں کی تصنیف یا تالیف کردہ ہیں جو کم علم ہیں اور محض عقیدت کے طور پر یا سعادت حاصل کرنے کیلئے لکھنے پر آمادہ ہوتے، بعض لوگوں نے ذاتی مفاد پرستی کی خاطر اور بعض نے اس سلسلے کے بنیادوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان بزرگوں کے مافوق الفطرت اور محیر العقول کارناموں پر مبالغہ آمیز طریقے سے لکھا

گویا ہر بواہوس نے عشق پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گمتے

میں نے یہ کوشش کی ہے کہ کوئی بات بغیر حوالے اور سند کے نہ آئے عام طور پر یہ سعی بھی کی گئی ہے کہ اصل کتاب کے حوالے دیئے جائیں اور ثانوی حوالوں سے اجتناب کیا جائے لیکن ملتان میں لائبریری کی قلت ہے اور کتب نایاب ہیں اس لئے جہاں کہیں ناگزیر تھا یا زیادہ نقص کا خطرہ نہ تھا ثانوی حوالے اختیار کرنے پڑے لیکن ان کتب کے باقاعدہ حوالے بھی درج کر دیئے گئے تاکہ ایمان داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

میری نہیں سرزمین ملتان کی خوش نصیبی ہے کہ ہمیں جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق جناب علامہ متین فکری (مرحوم) جناب مرزا ابن حنیف جناب حبیب فائق اور جناب اسد نظامی جیسے علما ماہل فکر اور نایاب کتابوں کے حامل بزرگوں کی رہنمائی، شفقت اور اخلاص نصیب ہے۔ میرا یہ مقالہ نہ تو تکمیل کی منزل تک پہنچا اور نہ ہی دقیق بنا اگر مجھے ان بزرگوں سے قلمی اور نایاب کتب دستیاب نہ ہوتیں میں نے قلمی کتابوں کے حوالوں میں ان شخصیتوں کا ذکر کر دیا ہے جن سے مجھے یہ نسخے حاصل ہوئے۔ ان بزرگوں کے ساتھ ساتھ جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بھی بہت سی نایاب کتب مجھے ہمیا کیں میں ان سب بزرگوں اور شفیق بھائی ڈاکٹر طاہر تونسوی کی بے حد شکر گزار ہوں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق جیسے عالم کی رہنمائی حاصل ہوئی ڈاکٹر صاحب کا دم ملتان اور اہل ملتان کے لئے ہی نہیں پورے ملک کے لئے باعث برکت اور لائق قد افتخار ہے وہ نہایت دقیق اور بیش بہا کتابوں کے مصنف، مفسر قرآن، محقق، نقاد، دانشور اور شاعر ہیں مجھے اعتراف ہے کہ ان رہنمائی کے بغیر میرا یہ مقالہ اہم اور معیاری نہ بنتا۔

جناب علامہ عتیق فکری (مرحوم) جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، نے مقالے کے خاکے کی تیاری سے لے کر اس کی تکمیل تک نہ صرف مفید اور اہم مشورے دیئے بلکہ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ اللہ انہیں نعت رحمت کرے۔ جناب مرزا ابن حنیف نے ملتان کی قدامت اور سیاحوں کے بیانات کے سلسلے میں بڑی مدد کی، جناب حبیب فائق نے اپنی نایاب کتب بڑی فیاضی سے میرے سامنے رکھ دیں۔ انہوں نے جناب اسد نظامی جیسے بزرگ سے متعارف کرایا جن کے پاس کم و بیش ڈیڑھ ہزار قلمی نسخے اور ہزاروں کی تعداد میں نایاب کتب موجود ہیں۔ اس قلندر منشی اور درویش

صفت انسان کی فیاضی کا کمال یہ ہے کہ وہ خود زحمت اٹھا کر ہمیں نایاب فلمی کتابیں پہنچاتے رہے اور انہوں نے ان نایاب نسخوں کو استفادے کے لئے ہمارے پاس رہتے دیا۔ ادھر ایسے خضر صفت لوگ موجود ہیں تو دوسری طرف وہ دولت مند اور امرا بھی ہیں جو محض نام و نمود کی خاطر کتب خانے قائم کرتے ہیں ان کتابوں کو اماںوں میں مقفل کر کے ان کو محض سجاوٹ کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ میں نے بہت سے سجادہ نشینوں، نام نہاد دانشوروں اور تنگ دل امرا کو نہ صرف خطوں کے ذریعے اپیل کی بلکہ اپنے بہت سے عزیزوں کی معرفت ان تک رسائی بھی حاصل کی لیکن سوائے زبانی جمع خرچ کے اور ٹر خانے کے انہوں نے کوئی چیز مہیانہ کی یہاں تک کہ وہ متولی اور سجادہ نشین جو بزرگوں کی مسندِ فضیلت پر بیٹھے ان کی نیک نامی کی کمانی کھارے ہیں خود اپنے بزرگوں کی تعلیم اور اتار کے ریکارڈ اور تاریخ کی ترتیب کیلئے کوئی مدد کرنا تیار نہ ہوتے اس لئے آفرین ہے ان بزرگوں پر جن کے اسم گرامی اور درج کے گئے ہیں کہ جو فقری کے باوجود فیاض ہیں، دریا دل ہیں اور وسیع النظر ہیں۔ جو اپنی ساری کمائی ان کتابوں کے حصول پر خرچ کرتے ہیں جو ان کے نزدیک دوسرے لوگوں کو شعور عطا کر سکتی ہے یوں وہ اپنی جھونپڑیوں اور بال بچوں کو دھندلوں میں رکھتے ہیں، لیکن دوسروں کے ذہن و دماغ کو اجلے اور ان کے نکر و شعور کو لوزِ عرفان سے منور کر دیتے ہیں انہیں درویشوں اور صوفی منش انسانوں کے ذریعے مجھے وہ مآخذ حاصل ہوئے ہیں جو بڑی بڑی لائبریریوں اور عجائب گھروں میں بھی موجود نہیں ہیں۔ صوفیاء کے ملفوظات، ان کے کلام اور علم و ادب کے اور نجل مآخذ (SOURCES) تک رسائی ان بزرگوں کی عنایت اور شفقت کی بدولت ہے۔ ان فلمی نسخوں کی تفصیل آگے چل کر امگ سے درج کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو خضر کی عمر عطا کرے کہ ان کی بدولت زوال آمادہ معاشرے کا بھرم قائم ہے۔ جناب ڈاکٹر انوار احمد اور جناب ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ کے صاحب مشورہ کے لئے شکر گزار ہوں۔ جناب کریم ملک اور جناب جبار صاحب نے اس مقالے کی طباعت کے لئے سائی کی ان کل بھی شکر بہ ادا کرتی ہوں۔

مقالے کی موجودہ صورت یہ ہے کہ اس کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) باب اول — متان — پس منظر

(۲) باب دوم — متان کے صوفیاء (دسویں صدی، ہجری سے پہلے)

(۳) باب سوم — متان کے صوفیاء (دسویں صدی، ہجری کے بعد)

(۴) باب چہارم — متان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ

پہلا باب ملتان کے بارے میں ہے۔ اس باب میں تین حصے قائم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں ملتان کی قدامت، اہمیت اور سیاسی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ محمد بن قاسم کے حملے سے پہلے عرب ہند تعلقات، ان کی نوعیت پھر محمد بن قاسم کے تحت مسلمانوں کا حملہ اور اس کے اثرات، محمود غزنوی کے حملے اور اثرات کا ذکر کرنے کے بعد صوفیائے کرام کی برصغیر میں آمد کا احوال ہے۔

اس باب کے دوسرے حصے میں ملتان کی مذہبی، معاشرتی، لسانی اور تہذیبی زندگی کا جائزہ، یونانی، چینی، عربی اور یورپی سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ ان بیانات کی تحقیق و مستحضر کے لئے اصل کتابوں تک رسائی حاصل کی گئی۔ خوش قسمتی سے عرب سیاحوں کے سفر ناموں اور تاریخوں کے اردو ترجمے کئے جا چکے ہیں اس لئے اس سلسلے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی اور تراجم کے ذریعے ان کے بیانات کی تفہیم ہمارے لئے مشکل نہ رہی۔ مترجم حضرات نے اچھا کیا ہے کہ اردو ترجمے کے ساتھ ساتھ اصل عبارتیں بھی دے دی ہیں جن کی وجہ سے بہت سہولت رہی۔

تیسرے حصے میں سرزمین ملتان میں لسانی تشکیلات کے عمل کا تجزیہ مختلف ماہرین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ لسانی تشکیل کا عمل صدیوں جاری ہے۔ ملتان میں یہ عمل غیر ملکی حملہ آوروں کی وجہ سے مسلسل اور مربوط انداز میں جاری رہا، مسلمانوں کی آمد سے اس علاقے کے لوگوں پر نہ صرف سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح کے اثرات مرتب ہوئے بلکہ زبان کی تشکیل اور تبدیلی میں لسانی اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے ماہرین فن نے ملتان کو اردو زبان کی تشکیل کا پہلا گہوارہ قرار دیا ہے۔ اس حصے میں انہی حقائق کا ذکر ہے۔

دوسرا باب ملتان کے ان صوفیاء پر مشتمل ہے جن کا تعلق دسویں صدی ہجری تک سے ہے۔ اس باب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس دور میں ملتان کی مذہبی، تہذیبی، معاشرتی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ملتان پر بنو ساسم کی حکومت تھی اور بعد میں کافی عرصہ قرامطیوں کا قبضہ رہا۔ فرقہ اور اس کے عقائد کا ذکر اجمالا کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں صوفیاء کرام کے ملتان میں ورود اور ان کی مذہبی، تہذیبی، معاشرتی، لسانی اور ادبی خدمات کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے۔ ان صوفیاء میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باہر سے ملتان تشریف لائے اور ساری عمر شہد ہدایت میں

گزار کر کہ ہیں دفات پائی۔ کچھ وہ ہیں جو تعلیم و ہدایت کا فریضہ انجام دے کر واپس چلے گئے اور کچھ ایسے صوفیاء ہیں جنہوں نے اسی سرزمین سے جنم لیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

اس باب میں دیوان چاولی مشائخ، حضرت شاہ یوسف گردیز، خواجہ معین الدین اجمیری قلیب لیل، بختیار کالی، بہار الدین زکریا ملتانی، بابا فرید گنج شکر، مخدوم عبدالرشید حقانی، شاہ شمس سبزواری، صدر الدین عارف، شیخ رکن الدین عالم، شیخ حسام الدین ملتانی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ملا لال الدین سرخ بخاری، صدر الدین راجو قتال، شیخ حسام الدین متقی ملتانی، امیر خسرو اور حسن بخاری کا احوال الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ ان بزرگوں کے علاوہ ملتان کے کئی ایک صوفیاء کا ذکر رپیر دربر شاہ، شیخ حسین کاہر، حضرت شاہ داتا شہید، حضرت سلطان ایوب قتال، شیخ محمد اسماعیل اور حضرت شاہ علی محمد، مجموعی حیثیت میں کیا گیا ہے۔ ان صوفیاء کے احوال میں زیادہ ان کی سانی و ادبی اور تہذیبی خدمات کو سامنے رکھا گیا ہے۔

تیسرا باب سرزمین ملتان کے ان صوفیاء پر مشتمل ہے جو دسویں صدی ہجری کے بعد کے زمانے کے ہیں اور جن کا براہ راست تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔ اس باب کے شروع میں پس منظر کے طور پر اس دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت موسیٰ پاک شہید، حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی، حضرت خواجہ خدابخش، حضرت سلیمان تونو، حضرت غلام حسن شہید اور حضرت خواجہ غلام فرید کے احوال و آثار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان صوفیاء کی تہذیبی خدمات، فنون لطیفہ و مفیدہ میں ان کی دلچسپی، اثرات اور سانی و ادبی کارناموں کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے۔ ان صوفیاء کے ملفوظات کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے اور قلمی نسخوں کی مدد سے ان کے ادبی کارناموں کی تفصیل بھی سامنے لائی گئی ہے۔ حضرت حافظ محمد جمال اللہ ملتانی، حضرت غلام حسن شہید اور حضرت خواجہ غلام فرید کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری پر اتنی تفصیل سے ابھی تک نہیں لکھا گیا ہے۔ حضرت غلام حسن شہید کی اردو شاعری کی دریافت اور اس پر تبصرہ پہلی بار سامنے آ رہا ہے۔ اس لحاظ سے اس مقالے میں واقعی نئی تحقیق سامنے آئے گی۔

چوتھا اور آخری باب دراصل پورے مقالے کا پنچوٹ ہے۔ جس میں صوفیائے کرام کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بھی تین حصے بنائے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں ملتان کے

فنون لطیفہ و مفیدہ پر صوفیاء کے اثرات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، ان فنون میں فن تعمیر ملتان کی مساجد اور خانقاہوں کے حوالے سے، فن کوزہ گرمی، قالین اور پارچہ باقی، فن خطاطی طب کا فن عرس اور میلے، فن موسیقی اور سماع کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان سب کا جائزہ صوفیاء کے اثرات اور ملتان میں ان کی ترویج و ترقی کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ ملتان کی تعلیمی، تدریسی اور علمی زندگی پر صوفیاء کے اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔

ملتان میں خانقاہوں اور مدرسوں کا قیام اور ان کی بدولت عظیم تعلیمی و تدریسی نظام کا نفاذ دراصل صوفیائے کرام کا مرہون منت رہا ہے۔ اسی طرح ملتان میں فلسفے کی ایک عظیم روایت زمانہ قدیم سے قائم دکھائی دیتی ہے۔ اس روایت میں بھی صوفیاء کا حصہ اور ان کی خدمات کسی لحاظ سے کم نہیں۔ اس باب کے تیسرے اور آخری حصے میں ملتان کی ادبی و ہندی زندگی پر صوفیائے کرام کے اثرات کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی عمومی حالت کا ذکر کیا گیا ہے پھر مسلمانوں کی آمد کے اثرات، صوفیائے کرام کا ورود اور ان کی تعلیمات، زبانوں کے اختلاف میں صوفیاء کا حصہ، اردو زبان و ادب کی ترویج صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ عمومی سطح پر لینے کے بعد ملتان کے صوفیاء کے ہندی زبان پر اثرات اور شعروادب کی ایک عظیم روایت کی تشکیل میں ان کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ملتان میں مزاج پر صوفیاء کے اثرات، موجودہ دور میں تصوف کی صورت حال اور عصر حاضر میں اس کے احیاء کی ضرورت کا ذکر کیا ہے اور حرف آخر کے عنوان سے اس مقالے کا جواز پیش کیا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کے لحاظ سے یہ مقالہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اصل ماخذات کے حصول کے بعد ان پر روایتی انداز میں تبصرہ نہ کروں اور نہ دوسروں کی تحریروں پر اکتفا کروں بلکہ اپنے مطالعے اور رائے کو اہمیت دوں۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری سے پہلے صوفیاء کے سلسلے میں بالعموم اور دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء کے سلسلے میں بالخصوص آپ کو اور جنبل کامٹے کا۔ حضرت بہار الحق زکریا حضرت بابا فرید، حضرت موسیٰ پاک شہید، حضرت سلیمان تونسوی، حضرت خواجہ خدابخش، حضرت حافظ جمال، حضرت غلام حسن شہید اور حضرت خواجہ فرید کے احوال و افکار اور شعروادب میں ان کی خدمات کے جائزے میں آپ کو انفرادیت اور تازگی کا احساس

ہوگا۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس مقالے کی بعض چیزیں پہلی بار سامنے آ رہی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) حضرت غوث بہار اکتی زکریا ملتانی کے فارسی دیوان کی دریافت اور ان کی فارسی شاعری کا جائزہ۔

(۲) حضرت غلام حسن شہید کی اردو شاعری کے نمونوں کی دریافت اور ان پر تبصرہ (انکی فارسی شاعری پر تبصرہ بھی ایک نئی چیز ہے)

(۳) حضرت حافظ جمال اللہ کی شاعری پر تبصرہ۔

(۴) حضرت خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری کا اس قدر تفصیلی جائزہ شائد ہی پہلے کسی نے لیا ہو۔

(۵) فقیر محمد عارف اور شاہ بخش عاصی ملتانی کو بطور شاعر پہلی بار اس مقالے میں متعارف کرایا گیا ہے۔

(۶) اس قدر قلمی نسخوں کی دستیابی اور ان کے حوالوں کا اندراج۔

(۷) اس موضوع پر ذریعہ مواد کی فراہمی اور ان کو یکجا کرنے کا مشکل لیکن اہم کام

میری یادنی کاوش کہاں تک ماہرین فن اور اہل علم کو نگاہ میں بار پاتی ہے مجھے اس کا انتظار ہے۔ صنف نازک میں شمار ہونیکے حوالے سے اپنی نارسائی کا جواز غالب کے اس شعر میں پیش کرتی ہوں کہ

مناں یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے تفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لئے

ردِ بینہ تریضے

باب اول

مُلْتان

- الف - مُلتان کی قدامت و اہمیت اور سیاسی تاریخ
 ب - مُلتان کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا جائزہ
 سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں
 ج - سرزمین مُلتان میں بسائی تشکیلات کا عمل

بسم الله الرحمن الرحيم

رأب اب

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

(الف) ملتان کی قدامت و اہمیت اور سیاسی تاریخ

ملتان کی قدامت و اہمیت | راوی، پنجاب، جہلم کی موج لہروں میں گھرا ہوا ملتان کا زرخیز علاقہ اپنی قدامت اور تاریخی حیثیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اپنی سرسبزی و شادابی، زراعت اور فراواں دولت کی وجہ سے ہر حملہ آور کے لئے کشش کا باعث بنا رہا۔ ہر سیاح اور جغرافیہ نویس نے، چاہے وہ عرب و ہند سے تعلق رکھتا تھا یا یورپ کی سرزمین سے، اپنی تصنیف یا تالیف میں اس علاقے کا ذکر ضرور کیا ہے۔ ان کے بیانات سے ملتان کی قدامت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ملتان کی قدامت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ "رگ وید" جیسی قدیم مذہبی کتاب کا کچھ حصہ ملتان کے آس پاس کے علاقوں میں تصنیف ہوا۔ "رگ وید" ملتان کی وسیع وادیوں میں تیرہ سو سال قبل از مسیح سے لے کر قبل مسیح آٹھ سو سال تک میں مکمل ہوئی اور یہی زمانہ تھا جب آریا مشرقی سندھ کے علاقے سے ہوتے ہوئے اپنے آخری دور میں سرسوتی یعنی بھنڈا کے علاقہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہیں "رگ وید" کا کچھ حصہ تصنیف ہوا۔ علامہ عتیق فکری کی تحقیق کے مطابق،

"اس کا تین چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ پنجند، علی پور، ملتان، اور ساہیوال یعنی ہڑپہ کے علاقہ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں جھنگ، شورکوٹ بھی شامل ہے۔ کیونکہ ایک ہزار قبل مسیح شورکوٹ کے قبیلہ بھارت سے آریا کی ایک زمانہ تک جنگ رہی تھی اور شورکوٹ کی سیوی حکومت کے نپے کچھ

آثار سکندر کے وقت تک موجود تھے جو ختم ہو کر چند گہیت کی حکومت میں شامل ہو گئے۔ (۱)۔

رگ وید نہ تو ایک شخص کی لکھی ہوئی ہے اور نہ ایک ہی وقت میں لکھی گئی ہے۔ صدیوں کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی سرمائے کو محفوظ رکھنے والی رگ وید، کئی رشیوں نے مختلف اوقات میں لکھی۔ یہ بھجنوں، اشلوکوں پر مبنی ہے جو آریاؤں کے صدیوں کے ذہنی و فکری ارتقاء کا نتیجہ تھا۔ سنسکرت کالج کلکتہ کے پرنسپل اور ہندی فلسفے کے سکالر ایس، آر، این گپتا کے مطابق

” رگ وید کے بھجن نہ تو شخص واحد کی محنت کا ثمرہ ہیں نہ وہ کسی ایک خاص زمانے سے متعلق ہیں، غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے ان کو لکھا ہے اور یہ بھی اغلب ہے کہ بعض تو آریوں کے ہندوستان آنے سے قبل ہی مرتب ہو چکے تھے، یہ روایتاً پہنچے ہیں اور بعد کی نسلوں کے شعراء کے جدید اضافے ہونے لگے اور جب مجموعہ بہت بڑھ گیا تو غالباً اس کو موجودہ صورت کی ہیئت میں ترتیب دیا گیا، یا اور کسی قدیم صورت میں ترتیب دیا گیا ہو گا جو موجودہ ہیئت اور ترتیب کا ماخذ ہوں۔ اس لئے ہندوستان میں آنے سے قبل یا بعد میں یہ وید مختلف زمانوں میں آریا قوم کی تہذیب کا آئینہ رہے ہیں۔ یہ یکتا یادگار اس طویل غائب شدہ زمانے کی ہے۔ جس کی جمالیاتی قدر بہت اہم ہے اور جس میں اصلی شاعری کی زبردست جھلک ہے۔“ (۲)

آریا جب کھیتی باڑی کے لئے زمین کی تلاش میں ملتان کے وسیع علاقے میں پہنچے تو انہوں نے دریاؤں کے آس پاس آبادیاں قائم کر لیں۔ رگ وید میں دیوتاؤں کے لئے بھجنوں کے علاوہ ان ندیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے کنارے وہ آباد تھے۔ چنانچہ ان

۱۔ بحوالہ نقش ملتان جلد اول مصنف علامہ متین فکری، ص ۲۳ مطبوعہ فکری اکیڈمی بشارت مجلس تاریخ و ثقافت ملتان۔

۲۔ بحوالہ ”تاریخ ہندی فلسفہ“ جلد اول از ایس، آر، این گپتا، ص ۲۱ - ۲۰، مطبوعہ دارالطبع جامعہ

عثمانیہ سرکار حیدرآباد دکن، ۱۹۲۵ء

کی شاعری میں خاص طور پر سندھ ندی کا ذکر ملتا ہے جس کی روانی سے وہ اپنی شاعری کی روانی اور فصاحت کو تشبیہ دیتے تھے۔ چنانچہ سندھ ندی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

”چمکنے والی درختاں، عالی شان، نہ فتح ہونے والی ہے،

سب ندیوں سے زیادہ اس میں پانی ہے، خوب صورت ابلق

گھوڑی کی طرح حسین ہے۔ اس کا پانی گھاٹ سے ادھر چڑھ جاتا ہے (۳)

آریاؤں نے مشرقی سندھ اور ملتان کی وسیع سرزمین کا رگ وید میں ذکر کیا ہے۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے گنگا جمنی کی طرف رہائش اختیار کر لی تھی لیکن اپنی تحریروں میں جو رسم الخط اور انداز اپنایا اس میں مشرقی سندھ اور ملتان کی سرزمین کا اثر ہے۔ بقول علامہ عتیق فکری،

” ہمیں رگ وید میں نہ تو بنارس، نہ لکھنؤ، نہ بہار نہ ممقرا

کا ذکر ملتا ہے۔ بلکہ بھنڈہ جو زمانہ قدیم میں ملتان کی سلطنت کے تحت

تھا۔ اس کی ندی سرسوتی جو ایک زمانہ ہو ختم ہو چکی ہے کا نام ملتا

ہے یا پھر مشرقی سندھ اور ملتان کے علاقے کا ذکر ملتا ہے؟ (۴)

معروف ماہر آثارِ قدیمہ مرزا ابن حنیف اپنی تصنیف ”سات دریاؤں

کی سرزمین“ میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ رگ وید کی پہلی کتاب کے ۱۳۲ ویں

گیت میں جن دو شہروں ”ویل استھان“ اور ”مہاویل استھا“ کا ذکر ہے وہ دراصل

ملتان ہی کا قدیم نام ہے۔ وہ لکھتے ہیں،

” اس گیت سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ ان دونوں شہروں

ویل استھان کا اور مہاویل استھا کو آریا پہلے ہی مسمار کر چکے تھے۔ سوال ہے

کہ یہ آخر کون سے شہر ہو سکتے ہیں؟ ملتان کا ایک نام ”مول استھان“

۲۔ ”ویدک ہند“ از میڈم زیڈ نے راگوزن ص ۲۰۳، اردو ترجمہ مولوی حمید احمد انصاری

مطبوعہ دارالترجمہ سرکار حیدرآباد دکن ۱۹۲۱ء

۳۔ بجوالہ ”نقش ملتان“ جلد اول، ص ۱۰۶۔

(ملی استھان) بھی رہا ہے۔ چنانچہ کیا کسی طرح یہ ممکن ہے کہ رگ وید کا
 ویل استھان کا (ویلاستھان کا) یا ہاویل استھان ، تین سو اسی ہزار
 برس بیشتر ملتان ہی ہو اور ملتان ہی کا نام اس وقت ویل استھان ہو؟
 میرے نزدیک ایسا ممکن تو ہے کہ " ویل استھان " کا زمانہ گزرنے کے
 ساتھ ساتھ بتدریج تغیر و تبدل کے سبب " مول استھان " بن گیا ہو۔ ایک
 صورت اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ رگ وید کے دور
 میں ملتان کا نام مول استھان (مل استھان) ہو۔ آریائی شاعر نے اپنی
 نظم میں مول استھان یا اس سے بالکل ملتا جلتا ہی کوئی ایسا نام باندھا جو
 صرف میم (م) سے شروع ہوتا ہو، مگر جب مدتوں بعد اس گیت کو
 ضبط تحریر میں لایا گیا تو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تلفظ بھی تبدیل ہو
 جانے سے لوگوں کی زبانوں پر اس کا نام ویل استھان کا چڑھ گیا ہو اور
 لکھا گیا ہو۔ بہر کیف میرے خیال میں یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ " ویل
 استھان " کا مول استھان اور مولستان بنا ہو یا مول استھان کو آریاؤں نے
 ویل استھان کا نام دیا ہو اور یہی لکھا بھی ہو۔ اگر میری یہ قیاس آرائی،
 درست ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سکندر کے حملے سے بھی ہزار بارہ سو
 سال قبل ملتان کا نام ویل استھان، ہاویل استھان، مول استھان یا پھر
 ان سے ملتا جلتا ہی کوئی نام ہوگا۔ (۱)

رگ وید کے متعلقہ حصے کا انگریزی ترجمہ رالف ٹی۔ ایچ گرنفٹھ نے اپنی کتاب
 "The Hymns of the Rigveda" میں یوں کیا ہے۔

" اے مگھون! ان طاقت ور دلیر جاوگر نیوں کو مار بھگا۔ انہیں
 تنگ کر ڈھے میں، گہرے اور تنگ کر ڈھے میں پھینک دے " (۲)

گرنفٹھ نے کوئی ایک صدی قبل (۱۸۸۹ء) رگ وید کا دو جلدوں میں مکمل

۱۔ "سات دریاؤں کی سرزمین" تین پر اسرار خطے اور ملتان، از ابن حنیف پبشر کاروان ادب ملتان۔

۲۔ بار اول، اکتوبر ۱۹۸۰ء ص ۲۳۵ تا ۲۳۶۔



87053

ترجمہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ویدی زبان کے بارے میں معلومات بہت کم تھیں، اور ترجمہ کی جملہ اور ضروری سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں۔ چنانچہ گرفتہ نے "ویل استھان کا اور ہاویل استھا" کا اپنی معلومات کی حد تک لفظی ترجمہ کر دیا۔ یعنی اس نے "ویل استھان" کا ترجمہ "تنگ گڑھا" اور "ہاویل استھا" کا ترجمہ "گہرا اور تنگ گڑھا" کیا۔ حالانکہ خود رگ وید کے مذکورہ گیت کی رو سے بھی یہ دونوں شہر تھے اور اس گیت کی رو سے تباہ ہو چکے تھے۔ رگ وید میں متعدد تباہ شدہ شہروں اور بڑی بڑی تباہ شدہ آبادیوں کے ٹیلوں کا ذکر ملتا ہے)۔ چنانچہ بعد میں برجٹ اور ریمنڈ ایلچن نے اپنی کتاب "The Rise and fall of civilization

in India & Pakistan

میں انہی سطروں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ یوں ہے۔

"اے مگھون (اندر) تباہ شدہ شہروں ویل استھان اور تباہ شدہ شہر

ہاویل استھا میں جادو گرنیوں کے غول کو تباہ کر دے" (۱)

ان ناموں کے بارے میں یہ قیاس درست ہو یا نہ ہوتا ہم اس میں شک

نہیں کہ تہذیب انسانی کے حامل قدیم ترین شہروں میں ایک ملتان ہے۔ آرسی ٹیل کے مطابق

(جس وقت) زمین و آسمان کی مدت ۶،۲۸۵،۰۰۰ برس تھی اس وقت سے ملتان

آباد ہے اور چاروں دوروں سے گزر چکا ہے۔ پہلے دور میں اس کا نام راہنس پور تھا^(۲)

1 "The Rise and fall of civilization in

India & Pakistan" Page 308 by BRIDGET

AND RAYMOND ALCHIN.

* The Hymns of the Rigveda, Translated

by PALPH T.H.GRIFFITH

2 Volumes. First Edition 1889, Fifth

print 1971 - VARANASI - INDIA.

۲- حکایات پنجاب (حصہ سوم) مرتبہ آرسی ٹیل ترجمہ میاں عبدالرشید ص ۳۶۲ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۲ء -

مستان کی قدامت کا اندازہ لگاتے ہوئے مرزا ابن خلیف مزید لکھتے ہیں کہ
 ”مستان کی قدامت اور اہمیت کے سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں
 رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ نہ صرف سکندر اعظم بلکہ عروج یافتہ ہڑپائی دور
 (۲۵۰۰ ق م تا ۲۰۰۰ ق م) میں بھی مستان میں قلعہ اور فصیل موجود تھی۔
 ہڑپائی دور میں بالفرض نہ سہی تو کم از کم سکندر کے زمانے میں تو مستان میں
 عظیم الشان اور مضبوط و مستحکم قلعہ بہر حال موجود تھا۔ چنانچہ سواد و ہزار سال
 قبل مستان میں قلعہ کی موجودگی سے باسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسے
 اتنا بڑا مرکزی اور اہم شہر بننے میں کتنا عرصہ صرف ہوا ہوگا کہ جہاں قلعہ بھی
 بن سکے۔ ظاہر ہے کہ شہر کا یہ تدریجی ارتقاء چند برسوں میں تو ہونے سے رہا
 ہزاروں سال ہی لگے ہوں گے۔“ (۱)

کرم الہی بدر کے بیان کے مطابق

”جب آریالوگ یہاں آئے تو انہوں نے دریائے سندھ کی مناسبت سے
 اس تمام علاقے کو سندھ کہنا شروع کر دیا جو دریائے سندھ سے سیراب ہوتا
 تھا۔ لورالائی سے روپڑ تک اور سوات سے راجپوتانہ تک آریوں کی اصطلاح
 میں سندھ ہی سندھ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر مستان کو مرکز مان کر پربکار بحیرہ عرب
 تک کھولی جائے تو جتنا علاقہ اس کے اندر ہوگا اس کی طبعی اور لسانی وحدت
 ہوگی اور یہی آریوں کا سندھ تھا۔“ (۲)

پھر آگے چل کر کرم الہی بدر اپنی بات کے ثبوت میں فاؤچر (Foucher)
 کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ

”فاؤچر صاحب بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ ہم مستان کی قدامت سے انکار
 نہیں کر سکتے۔ یہ چھ ہزار سال ق م میں کیشپ پورہ کے نام سے موجود تھا۔“

۱۔ بحوالہ سات دریاؤں کی سرزمین، تین پراسرار خطے اور مستان، ص ۲۲۱۔

۲۔ تاریخ مستان (۵ ہزار قبل مسیح سے دور حاضر تک) مصنف کرم الہی بدر، بار اول ۱۹۷۸ء

امتراج پبلی کیشنز، لاہور، ص ۵۸۔

اور تیسری صدی ق م میں جب آریوں کے قافلے وادی سندھ میں اترے تو ملتان بڑی اور آبی دونوں راستوں کے لحاظ سے وادی سندھ کے ممتاز شہروں ہڑپہ اور موئنجو داڑو کو ملانے والا مرکزی شہر تھا۔ (۱)

۲۔ ملتان کے قدیم نام اور ان کا جائزہ | دور قدیم میں ایک نہایت اہم اور مرکزی شہر ہونے کی حیثیت سے ملتان ہمیشہ حملہ آوروں کی زد میں رہتا تھا۔ اس لئے یہ شہر بار بار اُجڑتا اور بتا رہا اور اس کے حکمران بھی بدلتے رہے اور اسی بنا پر مختلف زمانوں میں اس کے نام بھی بدلتے رہے۔ ملتان کے مختلف ناموں اور وجہ تسمیہ کا جائزہ لیں تو سابقہ صفحات میں آنے والے ناموں کے علاوہ بہت سے اور نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ملتان کے قدیم ناموں میں قدیم ترین نام "کیسپ پورہ" یا کسپ پورہ، ہے۔ یونانی مؤرخوں ہیروڈوٹس HERODOTOS ۴۸۴ تا ۴۲۵ ق م اور ہکٹائیوس HECATAESUS (۵۰۰ ق م) نے قدیم زمانے میں ملتان کے نام کو کیسپ پورہ یا کسپے ٹورس اور ٹیوی می KLAODIOS PTOLEMAIOS (دوسری صدی عیسوی) نے کیسپیرا کہہ کر لپکا رہا ہے۔ قدیم سنسکرتی لٹریچر میں اس کا نام "کیسپ پورہ" آیا ہے، یہ بھاگ پورہ، سمبا پور اور ہنس پور کے ساتھ آیا ہے (۲) ہندو دیومالائی کہانیوں کے مطابق ملتان "جہارشی کیسپ" (۳) نے آباد کیا جس کی وجہ سے

- ۱۔ "تاریخ ملتان" (پانچ ہزار قبل مسیح سے دور حاضر تک) مصنف کرم الہی بدر، ص ۸۸، مطبوعہ امتزاج پبلی کیشنز، لاہور، بار اول ۱۹۷۸ء
- ۲۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (الف)، تاریخ ملتان از کرم الہی بدر، ص ۲۰ تا ۵ (ب)، سات دریاؤں کی سرزمین، ص ۲۳۷۔
- ۳۔ کیسپ ویری دور کے سات عظیم ترین رشیوں میں سے ایک تھا۔ بحوالہ سات دریاؤں کی سرزمین، ص ۲۳۷۔

اس کا نام کیسپ پورہ یا کَشپ پورہ پڑ گیا۔

ملتان کا ایک نام "پرہلا پورہ" بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ ہندوؤں کی قدیم ترین مقدس پران کتابوں میں درج کی گئی ہے (۲) یہ نام بھگت پرہلا د کے نام پر پڑا تھا۔ بھگت پرہلا د کا مندر اب تک قلعے کے مشرق کی طرف حضرت غوث بہار الدین زکریا ملتانی کے مزار کے پاس موجود ہے بھاگوت پران کی رو سے ملتان راجہ کرشن کے بیٹے شامپ کے ناک سے شامپ پورہ بھی کہلوایا کیونکہ شامپ نے ملتان کو آباد کیا تھا۔ شامپ کو کسی رشی کی بددعا کی وجہ سے کوڑھ کی بیماری ہو گئی تھی عرصہ تک علاج کروانا رہا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ ایک عرصہ تک متروں کے درختوں کے سائے میں لیٹا رہا۔ اس طرح اسے صحت حاصل ہوئی اس خوشی میں اس نے ملتان شہر کو جو عرصہ سے غیر آباد چلا آ رہا تھا آباد کیا۔ یوں ملتان اس کے نام پر "شامپ پورہ" یا "شام پورہ" کہلایا۔ (۳)

ملتان کے ناموں میں ایک "سنب پورہ" بھی آتا ہے جس کے متعلق مقدس پران میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک جنگ میں رانی جنب وطن نے کرشن جی کے ساتھ وفاداری دکھائی۔ کرشن جی کے رتھ کا لوہا ٹوٹ گیا تو رانی نے اس کی جگہ اپنا بازو دے دیا۔ چنانچہ کرشن جی نے کامیابی کے بعد ملتان شہر رانی کے بیٹے سنب کو بخش دیا جس نے ملتان کو جدید طرز سے آراستہ کیا۔

۱- سید نور علی ضامن لکھتے ہیں "چھٹی صدی قبل از مسیح کے دارا اول کے فرستادہ مشہور جہاز ران سکائی لیکس کی دریائے سندھ کی تفتیشی سیاحت کا علاقہ پیکسٹیک کا شہر کیسی پیٹرکس

Casy Patrus سے آغاز کرنے کا ذکر ہے۔ چند ہویں صدی کے البیرونی نے اس کو KASYAPARURA کاشی اپاپورا بنا دیا ہے۔ ہیروڈوٹس نے یونانی میں تلفظ ڈھالا تھا۔ البیرونی نے اصل مقامی تلفظ کہہ ڈالا اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ وہ شہر ملتان تھا۔ غالباً اس کا قول درست ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں تذکرہ شرح سکندر نامہ ایرین یونانی) مطبوعہ ادارہ تحقیق

وتذکرہ احمد پور شرقیہ ۱۹۶۶ء ص ۲۶

۲- ملاحظہ فرمائیے بھاگوت پران (ساتواں اسکند) کوہ نور پریس لاہور ۶۸ء

۱۸۶۷ء ص ۱۱۰ تا ۱۱۲ (علامہ عتیق فکری کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی۔)

۳- بھاگوت پران ص ۲۲۵

اسی وجہ سے ملتان کا نام سنب پورہ پڑ گیا۔ (۱) ملتان کا ایک نام "مترون" بھی تھا۔ مترون کے معنی "سورج دیوتا کا شہر" (۲) ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ملتان کا نام "مترون" سورج دیوتا مترہ کی وجہ سے رواج پا گیا تھا۔ ملتان کا نام ادرستانہ، بھی مترون، کی طرح راجہ سنب کے زمانے میں مشہور ہوا ادرستانہ کے معنی "ادیتہ کا شہر" کے ہوتے ہیں۔ سورج کنڈ یعنی "سورج کا تالاب" ملتان میں آج بھی موجود ہے۔ ملتان کے مختلف ناموں کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا ابن حنیف قیاس ظاہر کرتے ہیں کہ

"کسی زمانے میں اس کا ایک نام ملوہہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام بھی رہا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ اسی کے نام پر اس عظیم شہر کے زیر اثر علاقے یعنی وسطی پنجاب کو ملوہہ کہا جاتا ہو جیسا کہ ایک وقت میں بابل شہر کے نام پر اس کے زیر اثر عراق کے ایک مخصوص و بڑے حصے کو ملک بابل بھی کہا گیا۔" (۳)

ان ناموں کے علاوہ مختلف ادوار میں ملتان کے یہ نام بھی رہے ہیں، ہنس پورہ، بھاگ پورہ، مولوسان پورہ،

-
- 1- بحوالہ بھاگوت پران (اٹھ سٹوان ان ادھیائے) ص ۳۲۶، مطبوعہ کوہ نور پریس لاہور
 - ۶۸-۱۸۶۷ (سنسکرت سے برج بھاشا میں ترجمہ از منشی ہرنرائن باعانت پنڈت بہادر سنگھ)
 - ۲- مرزا ابن حنیف کے مطابق ابتدائی ویدی دور میں شمسی دیوتاؤں کی تعداد چھ تھی جس میں سے ایک کا نام "متر" تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "سات دریاؤں کی سرزمین" ص ۱۳۸۔
 - ۳- مرزا ابن حنیف کے مطابق "ادیتا" کے معنی سورج دیوتا کے ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "سات دریاؤں کی سرزمین" ص ۲۳۸-۲۳۹ ملتان کے تین مختلف نام یعنی سنب پورہ، مترون اور ادرستانہ تینوں ایک ہی راجہ سنب کے دور میں مشہور ہوئے۔ یہ نام مختلف واقعات کی بنا پر مشہور ہوئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔
 - ۴- "سات دریاؤں کی سرزمین" ص ۲۲۵۔

(۱) میسان، مالستھان پورہ، مولتارن، مولتان^(۲) اور پھر آخر میں ملتان۔ دراصل ان ناموں کے سلسلے میں مختلف حوالوں میں جو دیو مالائی کہانیاں اور مافوق الفطرت واقعات درج ہیں ان کو تاریخی واقعیت کی حیثیت تو نہیں دی جاسکتی تاہم ان سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ "ملتان" وادی سندھ کا قدیم ترین شہر ہے اور اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب انسانی تہذیب و معاشرت اور اعتقادات میں دیوی دیوتاؤں اور دیو مالا کا بڑا دخل تھا۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی "ناقابل تردید مسلمہ" بن کر سامنے آتی ہے کہ ملتان ایک بڑے وسیع اور عریض آزاد اور خود مختار علاقے کا مرکز تھا۔ اور ملتان کے لفظ سے ایک خاص شہر کے علاوہ ایک بہت بڑی اقلیم ولایت، ملک راجدھانی، سلطنت حکومت بلکہ خاص جغرافیائی وحدت مراد لی جاتی تھی۔

ملتان کا قدیم قلعہ (ابن قاسم باغ) بھی ملتان کی قدامت کا ایک ثبوت ہے اگرچہ مرور زمانہ کے تحت اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں کیونکہ یہ ہر حملہ آور کا نشانہ بنتا رہا ہے اس کی حیثیت ہر حاکم کے لئے صدر مقام کی تھی اس لئے یہ بار بار تباہ ہوا۔ اور پھر نئی تبدیلیوں کے ساتھ آباد ہوتا رہا۔ اس قلعہ کی غاروں سے برآمد ہونے والی مٹی کی ٹھیکریوں پر جو حروف کندہ تھے ان کا رسم الخط موہن جو دڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں کا ہم عصر ہے۔ علامہ عتیق فکری کی تحقیق کے مطابق

"قلعہ قدیم سے نکلا ہوا رسم الخط موہن جو دڑو اور ہڑپہ کی تہذیب کا ہم عصر ہے اور یوں ملتان اور اس کے گرد و نواح کی تہذیب قبل مسیح ۲۵۰۰ کے لگ بھگ متعین ہو جاتی ہے۔ پھر جو حروف اور اشیا برآمد ہوئی تھیں اس سے بھی قدامت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ

۱۔ منشی عبدالرحمن خاں کی مطابق ملتان کا سب سے پہلا نام میسان تھا، ملاحظہ فرمائیے "آئینہ ملتان" ص ۲۶، مکتبہ اشرف المعارف ملتان، اشاعت اول۔

۲۔ مجھے جناب حبیب فائق کی لاتبری سے ایسا کارڈ دستیاب ہوا، جس پر مولتان، (MOOLTAN) کی ہرثبت ہے۔ یہ کارڈ ۲۳ مارچ ۱۸۹۶ء کا ہے اور اس پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہر بھی لگی ہے (اس کی فوٹو اسٹیٹ اس مقالے کے آخر میں منسلک ہے۔)

کام ابھی ابتدائی صورت کا حامل ہے لیکن جب اس ابتدائی کام کی کڑیاں رگ وید میں تلاش کرنے سے مل جائیں تو پھر یقین ہو جاتا ہے کہ اگر قبل مسیح ۱۵۰۰ سال ملتان کا وسیع علاقہ آریا اور ڈراویدیں بھیل اور کولاریوں کی رزم گاہ تھا۔ اور موہن جو دھڑ و بھی اس رزم گاہ کی ایک مکمل اور مثبت کڑی ہے تو پھر ملتان کے قلعہ اور اس کی قدامت کے مزید ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔ (۲۵)

۳۔ عربوں اور اہل ہند کے روابط قبل از اسلام

سندھ اور ملتان کے بارے میں تمام تاریخوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ ہمیشہ سے راست باز، صاف دل، صلح پسند، محنتی، ذہین اور سچے عقائد رکھنے والے سیدھے سادے خدا پرست لوگ تھے۔ مذہب کا عمل دخل ان کے ہر شعبہ زندگی میں رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی باقاعدہ روشنی تو ابن قاسم کے حملے کے بعد پھیلی اور ان ہی علاقوں کے طفیل ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچی لیکن اس نور کی کرنیں اس تاریخی حملے سے پہلے بھی اس خطہ ارض کو منور کر رہی تھیں اور اس کی زیادہ تر وجہ عرب اور ہند کے تعلقات تھے جو زمانہ قدیم سے چلے آتے تھے۔ یہ تعلقات قبل از اسلام بھی موجود تھے اور عہد اسلام کے بعد بھی نہ صرف قائم رہے بلکہ اور زیادہ استوار ہو گئے۔ کرم الہی بدر کے بیان کے مطابق،

”اسلام کی آمد سے صدیوں پیشتر عرب تجارتی سامان لے کر ہندوستان

آتے تھے اور یہاں سے دور دراز ممالک تک جاتے تھے۔ تاریخی طور پر

عربوں کے روابط سرزمین ہندوستان سے بہت قدیم ہیں۔ (۲۶)

ہنٹر کے بیان کے مطابق

۱۔ اکلین نام کی قوم اب بھی نواح ملتان میں آباد ہے۔

۲۔ ”نقش ملتان“ جلد اول ص ۲۴، ۲۵

۳۔ ”تاریخ ملتان“ ص ۷۱۔

" ہندوستان اور مغربی ممالک یعنی عرب، فلسطین اور مصر کے درمیان تجارتی روابط کی تاریخ بہت ہی پرانی ہے۔ سلیمان بادشاہ نے اپنا سونا، (Ophir) جو موجودہ Bey pur ہے سے حاصل کیا۔ اسی طرح چاندی، ہاتھی دانت، بوز نے اور مور بھی حاصل کئے؛ (۱) زمانہ قدیم سے عرب و ہند کے درمیان تجارتی تعلقات کی بناء پر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو تجارتی اشیاء عرب جایا کرتی تھیں

" ان میں ہندوستان سے ہر قسم کا عود، صندل، کافور، مانور، جوزبوا،

قرنفل (لونگ)، قاقہ، کبابہ، نارجیل، نباتاتی کپڑے، روئی کے مٹھی کپڑے

اور ہاتھی دیار عرب میں جاتے تھے۔ سرندیپ سے ہر قسم اور ہرزنگ کے

یا قوت، موتی، بلور، سنبادج، ملی اور سنجان (سندان) سے فلفل (مرق)

کلمہ سے، رصاص قلعی جنوب سے بقم اور داؤزی یعنی تارسی اور سنہ سے قسط

بانس اور بید کی لکڑیاں عرب میں بھی جاتی تھیں؛ (۲)

ان چیزوں کے علاوہ جو چیزیں ہندوستان سے عرب جاتی تھیں ان کی تفصیل اظہر مبارکپوری اس طرح دیتے ہیں۔

" ہندی تلواریں، سندھ سے سندھی کپڑے، سندھی مرغی، پالہ اونٹ

فالچ، جس کی نسبت سے عرب کا مشہور بختی اونٹ ہوتا ہے، ہند سے

عود ہندی، بردص (بھڑوج) سے بھڑوجی نیزے اور ان کے بانس،

کھنابت اور سندان سے نقال کنباہتہ یعنی کھنابت کے جوتے اور نارجیل

تھانہ سے عمدہ کپڑے اور اسی طرح مختلف مقامات کی مختلف چیزیں عرب

جایا کرتی تھیں؛ (۳)

History of British India by Hunter

Vol-I Page 25.

۲۔ "عرب و ہند عہد رسالت میں" ص ۲۴، ۲۹۔

۳۔ ایضاً --- ص ۲۴، ۲۹۔

۴۔ عرب و ہند تعلقات عہد رسالت میں | عرب میں ہندوستان کا مال

یوں تو پورے عرب میں جاتا تھا لیکن ابلہ، صحار، عدن اور جبار میں خاص طور پر تجارتی منڈیاں قائم تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں غیر ملکوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان میں رومی، ایرانی، حبشی اور ہندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عرب و ہند کے تجارتی تعلقات عہد رسالت میں بھی اسی طرح قائم رہے جیسے پہلے تھے۔ تجارتی تعلقات کی بدولت ہندوستان سے درآمد شدہ اشیاء کا استعمال عربوں میں عام تھا۔ یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہندوستان کی کئی چیزوں کو استعمال کیا اور اپنی پسند کا اظہار بھی فرمایا۔ علامہ اطہر مبارک پوری کا بیان ہے کہ،

”عہد رسالت میں ہندوستان کی بہت سی اشیاء کا استعمال عام تھا، ان کے نام اور خواص سے لوگ واقف تھے، کافور، زنجبیل (ادرک) عود ہندی، عود مشک قرنفل (لونگ) فلفل (مرچ) ہندی نیزے، ہندی تلوار، ہندی کپڑے وغیرہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال کئے جاتے تھے۔ اور

قرآن و حدیث میں بھی ان کے نام موجود ہیں“ (۱)

حضور نے ہندوستان کی جن چیزوں کو پسند فرمایا اور انہیں استعمال کیا ان کا مختصر جائزہ اس طرح ہے۔

مشک — حضور کی پسندیدہ چیزوں میں خوشبو بھی شامل ہے۔ آپ جب کہیں سے گزرتے تو اپنی خوشبو سے پہچانے جاتے تھے۔ خوشبوؤں میں مشک آپ کی پسندیدہ خوشبو تھی۔

عود اور کافور — حضور کو عود اور کافور کی ملی جلی خوشبو پسند تھی۔ اور انگیٹھی میں عود کے ساتھ کافور بھی سلگاتے تھے۔

لونگ، مشک اور عود کا بار — قدیم زمانے میں عرب میں لونگ کے دانوں اور عود کے ٹکڑوں سے بار بنایا جاتا تھا۔ جسے ستجاب کہتے تھے۔ یہ بار خوشبو کے ساتھ ساتھ

1۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۵۳ - ۱۵۴۔

ذہنیت کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔

زنجبیل (ادرک) — جسے جنت کی لذتوں میں سے ایک کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہندوستان سے عرب جاتا تھا، کست ہندی کی لکڑی سے علاج عہد رسالت میں نہ صرف عام تھا بلکہ حضورؐ نے بھی اسے دوا کے طور پر استعمال کرنے کی بار بار تاکید کی ہے حضورؐ نے اس سے سات بیماریوں میں شفا کی خبر دی ہے۔ (۱)

ساگوان کی لکڑی کا استعمال عرب میں عام تھا، حضورؐ جس تخت پر آرام فرماتے تھے اس کے پائے ساگوان کی لکڑی کے تھے۔ اس کے علاوہ ہندی نیزے، ہندی تلوار، سندھی کپڑے، کرتہ لنگی کا استعمال، ہندی طرز کی موتراشی وغیرہ کے متعلق بھی عہد رسالت میں تذکرہ ملتا ہے۔ کرتہ لنگی کا استعمال تو ملتان اور سندھ میں آج بھی عام ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا رواج ملتان اور سندھ کے لوگوں کی وجہ سے عرب میں ہوا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ تجارتی لین دین کے سلسلے میں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس لئے ہندوستان کے لوگوں سے عرب والے پوری طرح واقف تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ ان کے حلیے، شکل و شباہت اور رنگ سے اچھی طرح مانوس تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے وفات سے چند ماہ قبل ہندوستان کے آدمیوں کا ایک موقع پر ذکر فرمایا تھا۔ جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قیادت میں نجران سے قبیلہ بنی حارث ابن کعب کا وفد حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اُن کو دیکھ کر فرمایا

”من هو اء القوم ؟ كانہ دجال ا لہند“ (۲)

ترجمہ: یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستان کے آدمیوں کی طرح ہیں۔

حضورؐ کی احادیث میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کی اشیاء اور اہل ہند کا ذکر مختلف انداز میں ملتا ہے۔ عرب و ہند کے قدیم تعلقات ابتدا میں صرف تجارتی اور معاشی تھے مگر بعد میں فکری، تمدنی اور ثقافتی تعلقات بھی پیدا ہو گئے بلکہ تجارتی و اقتصادی تعلق

۱۔ مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے ”عرب و ہند عہد رسالت میں“ ص ۱۶۳ - ۱۶۴

۲۔ سیرۃ النبیؐ کامل از ابن ہشام جلد نمبر ۲، ترجمہ عبد الجلیل صدیقی، ص ۵۹۲، مطبوعہ شیخ غلام علی

اینڈ سنز، لاہور، اشاعت اول ۱۹۶۲ء

کو فکری اور ثقافتی تعلق نے اور زیادہ مضبوط کر دیا

عربوں نے اپنے ملک میں بسنے والے ہندوستانیوں کو "زط"^(۱) (یہی لفظ مقامی تلفظ کے تحت جت بن گیا۔ جس کے معنی شتر بان کے ہیں۔ "ز" کی آواز "ج" سے بدل جاتی ہے۔ مولانا سلیمان ندوی زط کو جت کا حصہ سمجھتے ہیں۔) اسادرہ سیابجہ، احامد میدیاسرہ اور لکا کرہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا۔ کسی دوسرے ملک کے آدمیوں کو لٹنے زیادہ نام و لقب سے یاد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تعداد وہاں بہت زیادہ ہے اور ان کا وہاں کی معاشی، معاشرتی زندگی میں گہرا دخل ہے۔ چونکہ عربوں اور ہندوستانیوں میں بڑی حد تک ذہنی یک جہتی تھی۔ اس لئے ہندوستانی باشندے بڑی آسانی سے عربوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ اہل ہند اور عربوں میں اس اعتبار سے بھی ہم آہنگی تھی کہ اصنام پرستی، مظاہر پرستی اور کواکب پرستی دونوں میں عام تھی۔ عربوں اور ہندوؤں کے بت خانے بھی مشترک تھے جن کی پوجا کے لئے ہندوستانی عرب جاتے اور عرب کے لوگ ہندوستان آتے تھے۔ ہندوستان کے جن بتوں کی یاترا کے لئے ہندوستان آتے تھے ان میں ملتان کا بت بھی شامل تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے سے بھی پہلے عربوں کے قدم ملتان کی سرزمین پر پڑ چکے تھے۔ عربوں کی آمد کا ایک مقصد کسی نہ کسی اعتبار سے مذہبی بھی ہوتا تھا یعنی وہ بت کی یاترا کے لئے آتے تھے اور محمد بن قاسم کے

۱۔ ہندوستان کی مختلف قومیں ملک عرب میں مختلف کاموں اور پیشوں کی وجہ سے مشہور تھیں۔ یہ لوگ

ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے ان میں سے زط (جاٹ) اور مید قوم کے علاقے ملتان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اصطخری کے مطابق وبلد السند هو المنصورہ واداضی الزط،

وما والاہنالی الملتان (ترجمہ) سندھ کا ملک منصورہ اور زط کی بستیوں اور اطراف و جوانب سمیت

ملتان تک پھیلا ہوا ہے۔ بحوالہ عرب و ہند تعلقات عہد رسالت میں ص ۶۳۔

۲۔ مید قوم کا کام جہاروں اور کشتیوں کو لوٹنا تھا۔ اس قوم کی بستیاں بقول اطہر مبارک پوری،

"دیباۃ سندھ کے ساحلی مقامات سے لے کر ملتان تک ان کی آبادیاں تھیں بلکہ گجرات اور کوکن کے سواحل میں بھی یہ سمندری لٹیرے بکثرت آباد تھے؟"

(بحوالہ "عرب و ہند عہد رسالت میں" ص ۵۹)

ساتھ آنے کا مقصد بھی کسی حد تک یہی تھا کہ اسلام کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محمد بن قاسم کے حملے کے بعد سرزمین ہند میں اسلام کی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ نہ صرف مذہبی اشاعت کا بلکہ اسلامی علوم کو بھی فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ اس حملے کے بعد عرب مسلمانوں نے سندھ اور ملتان کے علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کی اور ان کے مذہبی، سیاسی، تمدنی، تہذیبی، لسانی اور علمی اثرات خود بخود یہاں پر بسنے والی اقوام میں پھیلنے لگے۔

۵۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کا آغاز | تجارتی لین دین اور روابط کا

سلسلہ تو اسلام سے پہلے بھی قائم تھا جس کی تفصیل سابقہ صفحات میں آچکی ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا پہلا حملہ حضرت عمرؓ کے دور میں ہوا۔ ۱۵ ہجری (۶۳۶ء) میں حضرت عمرؓ نے عثمان بن ابی عاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر کیا۔ عثمان نے ایک بحری بیڑا تیار کر کے ہندوستان پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ یہ جہاز اتفاق سے بندرگاہ تھانہ (جو گجرات اور کوکن بمبئی کی سرحد پر ہے) پہنچا عرب یہاں سے بہت سا مال غنیمت لے کر عمان پہنچے۔ حضرت عمرؓ کو جب اس حملے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اسے ناپسند فرماتے ہوئے عثمان ثقفی کو لکھا کہ

۱۔ (۱) اعجاز الحق قدوسی کے مطابق یہ مسلمانوں کا ہندوستان پر پہلا بحری حملہ تھا (بحوالہ تاریخ سندھ) حصہ اول ص ۶۰، مرکزی اردو بورڈ لاہور، بار اول جون ۱۹۷۱ء
(۲) ایلینٹ کی "تاریخ ہندوستان" میں لکھا ہے۔

"The first Muslim fleet appeared in Indian Waters in 636 A.D. during the Caliphate of Umar when Usman Sakfi the Governor of Bahrain and Uman, sent an army across the sea to Tanal. (The History of India" Vol. I by Elliot, H. M. Sir, Page 115-116. Islamic Book Service, 1976, Lahore).

” اے ثقفی! تو نے گویا کیرے کو لکڑی پر سوار کر کے سمندر کے حوالے کر دیا ہے، خدا کی قسم اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو تمہاری قوم سے اس کا بدلہ لوں گا“ (۱)

لیکن عثمان ثقفی نے اپنے بھائی مغیرہ ابن عاص کو پھر ایک بیڑے کا افسر بنا کر بھیجا۔ اس دفعہ انہوں نے سندھ کے مشہور ساحل دیبل پر حملہ کیا اور مالِ غنیمت کے ساتھ واپس بحرن گئے۔^(۲) یہ سندھ پر عربوں کا پہلا حملہ تھا۔ ہندوستان پر عربوں کے اصل حملے خشکی کی جانب سے ہوئے جہاں وہ ایران کو فتح کرتے ہوئے مکران، کرمان اور سیستان تک پہنچے۔ اس طرح سندھ تک ان کی سرحدیں اسلامی نو مفتوحہ علاقوں کے ساتھ مل گئیں۔

حرم ۲۲ھ میں حضرت عثمان بن عفان خلیفہ ہوئے، ۲۵ھ میں انہوں نے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر بن کرزہ کو سیستان روانہ کیا جہاں سے وہ کابل پر حملہ آور ہوا جو اس عہد میں سیستان کا حصہ تھا۔ سیستان تو حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہو چکا تھا، کابل اب فتح ہوا لیکن عربوں کے جاتے ہی کابل پھر خود مختار ہو گیا۔ ۲۹ھ میں عبداللہ بن عمیر لیشی سیستان کے حاکم مقرر ہوئے تو انہوں نے کابل میں سرکشوں پر قابو پایا۔ دوسری طرف عبید اللہ بن عمر مکران کے حاکم مقرر ہوئے جو فتوحات کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحد تک پہنچے۔ تیسری طرف عبدالرحمن بن عبیس کرمان کے گورنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے کرمان میں باغیوں پر قابو پا کر امن و امان قائم کیا۔ ان علاقوں میں باغیوں کی مسلسل شورشل کی وجہ سے ابن عامر خود سیستان پہنچے اور سیستان میں ربیع بن زیاد حرثی کو اور کرمان میں جاشع بن مسعود کو حاکم مقرر کیا۔ ان لوگوں نے آکر یہاں باغیوں پر قابو پا کر امن و امان کی صورت بحال کی۔ اگرچہ سرکشوں کی بار بار بغاوت کی وجہ سے حاکموں کے دل پر میل آگئی تھی مگر مذہبی احکام کی وجہ سے قتل و غارت سے اجتناب کیا گیا۔ صرف ان کے سرغنوں اور فسادلوں

1- اس کی اصل عبارت فتوح البلدان، ص ۲۲۰ میں یوں درج ہے۔ ” فکتب الیہ عمربیا انا ثقیف

حملت وود اعلیٰ عود، وانی ا حلف باللہ ان لو ا صیبوا لوخذت من قومک مثلہم۔“

۲- پج نامہ، ص ۴۲-۴۳، اور تحفۃ الکرام، ص ۳۱ میں درج ہے کہ مغیرہ دیبل میں شہید ہوئے لیکن فتوح

البلدان، ص ۲۲۲، اور تعلیقات پج نامہ، ص ۲۱۶ کے مطابق مغیرہ فاتح کی حیثیت سے واپس آئے تھے۔

کو جلا وطن کیا گیا۔ (۱)

۲۲ھ میں حضرت امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن سوار عجمی کو سواحل ہند کے سرکش لوگوں کو سزا دینے کے لئے چار ہزار کالشکر دے کر مکران بھیجا انہوں نے قیقان کے سرکشوں کو شکست دی اور مالِ غنیمت لے کر امیر معاویہ کے دربار پہنچے۔ ۲۲ھ میں مہلب بن ابی صفراء اپنی فوج لے کر ہند کی طرف بڑھے (۳) مہلب کا بل اور پشاور کی گھاٹیوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ زمانہ قدیم کی طرح یہ علاقے اس وقت بھی وادی سندھ میں شامل تھے یہ سب کچھ تباہ کرتے ہوئے واپسی میں ملتان اور پشاور کے درمیانی علاقوں کو پامال کر ڈالا شہر قندابیل کے پاس غنیمت سے مقابلہ کر کے اس کو شکست دی۔ مالِ غنیمت لے کر ملکِ قیقان آئے تو ترکوں سے لڑائی ہوئی اور ترکوں کو شکست دی۔ پھر سنان بن سلمہ بن محبق ہذلی جیسے عالم فاضل شخص نے مکران اور سندھ میں امن قائم کر کے خود انتظام سنبھالا۔

۲۰ھ میں یحییٰ کے مرنے کے بعد اس کا بھائی چندر سندھ کا حکمران بنا۔ وہ بدھ مذہب کا پیروکار تھا۔ ۲۸ھ میں اس کی وفات کے بعد ملک میں طوائف الملوک کی شروع ہو گئی اور ارور (الور) کے تخت پر تیج کا چھوٹا بیٹا راجہ داہر بیٹھا۔ راجہ داہر کے دربار میں کچھ عرب محمد بن حارث علانی کے ماتحت اسلامی ملکوں سے بغاوت کر کے بھاگ آئے تھے اور

۱۔ اس زمانے میں بلوچستان کے نام کا کوئی صوبہ نہ تھا بلکہ مکران اور سیستان ہی سندھ سے ملے ہوئے تھے اس لحاظ سے ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا حملہ خشکی کی طرف سے ہوا اور پہلا علاقہ ہندوستان کا ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اور خود صحابہ رسول کے مقدس ہاتھوں سے مفتوح ہوا۔

(بحوالہ "تاریخ سندھ" از ابو ظفر ندوی، ص ۳۱-۳۲)

۲۔ ابو ظفر ندوی نے تاریخ سندھ ص ۳۴ پر یعقوبی جلد اول ص ۶۶۸، لیدن کے حوالے سے ۲۲ھ بتایا ہے جبکہ اجماع الحق قدوسی کی تاریخ سندھ کے ص ۶۶، اور علامہ عتیق فکری کی "نقش ملتان ص ۲۵۱ کے مطابق ۲۲ھ ہے۔

۳۔ ان کی یہ روانگی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ عربوں میں وہ پہلے شخص ہیں جو ہند کے اس دروازے سے داخل ہوئے جس سے آج تک قدیم قومیں آتی رہی ہیں، یہ درہ خیبر تھا۔ (بحوالہ تاریخ سندھ، از ابو ظفر ندوی، ص ۳۵، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء)

اور میں امن کی زندگی بسر کر رہے تھے^(۱)۔ محمد بن حارث علانی نے راجہ داہر کو بہت سی جنگوں میں مفید مشورے دیئے۔ جس کی بدولت راجہ کبھی داخلی مشکلات میں گرفتار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۹۲ھ / ۷۱۰ء میں ۲۳ برس حکومت کرنے کے بعد محمد بن قاسم کے ہاتھوں اس کا اور اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ راجہ داہر نے محمد بن حارث علانی اور اس کے خاندان کو بڑے لپھے طریقے سے رکھا۔ خصوصاً محمد بن حارث علانی کو راجہ کے دربار میں خاص اہمیت حاصل تھی، سعود حسن شہاب کے مطابق

” وہ راجہ کا معتمد خاص تھا۔ حتیٰ کہ سکوں پر ایک طرف راجہ داہر کا نام کندہ ہوتا تھا اور دوسری طرف محمد بن حارث علانی کا۔ تاہم جب محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تو محمد بن حارث نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف صف آرا ہونے سے انکار کر دیا۔“ (۲)

۱۔ محمد بن حارث علانی کے خاندان کے سندھ میں رہنے کی وجہ کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ ججاج بن یوسف ثقفی جب عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے سعید بن عسلان کلبی کو مکران کا علاقہ سپرد کیا۔ سعید نے وہاں کے ایک شخص سفہوسی بن لام الہامی سے اپنی مدد کے لئے کہا اور اس کے انکار کرنے پر ناراض ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔ یہ شخص محمد بن حارث علانی کا رشتہ دار تھا۔ علانی نے موقع ملتے ہی سعید کو قتل کر ڈالا۔ ججاج نے سعید کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے علانی خاندان کے ایک سردار سلیمان کو قتل کر کے اس کا سر سعید کے خاندان کو بھجوایا اور جماعہ بن سعرتیمی کو بڑے لشکر کے ساتھ علانیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی محمد بن حارث اور اس کے ساتھی بھاگ کر سندھ چلے گئے جہاں راجہ داہر نے انہیں پناہ دی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (۱) ”جمع نامہ“ از علی بن احمد بن ابوبکر کوفی مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۱۲ تا ۱۱۷، (۲) تحفۃ الکرام، ص ۲۲ تا ۲۶۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”جمع نامہ“ ص ۲۲ تا ۲۳۔

۳۔ بحوالہ۔ خطہ پاک۔ ادب، ص ۱۹۲۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور، طبع اول

۶۔ محمد بن قاسم کی آمد | اس تفصیل سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بہت عرصے سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ عربوں کا کوئی نہ کوئی لشکر مختلف ادوار میں ہندوستان کے کسی نہ کسی علاقے پر حملہ آور ہوتا رہا جس میں سندھ کا علاقہ خاص طور پر شامل ہے۔ سندھ کا ملک نسبتاً عراق سے نزدیک تھا اور ایرانی سرحد بھی سندھ سے ملتی تھی۔ اسلامی فتوحات کی حدود ایران کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ دوسری طرف سندھ کا راجہ داہر چاہتا تھا کہ ایرانی علاقہ مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ اس سلسلے میں وہ ایرانی شہسپندوں کو بھی اپنے علاقے میں پناہ دیتا تھا۔ خصوصاً سمندری قزاقوں کو مسلمانوں نے ابھی تک سندھ کی فتح کی جانب باقاعدہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن ایک فوری وجہ ایسی بنی کہ جس کی بناء پر سندھ کی فتح ناگزیر ہوئی اور یوں فاتح سندھ محمد بن قاسم کے قدم سرزمین ملتان تک بھی پہنچے۔ سراندیپ کے راجہ نے جزیرہ یواقیت سے خلیفہ ولید بن عبد الملک کی خدمت میں دوستی کی غرض سے آٹھ جہاز تحائف کے بھجے جن میں انواع و اقسام کے موتی و جواہر، حبشی غلام کینزیں اور دوسری نادر چیزیں شامل تھیں۔ ان جہازوں میں کچھ مسلمان عورتیں بھی تھیں جو کعبہ شریف کی زیارت کے لئے جا رہی تھیں۔ جہاز جب ملک قانڑوں کے نزدیک پہنچے تو مخالف طوفانی ہواؤں کی وجہ سے جہازوں کا رخ دیبل کے ساحل کی طرف ہو گیا جہاں انہیں قزاقوں کے ایک گروہ نے جن کا تعلق مید قوم سے تھا، ٹوٹ لیا۔ انہوں نے مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے جواہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر ایک عورت نے چلا کر کہا **اَغْثِنِي يَا حَجَّاجُ**۔ یہ عورت یربوعیہ خاندان کی تھی۔ کچھ مسافروں نے جو کسی طرح بچ بچا کر حجاج تک پہنچے، سارا حال سنایا اور اس عورت کی فریاد کے بارے میں بھی بتایا جسے سنتے ہی حجاج نے بے اختیار لبیک، لبیک کہا اور

۱۔ بحوالہ تحفۃ الکلام، ص ۲۴، از میر علی شیر قانع ٹھٹوی مترجم اختر رضوی، مطبوعہ سندھی

ادبی بورڈ کراچی، اشاعت اول ۱۹۵۹ء

۲۔ حج نامہ میں اس عورت کو قبیلہ عزیر کی بتایا ہے جبکہ فتوح البلدان میں بلاذری نے

ص ۴۳۵، پر اسے یربوعیہ خاندان کی بتایا ہے اور اعجاز الحق قدوسی نے بھی تاریخ سندھ

ص ۸۲، پر بلاذری کی تائید کی ہے۔

اس نے فوراً ایک خط راجہ داہر کو لکھا کہ ہمارے ملک کے لوگ جو تمہارے علاقے میں قید کر لئے گئے ہیں، ان کو باعزت طریقے سے واپس کرو اور جو مال و اسباب لوٹا ہے اس نقصان کا تادان ادا کرو۔ راجہ داہر نے اس کے جواب میں بڑی لاپرواہی سے لکھ بھیجا کہ یہ کام سمندری قزاقوں کا ہے جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔ حجاج نے یہ جواب دیکھ کر ولید بن عبد الملک کو تمام حالات لکھ کر سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ حجاج نے چند دن کے بعد دوسری عرضداشت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ امیر المؤمنین نے کثیرا تخریجات کی وجہ سے حملے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ جتنا خرچ ہوگا اس سے دو گنی رقم خزانے میں جمع کروادوں گا۔ جس پر ولید نے یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اجازت حاصل ہوتے ہی حجاج نے محمد بن قاسم کو اس مہم پر بھیجا۔ راجہ داہر ۱۰ رمضان ۹۳ھ / ۷۱۱ء میں لڑتا ہوا مارا گیا اور سندھ عربوں کے قبضے میں آ گیا۔

۷۔ ابن قاسم کے ہاتھوں فتح ملتان ۹۵ھ میں محمد بن قاسم سندھ کے مختلف

علاقوں کو فتح کرتا ہوا سکہ تک پہنچا جو ملتان کے قریب تھا۔ سترہ دن تک سکہ والے مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ آخر کار مایوس ہو کر حاکم سکہ رات کی تاریکی میں ملتان کی طرف چلا گیا اور عربوں نے سکہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم دریائے راوی (موجودہ راوی، پنجاب، جہلم) پارا تر جو ملتان اور سکہ کے درمیان تھا۔ فوج ٹھیک ملتان کے سامنے گھاٹ پر اتری۔ تھوڑی دیر بعد ملتان کی فوج والی سکہ کے زیر کمان حملہ آور ہوئی۔ والی سکہ، سکہ میں اپنی شکست کا بدلہ یہاں لینا چاہتا تھا اس لئے بڑا زبردست حملہ کیا۔ شام تک جنگ ہوتی ہی اس دور میں عربوں کا ایک بہادر افسر زائدہ بن عمیرہ الطائی شہید ہو گیا۔ اس کی شہادت سے مسلمانوں میں اتنا جوش پیدا ہو گیا کہ ہر مسلمان سرفروشی کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ ان کے حملے کی شدت سے گھبرا کر ملتان کی لشکر قلعہ بند ہو گیا اور فصیل سے تیر، پتھر وغیرہ برسانے لگا۔ عربوں

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (۱) پیر نامہ، ص ۱۱۸ تا ۱۲۱ (۲) تاریخ سندھ از اعجاز الحق

قدوسی ص ۸۰ تا ۸۵ (۳) نقش ملتان، ص ۲۵۳ تا ۲۵۵۔

نے یہ دیکھ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بیس روز تک محاصرہ جاری رہا تو عربی فوج پریشان ہو گئی کیونکہ وہ اپنے مراکز اودھ، نیردن اور برہمن آباد سے دور تھے۔ سامانِ رسد ختم ہو گیا تھا اور آس پاس کے علاقے نامانوس تھے۔ علاقہ ریگستانی تھا اس لئے پانی کی کمی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ بار برداری والے گدھے ذبح کر کے کھانے لگے۔ آخر ایک سندی نے ایسے نائے کا پتہ بتایا جہاں سے پانی ایک جھیل میں جمع ہوتا تھا۔ اس جھیل سے ملتان والے فائدہ اٹھاتے تھے۔ لوگ اس کو نلاج یعنی نالہ کہتے تھے۔ مسلمانوں نے اس کے پانی کا رخ بدل دیا۔ ملتانی پیا سے مرنے لگے۔ مجبوراً قلعے سے باہر نکل کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت راجہ داہر کے بھائی چندر کا لڑکا گور سنگھ ملتان کا حاکم تھا۔ جب اس کو فتح کی کوئی امید نظر نہ آئی تو وہ رات کی تاریکی میں راجہ کشمیر سے مدد لینے کشمیر چلا گیا۔ ملتانی فوج اس کی غیر حاضری میں بھی لڑتی رہی۔ محاصرہ طویل ہوتا گیا تو عربوں میں بچپنی پھیلنے لگی۔ وہ قلعے کے چاروں طرف گھوم پھر کر اس کا ایک ایک کونہ دیکھنے لگے کہ کہیں سے کوئی رخصت نظر آئے تو قلعے میں گھس کر بھر پور حملہ کریں تاکہ خود کو فاقوں سے نجات دلا سکیں۔ اتفاق سے ایک دن ایک شخص قلعہ سے نکلا، عربوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے پناہ مانگی تو اسے اس شرط پر پناہ دی گئی کہ قلعے کے اندر کا حال بتائے اور قلعے کے کمزور حصے کی نشاندہی کرے۔ اس شخص نے بتایا کہ شمالی جانب دریا کے کنارے کی طرف ایک جگہ کمزور ہے۔ محمد بن قاسم نے منجنیقوں کا رخ اس طرف کر کے تین دن مسلسل اس قدر پتھر برسائے کہ دیوار ٹوٹ گئی اور اندر جانے کا راستہ بن گیا۔

ملتانی فوج نے جب دیکھا کہ دیوار ٹوٹنے والی ہے تو انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھول کر ایک دم حملہ کر دیا۔ عربی فوج اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔ انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ملتانی مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور بدحواسی کے عالم میں قلعے کی طرف واپس اس طرح بھاگے کہ قلعے کا دروازہ بند کرنا بھی بھول گئے۔ اس طرح عربی فوج

۱۔ بلاذی اسے تالاب کہتا ہے، اس کا بیان ہے کہ یہ ایک تالاب تھا جس میں نہر بُنیید کا پانی

جمع ہوتا تھا۔ ملتان والوں کی زبان میں اس کے لئے جو لفظ تھا عربی میں اس کو "نلاج" کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے

اس کو بند کر دیا۔ فتوح البلدان (جز دوم) ص ۱۹۱، دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۰ء

فاتحانہ شان سے قلعے میں داخل ہو گئی۔ امن پسند شہری محفوظ رہے اور مسلح فوجی سپاہی جنہوں نے مقابلہ کیا تھا ان میں سے تقریباً چھ ہزار مارے گئے^(۱)۔ جو مال غنیمت ہاتھ آیا وہ تمام سپاہیوں میں تقسیم کیا گیا۔

حجاج بن یوسف سے فتح سندھ کی اجازت لیتے وقت محمد بن قاسم نے وعدہ کیا تھا کہ جس قدر رقم جنگ میں خرچ ہوگی میں خزانہ میں اس سے دوگنی رقم جمع کرواؤں گا۔ اب تک تمام فتوحات میں مال غنیمت میں سے وہ ایک معقول رقم خزانے میں جمع کرانا رہا تھا اور بقایا رقم بڑی فیاضی سے سپاہ میں تقسیم کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ خود اس کو کچھ نہیں ملتا تھا فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم اس فکر میں تھا کہ اپنا وعدہ کس طرح پورا کرے کہ ایک دن ایک برہمن کی نشاندہی پر ایک حوض سے دو سو من سونا اور سونے کی کترن سے بھرے ہوئے چالیس مٹکے ملے۔ اس خزانے کی مالیت تقریباً بارہ کروڑ تھی^(۲)۔

محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو اس خزانے کا پانچواں حصہ بھجو کر انتظامی امور کی طرف توجہ کی۔ جزیہ اور خراج کی تشخیص کی۔ لوگوں کو اطمینان دلایا کہ وہ امن سے رہیں۔ محمد بن قاسم نے ملتان کے خاص اور منتخب لوگوں سے پختہ عہد لے کر جامع مسجد اور مینار تعمیر کرائے۔ امیر داؤد بن نصر بن ولید عمانی کو ملتان کا حاکم مقرر کر کے اردگرد کے قلعوں میں بھی اپنے خاص آدمی مقرر کئے جن میں خرم بن عبد الملک تمیمی کو برہم پور کے قلعے پر جو دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے متعین کیا۔ عکرمہ بن ریحان شامی کو ملتان کے نواح کا حاکم بنایا۔ احمد بن خرمیہ بن عقبہ مدنی کو اشہار اور کردور کا قلعہ سپرد کیا اور کچھ عرصہ خود ملتان میں اپنی فوج کے ساتھ آرام کی غرض سے ٹھہرا اور پچاس ہزار کے قریب فوج، اسلحہ اور سامان جنگ

۱۔ بلاذری نے فتوح البلدان جزو دوم (ترجمہ از سید ابوالخیر مودودی ص ۱۹۱) میں کہا ہے کہ یہ چھ ہزار پجاری تھے جن کی جان بخشی کی گئی اور ان کو غلام بنالیا گیا۔ جبکہ مجمع نامہ ص ۲۲۲، اور تاریخ سندھ از ابو ظفر ندوی کے ص ۱۱۴ کے بیان کے مطابق یہ چھ ہزار پجاری نہیں بلکہ فوجی سپاہی تھے۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حوض دو نيزوں کے برابر لبا، دو نيزوں کے برابر حوڑ اور گہرا تھا۔ دو نيزوں کے لئے عربی کا لفظ ہے ”مَلْتَان“ گویا ملتان واقعی ”مَلْتَان“ ثابت ہوا۔

کی تیاری کی تاکہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کر سکے (۱)

۸۔ ملتان محمد بن قاسم کے بعد

ہوتے ہی پہلی صدی ہجری میں عربوں کے قبضہ میں آگیا اور غزنوی دور تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ لیکن ۱۱۱ھ میں یہ سندھ سے الگ ہو گیا۔ لسانی اعتبار سے یہ سن اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد یہاں ملتان زبان سندھی زبان سے علیحدہ ہو کر آزادانہ طور پر ارتقاء پانے لگی۔ (۲)

ملتان پر پہلے ۱۳۲ھ تک بنی امیہ کا قبضہ رہا۔ پھر ان کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی ملتان بنو عباس کی حکومت کے تحت آگیا۔ اس کے بعد صورت حال کچھ اس طرح رہی کہ اگر مرکز میں خلیفہ طاقت ور ہے تو اردگرد کے سارے علاقے اس کے ماتحت ورنہ ہر کوئی اپنی الگ الگ حکومت بنانے کے چکروں میں پڑ جاتا۔ ملتان بھی کچھ ایسی ہی صورتحال سے دوچار رہا۔ کبھی یہ مرکزی حکومت کے تحت ہوتا اور کبھی یہاں کے حاکم خود مختار حکومت قائم کر لیتے۔

ملتان پر بنو سامہ نے بھی حکومت کی تھی جو خالص عربی النسل تھے جن کا سلسلہ قریش کے لونی بن غالب سے جا ملتا ہے جو قریش کے اجداد میں سے تھا۔ لونی کی اولاد میں سے ایک کا نام سامہ تھا۔ اسی کی اولاد بنو سامہ کہلاتی۔ یہی لوگ "بنو منبہ" کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں تقریباً ۲۹۰ھ میں ان کی حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ ۲۸۰ھ میں ابن رستہ ملتان آیا تھا اور ملتان میں سامی حکومت کا تذکرہ سب سے پہلے اسی نے الاطلاق النفیسیہ میں کیا۔ اس کے مطابق

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (۱)، تاریخ سندھ از ابو ظفر ندوی ص ۱۱۲ تا ۱۱۷۔

(۲) بیج نامہ ص ۲۴۶ تا ۳۴۷۔

(۳) تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی ص ۲۱۷ تا ۲۱۸۔

۲۔ بحوالہ ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۹۷، ۹۸، اردو

اکادمی بہاولپور، بار اول ۱۹۶۷ء

” ملتان میں ایک قوم ہے جو اپنے آپ کو سامہ بن لوئی کی اولاد سے بتاتی ہے
ان کو وہاں بنو منبہ کہا جاتا ہے، یہی لوگ ہندوستان میں ملتان پر حکمران
ہیں، یہ امیر المؤمنین کے لئے دعا کرتے ہیں۔“ (۱)

مشہور سیاح مسعودی (جو ۳۰۰ھ میں ملتان آیا) لکھتا ہے۔

” ان الملك في ولا سامه بن لوئی من غالب، وهو ذو جیوش و منته،

و ثغو من ثغور المسلمين الكبار۔“ (۲)

ترجمہ: اس ملک میں سامہ بن لوئی بن غالب کی حکومت ہے اور یہ ملک مسلمانوں کی وسیع
سرحدوں والے ملک میں نہایت اہم ہے جس کی فوج کثیر اور ناقابل شکست ہے۔
بنو سامہ کی حکومت کافی عرصہ تک رہی۔ ۳۷۳ھ میں ملتان کا حاکم جلم بن شیبان
تھا جو اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا یہ پتہ نہیں چلتا کہ ملتان پر کب بنو سامہ کی حکومت
ختم ہوئی اور کب اسماعیلی یہاں کے حکمران بنے۔ اسماعیلی شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ
بنو سامہ سنی العقیدہ تھے۔ جلم بن شیبان کو اسماعیلی امام العزیز باللہ (قاہرہ مصر، متوفی
۳۸۶ھ) نے ۳۷۲ھ میں فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا تھا۔ تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ
وہ کس راستے سے سندھ گیا اور نہ ہی ملتان پر اس کا کوئی حملہ ثابت ہوتا ہے۔ ابوظفر ندوی
کے مطابق

” ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلم بن شیبان نے ملتان پر کوئی حملہ باہر سے نہیں

کیا۔ بلکہ اندرون شہر بغاوت کر کے خود مددگار بنا اور پھر سردار ہو گیا۔“ (۳)

جلم بن شیبان نے ملتان پر قبضہ کر کے سب سے پہلے فاطمی خلیفہ کا سکہ اور ان کا نام کا خطبہ

۱۔ بحوالہ الاطلاق النفیس، ص ۱۳۵، مطبع لیڈن سنہ اشاعت ۱۸۹۲ء۔ اصل عبارت اس طرح

ہے۔ ” وبالملتان قوم یدعون انہم من ولد سامہ بن لوئی یقال لہم بنو منبہ وہم الملوك

على الهند فیہا وهو یدعون لامیر المؤمنین۔“

۲۔ بحوالہ مروج الذهب و معاون الجود ہراز مسعودی، الجزء الاول ص ۱۸۹۔ مطبوعہ بیروت

الطبع الاولی بیروت ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء (بخاب علامہ متقی مگرمی کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کیا گیا۔)

۳۔ بحوالہ تاریخ سندھ ص ۲۵۶۔

جاری کروایا۔ اس نے اس قدیم مندر کو بھی توڑ دیا جو فتح ملتان سے لے کر اب تک صحیح حالت میں تھا اور یہاں کے حکمرانوں کے لئے سیاسی و مالی فوائد کا باعث تھا۔ اس مندر کی جگہ ایک جامع مسجد بنوائی اور محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو بنو امیہ کی یادگار سمجھ کر بند کر ڈالا۔ جلم بن شیبان نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے کافی جدوجہد کی اور مقامی ہندو راجاؤں سے معاہدے کر کے اپنی سلطنت کو مضبوط بنایا۔

جلم بن شیبان کے بعد شیخ حمید ملتان کا حاکم بنا وہ بھی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے زمانے میں یعنی ۳۸۱ھ میں غزنہ کے ترک حاکم امیر ناصر الدین سبکتگین نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد ۳۸۱ھ یا ۳۸۲ھ میں ملتان کو فتح کرنے کے لئے اس طرف پیش قدمی کی۔ شیخ حمید جانتا تھا کہ وہ اکیلا ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اردگرد سے بھی امداد کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے اس نے صلح کرنے میں عافیت سمجھی۔ مصنف فرشتہ کے مطابق ”جب اپتگین فوت اور سبکتگین اس کا قائم مقام ہوا شیخ حمید نے پر خاش میں صلاح اور فلاح نہ دیکھی اور پیغام دیا کہ ہمارے اور تمہارے اسلام کی شرکت کے سبب سے نہایت یک جہتی ہے سزاوار مراحم خداوندی وہ ہے کہ اس گروہ کو اپنے وابستگوں سے تصور فرما کر عسا کر منصورہ کو مامور کریں کہ مالک ہند کے تاراج کے وقت اس جماعت خیر خواہ کے احوال میں تعرض اور مزاحمت نہ پہنچاویں۔ سبکتگین نے بقتضائے وقت اس کے ملتس کو قبول کیا اور جیپال کی فتح کے بعد ہمدردی تمام پیش آیا اور ملتان کی جاگیر اس کے نام مقرر کی۔“ (۱)

۹۔ محمود غزنوی کا حملہ

۳۸۶ھ میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی کے تخت پر بیٹھا۔ ملتان کی سرحد سے متصل ایک مضبوط قلعہ بھاٹیہ کے (موجودہ بھڑی) مقام پر تھا جو لاہور کے تابع تھا، اس کا حاکم بجے رائے اپنے آپ کو خود مختار سمجھ کر لاہور کے حاکم کی پرواہ نہیں کرتا تھا بلکہ ایک مرتبہ غزنہ کے حکام سے سرحدی معاملے پر بدتمیزی سے پیش آیا تو سلطان محمود غزنوی اس کو سبق سکھانے کے لئے ۳۹۵ھ میں ملتان کے راستے بھاٹیہ

پہنچا۔ جبے رائے مقابلہ نہ کر سکا تو اس نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔ اس دوران ملتان کے حاکم شیخ ابوالفتح داؤد بن نصر نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ اس لئے محمود غزنوی اس سے ناراض ہو گیا۔ اس وقت ملتان کا حاکم شیخ حمید کا پوتا شیخ ابوالفتح داؤد بن نصر تھا جس نے اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے ترکوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ محمود غزنوی ۳۹۶ھ میں تازہ دم فوج لے کر درہ بولان کی بجائے درہ خیبر کے دور دراز علاقے سے ملتان کی طرف اس لئے روانہ ہوا کہ حاکم ملتان کو حملے کی اطلاع نہ مل سکے۔ راستے میں لاہور کے راجہ آنندپال نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ محمود غزنوی بھٹنڈا کے راستے سے ملتان پہنچا۔ داؤد نے دیکھا کہ آنندپال جیسا طاقتور حکمران محمود غزنوی کا مقابلہ نہیں کر سکا تو قلعہ بند ہو گیا۔ محمود غزنوی نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چھ سات روز کے محاصرے کے بعد شہر کے چند معزز لوگوں نے دونوں کے درمیان صلح کرادی اور معاہدہ دو لاکھ درہم سالانہ خراج پر طے ہوا۔ اس کے علاوہ اجماعاً الحق قدوسی کے خیال میں،

” غالباً اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ ملتان کا ایک حصہ جو دریائے سندھ سے

متصل تھا، وہ سلطان کو دے دیا جائے (۱)۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آنندپال نے قومی جنگ کے نام پر ہندوستان کے تقریباً تمام راجاؤں سے مدد حاصل کی اور بڑا لشکر تیار کر کے محمود غزنوی کے مقابلہ کے لئے پشاور پہنچا۔ ملتان کے امیر شیخ ابوالفتح داؤد بن نصر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ۳۹۹ھ میں محمود بھی اپنی فوج لے کر آگیا۔ چالیس روز تک دونوں فوجیں آمنے سامنے رہیں لیکن جب محمود نے دیکھا کہ ہندوستانی فوج کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے تو اس نے دونوں طرف خندقیں کھدوا کر مقابلہ شروع کیا اور زبردست معرکے کے بعد ہندوستانی فوج کو شکست دی۔ محمود غزنوی کو ملتان کے حاکم کے منافقانہ رویے پر بہت غصہ آیا۔ اسے مزہ چکھانے کے لئے ۲۰۱ھ میں غوریوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد وہ تیزی سے ملتان کی طرف آیا۔ ملتان والوں کو تیاری کا موقع نہ مل سکا اس لئے وہ قلعہ بند ہو گئے۔ مگر محمود غزنوی نے زبردست حملہ کر کے ملتان کو فتح کیا۔ بڑے پیمانے

۱۔ تزجمہ تاریخ فرشتہ (اردو)، جلد اول، ص ۱۵، نو لکچور پریس لکھنؤ (لاسٹے خاں لاہوری)

پر گرفتاریاں اور قتل و غارت ہوئی۔ شیخ داؤد بن نصر بن حمید بھی گرفتار ہوا جسے غزنویوں نے جیایا گیا اور وہیں قلعہ غورک میں قید کے دوران اس کا انتقال ہوا۔ اب صوبہ ملتان پر مکمل طور پر محمود غزنوی نے قبضہ کر لیا۔ جلم بن شیبان نے اپنے دور میں ملتان میں محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو بند کروا کر ایک نئی مسجد تعمیر کی تھی۔ محمود غزنوی نے اس مسجد کو بند کروا کر محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو دوبارہ آباد کیا۔

۱۔ صوفیا اور بزرگوں کا دوسرے زمین پاک ہند میں

اس ساری تفصیل سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ سرزمین ملتان کی قدامت، اہمیت، مرکزیت اور سیاسی و تاریخی عظمت مسلمہ ہے۔ یہ سرزمین موہن جو ڈارو، ہڑپہ اور بابل ہینوا کی تہذیب کی ہم عصر رہی ہے۔ دوسری تہذیبیں مٹ گئیں لیکن ملتان قرن باقرن سے قائم رہا۔ مختلف ادوار میں اس کے مختلف نام رہے۔ مختلف قومیں مختلف اوقات میں یہاں حملہ آور ہوتی رہیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ اور بالخصوص عربوں کے ساتھ اس کے روابط اور تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ قبل از اسلام یہ روابط تجارتی بھی تھے اور مذہبی بھی۔ محمد بن قاسم کے حملے کے بعد ملتان میں باقاعدہ طور پر اسلام کی روشنی پھیلی۔ اس حملہ کے بعد یہاں اسلامی اقدار کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کے چراغ روشن ہوئے۔ محمود غزنوی کی فتح ملتان تک عرب مسلمانوں کی حکومت یہاں کسی نہ کسی صورت میں قائم رہی۔ محمود غزنوی کے حملے کے ساتھ ہی بے شمار صوفیاء، بزرگ ہستیاں، مذہبی شخصیتیں اور علم و فضل کے حامل لوگ ہندوستان میں آنا شروع ہوئے۔ ان میں "کشف المحجوب" کے مصنف مشہور صوفی بزرگ علی بن عثمان علی ہجویری غزنوی سے روانہ ہو کر مسلمان ممالک کا سفر کرتے ہوئے آخر لاہور پہنچے اور یہاں مستقل قیام فرمایا۔ شیخ اسماعیل بخاری اور شیخ فرید الدین عطار بھی برصغیر میں آئے۔ حضرت شہاب الدین سہروردی کے شاگرد رشید شیخ جلال الدین تبریزی بنگال پہنچے۔ عبدالکریم الجلیلی مصنف انسان کامل نے بھی برصغیر کا سفر اختیار کیا۔

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ترجمہ تاریخ فرشتہ (۱ و ۲) جلد اول، ص ۲۰-۲۱

اسی طرح سید محمود گیسو دراز، پیر صدر الدین، سید یوسف الدین برصغیر میں سکونت پذیر ہوئے۔

سرزمینِ ملتان تو سب زمینوں سے بڑھ کر بزرگوں اور صوفیوں کے لئے ایک عظیم مرکز بنی رہی۔ اسی لئے اسے مدینۃ الاولیاء کہا گیا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے ملتان میں کئی برس تک قیام فرمایا۔ مقامی زبان میں جہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد بغرض اشاعتِ اسلام اجمیر جا کر مستقل قیام فرمایا۔ سید جلال الدین بخاری اُچشریف میں اور بابا فرید الدین گنج شکر پاک پتن میں قیام پذیر ہوئے۔ قطب الدین بختیار کاکی ملتان تشریف لائے، قیام فرمایا اور تبلیغ کے بعد دہلی کوچ کر گئے۔ جلال الدین سرخ پوش نے اُچ میں اور غوث بہار الحق زکریا نے ملتان میں سکونت اختیار کی۔

اس شہر بے مثال میں حضرت امیر خسرو اور صوفی شاعر عراقی کی آمد بھی ہوئی۔ ان کے شعر و نغمہ سے اس کی فضائیں گونجیں۔ حضرت خواجہ فرید کی روح پرور شاعری نے اس سرزمین میں معرفت کے بیج بوئے۔ انسانیت کو مساوت، اخوت، امن، عشق اور آشتی کا پیغام دیا۔ البیرونی جیسے محقق اور مؤرخ نے ملتان میں قیام کر کے نہ صرف کتاب الہندیہ کی اہم کتاب تصنیف کی بلکہ ہندی علوم کی بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی عربی زبان میں کئے۔ ان تمام بزرگانِ دین، علماء، مفکرین اور صوفیاء کی بدولت اسلامی فلسفے کے علاوہ تصوف بھی پورے برصغیر پاک و ہند میں پھیل گیا۔

اس اجمال کی تفصیل تو ہم اگلے باب میں پیش کریں گے۔ فی الحال اس باب کے دوسرے حصے میں ہم ملتان کے بارے میں سیاحوں کے بیانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن سے ملتان کی مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، لسانی اور تہذیبی زندگی کا عکس ہمارے سامنے آئے گا۔

اب، ملتان کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا جائزہ،

سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں ۶

(1) **ملتان اہم تہذیبی مرکز** | سرزمین ملتان اپنی تہذیبی اور تمدنی اقدار کے اعتبار سے دنیا کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہ شہر نہ صرف تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا بلکہ علم و ادب، ثقافت، جملہ فنون لطیفہ و مفیدہ اور روحانی اقدار کے لحاظ سے بھی دنیا کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شہر کو مدینۃ الاولیاء کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس سرزمین کو تقدس اور طہارت سے ہم کنار کرنے والے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام ہیں جنہوں نے اس سرزمین میں تخم معرفت بوسے اور لوگوں کی زندگیوں کو اپنے فیضانِ نظر سے انقلاب آشنا کیا۔ یہ انقلاب روحانیت اور اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار کا علمبردار تھا۔

ارضِ ملتان انسانی زندگی کی ایک عظیم بستی کی صورت میں کب معرض وجود میں آئی؟ انسانی تخیل اور تصور اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے لیکن یہ بھی ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ بابل، نینوا اور موہن جو ڈارو کا ہم عصر یہ شہر اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے اور تقدس و عرفان کے لحاظ سے دنیا کا ایک قدیم ترین شہر ہے۔ تاریخ کی گواہی اور مؤرخین و محققین کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شہر تین ہزار سال قبل از مسیح بھی آباد تھا (۱)۔ ملتان کے کاخ و کو، قلعہ کہنہ اور قدیم طرز تعمیر کی عمارتوں کے نیچے صدیوں اور قرون کی تہذیب دہی ہوئی موجود ہے جس کی ابتدا کا پتہ لگانا تو ممکن نہیں تاہم اس کی عظمت پارینہ کے کچھ

۱۔ معروف محقق اور ماہر آثار قدیمہ ابن خلیفہ لکھتے ہیں — "ملتان کے موعودہ مقام پر پہلی بستی

کم از کم ساڑھے پانچ ہزار سال قبل کے لگ بھگ — بسائی گئی تھی۔ سی"

(بحوالہ "سات دریاؤں کی سرزمین" مطبوعہ کاروان ادب، باراول ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۹)

اسی طرح ملتان کے مشہور محقق اور مؤرخ علامہ عتیق فکری کا بیان ہے کہ "ملتان کے علاقے کی قدامت...م

قبل مسیح تک چلی جاتی ہے۔" ("نقش ملتان" مطبوعہ فکری ایڈمی، باراول ۱۹۸۲ء، ص ۴۱)

قصے تو تاریخوں میں بند ہیں اور لچھ قدیم دستاویزات میں، لیکن اس کا ایک بڑا ماخذ وہ سفرنامے بھی ہیں جو چوتھی صدی، ق م سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک کے ان سیاحوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی حالات قلم بند کئے ہیں۔ مختلف سیاحوں کے بیانات سے ملتان کی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور ہم ان تفصیلات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں جو تاریخ میں بھی موجود نہیں ہیں۔ ان سیاحوں نے جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا اس کو کبھی اجمال سے اور کبھی تفصیل کے ساتھ اپنے سفرناموں میں درج کیا۔ یہ سیاح دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں یونانی، چینی، عربی، فرانسیسی اور برطانوی سیاح قابل ذکر ہیں۔ ہم زمانی لحاظ سے ان سیاحوں کے بیانات کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۲) یونانی اور چینی سیاح | تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے سکندر اعظم

مقدونی اپنی فوج کے ساتھ سرزمین ملتان پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کے نواحی قبائل کے ساتھ برسراپکار رہا۔ یہیں اس نے وہ مہلک تیرکھایا جس سے بعد میں اس کی موت واقع ہوئی۔ ڈاکٹر رفیق مغل کے بیان کے مطابق سکندر اعظم کی فوج کے ساتھ ایک مؤرخ ایرانی (Arrian) بھی تھا جس نے اپنی کتاب Anabasis میں یونانی حملے کی پوری تفصیل درج کی ہے۔ اس نے ملتان میں بسنے والی قوم کو "ملوئی" یا "ملی" کے نام سے پکارا ہے اور اس قوم کی بہادری اور جرات مندی کی بے حد تعریف کی ہے۔

چینی سیاح ہیون سانگ (HIUENTSIANG) جو بدھ مت کا پیروکار تھا اکتوبر ۶۳۱ء میں ملتان پہنچا تھا، اس نے ملتان شہر کا نام "میولوسان پولو" بیان کیا ہے اس نے اس شہر کی تمدنی، علمی اور ادبی، اقتصادی، مذہبی اور روحانی زندگی کے بارے میں جو تفصیل بیان کی ہے وہ بڑی دلچسپ ہے۔ میں یہ تفصیل ڈاکٹر محمد رفیق مغل کے الفاظ میں درج کرتی ہوں۔

"اس علاقے کا دارالخلافت (ملتان) تیس "لی" (تقریباً پانچ میل) کے علاقے پر محیط ہے۔ یہ شہر بڑا گنجان آباد ہے یہاں کے لوگ بہت امیر ہیں اور یہ علاقہ چکا (CHIKA) سلطنت کے ماتحت ہے۔ یہاں کی مٹی بہت

زرخیز ہے، آب و ہوا خوشگوار ہے۔ لوگ بہت سادہ اور ایمان دار ہیں۔ علم و ادب، باہمی عزت اور نیک اقدار سے محبت رکھتے ہیں۔ بیشتر لوگ رحوں کے لئے قربانی دیتے ہیں۔ اور بہت کم گوتم بدھ کے اصولوں پر قائم ہیں یہاں پر بدھ مت کی دس خانقاہیں ہیں۔ یہ زیادہ تر شکتہ حالت میں ہیں کچھ مذہبی پیشوا ہیں جو مطالعہ تو کرتے ہیں مگر اس میں کمال حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ یہاں پر ہندوؤں کے آٹھ مندر ہیں جن میں مختلف ذات کے لوگوں کے نمائندے رہتے ہیں۔ ایک مندر جو کہ "سورج دیوتا" کا ہے بہت عالیشان ہے اور گونا گوں آرائش سے مزین ہے۔ سورج دیوتا کا بت پیلے سونے کا بنا ہوا ہے اور اسے نادر جواہرات سے سجایا گیا ہے۔ عورتیں اس مندر میں سورج دیوتا کی تعریف میں مشعلیں روشن کر کے گاتی بجاتی ہیں اور پھول اور عطر دیوتا کی نذر کرتی ہیں۔ یہ رسم بہت قدیم ہے۔ بادشاہ اور امراء کے اہل خاندان قیمتی جواہرات اور پتھروں پر مشتمل تحائف دیوتا کو پیش کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ قریب ہی ایک جگہ پر کھلنے پینے کا انتظام ہے جہاں غریبوں کے لئے کھانا اور پانی تقسیم کیا جاتا ہے اور بیماریوں کے لئے دوائیں دی جاتی ہیں۔ بہت سے علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ دعا مانگتے آتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف تالاب ہے جس میں خوب صورت پھول اُگے ہوتے ہیں۔

۳۔ تج نامہ کی روایت برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا باقاعدہ ورود محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ہوا۔ محمد بن قاسم سندھ کو فتح کرتا ہوا آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ملتان پہنچا۔ ملتان میں مسلمانوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اہل ملتان قلعہ بند ہو کر لڑے۔ دو ماہ تک فسیلوں سے منجیقوں اور قدرک (ایک آلہ حرب) کے ذریعے پتھر اور تیر برسائے۔ آخر ملتان فتح ہوا۔ تج نامہ میں اس حملے کی جو تفصیلات درج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ "ملتان میں دولت کی ریل پیل تھی۔ فتح مکمل ہوئی تو شہر کے ریس

اور سربراہوں نے جمع ہو کر پچاس لاکھ ہزار درم وزن کی چاندی تقسیم کی۔ ہر سوار کو خاص طور پر چار سو درم وزن کی چاندی ملی۔ اس کے علاوہ ایک بُت سے بے شمار خزانہ ہاتھ لگا۔ بیچ نامہ میں لکھا ہے کہ ایک برہمن محمد بن قاسم کے پاس آیا اور کہا

” اے عادل امیر! یہ وہی بُت ہے کہ جو ملتان کے راجہ جو بن نے بنوایا تھا، اور جو مال دفن کر کے فوت ہو گیا تھا۔“

محمد بن قاسم وزیروں اور نائبوں کے ساتھ اس بُت خانے میں آیا۔ یہاں اس نے سونے کا ایک بُت دیکھا جس کی آنکھوں میں سرخ یا قوت جڑے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم کے حکم سے جب اس بُت کو اٹھایا گیا تو اس کے نیچے سے دو سو تیس من سونا اور سونے کی کترن سے بھرے ہوئے چالیس مٹکے برآمد ہوئے۔ کل تیرہ ہزار دو سو من سونا دھینے سے نکلا وہ سونا اور بہت سے بُت خزانے میں لائے گئے، اس کے علاوہ وہ موتی اور جواہرات جو کہ ملتان کی لوٹ میں ہاتھ آئے تھے وہ اور بہت سے دوسرے خزانے اور دھینے بھی قبضے میں کئے گئے۔

۴۔ عرب سیاحوں کے بیانات | مال و دولت کی بہتات کی وجہ سے ملتان

کو فرج بن الذہب (سونے کی سرحد) کہا جاتا تھا۔ عرب سیاح خرداذبہ (الموتوفی ۳۰۰ھ ۹۱۲ء) اپنی مشہور کتاب ”السالك والممالک“ میں لکھتے ہیں۔

”سجستان کے شہر زانج سے ملتان دو مہینہ کی راہ ہے اور ملتان کو فرج بیت الذہب (سنہری سرحد) کہتے ہیں کیونکہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف نے یہاں ایک گھر کے اندر ۴۰ ہزار سونا پایا تھا اور بھارا، ۳۳۳۱ من کا ہوتا ہے اسی بنا پر ملتان کو فرج بیت الذہب کہتے ہیں۔“

تیسری صدی ہجری کا ایک عرب سیاح اور تاجرا ابو زید حسن سیرانی (الکتاب الشافی من سلسلہ التواریخ میں) ملتان کے مشہور بُت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”منصورہ کے قریب ملتان میں جو مشہور بُت ہے، اس کی زیارت (یا ترا) کے لئے لوگ کئی کئی مہینہ کا سفر طے کر کے آتے ہیں اور اپنے ساتھ مشہور عود

ہندی قوموں کو لاتے ہیں، قماروں ایک شہر ہے جہاں عمدہ قسم کا عود پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اسے بُت پر دھونی کے لئے لاتے ہیں اور مہنتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بعض اقسام کے ایک من عود کی قیمت دو سو دینار ہوتی ہے اس کی بعض قسمیں اتنی نرم ہوتی ہیں کہ اگر ان پر انگوٹھی سے مہر لگائی جاتی تو اس کی چھاپ آجاتی ہے۔ تاجران خادموں سے عود کو خریدتے ہیں

عرب مؤرخ اور جغرافیہ دان احمد بن یحییٰ بن جعفر بلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ بمطابق ۸۹۲ء) کی معروف کتاب "فتوح البلدان" ہے جو اسلامی فتوحات کے سلسلے کی تاریخ ہے اور اس میں سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی تفصیل موجود ہے۔ البلاذری کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان میں بُت پرستی کا بڑا رواج تھا اور یہاں ایسے بت موجود تھے جن کی زیارت کے لئے دور دراز کے علاقوں سے لوگ آتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو بیشمار دولت ملی۔ البلاذری لکھتے ہیں کہ

"یہاں سونے کی کثیر مقدار ہاتھ آئی، بُد خانے میں دس گز سے آٹھ گز کا ایک حجرہ تھا جس میں بُد کے چڑھاوے جمع کئے جاتے۔ حجرہ چاروں طرف سے بند تھا، چھت میں ایک بڑا سا وزن تھا جس سے چڑھاوے اس میں ڈالے جاتے تھے۔ اس حجرے کی وجہ سے ملتان کو "فرج بیت الذہب" کہنے لگے۔ فرج کے معنی سرحد کے بھی ہیں۔

ملتان کا بُد ایک ایسا بُد تھا جس کے لئے اموال ہدیہ کئے جاتے اور اس پر نذریں چڑھائی جاتیں۔ سندھ والے اس کی بڑی عظمت کرتے۔ زیارت کو آتے اور ڈاڑھیاں اور سر منڈا کے اس کا طواف کرتے۔ لوگوں کا گمان ہے کہ یہ بُت ایوب علیہ السلام کا مجسمہ ہے؟

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"کہتے ہیں حجاج نے ہم کے مصارف اور غنائم کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ ۶ کروڑ خرچ ہوئے اور بارہ کروڑ حاصل ہوئے۔ کہا ہم نے اپنے خون کا بدلہ پالیا جو کچھ خرچ کیا۔ اس پر چھ کروڑ درہم مزید ہاتھ آئے اور داہر کا سر ملا۔"

ابو عبد اللہ ابن فقیہ ہمدانی بھی تیسری صدی کے آخر کا انشاء پرداز اور جغرافیہ دان تھا۔ اس کی تصنیف کا نام "کتاب البلدان" ہے۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ اس علاقے میں آیا تھا تو بحر ہند ملتان کو عبور کرتا ہوا گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

"یہ سمندر قلمزم سے وادی قری ہوتا ہوا برابر عمان، دیبل اور ملتان کو عبور کرتا ہوا چین میں چنیہ پہاڑ تک چلا آیا ہے۔"

اس نے ملتان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا۔

ابن فقیہ کا ہم عصر احمد بن عمر بن رستہ اگرچہ خود ہندوستان میں نہیں آیا تھا مگر اس نے اپنی معروف تصنیف "الاعلاق النقیہ" (سنہ تصنیف ۲۹۰ھ) میں ملتان کے بارے میں بہت سی دلچسپ معلومات درج کی ہیں۔ مثلاً اس کے بیان کے مطابق ملتان میں یسنے والی قوم سلمہ بن لونی کی ایک شاخ بنو امیہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی قوم ہندوستان کے اس حصے پر حکمران تھی اور خلیفہ (بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتی تھی)۔ ابن رستہ نے ملتان کے بُت کا بھی ذکر کیا ہے جس کی لمبائی ۲۰ گز سے زائد تھی، وہ آدمی کی شکل و صورت تھا اور اس کے چار چہرے تھے۔ اس لئے جس طرف بھی آدمی رخ کرتے وہ ان کے سامنے رہتا۔ اس کی پشت نہیں تھنی۔ یہ بُت دو ہزار سال پہلے کی تعمیر تھا۔ بند وؤں کے عقیدے کے مطابق یہ بُت آسمان سے اترتا تھا اور انہیں اس کی بندگی کا حکم دیا گیا تھا۔ لوگ سال ہا سال کی مسافت طے کر کے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ یہاں آکر اپنا سر منڈاتے تھے اور بائیں جانب سے سات بار طواف کرتے تھے، اس کے سامنے روتے تھے، گر گر اٹاتے اور زمین پر لوٹتے۔ کچھ لوگ تو اپنی آنکھیں نکال کر اس کی آستین میں رکھ دیتے۔ بعض لوگ اپنی جان اس بُت کی نذر کر دیتے۔ طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک لمبی لکڑی کے سرے کو انتہائی تیز اور نوکیلا بنا کر اسے زمین میں گاڑ دیتے پھر اس کے اوپر چڑھ جاتے تھے اور لکڑی کا تیز اور نوکیلا سرا اپنے پیٹ میں اس طرح چھب دیتے کہ وہ پشت کے راستہ باہر نکل آتا۔

علی بن حسین ابوالحسن المسعودی (المتوفی ۳۲۶ھ / ۹۵۷ء) ایک بلند مرتبہ جغرافیہ دان، مؤرخ، اور ستیاج گزرا ہے۔ اس کی دو کتابیں "عروج الذہب و معاون الجوہر" اور "التنبہ الاشراف" — بہت مشہور ہیں۔ "عروج الذہب و معاون الجوہر" میں ہندوستان کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مسعودی کی یہ تصنیف ۳۲۲ھ / ۹۴۳ء کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں ملتان

کے بارے میں بھی کچھ معلومات درج ہیں۔ اس نے بھی ملتان کو "سونے کی سرحد" کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے مطابق ملتان کا حکمران قبیلہ قریش کی ایک شاخ اسامہ بن لوی بن غالب کے خاندان سے متعلق تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ دریائے سندھ ملتان کے بعد منصورہ سے گزرتا ہوا دہل کے قریب سمندر میں گرتا تھا۔ اس دریا میں گھڑیاں رہتے تھے اور مسعودی کے مطابق جس پانی میں گھڑیاں ہوں وہ بڑا شیریں ہوتا ہے مسعودی نے ملتان کو مسلمانوں کی ایک اہم سرحد قرار دیا ہے جس کے چاروں طرف ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں آباد ہیں۔ پھر اس نے اس مشہور بُت خانے کا ذکر بھی کیا ہے جس کی یا ترا کے لئے ہندوستان بھر سے لوگ خوشبوئیات لے کر آتے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب کوئی ہندو راجہ ملتان پر حملہ آور ہوتا اور مسلمان اس کا مقابلہ نہ کر پاتے تو وہ اس بُت خانے کو توڑ دینے کی دھمکی دیتے۔ اس دھمکی پر ہندوؤں کی فوجیں واپس چلی جاتیں۔ اس نے ملتان کی بنی ہوئی ہاتھی دانت کی چوڑیوں، کھلونوں اور تانبے کے برتنوں کی بہت تعریف کی ہے (۱) مسعودی کا ۳۰۰ھ کے بعد ملتان جانا ہوا تھا۔ ۳۳۱ھ میں یعنی مسعودی کے تقریباً تیس سال بعد ابن ہبل سندھ آیا۔ ملتان کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ

”ملتان ایک بڑا شہر ہے جس میں فصل بھی ہے۔ وہاں لوگ (ہندو) اسی طرح حج کرنے جاتے ہیں جیسا کہ ہم مکہ میں، وہاں اسلامی سلطنت ہے اور غیر مسلم ان کے ماتحت ہیں۔ وہاں ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اور اس کے نزدیک مسلمانوں کی جامع مسجد ہے۔ عام طور پر لوگ شریعت کے تابع ہیں اور دینی امور پر عمل کرتے ہیں۔“ (۲)

ابراہیم بن محمد البواسق اصطخری ۳۴۰ھ / ۹۵۱ء میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کی دو کتابیں "کتاب الاقالیم" اور "مسالک الممالک" مشہور ہیں۔ مسالک الممالک میں سندھ اور ہندوستان

۱۔ عروج الذهب و معاون الجوبہر (عربی) ص ۱۸۹-۱۹۰ (الجزء اول) مطبوعہ بیروت،

الطبع الادلی، بیروت ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء (علامہ عتیق فکری کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کیا گیا)

۲۔ بحوالہ تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء ص ۲۱۲۔

کا ذکر موجود ہے۔ سندھ کے ضمن میں ملتان کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اصطخری نے بھی ملتان کو "فرج بیت الذہب" کہہ کر پکارا ہے اور ملتان کے بُت نامے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس نے بُت کے بارے میں کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جو دوسروں نے نہیں لکھیں مثلاً یہ مورتی انسانی شکل کی ہے اور اینٹ اور گج کی بنی ہوئی ایک کرسی پر پالھتی مارے بیٹھی ہے۔ اس کا سارا جسم سنبال کے چمڑے کی طرح ایک سرخ چمڑے سے منڈھا ہوا ہے اور صرف اسکی آنکھیں نظر آتی ہیں، دونوں آنکھیں جو ابھرتی ہیں، سر پر سونے کا ایک تاج ہے۔ آگے چل کر اصطخری لکھتا ہے کہ

"ملتان محفوظ اور مستحکم شہر پناہ سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ ملتان کے باہر ڈیڑھ میل پر بہت سی عمارتیں ہیں جن کو جند اور کہا جاتا ہے۔ یہ امیر کی چھاؤنی ہے۔ اس کے مطابق اہل ملتان لنگی اور کرتہ استعمال کرتے تھے۔ منصورہ ملتان اور ان کے مضافات کے باشندوں کی زبان سندھی اور عربی تھی"۱

ایک اور عرب سیاح محمد بن احمد شمس الدین ابو عبد اللہ بشاری مقدسی کی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقاسیم" میں ہندوستان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۳۶۵ھ/۹۸۵ء میں لکھی گئی تھی۔ بشاری مقدسی کے مطابق ملتان میں پھل بہت سستے تھے۔ روئی فی درہم ۲۰ من اور مصری فی درہم ۳۰ من ملتی تھی۔ مکان ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کئی کئی منزلیں تھے۔ شراب اور زنا کارواج بالکل نہ تھا اور جو شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا تھا وہ سخت سزا کا مستوجب ٹھہرتا، یہاں تک کہ قتل بھی کیا جاتا۔ اہل ملتان خرید و فروخت اور لین دین میں جھوٹ سے کام نہ لیتے تھے اور نہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ مسافروں سے محبت سے پیش آتے۔ وہ دریا کا عمدہ پانی پیتے تھے۔ بشاری مقدسی نے ملتان کو آسودہ شہر قرار دیا۔ یہ تجارت کا مرکز تھا اور یہاں نعمتوں کی فراوانی تھی۔ بادشاہ عادل اور منصف مزاج تھے۔ عورتیں بناؤ سنگھار کر کے بازار میں نہ آسکتی تھیں اور نہ کوئی عورتوں سے بات

۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "ہندوستان عربوں کی نظریں" ص ۳۶۸ تا ۳۷۸۔

چیت کر سکتا تھا۔

بشار ہی مقدسی کے مطابق ملتان کا پانی عمدہ اور زندگی راحت سے پڑھتی۔ لوگ خوشحال بامروت عالی ظرف، تندرست اور توانا تھے۔ لوگوں کا رنگ گندمی اور سیاہ تھا۔ زبان عموماً فارسی تھی۔ البتہ ملتان کی زمین سنگلاخ، مکانات تنگ اور ہوا گرم خشک تھی۔ بشار ہی مقدسی نے ملتان کے بت خانے کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے لیکن یہ تفصیلات کم و بیش وہی ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

ایک اور مسلمان سیاح اور مؤرخ ابن حوقل دو بار ملتان آیا۔ دوسری بار ۹۷۹ء میں وہ یہاں مقیم رہا۔ اس نے بھی اپنا سفر نامہ لکھا ہے جو مولانا سید ابوظفر ندوی کے بیان کے مطابق ۳۶۷ھ میں تیار ہوا^(۲)۔ ملتان کی تاریخ اور حالات کے بارے میں ابن حوقل کے اکثر بیانات اصطخری کے مندرجات پر منحصر ہیں۔ حوقل کے بیان کے مطابق شہر کا نام ملتان کے معروف بت کے نام پر رکھا گیا تھا جبکہ البیرونی کے نزدیک ملتان کا نام "مول استھان" تھا۔ جو بعد میں ملتان بن گیا۔ ملتان کی کرنسی کے بارے میں ابن حوقل کا بیان ہے کہ یہاں پہلے تجارت کے لئے طاہری سکے رائج تھے، یہ سماڑا کے راجہ کا تھا جو مختلف وزن کا ہوتا تھا کبھی $\frac{1}{2}$ درہم، کبھی $\frac{1}{8}$ درہم عراقی کے برابر اور کبھی ۵ درہم عراقی کے برابر جب اسماعیلیوں کا ملتان پر قبضہ ہوا تو ایک اور سکہ رائج ہوا جس کو "قاہریہ" کہتے تھے۔ یہ مصر کے فاطمی امہ کے نام سے قاہرہ میں بنایا جاتا تھا جو عراق کے ۵ درہم کے برابر ہوتا^(۳)۔ ملتان کی مصنوعات کے بارے میں ابن حوقل کہتا ہے۔ ملتان سے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ڈبیہ، چھری، چاقو، صندوقے اور ہتھیاروں کے دستے تیار ہو کر بڑی تعداد میں غیر مالک کو جاتے تھے۔ ہاتھی دانت کی چوڑیاں بھی بنتی تھیں جنہیں ہندو عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ ابن حوقل کے مطابق چوتھی صدی کے وسط تک ملتان اور منصورہ کے لوگ یہاں کی ملکی زبان سین ب

۱۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقاسیم ترجمہ لعنوان "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ص ۳۸۸، ۴۰۰۔

۲۔ تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی، ص ۲۲۳۔

۳۔ سفر نامہ ابن حوقل، ص ۲۲۶، مطبع لیدن

(سندھی) اور عربی میں گفتگو کرتے تھے۔^(۱)

ابوریحان البیرونی، عالمی شہرت یافتہ سیاح، مؤرخ اور جغرافیہ دان تصور ہوتا ہے وہ ۱۰۱۱ء میں ملتان میں قیام پذیر رہا۔ اس کی تصنیف "کتاب الہند"^(۲) بے حد معروف ہے۔ البیرونی نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ملتان کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ البیرونی لکھتا ہے،

"مشہور بتوں میں ایک آفتاب کے نام کا بت ملتان کا تھا اور اس نسبت سے اس کا نام آدت رکھا گیا تھا۔ یہ بت لکڑی کا بنا ہوا اور بکری کی طرح سرخ رنگ کی کھال میں منڈھا ہوا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں دو یا قوت سرخ جڑے ہوئے تھے۔ ہندو کہتے ہیں کہ وہ سب سے پھلے کرتا جگ میں بنایا گیا تھا فرض کرو کہ وہ اس جگ کے آخر میں بنا تو اس وقت سے ہم لوگوں کے زمانہ تک ۲،۱۶،۲۳۲ یعنی دو لاکھ سولہ ہزار چار سو بیس سال ہوتے ہیں۔"^(۳)

البیرونی نے ملتان کے معروف مندر کے ذکر کے علاوہ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق جب ابن قاسم نے ملتان فتح کیا تو سورج مندر کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جب قرامٹیوں نے ملتان پر قبضہ جمایا تو انہوں نے نہ صرف اس بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، نہ صرف بجا ریوں کو قتل کرایا بلکہ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو بھی بند کر دیا اور اس کی جگہ ایک علیحدہ مسجد بنوائی۔ پھر محمود غزنوی نے ۱۰۰۵ء میں قرامٹیوں کا قلع قمع کیا اور محمد بن قاسم کی مسجد کو دوبارہ آباد کیا^(۴) البیرونی نے

۱۔ سفرنامہ ابن حوقل بغدادی، ص ۲۲۶۔ لیدن

۲۔ البیرونی برسوں ملتان میں رہا۔ یہیں اس نے ہندی علوم پر مشتمل کئی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا

اور یہیں اس نے اپنی نہایت اہم کتاب "کتاب الہند" لکھی (بحوالہ برصغیر پر ملتان کے علمی اثرات" از علامہ عتیق فکری، امروز ملتان نمبر، ص ۵)

۳۔ کتاب الہند ۴۲۳ھ میں مکمل ہوئی (بحوالہ ابوریحان البیرونی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۱)

۴۔ بحوالہ "ابوریحان البیرونی" سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۲۲۔

۵۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "ابوریحان البیرونی" ص ۱۲۲۔

مستان کے کئی قدیم نام بھی درج کئے ہیں۔ البیرونی نے مستان کے ایک مقدس تالاب کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مستان میں ایک ایسا تالاب ہے جس میں نہانا ہندو اپنی پوجا کا حصہ سمجھتے ہیں۔“

ایک اور مسلمان جغرافیہ دان سیاح اور مؤرخ الادریس نے ۱۱۰۳ء میں اپنی کتاب ”مزہبت المشاق فی افتخار الافق“ میں مستان کا ذکر کیا ہے۔ اس نے سورج دیوتا کے بت کا حال خاص طور پر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۱۲۶۲ء سے متعلق ایک اور مسلمان مؤرخ اور سیاح زکریا قزوینی نے مستان کے بارے میں کچھ باتیں درج کی ہیں۔ یہ بھی کم و بیش اسی قسم کی ہیں جن کی تفصیل اس سے پہلے سیاحوں نے پیش کی ہیں۔ قزوینی کی کتاب کا نام ”اسرار البلاد و اخبار العباد“ ہے جس میں اس نے مستان کے باشندوں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ مسلمان اور کافروں پر مشتمل ہیں، لیکن حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

ابن بطوطہ کا شمار دنیا کے معروف ترین سیاحوں میں ہوتا ہے۔ رئیس احمد جعفری نے ”سفرنامہ ابن بطوطہ“ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس سفرنامے کی دوسری جلد میں مستان کا ذکر کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق مستان میں داخل ہونے سے پہلے دس کوس کے فاصلے پر ایک دریا عبور کرنا پڑتا ہے جو تنگ لیکن عمیق ہے اور بغیر کشتیوں کے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں دریا پار کرنے والوں کی تلاشی بھی ہوتی تھی۔ تاجروں سے ایک چوٹائی مال بطور محصول لیا جاتا تھا۔ ایک گھوڑے پر سات دینار محصول لگتا تھا۔ ابن بطوطہ جب ارج سے مستان آیا تو اسے تلاشی کی بڑی فکر تھی۔ لیکن مستان کے حاکم قطب الملک کی ہدایت کے مطابق اس کی تلاشی نہ لی گئی۔ ابن بطوطہ جب حاکم سے ملنے گیا تو اس نے ایک غلام ایک

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے

"Al-Beruni's India" by Dr. EDWARD SACHAU

Part-II Page.195

مطبوعہ شیخ مبارک علی، بار دوم ۱۹۶۲ء

گھوڑا اور کشمش اور بادام کے تحفے پیش کئے۔ ابن بطوطہ کے مطابق ملتان میں کشمش اور بادام نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے یہ تحفہ بہت پسند کیا جاتا تھا۔

ابن بطوطہ نے ملتان میں گھوڑ سواری اور فن تیر اندازی کی بے حد تعریف کی ہے اس کے مطابق اگر کوئی اپنی سواری کا کمال دکھانا چاہتا تو پہلے گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک چھوٹے سے نقارے پر نیزہ لگاتا اور پھر ایک چھوٹی سی دیوار پر لٹکی ہوئی انگوٹھی کو نیزے کی انی میں پرو کر انگوٹھی لے جاتا۔ جس قدر کمال کوئی ان کھیلوں میں دکھاتا تھا اسی قدر اس کے عہدے میں ترقی ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے دو ماہ تک ملتان میں قیام کیا۔ یہاں کے آداب طعام، دسترخوان کی وسعت اور رنگارنگ کھانوں کی بڑی دلچسپ تفصیل ابن بطوطہ نے درج کی ہے۔ وہ لکھتا ہے

” اس ترتیب سے کھانا لاتے تھے۔ پہلے روٹیاں لاتے ہیں جو نہایت تیلی، چپاتیاں ہوتی ہیں، بکری کو بھون لیتے ہیں اور اس کے چار یا چھ ٹکڑے کر کے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں لاتے ہیں جس کے بیچ میں حلوا صابوتیہ بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک مسیٹھی روٹی رکھتے تھے جس کو خشتی کہتے ہیں اور اس کو آٹے اور شکر اور گھی سے بناتے ہیں۔ پھر ایک چیز لاتے ہیں جس کو سمو سے کہتے ہیں اور وہ قیہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اس میں بادام اور جانفل اور پستہ اور پیاز اور گرم مصالحہ ڈال کر تیلی چپاتیوں میں لپیٹ دیتے ہیں اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے سامنے پانچ یا چار سمو سے رکھتے ہیں۔ پھر چاول گھی میں پکے ہوئے لاتے ہیں اور اس کے اوپر گھی ہوتا ہے۔ پھر لقیماۃ القاضی لاتے ہیں۔ اس کو ہاشمی بھی کہتے ہیں۔ پھر قایہ لاتے ہیں۔ حاجب کھانا شروع کرنے سے پہلے دسترخوان پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اور سب حاضرین بادشاہ کی تعظیم کرتے ہیں اور تعظیم ان کے ملک میں یہ ہے کہ سر کو رکوع کی طرح نیچے جھکاتے ہیں۔ جب یہ کر چکے ہیں تو دسترخوان پر بیٹھتے ہیں اور کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی اور سونے اور کانچ کے پیالوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں۔ جب

شربت پی چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے۔ اس وقت سب کھانا شروع کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر فقاہ کے پیالے آتے ہیں اور جب فقاہ پی چکتے ہیں تو پان سپاری آتا ہے۔ جب پان چھالیہ لے چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے۔ جب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو جیسی کھانے سے پہلے تعظیم کی تھی اسی طرح پھر کرتے ہیں اور پھر دسترخوان سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔“

۵۔ یورپی سیاحوں کے حوالے | اکبر اور جہانگیر کے زلمنے میں سات

انگریزوں نے یکے بعد دیگرے شمالی اور جنوبی ہندوستان کی سیاحت کی۔ ان سیاحوں کے نام یہ ہیں۔

1583 - 91	Ralph Fitch	۱۔ رلیف فچ
1599-1606	John Milden Hall	۲۔ جان ملڈن ہال
1608 - 13	William Hawkins	۳۔ ولیم ہاکنس
1608 - 11	William Finch	۴۔ ولیم فنج
1612 - 16	Nicholas Withington	۵۔ نیکولاس وڈانگٹن
1612 - 17	Thamas Coryat	۶۔ تھامس کوریات
1616 - 19	Edward Terry	۷۔ ایڈورڈ ٹیری

ولیم فوسٹرنے ان سیاحوں کے طویل بیانات اپنی تصنیف ،

"Early Travels in India" (۱۵۸۳ - ۱۶۱۹)

میں مرتب کئے ہیں۔ ان میں سے ولیم ہاکنس، ولیم فنج، تھامس کوریات اور ایڈورڈ ٹیری نے ملتان کا ذکر کسی نہ کسی لحاظ سے کیا ہے۔ اگرچہ ان سیاحوں نے ملتان کے بارے میں کوئی زیادہ تفصیل پیش نہیں کی۔ تاہم اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ولیم فنج کے مطابق

۱۔ "سفرنامہ ابن بطوطہ" حصہ دوم، مترجم رئیس احمد حفیظی، ص ۲۹۸ تا ۲۹۹، نفیس

ایڈیٹری کراچی، طبع چہارم، اپریل ۱۹۶۸ء۔

فرانسیسی زبان میں ۱۶۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ وی بال —

(V. Ball) نے کیا ہے۔ میورنیر لکھتا ہے

”مٹان ایک ایسا شہر ہے جہاں بڑی تعداد میں کپڑا بناتا ہے۔ یہ سارا کپڑا دریا کا

منہ ریت سے بند ہونے سے پہلے ٹھٹھ کی طرف لے جایا جاتا تھا۔ اب جبکہ

وہ راستہ بڑی کشتیوں کے لئے بند ہو چکا ہے تو یہ (کپڑا) اور لاہور میں

بنی ہوئی چیزوں کا کچھ حصہ آگرہ اور آگرہ سے سورت بھیجا جاتا ہے۔ چونکہ مال

کی نقل و حمل بہت ہنگامی ہے اس لئے صرف چند تاجر مٹان یا لاہور میں اپنا سرمایہ

لگاتے ہیں۔ بہت سے کاریگر کام چھوڑ چکے ہیں۔ اس لئے ان صوبوں میں

بادشاہ کی آمدنی کم ہو گئی ہے۔ مٹان ایسی جگہ ہے جہاں ایران میں تجارت

کرنے والے بنیے آکر بسے ہیں اور یہودیوں جیسا کاروبار کرتے ہیں بلکہ جیسا کہ

پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ سود خوری میں یہودیوں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

ان کا ایک خاص قانون ہے جو انہیں مخصوص ایام میں پرندے کھانے کی اجازت

دیتا ہے اور اس قانون کے تحت دو تین بھائی مل کر ایک بیوی رکھتے ہیں اور

ان سے پیدا ہونے والی اولاد کا باپ بڑا بھائی سمجھا جاتا ہے۔“ (۱)

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک اور فرانسیسی سیاح (Thevenot)

تھیونٹ ۱۶۶۶ء میں مٹان آیا۔ اس کا سفر نامہ ۱۶۸۷ء میں چھپا۔ مٹان کے بارے

میں اس نے یہ لکھا ہے

”مٹان کو کئی دریا سیراب کر کے زرخیز بناتے ہیں، مرکزی شہر جو مٹان کہلاتا

1- "Travels in India" by Jean Bap-
tice Tavernier (Vol. I) Translated
from the original French Edition of
1676. by V. Ball -- Page 90-91 Alberuni
Lahore. Reprinted 1976.

ہے۔ اب تک تجارت کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ کیونکہ یہ دریائے سندھ سے دور نہیں ہے لیکن اب دریا کی گزرگاہ کئی جگہوں سے خراب ہو جانے اور کئی مقامات پر دہانوں میں ریت بھر جانے کی وجہ سے جہاز دور تک نہیں جاسکتے خشکی کے راستے اخراجات زیادہ اٹھنے کی وجہ سے آمدورفت بہت گھٹ گئی ہے۔ بہر حال یہ صوبہ روئی بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے بہت زیادہ کپڑا بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں چینی، افیون، گندھک اور اونٹ بھی بکثرت ملتے ہیں۔ انہیں غزنی اور قندھار کے راستے فارس بھیجا جاتا ہے یا لاہور کے راستے ہندوستان کے مختلف مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ اب تک یہ سامان دریائے سندھ کے راستے ٹھٹھہ تک جاتا تھا جہاں کئی ملکوں سے آئے ہوئے تاجر انہیں خریدتے۔ لیکن اگر انہیں زیادہ منافع کی توقع ہوتی تو خشکی کے راستے سورت تک لے جانا پڑتا ہے۔

کئی ایک جغرافیہ دانوں نے ملتان شہر کو سندھ کے ساتھ ملایا ہے لیکن یہ خود ایک صوبہ ہے — ملتان کے کمانڈرز اور افسر مسلمان ہیں — لیکن یہاں بہت سے بنیے بھی ہیں — ہندو بنیوں کی تجارت یہودیوں جیسی ہے۔ مگر یہ بنیے یہودیوں سے زیادہ مکار ہیں۔ وہ ایک پیسہ بھی بنانے کا موقع ہاتھ سے جاتے نہیں دیتے۔ ان تاجروں کا شمار ہندوستان کے امیر طبقے میں ہوتا ہے اور میں جہاں بھی گیا ان کو ایسے ہی پایا۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی بیویوں پر حاسدانہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ عورتیں مردوں کی نسبت صاف رنگت کی ہیں۔ مگر پھر بھی گندمی رنگ ہے اور روغن و غازہ کی بہت شوقین ہیں ملتان میں کھتری بھی رہتے ہیں۔ یہ شہران کی اصل جائے سکونت ہے اور یہیں سے دوسرے علاقوں میں پھیلے ہیں — ہندو بنیوں اور کھتریوں کا ایک بہت مشہور مندر ملتان میں ہے۔ یہاں ہندو دوسرے شہروں کی نسبت ملتان میں زیارت کے لئے زیادہ آتے ہیں۔ مجھے اس بات کا نام معلوم نہیں جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کا چہرہ سیاہ ہے اور اس کا لباس سرخ چمڑے کا ہے

آنکھوں کی جگہ دو ہیرے جڑے ہیں۔ یہاں کا امیر یا گورنر مندر پر چڑھا دے
 کی ساری رقم وصول کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ملتان شہر ایک چھوٹا سا دار الخلافہ ہے
 لیکن خوب صورت اور مضبوط ہے۔ مغل حکمران اس صوبے سے ایک
 کروڑ پچھتر لاکھ لیر وصول کرتے تھے۔

مونٹیورٹ الفسٹن (Mounsttuart Elphinston) ۱۱ دسمبر
 ۱۸۰۸ء میں کابل جاتے ہوئے ملتان رکا۔ ملتان کے گورنر نواب سرفراز خان سدوزئی سے
 اس کی ملاقات ہوئی لیکن اسے شہر میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔ الفسٹن کا سفر نامہ ۱۸۲۲ء
 میں لندن میں شائع ہوا۔ وہ ملتان کے بارے میں لکھتا ہے۔

”یہ شہر ساڑھے چار مربع میل کے علاقے پر محیط ہے۔ اس کے گرد چالیس اور
 پچاس فٹ اونچی دیوار بنی ہوئی ہے جس پر مخصوص فاصلے پر برج بنے ہوئے
 ہیں۔ ایک اونچی جگہ پر قلعہ بھی ہے جس میں کئی عمدہ مقابر ہیں ان میں سے
 دو کے گنبد بڑے شاندار ہیں اور روغنی اینٹوں اور رنگوں سے سجے ہوئے
 ہیں۔ مقابر شہر کے چاروں اطراف سے خاصے فاصلے سے نظر آتے ہیں۔ ملتان
 ریشم کی مصنوعات کی وجہ سے مشہور ہے اور ایک قسم کے خاص قالین کی وجہ
 سے بھی لیکن یہ ایرانی قالین کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ شہر کے نواح میں علاقہ بہت
 خوش منظر اور زرخیز ہے۔ عموماً کتوؤں سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ لوگ بہاولپور
 والوں جیسے ہیں۔ سولے اس کے کہ یہاں پر ایرانی خدو خال کے مرد زیادہ
 نظر آتے ہیں جو زیادہ تر شہسوار ہیں۔ مٹی زرخیز ہے مگر زیادہ تر گاؤں
 اُجڑ چکے ہیں اور جہاں چاہی کاشت ہو رہی ہے وہاں بھی انحطاط پذیر ہیں
 گندم، جو، کپاس، شلغم، گاجریں اور نیل پیدا ہوتا ہے۔ درخت زیادہ تر
 نیم، کھجور اور پیپل کے ہیں۔ سارے علاقہ میں ہر قسم کا شکار ملتا ہے
 ہمارے قیام کے دوران موسم بہت اچھا تھا۔ رات کو کھر پڑتی تھی

لیکن دن قدرے گرم تھے؟ ”

چارلس مسین کا سفرنامہ "Narrative of Various Journeys in Balochistan, Afghanistan & the Punjab" کے نام سے پہلی بار ۱۸۴۲ء میں لندن میں شائع ہوا۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ چارلس مسین اپنے سفر کے دوران ۱۸۲۷ء میں دو مرتبہ ملتان آیا اور کئی روز تک قیام کیا۔ اس نے ملتان شہر کے بارے میں دلچسپ تفصیل درج کی ہے وہ لکھتا ہے،

” دور سے تو یہ شہر بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قریب آکر اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہ تین میل کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے اور فصیل بند ہے اس کے بازار بڑے بڑے لیکن تکلیف دہ حد تک تنگ ہیں اور ان میں وہ گہما گہمی بھی نہیں ہے جس کی توقع کسی بڑے مشہور تجارتی شہر سے کی جاتی ہے۔ قلعہ بہت زیادہ مضبوط تو نہیں لیکن غیر معمولی توجہ سے بنایا گیا ہے اور غیر لورپی انجینئروں کے بنائے گئے قلعوں کی نسبت زیادہ سلیقے سے بنایا گیا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے اینٹوں کی خندق بنائی گئی ہے۔ اس کے دروازے کی حفاظت ایک کھجواؤ پل کے ذریعے کی گئی ہے۔“

میسین کے مطابق اگرچہ سکھوں کے ملتان پر قبضے کے بعد تجارت میں کمی آگئی تاہم بازاروں کی رونق اور اشیائے صرف کی مناسب بہم رسانی باقی ہے۔ روپے پیسے کا لین دین کرنے اور سوتی اور لٹھی کپڑا بنانے والے بے شمار لوگ موجود تھے۔ ملتان کی شالیں اور لنگیاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور یہاں کی کڑھائی کا کام بہادرپور کے کام سے مقابلہ کرتا ہے

۱۔ امروز ملتان نمبر ۲۸ جون ۱۹۷۸ء

2- "Narrative of various Journeys in Balochistan, Afghanistan and the Punjab" Oxford Press 1974. Page 394.

افغانستان اور سندھ کے مغربی خطوں کے ساتھ اس کی تجارت جاری ہے۔
 آگے چل کر مسین ملتان کی قبروں، مقبروں، مساجد اور خانقاہوں کا ذکر بڑی تفصیل
 سے کرتا ہے۔ وہ اس روایت کا ذکر بھی کرتا ہے کہ سرزمین ملتان میں ایک لاکھ ولی دفن ہیں
 ملتان کے باغات کی تعریف اس نے کھل کر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

” ملتان میں باغات کی کثرت ہے۔ ان میں پھل دار درخت مثلاً آم، مانا، لیموں
 اور سنگترہ عام ہیں۔ کھجوروں اور سنبلوں کی خوب پیداوار ہوتی ہے۔ دریائے
 راوی اگرچہ تین میل کے فاصلے پر ہے لیکن طغیانی کے زمانے میں اس کا
 پانی شہر تک آجاتا ہے۔ دریا پر کشتیوں کی بندرگاہ سی بنائی گئی ہے جہاں سے
 دریائے سندھ اور انجم کار سمندر تک راستہ جاتا ہے“ (۱)

میسین کے اندازے کے مطابق اس وقت ملتان میں آٹھ یا نو ہزار مکان موجود تھے اور اس
 کی آبادی چالیس پینتالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی (۲)۔

جرمن سیاح بیرن چارلس ہوگل (Baron Charles Hugel)

(۱۸۶۰ - ۱۸۹۶ء) میں پنجاب اور کشمیر کی سیاحت پر ۳۶ - ۱۸۳۵ء میں آیا۔ اس
 نے اپنے تاثرات ایک کتاب کی صورت میں لکھے جس کو میجر ٹی بی جرویس T.B. Jervis
 نے ۱۸۴۴ء میں انگریزی میں منتقل کیا۔ چارلس ہوگل نے اپنے سفر نامے کو ایک تاریخی
 چیز بنا دیا ہے۔ اس نے ملتان شہر اور قلعے کی تعریف کی ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج
 کے ہاتھوں نواب مظفر خاں اور اس کے بیٹوں کی شہادت اور قلعے کی تسخیر کا حال

۲۰۱ - مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے

"Narrative of various Journeys
 in Balochistan Afghanistan & the
 Punjab" Oxford Press 1974. Page
 394 to 398.

بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔"

یورپی سیاح لیفٹیننٹ ایگزینڈر برنس ۱۵ جون ۱۸۳۱ء کو ملتان میں داخل ہوا اس نے ۲۱ جون تک یہاں قیام کیا۔ اس کا سفرنامہ "Travels into Bokhara" ۱۸۳۲ء میں تین جلدوں میں لندن سے شائع ہوا۔ اس سفرنامے کی تیسری جلد میں ملتان کا حال بڑی تفصیل سے درج ہے۔ برنس کے مطابق وہ ۱۵ جون ۱۸۳۱ء کو ملتان پہنچا۔ اُسے دور سے مقبروں کے گنبد دکھائی دیئے۔ وہ شام کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ میں اترے جو شہر سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس باغ کے گرد کچی دیوار تھی راستے کشادہ تھے۔ پھل دار درخت ہر طرف سایہ کئے ہوئے تھے۔ مقامی حکام نے برنس کا شاندار طریقے سے استقبال کیا۔ پچیس سو روپے، مٹھائی سے بھرے ایک سوٹو کرے اور کافی مقدار میں پھل پیش کیا۔ برنس اہل ملتان کی جہان نوازی اور فیاضی سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ ملتان جہنم سے بہت خوشی ہوئی برنس کے بیان کے مطابق ملتان اس وقت تین میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا شہر کے گرد ایک بوسیدہ دیوار تھی اور شمال میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس شہر کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے ایک تہائی ہندو تھے اور باقی مسلمان۔ مکانات پکی اینٹوں کے تھے جن کی چھتیں چوکور تھیں۔ یعنی مکانات چھ منزلہ تھے جو تنگ گلیوں کو اور تاریک بنا رہے تھے۔ باشندے زیادہ تر کپڑا بننے اور رنگنے کا کام کرتے تھے۔ ریشمی پارچہ جات میں "کھیس" زیادہ مشہور تھے جو ہر رنگ میں دستیاب تھے اور ان کی قیمت ۲۰ سے ۱۲۰ روپے تک تھی۔ برنس کے مطابق یہ کھیس بہاولپور کی بنی ہوئی لنگیوں کی نسبت ذرا کم نفیس تھے۔ جہاں راجہ رنجیت سنگھ کے ملتان پر قبضے کے بعد اس صنعت کی اور ترقی ہوئی۔ کیونکہ جہاں راجہ نے نہ صرف اس صنعت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنے دربار میں کسی اور

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

"Travels in Kashmir & the Punjab.

مطبوعہ روسین، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۳، ۳۷۸۔

کپڑے کے استعمال کی اجازت نہ دی۔ اس طرح اس کے استعمال میں بے حد اضافہ ہوا۔ یہ کھیس خراسان اور ہندوستان میں برآمد کئے جاتے تھے۔ برنس نے ملتان کی تجارت کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے مطابق یہاں شکار پور کے ۲۰ صرف، روپے کا لین دین کرتے تھے۔ ملتان کے مزارات سبھے ہوئے تھے۔ برنس نے خالقاہ غوث بہار الحق، شاہ رکن عالم اور بھگت پرہلا د کے مندر کا ذکر کرنے کے بعد قلعے کی تفصیلات بطور خاص درج کی ہیں۔ برنس ملتان کو ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں شمار کرتا ہے۔ اس نے ملتان کی قدامت پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ملتان کی آب و ہوا کے بارے میں برنس لکھتا ہے کہ ملتان کا موسم سندھ کے علاقوں سے مختلف ہے۔ بوندا بانڈی اور بارش ہر موسم میں ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی گرد و غبار ناقابل برداشت ہے۔ طوفان باد و باران عام ہیں اور کوہ سلیمان سے آتے ہیں۔ برنس نے یہ شعر بھی درج کیا ہے

چہار چیز ہست تحفہ ملتان

گرد و گرما، گدا گورستان

برنس نے اس شعر کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ برنس نے ملتان کی زراعت، یہاں کے کھیتوں اور نہروں کی خوب تعریف کی ہے۔

۶۔ موہن لال کاشمیری کا بیان

ہری رام گپتا نے موہن لال کاشمیری کی حیات اور کارناموں پر ایک کتاب مرتب کی جو لاہور سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی (۲)۔ اس میں موہن لال کاشمیری (۱۸۱۲ء تا ۱۸۷۷ء) کے کابل

۱۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

"Travels into Bokhara" Oxford University Press Karachi 1975, Page 109 to 121

۲۔ اس کتاب کا ترجمہ محمد عبدالرشید نے کیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اصل کتاب کے ساتھ ساتھ مجھے یہ ترجمہ جناب مرزا ابن حنیف کے پاس دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

میں دو سال کے قیام اور اس سلسلے میں اس کے سفر کی داستان بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ موہن لال کاشمیری ملتان بھی آیا اور اس نے جو تفصیلات ملتان کے بارے میں درج کی ہیں وہ بڑی دلچسپ ہیں۔ موہن لال ۱۶ دسمبر ۱۸۳۵ء کو ملتان پہنچا، شہر سے دو میل باہر اسے روک دیا گیا۔ اس وقت ملتان پر دیوان ساون مل کی حکومت تھی۔ دیوان کی اجازت کے بغیر اس کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی اور دیوان ساون مل دسے پر گیا ہوا تھا۔ ۲۰ دسمبر کو اسے اجازت ملی اور اس کے قیام کا بندوبست دولت گیٹ کے باہر ایک مکان میں کیا گیا جہاں وہ ۳۱ جنوری ۱۸۳۶ء تک رہائش پذیر رہا۔ اس کے بیان کے مطابق ملتان میں نیل کی کاشت کثرت سے کی جاتی تھی۔ ہر رنگ کا ریشم تیار کیا جاتا تھا۔ ریشم کی تیاری کے لئے شہر میں ۱۵۰ کارخانے تھے جن میں ہر سال چالیس ہزار گز ریشمی کپڑا اور دو لاکھ گز ریشم اور سوت ملا کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ اپنے ملتان میں قیام کے دوران موہن لال کے شکار پوری اور لوہانی سوداگروں سے گہرے تعلقات پیدا ہو گئے۔ ان سوداگروں نے ۳۰ جنوری کو موہن لال کے اعزاز میں طعام اور رقص کی محفل ترتیب دی۔ موہن لال کے مطابق ملتان کی رقا صائیں دہلی کی رقا صائوں کے مقابلے میں زیادہ محنت کرتی ہیں جبکہ انہیں دہلی والیوں کے مقابلے میں معاوضہ صرف تیسرا حصہ ملتا، لیکن وہ مغل دار الحکومت کی بہنوں کے مقابلے میں اپنی حرکات و سکنات، لباس اور زیورات کے معاملہ میں کم درجے کی تھیں۔“

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے،

"Travels in the Punjab Afghanistan, Turkistan to Balkh Bokhara & Harat by Mohan Lal, Al-Beruni, Lahore. Printed-1979. Page 389-400.

۷۔ ملتان کی مذہبی، معاشرتی، اقتصادی،

اور تہذیبی زندگی کا مجموعی جائزہ

سیاحوں کے ان بیانات کی روشنی میں جب ہم بحیثیت مجموعی ملتان کی مذہبی معاشرتی اقتصادی، لسانی اور تہذیبی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگوں پر شروع ہی سے مذہب کی گرفت بہت مضبوط رہی۔ مذہب کا عمل دخل زندگی کے ہر شعبے میں بہت زیادہ تھا۔ لوگ مذہبی شعائر کی سخت پابندی کرتے تھے۔ مذہبی عمارتیں بنانے کا رواج شروع سے عام تھا۔ مزاروں اور عبادت گاہوں کو خوب سجا یا جاتا تھا۔ نادرجواہرات اور سونے چاندی کے استعمال سے ان کی آرائش کی جاتی تھی۔ بتوں کی پوجا، چڑھاوے نذرانے دینے کا بڑا رواج تھا۔ لوگ عقیدت کے تحت اپنا سر منڈواتے، طواف کرتے کبھی اپنی آنکھوں کا نذرانہ پیش کرتے۔ یہاں تک کہ دیوتاؤں کے سامنے اپنی جان تک کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ لوگوں میں خدا خونی عام تھی۔ غریبوں اور محتاجوں کے لئے کھانے پینے کا مفت انتظام کیا جاتا تھا۔ بیماروں کے لئے دعاؤں کے علاوہ دواؤں کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔ لوگ عام طور سے نیکی کے کام کرنے کی طرف مائل رہتے۔ پر دے کی پابندی عام تھی، عورتیں حیا والی تھیں۔ اور بناؤ سنگھار کر کے کھلے عام نہیں آتی تھیں۔ غیر عورتوں سے بات چیت کرنا بھی ممنوع تھا۔ بدکاری، شراب، زنا اور دیگر معاشرتی برائیوں کے لئے سخت تعزیرات مقرر تھیں۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اسے قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔

سیاحوں کے بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سرزمین ملتان میں دولت کی ریل پل تھی۔ سونا، چاندی منوں کے حساب سے ہوتا تھا۔ ٹکوں اور دیگوں میں بھر کر رکھا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کو ملتان کے بُت خانے سے جو دینہ ملا تھا اس میں سونے کا وزن تیرہ ہزار دو سو من تھا۔ اس کی تفصیل سابقہ صفحات میں درج کی جا چکی ہے۔ غالباً اسی لئے ملتان کو فرج

بیت الذہب (سہری سرحد) بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں سونے کے بُت بنائے جاتے تھے اور ان کے جسم میں یا قوت، ہیرے جو اہرات اور قیمتی نگینے جڑے جاتے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ جہاں دولت کی ریل پیل ہو وہاں عیش و عشرت کے سامان بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور لوگ تعیش کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (چنانچہ کبھی کبھی امراء کے یہاں ناچ، گانے ہوتے تھے۔ ایک آدھ ستیاج نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔) لیکن ملتان کی عمومی معاشرتی زندگی ان تعیشتوں سے عاری تھی۔ غالباً اس کا سب سے بڑا سبب ملتان میں مذہب و اخلاق کا عمل دخل تھا۔ یہ سرزمین قبل از اسلام بھی اور اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد بھی ہمیشہ نیک لوگوں کے اثر میں رہی۔ اسلام سے پہلے بھی یہاں مذہب کی گرفت مضبوط رہی اور یہ عقائد کے علاوہ ہندو تصوف اور ہندو صوفیاء کی بدولت بھی تھا۔ اسلام کی اشاعت کے بعد مسلمان صوفیائے کرام نے اس سرزمین کے لوگوں کو رشد و ہدایت کے ذریعہ ہمیشہ نیکی پر مائل رکھا۔ اسی لئے یہاں کے لوگ ایماندار، سادہ اور علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ فنون لطیفہ ہوں یا فنون مفیدہ زمانہ قدیم ہی سے ملتان اس سلسلے میں اہم شہر رہا۔ اس کے مندر، مقبرے اور عمارات فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ امراء کے مکانات عام طور پر ساگوان کی لکڑی کے بنائے جاتے تھے جو کئی کئی منزلیں ہوتے تھے۔ صنعت و حرفت اور گھریلو نوعیت کی انڈسٹری کے اعتبار سے بھی ملتان بے حد معروف رہا ہے۔ ہاتھی دانت کا کام، کھلونے بنانے کا ہنر اور تانبے کے برتن بنانے کا بڑا رواج تھا۔ بہت سے سیاحوں نے ان کی تعریف کی ہے۔ ہاتھی دانت سے تیار کردہ چیزوں میں چڑیاں اور ڈبیاں زیادہ اہم تھیں۔ کھلونے، تانبے کے برتن، چھری چاقو، صندوقے اور ہتھیاروں کے دستے بھی تیار کئے جاتے تھے اور غیر ملکوں کو برآمد کئے جاتے تھے۔ کپڑے کی صنعت کے لئے ملتان شروع ہی سے ایک اہم مرکز رہا ہے۔ ریشم کی مصنوعات کے لحاظ سے بھی ملتان کی مرکزی حیثیت تھی۔ سوتی کپڑا بھی بنتا تھا۔ کڑھائی کا کام بہت معیاری ہوتا تھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قالین، کھیس، شالیں، لنگیاں اور کرتے بنانے کا عام رواج تھا اور یہ سب اشیاء غیر ملکی منڈیوں میں بڑی مقبول تھیں۔ سیاحوں کے بیانات کے مطابق ملتان تجارت کے لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں سے قندھار، غزنی، ایران

اور عرب کو ایشیا برآمد کی جاتی تھیں۔ لاہور کے راستے ہندوستان کے دیگر مقامات کو بھی یہ چیزیں مہیا کی جاتی تھیں۔

سیاحوں کے بیانات کے مطابق ملتان کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ یہاں کی فصلوں میں گندم، گنا، جو، کپاس، سبز یوں میں شلجم، گاجر، درختوں میں نیم، کھجور اور پیل اور پھلوں میں آم، مانا، سنترہ، لیموں اور کھجوریں بکثرت پائی جاتی تھیں۔ پھل عام تھے اور بہت سے تھے۔ پانی میٹھا اور عمدہ تھا۔ یہاں کا زرعی نظام نہایت اعلیٰ تھا اور آبپاشی کا کام زیادہ تر کنوؤں سے لیا جاتا تھا۔ شہر والے آسودہ حال تھے، نعمتوں کی فراوانی تھی، زندگی راحت سے بڑھتی، لوگ بامروت، عالی طرف، عالی دماغ، تندرست اور توانا تھے۔ مہمان نوازی کے لحاظ سے اہل ملتان مشہور تھے۔ ابن بطوطہ نے یہاں کے لوگوں کے آدابِ طعام، دسترخوان کی وسعت اور رنگارنگ کھانوں کی دلچسپ تفصیل درج کی ہے جو سابقہ صفحات میں آچکی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کھانا جدید دور کے "کورس" کے انداز پر کھایا جاتا تھا۔ وقفے وقفے سے مختلف چیزیں لائی جاتی تھیں اور مہانوں کی خوب تواضع کی جاتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ملتان کے لوگ کتنے فیاض، مہمان نواز اور شہ دل تھے۔ اسلام کی اشاعت کے بعد یہاں کے لوگوں میں حکومتی سطح پر بھی اور عوامی سطح پر بھی مذہبی رواداری عام تھی۔ یہاں تک کہ جب ایک سیاح تھامس کوریات نے مسلمانوں کے مذہب، قرآن اور حضور کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کئے تو تب بھی اس سے کچھ تعرض نہ کیا گیا۔ کیونکہ خود اس کے بیان کے مطابق مغل سلطنت میں عیسائیوں کو آزادی سے بولنے کی اجازت تھی"۔

بہت سے سیاحوں نے اہل ملتان کی بہادری اور شہ سواروں کی بہت تعریف کی ہے۔

ان کے بیان کے مطابق اہل ملتان کوشہ سواروں اور بہادری کے جوہر دکھانے کا بہت شوق تھا۔ حربی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ نہایت اعلیٰ درجے کے فوجی تھے۔ سکندر اعظم کو یہاں بے حد زک اٹھانی پڑی۔ یہاں تک کہ ملتان کے نواحی علاقے میں اسے جو ہلک زخم لگا۔ وہی اس کی موت کا باعث بنا۔ گھوڑ سواروں اور فن تیراندازی میں اہل ملتان کا جواب نہیں

تھا۔ شہ سواری کے مقابلے منعقد کرائے جاتے تھے۔ آج بھی عرس اور میلوں میں شہ سواری کے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔

۱۸۳۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملتان کی آبادی ۶۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جس میں سے ایک تہائی ہندو تھے اور باقی مسلمان^۱۔ کچھ سیاحوں نے اہل ملتان کی زبان کو سندھی قرار دیا۔ کچھ نے عربی اور کچھ نے فارسی۔ بہر حال یہ تینوں زبانیں سیاحوں کی آمد کے زمانے میں یہاں سمجھی اور بولی جاتی تھیں۔

1 - Travels into Bokhara Page 109.

۱۸۷۵ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کا تناسب یہ تھا، مرد ۱۵۶۱۳ + عورتیں

۱۳۷۰۸ = کل ۲۹۳۲۲۔ (بجوالہ تاریخ ضلع ملتان، لالہ حکم چند، ص ۴۱۰)

ج۔ سرزمینِ ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل

1۔ لسانی تشکیلات کا عمل | جہاں تک ملتان کی زبان کا تعلق ہے کچھ سیاحوں نے اہل ملتان کی زبان کو، جیسا کہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے، سندھی قرار دیا، کچھ نے عربی اور کچھ نے فارسی۔ بہر حال یہ تینوں زبانیں سیاحوں کی آمد کے زمانے میں یہاں سمجھی اور بولی جاتی تھیں۔ لیکن ہمیں بات کچھ اس سے پہلے زمانے سے شروع کرنی ہوگی کیونکہ جن سیاحوں نے ملتان کی زبان کے بارے میں ذکر کیا ہے وہ سب کے سب مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے بعد کے سیاح ہیں۔ یعنی ان کا زیادہ تر تعلق چوتھی اور پانچویں صدی ہجری سے ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ ما قبل اسلام ملتان کی زبان کیا تھی؟۔ اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ زمانہ قدیم کا ادب و شعر دستاویز نہیں ہوتا جس سے اس دور کی زبان کا پتہ لگایا جاسکے۔ سندھ ہو یا ملتان شروع ہی سے مسلسل شورشوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کی زد میں رہا۔ اس لئے اس دور کے ادب و شعر کے سرمائے کا ضائع ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ قدیم ترین نمونہ سندھی زبان میں لکھی جانے والی وہ قرآنی تفسیر ہے جو ایک عراقی نے ۲۷۰ھ میں لکھی۔ یہی ہندوستان میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ ہے (۲)۔ ایرانی سیاح بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق ۲۷۰ھ میں منصورہ کے رہنے والے ایک شخص نے جو عراق کا باشندہ تھا۔ لیکن اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی، راجہ ارور (الور) کی فرمائش پر اسلامی احکام و قوانین کی تشریح

۱۔ ان سیاحوں میں اصطخری، ابن حوقل، بشاری مقدس وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے حوالے سابقہ صفحات میں آچکے ہیں۔

۲۔ حوالے کے لئے دیکھئے (۱) تاریخ سندھ از ابوظفر ندوی، ص ۳۵۷-۳۵۸، ملتان کی زبان اور اس کا تعلق اردو کے ساتھ از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۳۲۱-۳۲۲، تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۲۸۶، ۳۱۴۔

اور قرآن مجید کی تفسیر ہندی زبان میں لکھی ہے۔ اسی طرح ابو ظفر ندوی نے ابن مہلب کی کتاب سیر البلاد اقلیم کے قلمی نسخے کے حوالے سے ملتان کے ایک شاعر مارون بن عبداللہ ملتانی کا ذکر کیا جو اپنی شجاعت اور بہادری کے کارناموں کو نظم کیا کرتا تھا۔ (۱۳)

جس زبان میں یہ تفسیر لکھی گئی یا شاعری کی گئی اسے سندھی زبان کہا جائے یا ہندی

۱۔ ابو ظفر ندوی (تاریخ سندھ، ص ۳۵۷) ڈاکٹر مہر عبدالحق (ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق، ص ۳۲۱) اور اعجاز الحق ندوی (تاریخ سندھ، ص ۳۱۴) نے بزرگ بن شہریار کی کتاب عجائب الہند، مطبوعہ لیدن کے حوالے سے اسے "سندھی" زبان کا نمونہ قرار دیا ہے۔ لیکن مولانا مسعود علی ندوی نے (ہندوستان عربوں کی نظریں، ص ۱۹۵) اس کتاب سے ہند کے بارے میں اقتباسات ترجمہ کرتے وقت اسے "ہندی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر فیہ سلطانہ نے بھی (اردو نثر کا آغاز و ارتقار، ص ۲) عجائب الہند ہی کے حوالے سے اس زبان کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یوں اصل عبارت یہ ہے

"وكان فيما مكاه عذانه ساله..... ان تفسير له القرآن بالهنديہ"

اس لئے ہندی ہونا چاہیے۔ لیکن دراصل اس زمانے میں سندھی اور ہندی میں کوئی فرق نہ تھا۔ ڈاکٹر اشفاق حسین قریشی کے مطابق "قدیم ایرانیوں کے یہاں ہند کا لفظ دراصل سندھ ہے اور اس سے قدیم تاریخ میں وہ علاقہ مراد ہے جسے آج پاکستان کہتے ہیں۔" (برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،

بزرگ بن شہریار چونکہ ایرانی تھا اس لئے یہ بات قرین قیاس لگتی ہے۔ اسی طرح شریف الدین پیرزادہ نے ڈاکٹر اشفاق حسین قریشی کے حوالے سے لکھا ہے کہ "لفظ سندھ کا صوتی تغیر، لفظ ہند کے استعمال کا باعث بنا۔ سندھ سنسکرت کے لفظ "سیاند" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں اور "سندھو" دریائے سندھ کا نام ہے۔ سیاند سے سندھ اور ہند کے نام نکالے گئے ہیں۔ علم اللسان کی رو سے ہندوستان دراصل دریائے سندھ کی سرزمین ہے۔" بحوالہ "پاکستان منزل بہ منزل" از شریف الدین پیرزادہ، ص ۶، مطبوعہ گلڈ اشاعت گھر، کراچی، طبع اول، اگست ۱۹۶۵ء)

۲۔ بحوالہ ہندوستان عربوں کی نظریں، ص ۶۹۳ تا ۱۹۵۔ (اس کی تفصیل آگے درج ہے)

۳۔ تاریخ سندھ، ص ۳۵۷۔

بہر حال وہی زبان تھی جو سندھ، منصورہ اور ملتان میں بولی، سمجھی اور لکھی پڑھی جاتی تھی۔ اور اس پر مسلمانوں کی زبان کے اثرات یقیناً پڑ چکے تھے۔ کیونکہ ہندوستان میں ان کی آمد کا باقاعدہ سلسلہ پہلی صدی ہجری سے شروع ہو چکا تھا۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق ”مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتان ہی ہے“ (۱)

اسی طرح ڈاکٹر مہر عبدالحق کی لسانی تحقیقات ہمیں اس ناقابل تردید حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ

”جو نہی عرب مسلمانوں نے اور ان کے عربی، فارسی، ترکی اور بوجھی زبانیں بولنے والے عساکر نے وادی سندھ میں قدم رکھا۔ ایک نئی زبان کی بنیاد پڑنا شروع ہو گئی“ (۲)

۲۔ زبان کی تشکیل کا عمل ما قبل از اسلام،

در اصل زبان و ادب کی ساخت و تعمیر اور تخلیقی عمل کے پیچھے صدیوں کے تہذیبی تجربے، مختلف قوموں کے ادغام و ارتباط، معاشرتی اور تمدنی عوامل و محرکات اور کئی ایک قدرتی عناصر و اثرات کار فرما ہوتے ہیں۔ ملتان میں اردو زبان و ادب کو وجود میں لانے کا عمل بھی صدیوں پر محیط ہے۔ ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے آریاؤں کی زبان نے مقامی طور پر بولی جانے والی دیسی زبانوں کو لپسا کر کے اپنے اثرات سے ایک نئی زبان کی تشکیل کی۔ پھر سہرات اور قندھار کے درمیانی خطوں میں آباد قوم ”ابھیر“ اس سرزمین پر حملہ آور ہوئی اور اس نے اپنی زبان ”اپ بھرنش“ کو چھٹی صدی عیسوی تک پراکرت اور سنسکرت کے معیار تک پہنچا دیا جو یہاں کی قدیم زبانیں تھیں۔ اس زبان نے پراکرت، سنسکرت اور دیگر دیسی زبانوں کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمولیا اور نتیجتاً زیادہ

۱۔ بحوالہ ”نقوش سلیمانی“ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص ۳۴۔

۲۔ بحوالہ ”ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق“ ص ۴۹۹۔

وسیع اور مقبول ہوتی چلی گئی۔ مختلف علاقوں میں اس کے مختلف نام پڑتے گئے۔ مثلاً پشاپچی
 ابھرنش شورسینی، ابھرنش ماگدھی ابھرنش، ہہاراشٹری ابھرنش، واراچڈا ابھرنش وغیرہ۔
 مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آمد میں آمد سے پہلے اسی ابھرنش کے اثرات جگہ جگہ پھیلے ہوئے
 تھے۔ پنجاب اور سندھ کا علاقہ بھی اس کے اثرات سے خالی نہ تھا۔ ویسی اور مقامی بولیوں
 کے ساتھ مل کر اس نے ہر علاقے میں جدید آریائی زبانوں کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔ شورسینی
 ابھرنش کا اثر سندھ اور ملتان کے علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بیان کے مطابق
 ”جب محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ و ملتان فتح کیا تو یہاں ایک
 ایسی کچھڑی زبان بولی جاتی تھی جو پشاپچی اثرات بھی رکھتی تھی اور شورسینی
 اثرات بھی۔“ (۱)

ڈاکٹر شاہدہ بیگم بھی جمیل جالبی کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ
 ”شمالی اور مغربی ہندوستان میں جو زبانیں مروج تھیں وہ لگ بھگ
 سب کی سب شورسینی ابھرنش سے ماخوذ تھیں۔ پنجاب راجپوتانہ اور گجرات
 میں تو ایک حد تک لسانی آہنگ پایا جاتا تھا۔ سندھ کچھ الگ تھلگ ضرور تھا
 لیکن اس پر بھی ابھرنش کی شاخ پشاپچی کے ساتھ ساتھ شورسینی کا اثر
 غالب تھا اور وہاں کی زبان پنجاب کی زبان سے زیادہ دور نہ تھی۔“ (۲)
 ڈاکٹر مہر عبدالحق نے مسلمانوں کی آمد سے پہلے ملتان کی زبان کے بارے میں اس
 خیال کا اظہار کیا ہے کہ

”جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ صرف اتنا بتاتی ہے کہ وادی سندھ (۳)
 کی زبان ایسی ابھرنش ہے جو پشاپچی کی یا تو شاخ ہے یا اس سے متاثر

۱۔ بحوالہ ”تاریخ ادب اردو“ جلد اول، ص ۸۰۷۔

۲۔ بحوالہ ”سندھ میں اردو“ ص ۲۱۔

۳۔ ۱۱۱۱ھ سے پہلے تک ملتان وادی سندھ کا حصہ رہا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق لکھتے ہیں،

”لسانی تاریخ میں ۱۱۱۱ھ کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس وقت نہ صرف ملتان (باقی برصغیر ثانی)

کی آمد کا سلسلہ ابن قاسم کے حملے سے پہلے بھی جاری رہا۔ چنانچہ سندھ میں سب سے پہلے مغیرہ بن عاص ۱۵ھ میں بحری راستے سے داخل ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ بن عامر بن کرینہ نخلی کے راستے ۲۲ھ میں مکران تک پہنچا۔ درہ خیبر کے راستے پہلا حملہ ۴۴ھ میں ہوا۔ ابن سمرہ کی فوج کے سردار ہلب بن ابی صفرہ نے ملتان اور پشاور کے درمیانی علاقے کو اس حملے کا نشانہ بنایا اور ہوادہی سندھ کے بالائی حصے کو پامال کیا^(۱)۔ ان حملوں سے تہذیب و زبان کے ہمہ گیر یادیر پا اثرات مرتب نہ ہوئے۔ کیونکہ مسلمان یہاں مختلف مقاصد کے تحت آئے اور عارضی قیام کے بعد واپس چلے گئے۔ البتہ ۹۳ھ میں جب محمد بن قاسم کا حملہ ہوا اور سندھ اور ملتان کے علاقے مستقل طور پر مسلمانوں کے زیر نگیں آگئے تو تہذیب و زبان کے اثرات وسیع پیمانے پر مرتب ہونا شروع ہوئے۔

غالب قومیں ہمیشہ اپنے کچھ اور تہذیبی اثرات کے ساتھ ساتھ زبان کے اثرات بھی ساتھ لاتی ہیں اور مغلوب قوموں کو بہت جلد متاثر کر لیتی ہیں۔ یہی کچھ برصغیر پاک و ہند میں ہوا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

”مسلمانوں کے آنے کے ساتھ مفتوح علاقے کی تہذیب، معاشرت اور زبان پر وہی اثر ہوا جو آریاؤں، پشچیوں اور ابھیروں کی فتوحات سے یہاں کی تہذیب اور زبانوں پر ہوا تھا۔ فاتح و مفتوح جب تہذیبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور لسانی سطح پر ایک دوسرے سے ملے تو ایک پیچ میل قسم کی زبان اپنے خدوخال اجاگر کرنے لگی تھی۔ جس میں سامی، ایرانی، تورانی اور دوسری بولیوں نے مل جل کر لسانی کچھڑی پکانے کا عمل کیا تھا۔“^(۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مسلمانوں کے اثرات کو آریاؤں اور دیگر قوموں کے اثرات سے مشابہ قرار دیا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ اثرات ان اثرات سے کہیں زیادہ انقلابی، گہرے اور دیر پا تھے۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے تو یہاں کی زندگی کا ڈھانچہ (Pattern of life) بدل کر رکھ دیا۔ اس کے باوجود کہ محمد بن قاسم نے حتی الوسع پرانے نظام کو تبدیل نہ کیا اور بقول

۱۔ بحوالہ ”ملتان کی زبان اور اس کا اردو سے تعلق“ ص ۹۵

۲۔ بحوالہ ”تاریخ ادب اردو“ جلد اول، ص ۶۷۲

ڈاکٹر تارا چند،

”مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ عقل مندی اور فیاضی کا ثبوت دیا۔ مال گزاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا اور قدیمی ملازموں کو برقرار رکھا۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی اور ان پر فقط ایک خفیف محصول عائد کیا۔ جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمین داروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں۔“

لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سندھیوں نے اپنے نام تک بدل ڈالے اور اپنے سندھی ناموں کے ساتھ ساتھ دوسرا عربی نام رکھنے لگے۔ اس قسم کی مثال دنیا کی تاریخ میں اور کسی قوم کے ذیل میں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ محمود غزنوی کے حلوں سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں اور خصوصاً سندھ اور ملتان میں اسلامی اقدار اور اسلامی کلچر نے اپنے قدم جمائے تھے اور زمین سہوار ہو چکی تھی۔ محمود غزنوی کی بُت شکنی نے تو زندگی کے تصورات ہی بدل ڈالے۔ بت شکنی کے ذریعے محمود غزنوی نے محض کوئی مذہبی فریضہ انجام نہیں دیا تھا بلکہ دولت کے ارتکاز کو بھی ختم

کیا تھا۔ ہندوستان کے بت دولت کے عظیم مرکز بن چکے تھے۔ وہ Hoarding کا ذریعہ تھے۔ لوگ بتوں کی آڑ میں دولت کے پجاری بن چکے تھے۔ یہ بت ایک ادارہ تھے، ایک نظریہ تھے۔ محمود غزنوی نے دولت کے بت پاش پاش کر دیئے (۲)۔ ان استحصالی اداروں پر کاری ضرب لگائی۔ چنانچہ مسلمانوں کے اثرات محض دوسری قوموں جیسے نہ تھے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی عظیم الشان تہذیبی روایات، رواداری، اصول پرستی کی صحت منداقدار، ارتکاز دولت کے منافی انقلابی اقتصادی فلسفے اور نہایت وسیع اور ترقی یافتہ زبان نے مقامی باشندوں کو تہذیبی، اقتصادی اور لسانی سطح پر انقلابی انداز

۱۔ بحوالہ ”آب کوثر“ ، ص ۲۵-۲۶

۲۔ سامری نے بھی یہی کیا تھا کہ لوگوں سے سونا چاندی لے کر انہیں پگھلایا اور بچھڑا بنا دیا۔

لوگ اس کی پوجا کرنے لگے۔ حضرت موسیٰ نے بچھڑا توڑ کر نہ صرف اس بدعت کا بلکہ دولت کے ارتکاز کا بھی خاتمہ کیا تھا۔

میں مرعوب و متاثر کیا۔ چونکہ حملہ آور مسلمانوں کی اکثریت اسی سرزمین میں آکر بس گئی۔ اس لیے یہاں کی تہذیبی اقدار اور زبان سے خود انہوں نے بھی اثر قبول کیا۔

۲۔ زبان اردو کی تشکیل کا عمل | چنانچہ مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے

درمیان اظہار و ابلاغ کے لیے مشترک زبان کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی اور اسی ضرورت نے ایک نئی زبان کی تشکیل کی چونکہ مسلمانوں کی پہلی آمد سندھ اور ملتان کے علاقوں میں ہوئی۔ اس لیے نئی مشترک زبان (اردو) کا ہیولی اسی علاقے میں تیار ہوا۔ حسام الدین راشدی کے مطابق

”یاد رہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندستان

میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی

زبانوں کے ہزار ہا الفاظ ہندی زبانوں میں شامل ہو گئے۔ اور اہل ہند، ہندوہوں

یا مسلمان انہیں سمجھنے اور بولنے لگے۔“ (۱)

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں،

”..... جو حضرات سندھ کی اسلامی فتح اور بعد کی تاریخ سے واقف ہیں وہ

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے اس قول کو ماننے میں ذرا بھی تاثر نہ کریں

گے کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ سندھ ہے۔“ (۲)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق فرماتے ہیں

”ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین پر

اسلام کی روشنی پہنچی۔ ہمیں سندھ اس لئے بھی عزیز ہے کہ یہیں حجازی

تہذیب اور عربی ثقافت ہندو قدیم کی تعلیم و روحانیت سے ہم کنار ہوئی اور پھر

اس اتحاد و اشتراک سے ایک نئی تہذیب و ثقافت وجود میں آئی اور ہماری یہ

۲۰۱۔ بحوالہ ”اردو زبان کا اصلی مولد سندھ“ رسالہ ”اردو“ انجمن ترقی اردو، کراچی، اپریل ۵۱،

ص ۹۔ ۱۰ (یہی مضمون اظہار کراچی، مارچ، اپریل ۱۹۸۳ء کے شمارے میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔)

قومی زبان اُردو اسی تہذیب و ثقافت کا شاہکار ہے اور اس کی زندہ جاوید

یادگار ہے؟ (۱)

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

”— اتنی بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن عوامل نے ہندوستان کی

ایک آریائی زبان کو ہماری اُردو کا قالب عطا کیا۔ وہ سب سے پہلے سندھ میں

کار فرما ہوئے؟ (۲)

گویا سید سلیمان ندوی، حافظ محمود خاں شیرانی، حبیب الرحمن، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر مہر عبدالحق، پیر حسام الدین راشدی، ابو ظفر ندوی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور دیگر

محققین اور ماہرین لسانیات کا یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو کا پہلا گہوارہ وادی سندھ اور ملتان

کی سرزمین ہے۔ اس کے بعد لسانی تشکیلات کا یہ عمل دوسرے علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔ ابن

قاسم کے چلے جانے کے بعد بھی دین اسلام کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا تسلط سندھ اور

ملتان پر کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا، شمس اللہ قادری کے بقول

”فارسی اور انگریزی مؤرخین کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد

سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہو گئی اور ملک پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا بلکہ

عربی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ الواصل باللہ (۲۴۷ھ) کے زمانہ تک

دربار خلافت سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور منصورہ ان کا مستقر

حکومت تھا؟ (۳)

یہاں تک کہ محمود غزنوی اور غوریوں کے حملوں کے بعد مسلمانوں کے اقتدار میں ایک ہمہ گیر اور

مستقل تسلسل کی صورت پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کی زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی ذخیرہ الفاظ

کی آمیزش تھی۔ بقول ڈاکٹر شاہدہ بیگم،

۱۔ بحوالہ ”خطبات عبدالحق“ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۱۰۶

۲۔ بحوالہ ”سندھی اُردو کے لسانی روابط“ ص ۴۰

۳۔ بحوالہ ”تاریخ زبان اُردو۔ اردو سے قدیم“ ص ۷

” بلاشبہ جواں سال محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے مجاہدوں میں اکثریت عربوں کی تھی لیکن ایک تعداد وہ بھی تھی جو فارسی نژاد تھے۔ یہ نووارد اپنے جلو میں عرب کی تمدنی روایات اور ثقافتی نوادرات لے کر آئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض تحائف ایسے بھی تھے جن کے ایرانی الاصل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ بعینہ یہی صورت زبان کی بھی تھی۔ اس میں بھی جا بجا کسرائیت کی جھلک پائی جاتی تھی۔“ (۱)

چنانچہ مسلمانوں کی زبان کے بے شمار الفاظ دیسی زبان میں شامل ہوتے چلے گئے اور اس طرح جو مشترک زبان وجود میں آئی اس کو مختلف علاقوں میں مختلف نام دیئے گئے یعنی گجری، ملتانی، سندھی، دکھنی، ہندوستانی، ہندسی، ہندوسی، ریختہ، اُردوئے معلیٰ وغیرہ۔ لیکن آخر کار یہ اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔

پروفیسر علی حیدر کے الفاظ میں

” اُردو زبان کا مخزج ہندوستان کی مختلف پراکرتیں ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی نے رنگ و روغن کا کام کیا اور ایک زبان پیدا ہوئی جس نے اپنی ترقی کے مختلف ادوار میں مختلف نام پائے۔ اور بالآخر اُردو زبان کے نام سے موسوم ہوئی۔“ (۲)

اور یہی زبان برصغیر پاک و ہند کے تمام علاقوں کے لئے رابطے کی زبان (لنگو فرانیکا) ٹھہری۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اُردو زبان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

” یہ سب کی منہ چڑھی زبان، جسے آج ہم اُردو کے نام سے پکارنے ہیں، جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عربی، ایرانی، ہندسی، تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے۔ اس زبان میں ان تہذیبوں کی ہمہ گیر صفات یکجا ہو کر ایک جان ہو گئی ہیں۔ یہ زبان برعظیم کی معاشرتی، تہذیبی و سیاسی ضروریات کے تحت پروان چڑھی۔ مسلمانوں نے ضرورت کے

۱۔ بحوالہ ”سندھ میں اُردو“ ص ۳۶

۲۔ بحوالہ ”نقد ادب“ ص ۵

تحت اپنایا اور انہی کے ساتھ بر عظیم کے گوشے گوشے میں اس طرح پھیل سی
 کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر اس کمار سی تک سمجھی اور بولی جانے لگی ۱۱
 دراصل عرب و عجم سے مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی زبانوں کے اختلاط اور باہمی روابط نے
 زبان سازی کا ایک نیا عمل شروع کر دیا تھا۔ باہر سے آنے والوں نے یہاں کی زبانوں سے
 اور یہاں کے رہنے والوں نے باہر کی زبانوں سے اثرات قبول کیے۔ جو لوگ یہاں مستقل
 طور پر آباد ہوئے۔ انہوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ اس قسم کی مثالیں زمانہ قدیم میں مل جاتی
 ہیں کہ باہر سے آنے والوں نے یہاں کی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ چنانچہ ایرانی سیاح
 بزرگ بن شہریار نے اپنی کتاب عجائب الہند میں لکھا ہے کہ

• ایک بڑے ہندوستانی راجہ نے جو الور (ارور) کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے
 علاقوں پر قابض اور اس کا نام مہرودک بن رائق تھا، ۲۷۰ھ میں امیر منصورہ
 عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھ کر فرمائش کی کہ ہندی زبان میں اس کیلئے
 اسلامی احکام و قوانین کی تفسیر و تشریح کی جائے۔ عبداللہ نے منصورہ کے
 ایک آدمی کو جو عراق کا رہنے والا نہایت ذہین، ہوشیار اور شاعر بھی تھا،
 اپنے یہاں بلایا اس شخص کی پرورش و پرداخت ہندوستان میں ہوئی تھی
 اس لئے وہ یہاں کی مختلف زبانیں اچھی طرح جانتا تھا۔ امیر نے اس سے راجہ
 الور کی فرمائش بتائی تو اس نے ایک قصیدہ تیار کیا اور اس میں وہ تمام
 باتیں جو راجہ چاہتا تھا بیان کر دیں اور اس کو راجہ کے پاس بھیج دیا۔ جب
 وہ قصیدہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے اسے بہت پسند کیا اور عبداللہ
 کو خط لکھا کہ قصیدہ نگار کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ عبداللہ نے اس کے
 پاس بھیج دیا۔ وہ راجہ کے پاس تین سال رہا، جب وہاں سے واپس آیا
 تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا۔ اس نے پورا حال تفصیل سے بیان کر دیا کہ جب
 وہ راجہ سے رخصت ہوا تو وہ دل و زبان دونوں سے اسلام قبول کر چکا تھا،

لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے اس کا اعلان نہیں کر سکتا تھا۔ (۱۱)
 آگے چل کر یہی سیاح ابو محمد حسن بن عمرو نجیری کے حوالے سے جو خود ۲۸۸ھ میں منصورہ میں
 مقیم رہ چکا تھا، لکھتا ہے کہ

” منجملہ اور واقعات کے اس نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے ہندی
 زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ چنانچہ میں نے تفسیر لکھی،
 اور جب سورہ یسین کی تفسیر تک پہنچا، اور اس کے سامنے ارشاد الہی،
 ” قال من يحي العظام وهي رميم، قل يحييها الذي انشاها اول مرة

و هو بكل خلق عليم“ کی تفسیر بیان کر رہا تھا، اس وقت وہ موتیوں اور
 جواہرات سے مرصع سونے کے ایک ایسے بیش قیمت تخت پر بیٹھا ہوا تھا جس
 کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس نے کہا اس کی تفسیر پھر سے بیان کرو
 جب میں نے دوبارہ بیان کی تو وہ تخت سے اتر پڑا اور زمین پر چلنے لگا۔ حالانکہ
 زمین چھڑکاؤ کی وجہ سے تر تھی، مگر وہ اپنا رخسار زمین پر رکھ کر رونے لگا۔
 یہاں تک کہ اس کا چہرہ گرد آلود ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یہی اصلی
 پروردگار، معبود اور ازلی وابدی ہے، اس کا کوئی ہمسر اور مشابہ نہیں۔ اس کے
 بعد اس نے ایک گھر تعمیر کرایا اور ظاہر یہ کیا کہ امور سلطنت پر غور کرنے کے لئے
 تنہائی اختیار کی ہے۔ مگر دراصل وہ اس میں پوشیدہ طریقہ سے نماز پڑھتا تھا
 جس کی کسی کو خبر نہ ہوتی تھی؟ (۱۲)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۷۰ھ (یعنی ۸۸۳ء) میں نہ صرف اسلام کی اشاعت
 کشمیر اور پنجاب میں ہونے لگی تھی بلکہ باہر سے آنے والے یہ مسلمان یہاں کی زبان بھی سیکھ
 چکے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی ہندی میں تفسیر بھی لکھی جانے لگی تھی اور شعر و شاعری بھی کی
 جانے لگی تھی۔ گویا مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے درمیان رلبط و ادغام سے تہذیب و معاشرت

۱۔ بحوالہ ” ہندوستان عربوں کی نظر میں “ ص ۱۹۳ تا ۱۹۵

۲۔ بحوالہ ” عرب و ہند کے تعلقات “ ص ۳۳۰ ، ۳۳۱

کی یکسانیت کے ساتھ ساتھ زبان کی یکسانی بھی پیدا ہو چلی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی،
اصطخری کے حوالے سے لکھتے ہیں

” ملتان کا امیر ہاتھی پر سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد جاتا ہے۔ یہ
خالص ہندو راجاؤں کی پریشان و شکوہ سواری گویا عرب امیروں کو پسند آچکی تھی
پھر کہتا ہے کہ ملتان کے لوگ پاجامہ پہنتے ہیں۔ اکثر لوگ فارسی اور سندھی بولتے
ہیں۔ غرض ہندوؤں اور مسلمانوں میں لباس اور زبان کی یکسانی پیدا ہو چکی تھی۔“
ابن حوقل کا بیان بھی طرز لباس اور زبان کی یکسانی کی تصدیق کرتا ہے۔

” یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس ایک ہی طرح کا ہے اور بالوں کے
چھوڑنے کا بھی وہی ایک طریقہ ہے اور اسی طرح ملتان والوں کی وضع ہے اور
منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے اور
مکران والوں کی بولی فارسی اور مکرانی ہے اور کرتوں کا لباس نمایاں ہے۔ مگر تاجور
لوگ قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں، جس طرح عراق اور فارس کے لوگ۔“ (۲)

الغرض صوفیاء کرام کی ہندوستان میں آمد سے پہلے مسلمان نہ صرف اپنی تہذیب و معاشرت اور
زبان و ادب کے اثرات مقامی باشندوں پر مرتب کر رہے تھے بلکہ سیاحوں، مؤرخین کے
بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی ہندوستانی رسم و رواج اور زبان سے متاثر
ہو رہے تھے۔ اس طرح گویا نہ صرف ایک مخلوط زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی بلکہ ایک مشترکہ تہذیب
بھی وجود میں آرہی تھی۔ محمود غزنوی کے حملے کے بعد صوفیائے کرام کا درویشی و مسعود سرزمین پاک و ہند
میں ہوا تو انہوں نے نہ صرف لاکھوں افراد کو مسلمان بنایا بلکہ مسلمانوں کے تشخص کو قائم رکھنے کی
سعی بھی کی۔ اردو زبان کو ترویج دینے میں ان کا جتنا حصہ ہے اور کسی کا نہیں، بقول ابواللیث صدیقی

” اردو کو جوان ہونے اور پروان چڑھنے کے لئے صوفیوں کی خانقاہیں مبلغین کی
جلسیں اور اللہ والوں کی غفلیں تلاش کرنا پڑیں۔ ان کے بھی دربار تھے۔ مگر شاہی وہاں

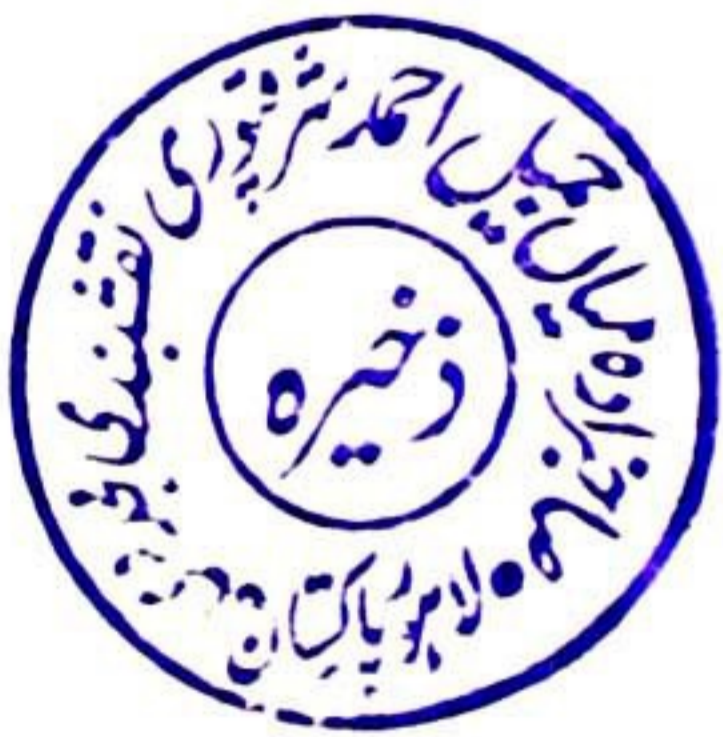
۱۔ بحوالہ ”عرب و ہند کے تعلقات“ ص ۳۳۰، ۳۳۱

۲۔ بحوالہ ”سفر نامہ ابن حوقل“ ص ۲۳۲، لیڈن پریس۔

نہ تھے۔ یہ عوام کے لئے کھلتے تھے۔ یہاں شرافت کی زبان، ثقافت کی زبان اور
تہذیب کی زبان کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ یہاں عوام کے دلوں میں اترنے کے لئے عوام
کی بولی کا رواج تھا۔ چنانچہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں سب سے زیادہ صوفیائے
کرام ہی نے کام کیا! (۱)

چنانچہ اب ہم نئے باب میں ان صوفیائے کرام کا ذکر کریں گے جنہوں نے ملتان کی سرزمین میں
تہذیب و زبان کے ایسے بیج بوئے جو بعد میں نخل طور بنے۔ ان صوفیوں میں بعض تو وہ ہیں جو ملتان
میں عارضی طور پر قیام پذیر رہے اور اپنا مشن مکمل کر کے دوسرے شہروں کو چلے گئے اور کچھ وہ
صوفیاء ہیں جو مستقل طور پر ملتان کی سرزمین میں قیام پذیر ہوئے اور آج بھی ان کے مزارات بزرگ
خاص و عام بنے ہوئے ہیں۔

۱۔ بحوالہ "ادب و لسانیات" ص ۲۰۷، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۰ء



کتابیات

نمبر شمار — مصنف — کتابیات — ناشر / ایڈیشن و نمبر

- ۱- ابن بطوطہ سفرنامہ ابن بطوطہ (حصہ دوم) نقیس اکیڈمی کراچی، طبع چہارم
رئیس احمد جعفری ۱۹۶۸ء
- ۲- ابن خلیفہ، مرزا سات دریاؤں کی سرزمین کاروان ادب، ملتان، بار اول ۱۹۸۰ء
- ۳- ابن حوقل سفرنامہ ابن حوقل لیڈن پریس
- ۴- ابن رستہ الاطلاق النقیہ (عربی) لیڈن پریس، ۱۸۹۲ء
- ۵- ابن ہشام سیرت النبی کامل (جلد دوم) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
عبد الجلیل صدیقی مولانا (مترجم) اشاعت اول
- ۶- ابوالفضل آئین اکبری نوکشور، لکھنؤ، ۱۸۸۲ء
- ۷- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر ادب ولسانیات اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۷۰ء
- ۸- اڈولف ہوسسم، پروفیسر تاریخ یونان قدیم دارالطبع عثمانیہ سرکار عالیہ حیدرآباد
محمد ہارون خان شیروانی، پروفیسر (مترجم) دکن، بار اول، ۱۹۳۱ء
- ۹- اظہر مبارک پوری، قاضی، عرب و ہند عہد رسالت میں ندوت المصنفین، دہلی، ۱۹۶۵ء
- ۱۰- ایضاً ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عارفین کراچی
- ۱۱- البلادی فتوح البلدان (جز دوم) دارالطبع، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
(مترجم) مودودی، ابوالخیر، سید دکن، ۱۹۳۰ء
- ۱۲- المسعودی مروج الذهب و معادن الجوہر (عربی) بیروت الطبع الاولی، بیروت ۱۹۶۵ء
- ۱۲- بدر کرم الہی تاریخ ملتان امتزاج پبلیکیشنز، لاہور، بار اول ۱۹۷۸ء
- ۱۳- بیوری، پروفیسر تاریخ یونان دارالطبع عثمانیہ سرکار عالیہ، حیدرآباد دکن

- مولوی ہاشمی فرید آبادی، سید (مترجم) ۱۹۱۹ء
- ۱۵- ٹپل آر۔ سی حکایات پنجاب (حصہ سوم) مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۲ء
میاں عبدالرشید (مترجم)
- ۱۶- جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۷۵ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو (جلد دوم)، مجلس ترقی ادب لاہور
- ۱۷- حکم چند تواریخ ملتان
- ۱۸- دردانی، محمد معین صوفیائے سندھ اور اردو ایجوکیشنل پریس، کراچی
الدین، پروفیسر
- ۱۹- راگوزن، زیڈ۔ اے، ویدک ہند دارالترجمہ سرکار، حیدرآباد دکن ۱۹۲۱ء
حمید احمد انصاری (مترجم)
- ۲۰- شاہدہ سلیم، ڈاکٹر، سندھ میں اردو اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
- ۲۱- شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر، سندھی اردو کے لسانی روابط، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء
- ۲۲- ضامن، سید نور علی، "تذکرہ" شرح سکندر نامہ ایرین ادارہ تحقیق و تذکرہ، احمد پور شرقیہ
- یونانی ۱۹۶۶ء
- ۲۳- عبادت بریلوی، ڈاکٹر، خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۶۴ء
- ۲۴- عبدالرحمن، منشی، آئینہ ملتان مکتبہ اشرف المعارف، ملتان
- ۲۵- عتیق فکری، علامہ، نقش ملتان (جلد اول) فکری اکیڈمی بشارت مجلس ثقافت
و تاریخ ملتان، سن اشاعت جنوری ۱۹۸۲ء
- ۲۶- علی بن احمد بن ابوبکر کوفی، پچ نامہ سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد،
پہلا ایڈیشن، اپریل ۱۹۶۳ء
- ۲۷- علی حیدر، پروفیسر، نقد ادب کتاب منزل، پٹنہ ۱۹۶۰ء
- ۲۸- فرحت ملتان، اولیائے ملتان مکتبہ تنویر ادب ملتان، بار سوم ۱۹۸۴ء
- ۲۹- فیاض محمود، سید (مترجم)، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۱۳ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- ۳۰- قادری، شمس اللہ، تاریخ زبان اردو، اردو کے قدیم، تلج پریس مکتبہ معین الادب، لاہور

۳۱- قانع ٹھٹوی، علی شیر میر، تحفۃ الکرام، سندھی ادبی بورڈ کراچی، ۱۹۵۹ء

نبی بخش خاں بلوچ، ڈاکٹر (مترجم)

۳۲- قدوسی، اعجاز الحق، تاریخ سندھ (دو جلدیں) مرکزی اُردو بورڈ، لاہور

۳۳- گپتا، ایس۔ آر۔ این، تاریخ ہندی فلسفہ (۱-۱۰) دارالطبع جامعہ عثمانیہ، سرکار حیدرآباد

دکن، ۱۹۲۵ء

۳۴- گیلانی، اولاد علی سید، مرقع مولتان، سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان نے

۱۹۳۸ء میں شائع کی۔

۳۵- لطیف ملک (مترجم) ابوریحان البیرونی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

۳۶- محمد اکرام، شیخ، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۳۷- ایضاً آپ کوثر

۳۸- محمد معصوم، میر، بکھری، تاریخ معصومی، سندھی ادبی بورڈ، کراچی، طبع اول

۱۹۵۹ء

نبی بخش خاں بلوچ، ڈاکٹر، (تصحیح و حواشی)

۳۹- مہر عبدالحق ڈاکٹر، ملتان، زبان اور اس کا اُردو سے تعلق، اُردو اکادمی، بہاولپور، بار اول، ۱۹۶۷ء

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۴۰- ندوی، سید سلیمان، مولانا، نقوش سلیمانی،

۴۱- ایضاً عرب و ہند کے تعلقات، کریم سنز پبلشرز کراچی

۴۲- ایضاً عرب و ہند کے تعلقات، ہندوستانی اکیڈمی، یوپی، ہندوستان

۱۹۳۰ء

۴۳- ندوی، مسعود علی، ہندوستان عربوں کی نظریں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۰ء

۴۴- ندوی، سید البظفر، مولانا، تاریخ سندھ (حصہ اول و دوم) معارف، اعظم گڑھ ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۶ء

۴۵- منشی ہرنرائن

۴۵- منشی ہرنرائن باعانت، بھاگوت پران (ساتواں اکند) کوہ نور پریس لاہور، ۶۸-۱۸۶۷ء

پنڈت بہادر سنگھ (مترجم)

رسائل / اخبارات،

۱- راشد می، حسام الدین پیر، اردو زبان کا اصلی مولد، سندھ، رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو،

کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء

۲- رفیق مغل، ڈاکٹر، ملتان غیر ملکی سیاحوں کی نظریں، روزنامہ "امروز" ملتان نمبر،

۲۸ جون ۱۹۷۸ء

دسویں صدی ہجری تک کے صوفیاء کا احوال

(الف)

ملتان اور نبوسامہ — ملتان اور قرامطہ — صوفیاء کا اوڈملتان میں

(ب)

دسویں صدی ہجری تک کے صوفیاء — کا تذکرہ

(الف)

ملتان اور بنو سامہ

سالقہ باب میں ملتان کی قدامت، سیاسی اہمیت، اقتصادی، سماجی، مذہبی، لسانی اور تہذیبی صورت حال کا جائزہ تاریخوں اور سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اگرچہ عرب اور ہندوستان کے تجارتی روابط بہت قدیم زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ لیکن جب سندھ پر عرب حکومت کا قبضہ ہوا اور سندھ عرب کا ایک مفتوحہ صوبہ بن گیا تو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان گہرے تعلقات کا سلسلہ قائم ہوا۔ اب باقاعدہ طور پر دونوں کے علمی و تمدنی روابط بڑھنا شروع ہوئے محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور ملتان کی فتح کے بعد عربوں کا اثر رسوخ کسی نہ کسی صورت میں صدیوں باقی رہا اور یہ علاقے عربوں ہی کے زیر نگیں رہے۔ البتہ جوں جوں دور افتادہ عرب حکومت کی گرفت بوجہ ڈھیلی پڑتی گئی توں توں بہت سے علاقے خود مختار ہوتے گئے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں ملتان کے بنو سامہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا^(۱)۔ یہ عربی النسل خاندان تھا۔ اس کو بنو منبہ بھی کہا جاتا تھا۔ ابن رستہ کے بیان کے مطابق

”ملتان میں ایک قوم ہے جس کا خیال ہے کہ وہ سامتہ بن لونی کی ایک شاخ بنو منبہ کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی قوم ہندوستان کے اس حصہ میں حکمران ہے۔ یہ سندھ کے شہر منصورہ کے قریب رہتی ہے اور ملتان میں ایک بت ہے جس کی آمدنی بہت زیادہ ہے اور بنو منبہ ہی اس آمدنی

۱۔ بحوالہ آب کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۲۹، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، آٹھویں بار ۱۹۷۹ء

اور دوسرے تمام سامانوں کے مالک ہیں۔ (۱)

۲۔ ملتان اور قرامطہ | اس دوران میں قرامطی جو اسماعیلی عقائد رکھتے

تھے۔ کوفہ، بصرہ اور مصر و شام پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ مکہ پر بھی انہوں نے حملہ کیا اور حجرِ اسود اٹھا کر لے گئے (۲)۔ ان کا دائرہ اثر بڑھتے بڑھتے سندھ اور پھر ملتان تک پہنچا۔ جلم بن شیبان نامی شخص قاہرہ سے فوج لے کر ملتان آیا اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس نے ملتان پر باہر سے حملہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ اندرون شہر بغاوت کر کے خود مددگار بنا اور پھر ۳۷۳ھ (۹۷۷ء) میں سردار ہو گیا (۳)۔ جلم نے بنو منبہ کا اقتدار ختم کر دیا اور فاطمی خلیفہ کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ مولانا عبد الحلیم شرر مقدسی کی "احسن التقاسیم فی معرفت الاقالم" کے اقتباسات کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"ملتان میں خلفائے بنی فاطمہ کا خطبہ جاری ہے اور یہاں کوئی حکم بغیر

ارض مصر کے فاطمی خلیفوں کی منظوری کے اجراء نہیں پاتا۔ اہل ملتان کے ہدایا اور

قاصد برابر مصر میں آتے جلتے رہتے ہیں اور مصر کے اسماعیلیوں کا یہاں اس قدر

زور ہے کہ بغیر ان کی اجازت کے یہاں کوئی شخص ملتان کے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا" (۴)

جلم بن شیبان نے باقاعدہ طور پر قرامطی عقائد کی تبلیغ شروع کی۔ قرامطیوں کی حکومت کسی نہ کسی

صورت میں دو سال تک قائم رہی۔ حسن رضا گردیزی اپنی کتاب "شاہ یوسف گردیزی" میں ملتان

میں قرامطیوں کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اس فرقے کی بدولت ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور بدمنی کا دورہ دورہ

تھا۔ بے چارے مسلمان جائے امن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ قرامطہ

۱۔ "الاعلاق النفیہ" از ابن رستہ ترجمہ از مسعود علی ندوی بعنوان ہندوستان عربوں کی نظر میں" ص ۸۰

۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے (۱) گزٹ میگزین پنجاب ص ۳۲ (۲) تاریخ ملتان از کم الہی بدر ص ۳۶ (۳) ارض ملتان از اکرام الحق، ص ۲۳۱

۳۔ "تاریخ سندھ" از ابو ظفر ندوی، ص ۲۵۶

۴۔ "تاریخ سندھ" از عبد الحلیم شرر ص ۱۲۳ - ۱۲۵

یوں تو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن انہیں اسلامی عقائد سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ نہ فقط اسلامی عبادات کے منکر تھے بلکہ ان کی تمام سرگرمیاں عباسی حکومت کے خلاف ہوتے ہوئے ہر اس سلطنت کے خلاف ہو گئیں جو بنی فاطمی حکومت کے حق میں نہیں تھے (۱)۔

خطہ پاک اوج میں "الدولت العربیہ الکبریٰ لحدود کامل المحاصی" کے حوالے سے لکھا ہے، "قرامطہ فرقہ باطنیہ ہی کی ایک شاخ تھی جس کا بانی مہدی بن عبد اللہ بن سنان کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان تھا مگر یہ باطن اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی شورش انگریزوں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ کے خلاف لوگوں کو ابھارا اس کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مقصد اسلام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ قرامطہ کا ہیڈ کوارٹر کوفہ کے نواح میں ایک بستی تھی جس کا نام انہوں نے "دار الہجرت" رکھا ہوا تھا۔ یہیں سے ان کی جماعتیں قتل و غارت گری کے منظم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نکلتیں اور سلطنت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کرتیں" (۲)۔

علامہ عتیق فکری زنجینی کے حوالے سے قرامطہ کے عقائد کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں، "قرامطہ کا قول تھا کہ حضرت رسولؐ کے بعد صرف سات آئمہ ہوئے ہیں۔ یعنی سیدنا حضرت علیؑ سے لے کر سیدنا جعفر تک عام شیعہ عقیدہ کے چھ آئمہ ہوئے ہیں۔ اور ساتویں امام حضرت محمد بن اسماعیل بن جعفر ہیں۔ قائم اور مہدی وہی ہیں اور ان کو رسالت کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضور اکرمؐ کی رسالت اس روز ختم ہو گئی تھی۔ انسان کا جسم سات حصوں میں منقسم ہے" (۳)۔

قرامطہ کے عقائد اور نظریات کے بارے میں تاریخوں میں جو کچھ درج ہے ان کا لب لباب یہ ہے۔

- ۱۔ قرآن کے ظاہری اور باطنی معنی کو امام ہی جانتا ہے جو اپنے ماننے والوں کو تعلیم دیتا ہے۔
- ۲۔ طلوع آفتاب سے پہلے نماز کی صرف چار رکعتیں ہیں۔

۱۔ "شامیوسف گردیز" ص ۴۹، مطبوعہ کاروان ادب ملتان، ماراؤل ۱۹۸۳ء

۲۔ بحوالہ "خطہ پاک اوج" از مسعود حسن شہاب، ص ۱۱۲، اردو اکیڈمی بہاولپور، طبع اول ۱۹۶۷ء

۳۔ نقش ملتان ص ۳۲۲، مطبوعہ فکری اکیڈمی و مجلس تاریخ ثقافت ملتان، ماراؤل ۱۹۸۲ء

- ۳۔ بیت اللہ شریف کی بجائے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے۔
- ۴۔ سال بھر کے روزے صرف دو ہیں۔ ایک روزہ مہرجان کے اور دوسرا نیم روز کے دن
- ۵۔ شراب حرام اور خمر حلال ہے۔
- ۶۔ جس جانور کی کنگلی اور دانت ہوں ان کا کھانا جائز ہے۔
- ۷۔ جنابت سے غسل کرنا واجب نہیں ہے۔
- ۸۔ جمعہ کی بجائے اتوار یوم البیت ہے۔
- ۹۔ ان کے علاوہ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا و عقبیٰ میں نہ نیک اعمال کی جزا ہے نہ بد اعمال کی سزا۔ ان نظریات کی تبلیغ اور ترویج کی وجہ سے لوگوں کے عقائد راسخ العقیدہ مسلمانوں جیسے نہ رہے تھے۔ ادھر تو داخلی طور پر لوگ ان نظریات کی یلغار کے سبب گم کردہ راہ ہو رہے تھے اور ادھر ملتان بیرونی حملہ آوروں کی مسلسل فوج کشی اور کشت و خون کی بدولت بے چینی اور بے سکونی کی زد میں تھا۔ لوگوں میں خود غرضی، منتشر خیالی اور توہم پرستی عام ہو گئی تھی اور تہذیبی سطح پر بکھراؤ کی سی کیفیت تھی۔ اسلامی اقدار پر ایک طرف تو قرامطیوں کی یلغار تھی اور دوسری طرف ہندووانہ رسموں کے اثرات مسلمانوں پر پڑ رہے تھے۔ شیخ محمد اکرم نے قرامطیوں کے زمانے میں مذہبی انتشار کی روڈ ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

”ان لوگوں (قرامطی مبلغین) کی کوششوں اور عام روحانی بد نظمی سے جو حالت پیدا ہو گئی تھی اس کا اندازہ سومرہ خاندان کے حالات دیکھ کر ہو سکتا ہے جن کے نام ہندووانہ تھے اور مذہب کی نسبت یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سمہ خاندان کے زمانے میں اسلامی اثرات غالب آگئے تھے لیکن اس کے بعض حکمرانوں کے نام بھی ہندووانہ تھے اور یقیناً ان کے رسم و رواج میں بھی کئی باتیں ہندوؤں کی باقی رہ گئی ہوں گی۔“ (۲)

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) نقش ملتان، ص ۳۲۲-۳۲۳ (ب) شاہ یوسف گریز

ص ۵۰ (ج) امروز ملتان نمبر

۲۔ ”آب کوثر“ ص ۳۹۔

لوگوں میں روحانی اور اخلاقی زوال عام ہو رہا تھا۔ شیخ محمد اکرام ہی کے بقول
 "ان کی روحانی زندگی میں صدیوں تک ایک عجیب کھلبلی مچی رہی" (۱)

۳۔ صوفیاء کا دو ملتان میں

محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے مسلمان سپاہیوں میں سے ہر ایک، صوفی بھی تھا، عالم باعمل بھی، خلق عظیم کا حامل بھی اور جاننا بجا بہ بھی۔ اس لئے ان کی بدولت نہ صرف دین اسلام کی اشاعت کا کام انجام پایا بلکہ لاکھوں گم کردہ راہ انسانوں کو صراطِ مستقیم کا اذن بھی ملا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں فرقہ بندی اور افتراق نے سر اٹھایا۔ مختلف عقائد رکھنے والے گروہوں نے فتنہ پردازیاں کیں اور نتیجہ انشار اور زوال کی صورت میں سامنے آیا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ محمد بن قاسم کے سپاہیوں جیسا کردار اور اخلاق رکھنے والی شخصیتیں بروئے کار آئیں اور اصلاح احوال کی طرف متوجہ ہوں۔ چنانچہ اس صورت حال میں صوفیائے کرام اور برگزیدہ ہستیوں کا ورود ملتان کیلئے باعث برکت و سعادت ثابت ہوا۔ ان کی بدولت ملتان میں صحیح اسلامی تعلیمات رشد و ہدایت اور روحانی و اخلاقی اقدار کا احیاء ہوا۔ جن صوفیاء نے اس سرزمین کو شرف بخشا ان میں شاہ یوسف گردیز، خواجہ معین الدین اجمیری، قطب الدین بختیار کاکی، شیخ بہار الدین زکریا ملتانی، باہا فرید الدین گنج شکر، شاہ شمس سبزواری، صدر الدین عارف، جلال الدین سرخ بخاری، عبدالرشید حقانی، حسام الدین ملتانی، جہانیاں جہاں گشت، شاہ راجو قتال، حسام الدین متقی ملتانی وغیرہ قابل ذکر ہیں یہ تمام صوفیاء دسویں صدی ہجری سے پہلے کے ہیں۔

ان صوفیاء میں کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے ملتان میں عارضی قیام فرمایا۔ یہاں کے بزرگوں سے فیض اٹھایا، تبلیغ اور نیکی کے کام انجام دیئے اور پھر دوسرے شہروں کو فیض یاب اور مستفید کرنے کے لئے آگے بڑھ گئے۔ مثلاً حضرت معین الدین اجمیری، قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے اس سرزمین کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ یہاں رشد و ہدایت، تبلیغ و تلقین، درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری کیا۔ ہم ان صفحات میں چند اہم ترین صوفیاء اور بزرگ ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(ب)

دسویں صدی ہجری تک کے صوفیاء کا احوال

۱۔ حضرت دیوان چاؤلی مشائخ | حضرت دیوان چاؤلی مشائخ دور اولین

کے صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ وفات (۱۳۱ھ) کے لحاظ سے حبیب عجمی (متوفی ۱۲۱ھ) سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) مالک بن دینار (متوفی ۱۲۸ھ) اور داؤد طائی (متوفی ۱۶۲ھ) کے ہم عصر ہیں۔ اس لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کے صوفیاء میں آپ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ چونکہ آپ کا تعلق سرزمین ملتان سے تھا۔ اس لئے ان کی بدولت ملتان کا شمار تصوف کے اولین مراکز میں ہوتا ہے، آپ کا اصلی نام رائے چاؤلی تھا۔ آپ ہندو راجہ ہپال کے چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ کا تعلق راجپوت قوم ڈھوڑی کے سردار رائے لکھن سے تھا جو گنگن پور، پر

۱۔ سرزمین ملتان کے پہلے صوفی ہونے کا اعزاز ان کو حاصل ہے۔ انہوں نے اسی سرزمین پر جنم لیا اور یہیں وفات پائی۔ اگرچہ ملتان میں تصوف کا باقاعدہ سلسلہ شاہ یوسف گردیز سے شروع ہوا لیکن وہ غزنی سے تشریف لائے تھے۔ بقول بشیر حسین ناظم

”آپ (دیوان چاؤلی مشائخ) ادائل اسلام کے ادلیائے کرام میں سے ہیں“

(بحوالہ ادلیائے ملتان، ص ۳، سنگ میل پبلیکیشنز اردو بازار لاہور)

۲۔ حکم چند کیفیت خاندان قوم ڈھوڑی میں لکھتے ہیں۔

”اس قوم کی ملکیت زیادہ تر مشرقی حصہ برصغیر میں ہے۔ اصل قوم ان کی راجپوت تھی

مورث اعلیٰ ان کا ہپال نامی قوم راجپوت رانا تھا۔ قبل از اسلام کے مورث اعلیٰ ان کے

اس ملک کے راجہ تھے۔ دیوان چاؤلی مشائخ انہیں کی قوم میں سے تھا۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

حکومت کرتا تھا۔ کنگن پور تحصیل میسی کے ساتھ ہے جو اب موضع چاؤلی مشائخ کے نام سے مشہور ہے۔^(۱)

اگرچہ دیوان چاؤلی کا تعلق ہندو خاندان سے تھا لیکن آپ کا رجحان شروع ہی سے دین اسلام کی طرف تھا۔ چنانچہ باطنی طور پر آپ حضور م کے انوار و تجلیات سے منور ہوتے رہے۔ جب درجہ ولایت کو پہنچے تو آپ نے مسلمان ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ گلزار فریدی میں لکھا ہے

”دیوان چاؤلی مشائخ روئے زمین کے قدیم ترین مشائخ میں سے ہیں اور متاخرین نے ان کی خاک پاک سے فیض اٹھایا۔ ان کا والد راجہ بے پال عباسیہ سلطنت کے اوائل میں خطہ ملتان کا فرمان روا تھا۔ دیوان مشائخ چھوٹی عمر میں مسلمان ہو گئے تھے اور روحانی طور پر سید عالم سے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) جو مسلمان ہوا اور خانقاہ اس کی اسی نواح میں بموضع دیوان چاؤلی مشائخ ہے۔ تاریخ ملتان ص ۱۹۲
حکم چند دیوان چاؤلی مشائخ کے آباؤ اجداد کے ذکر میں لکھتے ہیں

”رائے لکھن راجپوت مورث اقوام ڈھوڑی یہاں آیا اور اسی قوم جہونی پر فتح پا کر قابض قلعہ پر ہو گیا۔ راجپوت موصوف کے تین سپہر تھے۔ رائے اجن رائے دسیر رائے رتہ لجدو رائے لکھن کے اجن بڑا بیٹا اور لجدو نوات اس کے ہسپال سپر کلاں اس کا گدھی نشین ہوا۔ ہسپال کے پانچ سپہر اور ایک دختر تھی سب سے چھوٹا بیٹا رائے چاؤلا یعنی دیوان چاؤلی مشائخ یہی حضرت ہے اور دختر کنگن برس تھا۔“

(بحوالہ ”تاریخ ملتان“ از حکم چند ص ۱۰۹۔ یہ کتاب پبلک لائبریری ملتان سے حاصل کی گئی۔ اس کا سرورق پھٹا ہوا ہے۔)

۱۔ فرحت ملتان نے آپ کا شجرہ اس طرح دیا ہے

”رائے لکھن، رائے ادوی، رائے اجن، راجہ رانا ہسپال اور اس کے پانچ فرزند اور ایک دختر تھی جو چار بھائیوں کے مظالم سے تنگ آکر زندہ دفن ہو گئی۔“ (بحوالہ ”اولیائے ملتان“ از فرحت ملتان، ص ۲۴۲ مکتبہ تنویر ادب ملتان، اشاعت سوم ۱۹۸۴ء)

فیض یاب ہوئے تھے۔ (۱)

دیوان چاؤلی کی ہمشیرہ محترمہ کنگن کو جس کے نام پر موضع کنگن پور کہلوا یا، کو بھی اسلام سے فطری لگاؤ تھا۔ انہوں نے بھی اپنے بھائی کے ساتھ ہی دین اسلام قبول کر لیا جس پر دوسرے بھائی دونوں کے جانی دشمن ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے ۱۳۱ھ میں دیوان چاؤلی مشائخ کو جبکہ ان کی عمر صرف ۲۲ برس کی تھی (۲) — شہید کر ڈالا لیکن بعد میں ندامت اور پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے خود بھی اسلام قبول کر لیا۔

حضرت دیوان چاؤلی مشائخ کے زمانے میں ملتان کے حالات کیا تھے۔ ؟ تواریخ اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ ملتان پہلے سندھ کا حصہ تھا لیکن ۱۱۱ھ میں سندھ سے الگ ہوا۔ محمد بن قاسم کے جانے کے بعد ملتان کے حالات کی تفصیل نہیں ملتی۔ ادھر عربوں کے آپس کے انتشار کی وجہ سے سندھ پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس لئے یکے بعد دیگرے چند سالوں کے اندر سندھ میں کئی گورنر تبدیل ہوئے۔ سندھ کے لوگ بھی باغی ہو رہے تھے۔ چنانچہ ۱۰۰ھ میں تمیم بن زید العبتی سندھ کا گورنر بنا۔ اس کی وفات کے بعد حاکم الکابی آیا جس نے سندھ میں مسلمانوں کی حکومت سمیٹنے دیکھی تو یہاں کے لوگوں کی سرکوبی کے لئے محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو بن محمد بن قاسم کو فوجی دستے کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ عمرو بعد میں سندھ کا گورنر بنا۔ اسی طرح

۱- بحوالہ "گل زار فریدی" از مولوی گل محمد چشتی، ص ۳-۴، قلمی نسخہ فارسی تحریر شدہ ۱۹۰۲ء (ملفوظات و مناقب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر) جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوا۔
 ۲- پروفیسر محمد امین اپنے مضمون "تصوف اور ملتان" مطبوعہ امرتسار ملتان نمبر ۶، ۲۸، جون ۱۹۶۸ء میں دیوان چاؤلی مشائخ کی عمر وفات کے وقت ۲۲ سال بتاتے ہیں جس کے مطابق آپ کا سنہ پیدائش ۱۰۹ء بتا ہے جس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جیکہ فرحت ملتان " اولیائے ملتان " میں ص ۲۰۴، میں آپ کا سنہ پیدائش ۶۹ء بتاتے ہیں۔ جس کے مطابق آپ کی عمر ۵۲ برس بنتی ہے اور " تواریخ ملتان " از حکم چند، ص ۱۰۹ کے مطابق،

" بوقت انتقال عمرو دیوان چاؤلی مشائخ ۴۱ برس کی تھی۔ وفات انکی اخیراً ۱۲ ہجری میں ہوئی اور انکی اولیائی کا شہرہ گروہ دونواح میں مشہور ہوا اور اکثر لوگ مرید ہونے لگے۔ "

سندھ کے گورنر بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں عربوں کی حکومت بنو امیہ کے ہاتھوں سے چھن کر بنو عباس کے قبضے میں چلی گئی۔

سیاسی طور پر تو سندھ کے یہ حالات تھے جن میں ملتان کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس انتشار کی لپیٹ میں ملتان بھی آیا ہوا تھا۔ کیونکہ جب بھی مرکز کی گرفت کمزور ہوتی ملتان کا حاکم خود مختار ہو جاتا۔ ادھر بصرہ اور کوفہ میں بنو امیہ کے درمیان اقتدار کی جنگ جاری تھی۔ دوسری طرف اموی گورنروں نے لوگوں پر خوب ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ ان حالات میں صوفیاء کا پہلا طبقہ وجود میں آیا لیکن ان کے ہاں باقاعدہ تحریک کی صورت نہیں ملتی بلکہ سب انفرادی طور پر تصوف کی زندگی گزار رہے تھے^(۱)۔ پہلے طبقے کے ایسے ہی صوفیوں میں دیوان چاؤلی مشائخ بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی نیکی اور تقویٰ کے ساتھ گزار سی۔ اگرچہ وہ تصوف کی کسی باقاعدہ تحریک کے بانی نہیں ہیں نہ ان کی وجہ سے تصوف کا کوئی سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں صوفیانہ زندگی کی ابتدا کرنے والے دیوان چاؤلی مشائخ ہیں۔ آپ کی زندگی کے حالات تعلیمات اور اثرات کا تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے مزار کی مرمت کئی سلاطین نے کروائی۔ سب سے پہلے محمود غزنوی نے اپنے عہد میں پچاس ہزار روپے صرف کر کے آپ کا مزار بنوایا۔ جہانگیر نے بھی اس کی مرمت کروائی۔ پھر دیوان مولراج کے دور میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی^(۲)۔ آپ کا مزار روحانیت اور فیض و برکت کا مرکز بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف سلاطین بلکہ مختلف بزرگ اور اولیاء بھی آپ کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ ان صوفیاء اور بزرگوں میں بابا فرید الدین گنج شکر^(۳)، حضرت شیر شاہ، حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری،

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "تاریخ مشائخ چشت" از خلیق احمد نظامی، ص ۳، تا ۷۹،

دارالمؤلفین، اسلام آباد۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "مرقع ملتان" ص ۲۲۶، از سید محمد اولاد علی گیلانی، سیکرٹری

ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان نے ۱۹۳۸ء میں لکھ کر شائع کی۔

۳۔ "مرقع ملتان" ص ۲۲۵، اور تواریخ ملتان از حکم چند ص ۱۰۹، کے مطابق (باقی برصغیر ثانی)

حضرت بہار الدین زکریا ملتانی اور حضرت لال شہباز قلندر شامل ہیں۔

۲۔ شاہ یوسف گردیز

شاہ یوسف گردیز پانچویں صدی ہجری کے صوفی بزرگ ہیں۔ آپ ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں غزنی کے نواحی علاقہ گردیز میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید ابو بکر سیدنا حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے دادا مخدوم شاہ علی قسور جنیدی علی گردیزی اویسی تھے (۲)۔ جو بغداد سے ہجرت کر کے قصبہ گردیز میں رہائش

(بقیہ گذشتہ صفحہ) جس چاہ باوا فریدؒ میں حضرت گنج شکر نے چلہ کاٹا اور کافی عرصہ عبادت و ریاضت میں گزارا وہ حضرت دیوان چاؤلی مشائخ کے مزار کے پاس واقع ہے۔ اس واقعہ سے دیوان چاؤلی مشائخ سے ان کی عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ خلیق نظامی اپنی کتاب "احوال و آثار" فرید الدین گنج شکر ص ۶۸-۶۷، اور سید نعیم رحمانی اپنی تصنیف حضرت بابا فرید گنج شکر ص ۱۹ میں چلہ کشی کے اس کنویں کا عمل وقوع اور بتاتے ہیں۔ اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی یہ تو ثابت ہے کہ حضرت بابا فرید کو دیوان چاؤلی مشائخ سے عقیدت رہی اور انہوں نے کچھ عرصہ دیوان چاؤلی کے مزار پر گزارا۔

۱۔ عبدالحق محدث دہلوی مصنف اخبارالآخیر، ص ۱۳۰ اور مصنف تحفہ الکرام، ص ۳۶۲ نے شاہ یوسف گردیز کو بہار الدین زکریا کا ہم عصر بتایا ہے جبکہ محمد غوثی شطاری مصنف گلزار ابرار، ص ۲۳ نے ان کا سنہ پیدائش ۵۵۰ھ لکھا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ شاہ یوسف گردیز کی صحیح تاریخ پیدائش جو مستند تاریخوں سے ملتی ہے وہ ۴۵۰ھ ہے اور وفات ۵۳۱ھ ہے جبکہ بہار الدین زکریا کی پیدائش ۵۶۵ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ دونوں اصحاب ہم عصر نہیں ہو سکتے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) مرقع ملتان، ص ۲۱۵، (ب) جمال یوسف از فقیر محمد اشفاق، ص ۵ (ج) شاہ یوسف گردیز از حسن رضا گردیزی، ص ۱۱۵۔

۲۔ اویسی کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اویسی وہ ہوتا ہے کہ جو قول و فعل اور اعتقاد میں سنت رسولؐ کی اتباع کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ جو جناب خاتم النبوت و الشریعہ علیہ السلام کے باطن اقدس سے فیض پاتے وہ اویسی ہوتا ہے جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ اویسی وہ ہوتا ہے جس کو حضرت خضر سے فیض پہنچے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

پذیر ہوئے جہاں انہوں نے علوم اسلامیہ کی تبلیغ اور رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ شاہ یوسف گریز کی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ کا ہاتھ تو تھا ہی لیکن اصل حصہ ان کے دادا کا تھا۔ جنہوں نے آپ کو تمام روحانی مدارج طے کروائے۔ پھر آپ مختلف بزرگوں سے روحانی فیض حاصل کرنے کی خاطر ایران و توران اور روم و شام (بلخ، بخارا، سمرقند اور تاشقند) کے سفر پر روانہ ہوئے اور دوران سفر قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم کی تحصیل سے

” صاحب تصرفات ظاہر و باطنی، حامل محاسن صوری و معنوی قطب زمانہ اور

وجید العصر بن گئے۔“ (۱)

آپ ابھی سفر ہی میں تھے کہ والد محترم کی وفات کی اطلاع ملی۔ چنانچہ سفر ختم کر کے واپس چلے آئے۔ اور یہاں آکر اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزارنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے ہی سے آپ سے عمیر العقول کرامات سرزد ہونے لگیں۔ ۲۸۱ھ میں اپنے مرشد جناب شاہ علی قسور کے کہنے پر ملتان تشریف لائے (۲)۔ اور یہاں باقاعدہ تدریس و تبلیغ شروع کی اور آخری وقت تک لوگوں کو اپنے فیض سے نوازتے رہے۔ سید یوسف گریزی کی درس گاہ کے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) (گلزار ابرار از محمد غوثی شطاری) اردو ترجمہ اذکار ابرار مترجم فضل احمد جیوری، ص ۲۴، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور

۱۔ ادیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۶۵، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔

۲۔ آپ کے ملتان تشریف لانے کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے دادا کے پاس چند مریدین حاضر ہوئے جن کا لڑکا بہت بیمار تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ دعائے صحت فرمائیں۔ آپ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ راضی برضائے الہی رہیں۔ چنانچہ وہ لڑکا مر گیا اور اس کے درنار زور زور سے رونے لگے۔ حضرت شیخ یوسف کو رحم آیا اور اس کے لئے دعا فرمائی جس سے وہ لڑکا زندہ ہو گیا۔ آپ کے دادا اس بات سے ناراض ہوئے اور آپ کو درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ملتان بھیج دیا۔

” جمال یوسف“ میں لکھا ہے کہ حضرت باہجرات اپنی والدہ عقیفہ کے ملتان میں تشریف لائے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ” جمال یوسف“ ترجمہ از فقیر محمد اشفاق حسن، ص ۶، مطبع الہی اگرہ ۱۳۲۶ھ

(حبیب فاتح کی ذاتی لاٹری سے حاصل کی)

بارے میں علامہ عتیق فکری لکھتے ہیں کہ

” یہ پہلی باقاعدہ درس گاہ تھی جو محمود غزنوی کے بعد ملتان میں اسلامی علوم کی ترویج

کے لئے قائم ہوئی لیکن محمود غزنوی کے جانشینوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی“ (۱)

شاہ یوسف جب ملتان تشریف لائے (۲) تو اس وقت یہ شہر موجودہ ملتان کے جنوب میں ریلوے

لائن کے پار مانی پاک دامن کے مزار کے پاس آباد تھا۔ آپ نے سب سے پہلے یہاں کی بزرگ

ہستی حضرت ملا موج دریا کے ہاں قیام فرمایا (کیونکہ ان کے مرشد کا یہی حکم تھا) کچھ عرصہ آپ نے

ملا موج دریا کے پاس رہ کر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ جب خلقت کا بہت زیادہ ہجوم ہونے

لگا تو آپ نے دریائے راوی کے کنارے رہائش اختیار کر لی اور وہاں اپنا حجرہ بنوایا (۳) آپ

کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی وہاں رہائش اختیار کرنے لگے۔ حضرت ملا موج نے شاہ یوسف گردیز کا

بہت زیادہ ساتھ دیا اور تبلیغ کے کام میں ان کی مدد کی۔ لیکن وہ خود زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور

انہیں ان کی خانقاہ میں جہاں وہ عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ (۴) دفن کر دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ملتان کی سرزمین اندرونی طور پر قراصلہ کی قہر سامانیوں اور

۱۔ بحوالہ ”برصغیر پر ملتان کے علمی اثرات“ ص ۵۔ از علامہ عتیق فکری مطبوعہ امر و ملتان، ۲۸ جولائی ۱۹۸۸ء

۲۔ جس حالت میں ملتان تشریف لائے اس کے بارے میں بہت مشہور روایت ہے کہ آپ شیر پر سوار تھے

اور سانپ کو کوڑے کی بجائے استعمال کر رہے تھے۔ اس مفہوم کا ایک شعر آپ کے مقبرے پر درج ہے

وانی سوار شیر کہ در دست مار کرد
مخدوم شاہ یوسف این جا قرار کرد

حوالے کے لئے دیکھئے (۱) شاہ یوسف گردیز از حسن رضا گردیزی، ص ۱۲۴۔ کاروان ادب ملتان، بار اول ۱۹۸۳ء

(۲) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۶۶ (۳) جمال یوسف، ص ۱۶ (۴) اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۹۹

۳۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت شاہ گردیز کا مزار اب بھی موجود ہے اور گردیزی خاندان کے بیشتر

لوگ اس جگہ آباد ہیں۔

۴۔ بحوالہ جمال یوسف، ص ۲۴۔ حضرت موج دریا کے بارے میں تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ البتہ ایک پل موج دیا

کے نام سے ان کی یاد کو تازہ رکھے ہوئے ہے۔ ان کی خانقاہ سکھوں کے دور میں منہدم ہو گئی اور اب قبر کا نشان

بھی مٹ چکا ہے۔ البتہ مسجد باقی ہے۔

بیردنی طور پر غزنیوں کی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق ”حمود غزنوی کے مسلسل حملوں نے پورے سندھ اور ہند میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ اس لئے عوام میں بددلی اور بے چینی لازم تھی۔ اس کے علاوہ خود قرامطہ نے بھی لوٹ مار شروع کر رکھی تھی اور حمود کے جانشینوں کی وجہ سے بھی ملتان لاہور اور سرحد کا علاقہ انتہائی انتشار کا شکار تھا۔ ایسے روح فرساور میں ملتان کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔“ (۱)

ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں لوگوں میں بے سکونی اور بددلی کا پھیلنا بعید از قیاس نہیں۔ لوگوں کی روحانی اور اخلاقی اقدار کو زوال آچکا تھا۔ ان حالات میں حضرت شاہ یوسف گردیز کی ملتان میں آمد باعث برکت ثابت ہوئی۔ آپ نے اپنے فیض باطنی سے لوگوں کے خشک اور ویران شدہ روحانی جذبول کو سیراب کیا۔ عبادت و ریاضت کے ذریعے روحانیت اور وجدان کی اعلیٰ اقدار کا عملی نمونہ پیش کر کے لوگوں میں اخلاقی استقامت پیدا کی اور ان میں کھویا ہوا انسانی وقار بحال کیا۔ ارض ملتان کے مطابق

”آپ کا سب سے زیادہ کارنامہ ملتان کی از سر نو آبادی اور بحالی ہے۔“ (۲)

شیخ محمد اکرام نے حضرت شاہ یوسف گردیزی ملتان کے مزار کو اوج (ریاست بہاولپور) میں شیخ صفی الدین حقانی گزروانی کے بعد ہندو پاکستان کی دوسری قدیم ترین زیارت گاہ قرار دیا ہے (۳) اگرچہ ملتان کی سرزمین میں ان سے پہلے حضرت دلوان چاؤلی مشائخ (متوفی ۱۳۱ھ) کا نام آتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ باہر سے آنے والے بزرگوں میں حضرت شاہ یوسف گردیز پہلے صوفی تھے جو ملتان میں رشد و ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق

”ملتان کی سرزمین پر تاریخی اعتبار سے باہر سے آنے والا پہلا عالم و صوفی جس نے

۱۔ بحوالہ ”نقش ملتان“ از علامہ عتیق فکری، ص ۲۲۳، فکری اکیڈمی بشارکت مجلس تاریخ و ثقافت

ملتان بار اول ۱۹۸۲ء

۲۔ ارض ملتان از اکرام الحق، ص ۷۷۴، مطبوعہ شعبہ نشر و اشاعت ”الاکرام“ وفاق پرنٹنگ پریس لاہور۔

۳۔ ”آب کوثر“ از شیخ محمد اکرام، ص ۴۲-۴۳۔

ملتان میں قیام کیا وہ سید یوسف گردیزی تھے^(۱)۔
 ملتان میں آپ کی آمد ۲۸۱ھ (۱۰۸۸ء) بتائی جاتی ہے۔ یہ دور پوری اسلامی دنیا میں
 تصوف کے عروج کا دور تھا۔ حضرت شاہ یوسف گردیزی کی آمد سے ملتان میں بھی تصوف کا ایک
 نیا دور شروع ہوا^(۲)۔ اگرچہ ملتان میں حالات سازگار نہ تھے لیکن یہ آپ کا سچا جذبہ اور عزم
 و حوصلہ تھا کہ جس کی بدولت آپ نے تبلیغ اسلام کے ذریعے نہ صرف ملتان سے قرامطہ فرقے
 کو مٹایا بلکہ بہت سے ہندوؤں کو بھی مسلمان کیا۔
 علامہ عتیق فکرمی لکھتے ہیں

”آپ نے (حضرت یوسف گردیزی) بڑے خلوص کے ساتھ عوام کو درس دینا
 شروع کیا۔ عوام نے جب آپ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھا تو وہ آپ کے گردیدہ
 ہو گئے۔ سید یوسف گردیزی کی مقناطیسی شخصیت نے تھوڑے ہی عرصے
 میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور یوں ایک بار پھر ملتان اپنی پہلی رونق کی طرف
 لوٹ آیا۔ ہر طرف آپ کی روحانیت اور علمیت کے چرچے نے غیر مسلموں
 کو بھی اپنی طرف راغب کر لیا۔ بہت سے غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پر سلام
 قبول کیا۔ اس طرح آپ نے اشاعت اسلام کے فریضے کو بڑے احسن طریقے
 سے انجام دیا اور تادم آخر اہل ملتان اور مضافات کے لوگوں کو آپ دینی اور روحانی
 تعلیم سے نوازتے رہے۔“^(۳)

شاہ یوسف گردیزی لوگوں سے کسی زبان میں بات کرتے تھے یا انہیں کسی زبان میں درس دیتے
 تھے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ۱۳۲۶ھ کے مطبوعہ رسالہ ”جمال یوسف“ ص ۱۲ (جو ملتان کے

۱۔ بحوالہ ”نقش ملتان“ ص ۲۲۳۔

۲۔ بحوالہ (۱) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۶۶، (۲) ارض ملتان ص ۲۲۳۔ (۳) اولیائے ملتان

از فرحت ملتان، ص ۹۹، مکتبہ تنویر ادب ملتان، بار سوم ۱۹۸۳ء

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے پروفیسر محمد امین کا مضمون ”تصوف اور ملتان“ ص ۶، مطبوعہ امرتسار ملتان نمبر۔

۴۔ نقش ملتان، ص ۲۲۳ - ۲۲۴۔

ایک ذاتی کتب خانے کے فارسی اور عربی قلمی نسخے کا اردو ترجمہ ہے۔) سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت سی زبانیں جانتے تھے اور ہر ملک کے لوگوں سے انہیں کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے اس رسالے میں ایک شخص عبدالصمد سے روایت ہے کہ

”آپ ہر ملک کے آدمیوں سے خواہ ترک ہوں، خواہ رومی، خواہ ہندی، انہیں کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ میں نے تعجب کیا اور دل میں کہا کہ آپ نے یہ زبانیں کہاں سے سیکھیں۔ آپ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اگر قطب خدا یہ نہ جانے تو اس میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟“^(۱)

مغرض شاہ یوسف گردیزی ملتان کے ابتدائی زمانے کے صوفیاء میں ایک خاص اہمیت کے حامل تھے۔ آپ نے دین و دنیا کی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ملتان کے مسلمانوں کا کھویا ہوا اوقار بحال کیا۔ ان میں ایمان و ایقان کا جذبہ پیدا کیا۔ ہزاروں لوگوں کے دلوں میں اسلام کی قندیل روشن کی۔ ملتان کی بحالی از سر نو آبادی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے قرامٹیوں کا قلع قمع کرنے میں ان کا خاص حصہ ہے۔

حضرت شاہ یوسف گردیزی ۳۱ سال کی عمر میں ملتان آئے تھے اور ۸۱ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ گویا ۵۰ برس تک آپ نے اہل ملتان کو اپنے علم و فضل اور روحانی کمالات سے فیض یاب کیا۔ وصال کے بعد ان کو خود ان کی وصیت کے مطابق اسی حجرے میں دفن کیا گیا جہاں وہ آخری وقت تک لوگوں کو تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کرتے رہے۔ آپ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱۳۶/۵۳۱ء میں ہوئی۔ حضرت شاہ گردیز کا مزار بوہڑ گیٹ کے اندر محلہ شاہ گردیز میں واقع ہے۔ زیادہ تر گردیزی سادات اس محلے میں زمانہ قدیم سے رہائش پذیر ہیں اور اپنے جد امجد کی طرح علم و فضل سے شغف رکھتے ہیں۔ اسی خاندان کا ذاتی کتب خانہ ملتان کے عظیم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتب خانہ کی بنیاد شاہ یوسف گردیز نے ہی رکھی تھی۔ علامہ

۱- رسالہ جمال یوسف، ترجمہ از فقیر محمد استفان حسن العلوم، ص ۱۳۔ مطبع الہی آگرہ، کتب خانہ عابد

ملتان، بوہڑ گیٹ ملتان ۱۳۲۶ھ (حبیب فائق کی ذاتی لائبریری سے حاصل ہوا۔)

۲- بحوالہ ”جمال یوسف“ ص ۲۸۔

سید مرتضیٰ حسین قاضی کے مطابق

”حضرت شاہ یوسف نے کتب خانے کی بنیاد رکھ کر ملتان کو پہلی مرتبہ ایک خزانے سے آشنا کیا۔ ان کے خاندان میں کتب خانہ خصوصی امتیاز ہے“^(۱)

حضرت شاہ گردیز کا مزار فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ حسن رضا گردیزی کے مطابق
 ”آپ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد حجرے کی کچی چار دیواری پر گنبد کے بغیر کاشی کی خوب صورت اینٹوں کا خوشنما روضہ بنایا گیا۔ یہ عمارت ساخت اور وضع کی خوبی کے لحاظ سے بہت دلکش ہے۔ بلکہ اس حسین اور نادر ساخت کی تعمیر کا نمونہ ولایت کے عجائب گھر میں موجود ہے“^(۲)

سید اولاد علی گیلانی کے مطابق

”گرامویل روڈ لندن کے نزدیک ایک عالی شان عمارت کے اندر آثار قدیمہ ہندوستان کے بہترین نمونے انڈین کارنر میں بالترتیب آراستہ ہیں۔ ان نمونوں میں حضرت شاہ گردیز علیہ الرحمۃ کے مقبرہ مبارک کے نمونے کو سب سے پہلی جگہ دیا گیا ہے۔ اس نمونے میں روضہ مبارک کی بیرونی دیواروں کے علاوہ سید مراد شاہ صاحب مرحوم گردیزی کی قبر مع اشعار لوح بھی نمایاں طریق پر دکھائی گئی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملتان کی مشہور عمارت میں سے صرف اسی عمارت کا نمونہ وہاں موجود ہے“^(۳)
 ارض ملتان میں لکھا ہے

”ملتان کے مزارات میں جو فن تعمیر کے عمدہ ترین مظاہر ہیں، منفرد اور سب سے قدیم شاہ یوسف گردیزی کا مزار ہے۔ اس کا نمونہ لندن انڈیا آفس کے ایک کونہ میں محفوظ ہے۔ یہ سادہ اور دلکش عمارت اس خاص فن تعمیر کا پیش خیمہ تھی۔ جس نے تقریباً ایک صدی بعد نہ صرف ملتان بلکہ ہندوستان

۱۔ بحوالہ ”مقدمہ شاہ یوسف گردیز“ از حسن رضا گردیزی، ص ۲۵۔

۲۔ بحوالہ ”شاہ یوسف گردیز“ ص ۱۱۹۔

۳۔ بحوالہ ”مرقع ملتان، از اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۷۔

ملتان کے صوفیاء میں نہیں ہوتا لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے پانچ سال اس شہر میں گزارے اس لئے ان کے ذکر کے بغیر ملتان کے صوفیاء کی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔

(خواجہ معین الدین چشتی، جمیری برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی، ثقافتی، روحانی، اخلاقی اور علمی و ادب زندگی میں ایک تاریخ ساز شخصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ نے برصغیر کے منتشر مسلم معاشرے کو نئے سرے سے تعمیر کرنے میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ آپ کی پوری زندگی شریعت و طریقت کو ہم آہنگ کرنے، لوگوں میں تزکیہ باطن پیدا کرنے، اخلاقِ حمیدہ کی تربیت دینے اور صدق و صفا کے جذبات ابھارنے میں گزری۔ آپ نے تصوف کو عوامی تحریک کی صورت دے کر لوگوں میں ایک فکری انقلاب پیدا کر دیا۔) بقول اعجاز الحق قدوسی

”حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ان عظیم المرتبت بزرگوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے انسانیت کی بکھری ہوئی کاکلوں کو سنوارا اور دین و دنیا، مادیت اور روحانیت میں ایک عظیم توازن پیدا کیا اور معاشرے میں حسن اخلاق، تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی شمع روشن کر کے احترامِ انسانیت کا درس دیا۔ آپ نے رشد و ہدایت کی جو جلیل القدر خدمات انجام دیں وہ ہماری تاریخ کا ایک جلی عنوان ہیں۔ (۱)

خواجہ معین الدین اجمیری ۵۳۰ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور پرورش سنجا میں پائی جو سنجر

۱- بحوالہ ”اقبال کے محبوب صوفیاء“ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۱۲۲-۱۲۳، مطبوعہ اقبال اکادمی،

پاکستان، لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۷۶ء

۲- خواجہ معین الدین کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وصال کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے

مختلف کتابوں میں آپ کی تاریخ پیدائش کی تفصیل یوں ہے (۱) سیر العارفین، ص ۱۰۷ پر وحید احمد مسعود (مؤلف

سوانح خواجہ معین الدین چشتی) کے حوالے سے اور ”اقبال کے محبوب صوفیاء“ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۱۲۳،

کے مطابق ۵۳۳ھ (۲) خواجہ غریب نواز، از ادارہ تصنیف و تالیف، ص ۱۳، پر ۵۳۶ھ (۳) گلزار

ابرار، ص ۱۲۷ اور سفینۃ الاولیاء، از شہزادہ دارالشکوہ قادری، ص ۱۲۹، (ترجمہ محمد علی لطفی، نفیس

ایڈمی کراچی) پر ۵۳۷ھ لکھی ہے۔ لعلت خواجہ، ص ۱۲۹، میں ہندوستان کی سپریم کورٹ کے فیصلے

کے مطابق سن ولادت ۵۲۷ھ درج ہے۔ ”وقائع شاہ معین الدین چشتی“ (باقی بر صفحہ ثانی)

کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے والد جناب خواجہ غیاث الدین حسن نہایت پرہیزگار اور نیک طبیعت انسان تھے۔ جن کا تعلق سادات حسینی سے بتایا جاتا ہے۔ آپ کی عمر پندرہ سال تھی کہ آپ کے والد نے وفات پائی۔ اس کے بعد آپ نے حصول علم اور طلب حق کے لئے ۵۴۴ھ میں سمرقند اور بخارا کا سفر اختیار کیا اور وہاں ۵۵۰ھ تک قیام کیا۔ اس دوران میں قرآن مجید حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں بغداد، سمرقند اور بخارا اسلامی علوم و فنون کے مرکز تھے۔ یہاں آپ نے مولانا حسام الدین بخاری اور مولانا اشرف الدین جیسے مشہور عالموں سے علم حاصل کیا۔ یہاں سے آپ عراق، عرب سے ہوتے ہوئے ۵۵۲ھ میں قصبہ ہرون خواجہ عثمان ہارونی کی خدمت

(بقیہ گذشتہ صفحہ) میں معین الدین اجمیری کا سنہ ولادت ۴۷۱ھ لکھا ہے۔ اس کے مطابق "..... سال تولد چہار صد و ہفتاد و یکہ و عمر ۹۱، زودہ یک سال و سنہ و فائش پنج صد و شصت و دو است" (بحوالہ "وقائع شاہ معین الدین چشتی" ص ۱۳، مطبع منشی نوکلشور ۱۳۰۰ھ) لیکن ڈاکٹر ظہور الحسن شاربنے کافی تحقیق کے بعد ۵۳۰ھ بتائی ہے۔ ان کے ماخذات مرآت الاسرار (قلمی نسخہ رام پور لاہوری اور برٹش میوزیم) اقتباس انوار اور مرآت الانساب جیسی کتابیں ہیں اور یہی سنہ پیدائش میرے خیال میں درست ہو سکتا ہے۔

(بحوالہ "معین الہند" از ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، ص ۱، تاج پبلشرز، دہلی۔)

۳۔ بخارا صہبان کے نزدیک ہے۔ آپ صہبان میں پیدا ہوئے اور بخارا یا سنجر میں پرورش پائی بعض لوگ آپ کی جائے پیدائش سنجر مانتے ہیں لیکن آپ صہبان میں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ "معین الہند" ص ۱۶۔)

۱۔ بحوالہ (۱) معین الہند، ص ۲۳۔ (۲) سیر العارفین از حامد بن فضل اللہ جمالی مترجم محمد ایوب قادری ص ۲، مرکزی اردو بورڈ لاہور۔

۲۔ مجھے جناب حبیب فائق کی لاہوری سے سفینۃ الاولیاء (فارسی) کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جسے یار محمد مرید حضرت خواجہ حافظ غلام حسن شہید نے لکھا اور ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۸۰ھ کو مکمل ہوا۔ اس کتاب کے ۳۲۶ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں ص ۹۳ پر عثمان ہارونی سے خلافت حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ سفینۃ الاولیاء ص ۹۲ کے مطابق "قلب وقت و گمانہ عصر بودہ اند..... قبر در مکہ معظمہ است۔"

میں پہنچے اور ان کے دست حق پر بیعت کی۔ تقریباً دو ڈھائی سال یہاں رہے اور ریاضت و مجاہدہ کی سخت کوشش کی اور ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا^(۱)۔ پھر بغداد تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی سے ملاقات ہوئی۔ بغداد سے آپ شام، کرمان اور وہاں سے ہندوستان تقریباً، ۵۵ھ میں پہنچے۔ اسی دوران میں مختلف جگہوں پر پھرتے رہے اور ہر جگہ فیوض باطنی کے حصول کے لئے بڑی ریاضت کی۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تصوف کے انتہائی ارتقاء کا زمانہ ہے جس قدر صوفیاء کرام ان دو صدیوں میں نظر آئے ہیں وہ کسی اور دور میں نہیں ملتے۔ اس کی وجہ اس زمانے کے حالات ہیں۔ خواجہ معین الدین اجمیری کی ہندوستان تشریف آوری بھی اسی زمانے اور حالات کی بدولت ہے۔ آپ کا ہندوستان تشریف لانا، اجمیر جیسے زبردست سیاسی و مذہبی مرکز میں قیام فرمانا، یہاں پر روحانی اور سماجی انقلاب لانا، یہ سب آپ کے بلند حوصلے اور زبردست قوت ارادی کی عکاسی ہے۔ جب خواجہ صاحب ہندوستان تشریف لائے اس دور کی ہندوستان کی سماجی صورت حال خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں کچھ اس طرح تھی،

”ہر شخص نہ صرف“ اسیر امتیاز مالتو“ بلکہ ایک دوسرے سے برسر پیکار اتحاد و فکر و عمل کا کہیں دور دور تک نام نہ تھا۔ چھوت چھات نے مدنی زندگی کے سارے سرچشمے مسموم کر دیئے تھے۔ زندگی کی ساری لذتیں اونچی ذات کے لوگوں کیلئے مخصوص تھیں۔ غریب عوام جن مصائب میں مبتلا تھے ان کی دردناک تصویر ابو الریحان البیرونی نے ”کتاب الہند“ میں پیش کی ہے۔ زندگی ان کے لئے بوجھ

۱- حوالہ کے لئے دیکھئے

(۱) معین الہند، ص ۳۰ (۲) سیر العارفين، ص ۳- (۳) مرآة الاسرار (جلد دوم) ص ۳۵

(۴) سیر الاولیاء، ص ۵۱ - اخبار الاخیار، ص ۵۵۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۸، اور سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ آپ

نے بیس برس تک عثمان ہارونی کی خدمت کی (بحوالہ سیر الاولیاء، تالیف سید محمد مبارک کرمانی ”میر خورد“ ترجمہ

غلام احمد بریاں، الکتاب، لاہور ۱۹۸۲ء)

۲- بحوالہ ”معین الہند“ ص ۲۷-

تھی۔ اللہ نے انہیں آدمی بنایا تھا، لیکن اس کے بندوں نے انہیں جانوروں
کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔^(۱)

اعجاز الحق قدوسی کے الفاظ میں

”آپ کے تشریف لانے سے قبل ہندوستان میں عقائد و فکر کی گمراہیاں پھیلی ہوئی
تھیں۔ لوگ صحیح فکر اور صحیح عقیدہ سے محروم تھے۔ طبقاتی تفاوت اور ذات پات
نے تمدنی زندگی کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ غریبوں کے لئے زندگی ایک
بوجھ تھی۔“^(۲)

آگے چل کر سیرالادبیاء (عربی) کے حوالے سے اس دور کی تاریکیوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے
آپ کی تشریف آوری سے قبل سارے ہندوستان میں کفر و بت پرستی کا رواج
تھا۔ اور ہندوستان کا ہر شخص سرکشی اور انا د بکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرتا
تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدائے عزوجل کا شریک ٹھہراتے تھے اور وہ سب پھرتے،
ڈھیلے، درخت، چوپائے، گائے اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر
کی تاریکی سے ان کے دلوں کے قفل اور بھی تاریک اور مضبوط ہو رہے تھے۔^(۳)

ایسے حالات میں خواجہ معین الدین اجمیری ان کے لئے ایسے دین کا پیغام لائے جس میں ذات
پات، چھوت چھات اور طبقاتی تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں تھی جہاں فضیلت صرف اس شخص
کے لئے تھی جو تقویٰ میں دوسروں سے افضل تھا۔ آپ نے یہ سب کچھ صرف زبانی ہی نہیں بلکہ
عملی طور پر پیش کیا۔ خلیق احمد نظامی کے بقول

”حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے چھوت چھات کے اس بھیانک ماحول میں
اسلام کا نظریہ ”توحید“ عملی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف ایک تخیلی چیز

۱۔ تاریخ مشائخ چشت از علامہ خلیق احمد صد ۱۴۳۳ھ دارالمؤلفین اسلام آباد (۲) ”اقبال کے محبوب

صوفیاء“ از اعجاز الحق قدوسی، صد ۱۲۷۷ھ مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع اول، جنوری ۱۹۷۶ء

۲۔ اقبال کے محبوب صوفیاء“ از اعجاز الحق قدوسی، صد ۱۲۷۷ھ مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع اول، جنوری ۱۹۷۶ء

۳۔ ————— ایضاً ————— صد ۱۲۷۷ھ

نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک ایسا اصول ہے جس کو تسلیم کر لینے کے بعد ذات پات کی سب تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کا اعلان تھا۔ ہندوستان کے بسنے والے ہزاروں مظلوم انسان — اس اعلان کو سن کر دوبارہ زندگی کا کیف محسوس کرنے لگے۔ (۱)

خواجہ معین الدین اجمیری کی تبلیغ کے اثر نے پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے مطابق "لوگوں میں نئی مذہبی حس بیدار کر دی۔ ان میں ایمان پیدا کیا۔ ان کے فکر کو نئی زندگی اور نئی قوت بخشی۔ جس نے ذہنی ترقی اور فلاح عمومی کا ایک نیا باب شمالی ہند میں کھول دیا۔" (۲)

خواجہ صاحب نے دین حق کی تبلیغ کی خاطر مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا۔ چنانچہ تبریز، خرقان، ہرات اور سبزہ وار (افغانستان) سے ہوتے ہوئے۔ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ بمطابق ۱۶۵ء کو ملتان تشریف لائے (۳)۔ ملتان میں ان کی آمد کا ایک مقصد ڈاکٹر مہر عبدالحق کے مطابق یہ تھا کہ، "حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری لاہور سے ہندوستان کی طرف جانے لگے تو انہیں ایسی زبان سیکھنے کی ضرورت درپیش آئی جو ان کے قریضہ تبلیغ اسلام میں معاون ثابت ہو سکتی اور جو ہر بڑے مقام پر بولی اور سمجھی جاتی۔"

۱- تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۵

۲- بحوالہ "مقالات دینی و علمی" جلد اول، از پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص ۲۵۷، مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور۔

۳- بحوالہ (۱) معین الدین، ص ۲۹، (۲) خواجہ صاحب ملتان تشریف لائے یہ وہ زمانہ تھا جب شہاب الدین غوری ہندوستان فتح کرنے کے لئے ہندوستان پر حملے کر رہا تھا۔ آخر کار ۵۷۲ھ میں اس نے ملتان اور اُچ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور علی کرمانج کو یہاں کا حاکم بنا گیا۔ شہاب الدین غوری دوبارہ ملتان ۵۷۴ھ میں ملتان آیا اور یہاں سے گجرات کی طرف چلا۔ ۵۸۸ھ میں جب شہاب الدین غوری اجمیر فتح کرنے کیلئے ہندوستان آیا تو ملتان کے راستے لاہور پہنچا اور اجمیر کی طرف چلا گیا تھا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے "تاریخ فرشتہ" جلد اول از محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ عبدالحق خواجہ، ص ۲۱۵-۲۱۸-۲۲۲، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

پہنا پنچہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ ملتان تشریف لے گئے (۱)۔
 خواجہ معین الدین چشتی نے پانچ سال (۲) تک ملتان میں قیام فرمایا۔ قیام ملتان کے دوران
 انہوں نے یہاں کے عوام کی بولی بھی سیکھی، بقول شیخ اکرام
 "لاہور سے (بقول بعض تذکرہ نگاران) آپ ملتان تشریف لے گئے جہاں
 آپ نے طویل قیام کر کے ہندوستانی زبان میں بھارت تامہ حاصل کی (۳)۔
 اس ہندوستانی زبان کے بارے میں علامہ عتیق فکری یوں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں،
 "ملتان کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے عوامی زبان
 کو تبلیغ اسلام کی خاطر ملتان ہی سے حاصل کیا۔ اس سے یہاں کی عوامی زبان
 (جو قدیم سرائیکی کے سوا اور کون سی ہو سکتی ہے) اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے
 کہ راجپوتانہ اور شمالی ہند میں سمجھی جاتی ہوگی؟ (۴)
 معین الدین احمد چشتی اسے سنسکرت اور پراکرت زبان بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں،
 "اولاً آپ براہ قلعہ شادمان ملتان میں رونق افروز ہوئے۔ یہاں آپ
 نے کچھ عرصہ (تقریباً پانچ سال) قیام کر کے سنسکرت و پراکرت پر عبور حاصل کیا۔ (۵)
 اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں،

-
- ۱۔ بحوالہ "سرائیکی زبان اور اس کی ہمسایہ علاقائی زبانیں" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۳، مطبوعہ
 سرائیکی ادبی بورڈ ملتان، اشاعت اول ۱۹۷۷ء
 ۲۔ ملاحظہ فرمائیے (۱) "اقبال کے محبوب صوفیاء" از اعجاز الحق قدوسی، ص ۱۲۶-۱۲۷ (۲) لغات خواجہ
 از معین احمد، ص ۱۶۷-۱۶۸ (۳) "برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء" از قاضی جاوید، ص ۱۸، ادارہ ثقافت
 پاکستان لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء
 ۳۔ بحوالہ "آب کوثر" از شیخ محمد اکرام، ص ۲۰۲
 ۴۔ بحوالہ "نقش ملتان" از علامہ عتیق فکری، ص ۲۲۲۔ مطبوعہ فکری اکیڈمی بشارت مجلس تالیف
 و ثقافت ملتان، بار اول، جنوری ۱۹۸۲ء
 ۵۔ لغات خواجہ از معین الدین، ص ۱۶۷، مطبوعہ معین الادب کراچی، طبع اول، جون ۱۹۷۸ء

” پھر لاہور سے ملتان تشریف لاتے اور یہاں پانچ سال رہ کر ہندوؤں کی زبان سیکھی اور اس طرح آپ نے اسی برصغیر میں سب سے پہلے لسانی عصیت پر ضرب کاری لگائی اور اپنے طرز عمل سے اس حقیقت کو واضح کیا کہ ہر زبان ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ کسی زبان سے تعصب برتنا یا علاقائی عصیت پر اس کا نہ سیکھنا ابلاغ کے ایک بڑے ذریعہ سے محرومی ہے۔ آپ نے اپنے عمل سے اس حقیقت کو بھی واضح کیا کہ لسانی عصیت، محبت یگانگت اور احترام انسانیت کے گلشن کو سرسبز نہیں ہونے دیتی اور معاشرے میں ایک ایسا بگاڑ رونما کرتی ہے کہ وہ قومی وحدت اور سالمیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔“ (۱)

گویا خواجہ معین الدین اجمیری صوفیاء میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے زبان کو قومی وحدت کا ایک ذریعہ بنایا اور زبان کو وسیلہ بنا کر رشد و ہدایت اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُردو کے ابتدائی مربوط جملوں کے سلسلے میں جن بزرگوں کے نام آتے ہیں ان میں بھی خواجہ معین الدین اجمیری کا نام بڑا اہم ہے۔ کیونکہ اشاعت دین کے لئے عوام اور عوام سے رابطہ کیلئے عوام کی زبان میں ہی گفتگو کی جاسکتی ہے تاکہ صحیح طور پر تعلیم و تلقین ہو سکے۔ ظاہر ہے عوام کو بات سمجھانے کے لئے جب تک ان کی زبان سے واقفیت نہیں ہوگی کیسے بات سمجھائی جاسکتی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے نہ صرف زبان سے واقفیت حاصل کی بلکہ زبان کے اہم مراکز میں رہ کر اس زبان کا صحیح شعور بھی حاصل کیا جو عوام میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ملتان میں ان کے قیام کا ایک بڑا مقصد اس عوامی زبان میں مہارت حاصل کرنا بھی تھا جو نہ صرف اس علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ یہ دوسرے علاقوں میں بھی عوام میں ذریعہ اظہار تھی۔ چنانچہ اس زبان کو سیکھنے کے بعد خواجہ معین الدین دہلی اور اجمیر تشریف لے گئے اور اس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اُردو کے ابتدائی جملوں میں خواجہ معین الدین اجمیری کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ملک محمد جانی علیہ الرحمۃ کی کتاب ”اکھروتی“ کی شارح سے اس طرح کرتے ہیں

”— ادلیار اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ، زیرا کہ جملہ ادلیار اللہ در ملک

عرب مخصوص نہ بودہ۔ بس بہر ملک کہ بودہ زبان آل ملک را بکار بودہ اندوگمان

۱۔ بحوالہ ”اقبال کے محبوب صوفیاء“ ص ۱۲۶۔

نکند کہ بیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیر کہ اول از جمیع اولیاء اللہ
قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملتہ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زبان
سخن فرمودہ ۱۱

اگرچہ خواجہ صاحب کا ہندی زبان میں کوئی قول نہیں ملتا۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے
یہاں کے لوگوں سے ان کی زبان ہی میں گفتگو کی ہوگی۔ پھر ان کا پیشہ بھی طب تھا جس کی وجہ
سے ہر قسم کے مریضوں سے ان کا واسطہ رہتا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ قیاس ظاہر کرتی ہیں کہ
"ان کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کا پیشہ طب تھا۔ یعنی
ان کو رات دن عوام سے سابقہ رہتا تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ خواجہ صاحب
ہندوستانی مریضوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرتے، فرماتے تھے" (۱)

ملتان کے لئے ان کا سفر اور قیام اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ آپ نے عوام کی زبان
سیکھی تاکہ اس میں گفتگو کر سکیں۔ آپ کی تصنیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔
۱۔ انیس الارواح — اس کتاب میں آپ نے اپنے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہرودی کے
ارشادات کو جمع کیا ہے۔ آپ جو کچھ مجلس میں فرماتے خواجہ صاحب اسے لکھ لیتے۔ یہ کتاب فارسی
میں ہے۔

۲۔ کشف الاسرار — اسے "معراج الانوار" بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب تصوف پر ہے۔

۳۔ کنج اسرار (۲) — اسے گنج اسرار بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب آپ نے خواجہ عثمان ہرودی

۱۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرم کا حصہ "ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص ۸، مطبوعہ انجمن

ترقی اُردو پاکستان، ہالٹے اُردو روڈ کراچی نمبر ۱، اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء

۲۔ "اُردو نثر کا آغاز، ارتقاء" (۱۹ ویں صدی کے اوائل تک) "ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ص ۲۵، مطبوعہ

کریم سنز، پبلشرز، کراچی، طباعت اول ۱۹۷۸ء، تھیسز برائے پی ایچ ڈی (جامعہ عثمانیہ، بھارت)

۳۔ "خواجہ غریب نواز" از ادارہ تصنیف و تالیف مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت سوم،

۷۸ء ص ۱۰۰، پرمعین الدین اجیری کی اس کتاب کا نام "گنج الاسرار" بتایا گیا ہے جس کا اُردو ترجمہ مخزن الکلم

کے نام سے چھپا ہے۔

کے کہنے پر سلطان شمس الدین التمش کی تعلیم و تلقین کے لئے لکھی تھی جس میں تصوف کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ آپ نے سلطان التمش کو اس کتاب کی تعلیم دینے کے لئے کچھ عرصہ دہلی میں قیام فرمایا۔

۴۔ رسالہ تصوف منظوم — یہ کتاب آپ کے بلند افکار اور طرز شاعری کی آئینہ دار ہے۔

۵۔ رسالہ آفاق و انفس — اس میں تصوف کے چند نکات پر بحث ہے۔

۶۔ حدیث المعارف — یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔

۷۔ رسالہ موجودیہ — یہ کتاب بھی نادر الوجود ہے۔ (۱)

۸۔ دیوان معین یا دیوان خواجہ کے نام سے فارسی کا ایک دیوان بھی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ دیوان صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ غزلوں کی تعداد ۱۲۱ ہے (۲) ان غزلوں میں تصوف کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ سب سے پہلے اس دیوان کو مطبع نولکشتر نے ۱۲۸۸ھ میں بمطابق ۱۸۷۱ء شائع کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دیوان خواجہ معین الدین اجمیری کا نہیں بلکہ مولانا معین الدین ہرودی کا ہے (۳)۔ لیکن کچھ لوگ اسے خواجہ معین الدین اجمیری کے نام سے منسوب کرتے ہیں (۴)۔ غزلیات میں کہیں کہیں ہندی کارنگ بھی چھلکتا ہے ان کے علاوہ آپ کی کتابیں ہیں جن کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خواجہ صاحب ان کتابوں کے ساتھ ساتھ مجلس میں تعلیم و تلقین بھی کرتے تھے۔ یہ موضوعات زیادہ تر پیر کی خدمت، پاکیزگی، طہارت، نماز، محبت میں صداقت، قہقہہ اور لہو و لعب کی مذمت، گریہ و زاری، قبرستان کے آداب، قلب کی اصلاح، رشد و ہدایت کی ضرورت، اطاعتِ خداوندی اور قرآن پاک کی مختلف سورتوں

۱۔ خواجہ صاحب کی تصنیفات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے

(الف) معین الہند، ص ۱۱۱ تا ۱۱۶۔ (ب) خواجہ غریب نواز، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱

۲۔ ملاحظہ فرمائیے، دیوان خواجہ غریب نواز (لمحات خواجہ) ص ۳۸۵ تا ۵۰۶، مطبوعہ معین الادب

کراچی، لمحات طبع اول، جون ۱۹۷۸ء

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) مقالات شیرانی از حافظ محمود شیرانی، مطبوعہ کتاب منزل لاہور

(ب) آب کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۲۰۹-۲۰۸۔ (ج) خواجہ غریب نواز، ص ۱۰۱۔

۴۔ ملاحظہ فرمائیے "لمحات خواجہ" ص ۲۸۱ تا ۳۸۴۔

کی اہمیت سے متعلق ہوتے تھے۔ آپ کے ملفوظات کو آپ کے مرید قطب الدین بختیار کاکی نے "دلیل العارفین" کے نام سے اکٹھا کیا۔ آپ نے قطب الدین بختیار کاکی کو جو خطوط لکھے تھے وہ بھی "اسرار الواصلین" کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی تصوف کے نکات پر بحث ملتی ہے۔^(۱)

آپ کے خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشہی کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد خواجہ حمید الدین ناگوری کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ آپ کے بے شمار خلفاء ہیں۔

خواجہ معین اجمیری کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس سال خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات ہوئی۔ آپ کا انتقال بھی چند ماہ کے بعد اسی سال ہوا۔ اور یہ سال ۶ رجب ۶۳۳ھ ہے۔^(۲)

خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیمات میں انسان دوستی، محبت و اخلاص، اخوت و مساوات عدل و انصاف، مظلوم کی حمایت، بے غرض خدمت اور نفرت و تعصب سے ماوراء سماج کے قیام کا تصور شامل ہے۔ وہ ظاہری عبادات سے زیادہ انسان کی بے لوث خدمت کو ترجیح دیتے تھے۔ گویا وہ حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کے قائل تھے۔ فنون لطیفہ میں موسیقی کو بہت اہمیت دیتے

۱- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "معین الہند" ص ۱۵۶ تا ۱۶۴۔

۲- حوالے کے لئے دیکھیے (۱) آب کوثر، ص ۲۰۸۔ (۲) اخبار الانبیاء از عبدالحق محدث دہلوی (اُردو ترجمہ)

ص ۶۱-۶۲۔ (۳) خواجہ غریب نواز، ص ۶۸۔ (۴) گلزار ابرار، از محمد غوثی شطاری (اُردو ترجمہ) ص ۲۹۔

(۵) سیر العارفین (حاشیہ) ص ۲۰۔ (۶) تذکرہ خواجہ معین الدین اجمیری، مؤلف حضرت مولانا معین الدین، ص ۲۱۱

مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ لاہور (۷) معمولات مظہریہ و محبوب العارفین، ص ۴۴۔ ان سب کتابوں میں خواجہ

معین الدین اجمیری کا سنہ وفات ۶۳۳ھ دیا گیا ہے۔ جبکہ معین الہند کے مصنف مسالک السالکین، جلد دوم

ص ۲۵۵۔ کے حوالے سے ۶۲۷ھ لکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ۶۳۲ھ اور ۶۳۳ھ سنہ وفات کے

بارے میں بھی اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ بہر حال زیادہ تر مصنفین کا اتفاق ۶۳۳ھ پر ہے۔ برات الامراء

میں ص ۵۱ پر ۶۳۲ھ ہے۔

تھے۔ سماع سے انہیں خاص رغبت تھی۔ برصغیر پاک و ہند میں سماع کی محفلوں کو رواج دینے میں حضرت معین الدین اجمیری کا خاص ہاتھ ہے۔ قاضی جاوید کے مطابق

”خواجہ معین الدین چشتی موسیقی کو روحانی ارتقا کے لئے ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ ان کا رویہ سید علی ہجویری سے مماثلت رکھتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں وہ اس امر پر خاص طور پر زور دیتے ہیں کہ غیر روحانی مقاصد کے لئے موسیقی کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔“ (۱)

قطب الدین بختیار کاکی اوشی | اپنے مرشد حضرت معین الدین اجمیری کی

طرح قطب الدین بختیار کاکی بھی عارضی قیام کی خاطر طمان تشریف لائے۔ خواجہ معین الدین اجمیری کے نامور خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی ۵۶۹ھ میں مقام اوش میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام بختیار لقب کاکی (۲)۔ اور خطاب قطب الاقطاب تھا۔ جو ان کے مرشد معین الدین اجمیری کا عطا کردہ تھا ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے معلم ابو حفص سے حاصل کی۔ اس کے بعد ۵۸۲ھ میں بغداد میں معین الدین اجمیری سے بیعت کی (۳)۔ جب خواجہ معین الدین اجمیری سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے تو

۱۔ انیس الارواح میں اس کی سختی سے مخالفت درج ہے۔

۱۔ بحوالہ ”برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا“ ص ۱۹

۲۔ بحوالہ (۱) دلی کے بانیس خواجہ، از ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، ص ۱۴، مطبوعہ پیشتر دہلی۔ (۲)

قطب صاحب کی تاریخ ولادت ”انبار الاخبار“ ص ۵۹ میں ۵۰۵ھ درج ہے جو کہ قرین قیاس نہیں ہے اس لئے کہ آپ کا سنہ وفات ۶۳۳ھ ہے۔ اگر ۵۰۵ھ کو درست مان لیں تو آپ کی عمر ۱۲۸ سال بنتی ہے جو درست نہیں ہے۔ اس لئے ۵۶۹ھ ہی ٹھیک ہے۔ (۳) اردو نثر کا ارتقا، ص ۲۵ پر ۶۸۲ھ اور خواجہ غریب نواز، ص ۴۵ پر ۵۲۸ھ درج ہے۔

۳۔ کاکی کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ دہلی میں رہتے تھے تو عبادت میں مصروف رہتے تھے

اور کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ جب گھر میں فاقہ زیادہ ہوتا تو آپ کی بیوی ہمسائے سے ادھار لے آتی۔ ایک دن ہمسائے کی بیوی نے کہا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو تم کہاں سے ادھار لیتیں۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

قطب صاحب بھی ان سے ملاقات کے لئے ہندوستان چلے آئے اور پہلے ۵۹۰ھ (۱۱۹۲ء) میں ملتان تشریف لائے۔ ان دنوں ملتان بقول ظہور الحسن شارب "علم و فن کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے عالم یہاں رہتے تھے۔ لوگ دور دراز سے تحصیل علم کی غرض سے ملتان آتے تھے" (۱)۔

جب خواجہ بختیار کاکی ملتان تشریف لائے تو انہی دنوں بابا فرید گنج شکر بھی حصول علم کی خاطر ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز بختیار کاکی وہاں تشریف لے گئے تو بابا فرید گنج شکر کتاب "نافع" کے مطالعے میں مصروف تھے۔ خواجہ قطب سے ملاقات ہوئی تو آپ بہت متاثر ہوئے اور ان کے قیام ملتان کے دوران ہی میں ان کے دستِ حق پر بیعت کر لی (۲)۔ ملتان میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔ بابا فرید نے آپ کے ساتھ جانا چاہا۔ لیکن آپ انہیں تعلیم مکمل کرنے کی تلقین کر کے ملتان سے رخصت ہوئے۔ بختیار کاکی کافی عرصہ دہلی میں رہے۔ اسی دوران اپنی والدہ محترمہ سے ملنے ۶۰۲ھ میں اوش اور پھر وہاں سے

(بقیہ گذشتہ صفحہ)۔۔۔ آپ کی بیوی نے آپ کو بتایا تو آپ نے قرض لینے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ جب ضرورت ہو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر حجرہ کے طاق سے روٹیاں اٹھالی جائیں ان روٹیوں کو "کاک" کہتے ہیں۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) دلی کے بامیں خواجہ، ص ۲۰۔ (۲) سیر العارفين، ص ۳۱-۳۲۔

(۳) سفینۃ الاولیاء، ص ۱۳۰۔ (۴) مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۱۳۲۔ (۵) سیر الاولیاء، ص ۵۵۔ (۶) اخبار الاخبار، ص ۶۰۔

۴۔ (الف) "تذکرہ خواجگان چشت" میں لکھا ہے کہ سترہ سال کی عمر میں بیعت کی۔ بحوالہ تذکرہ خواجگان چشت، اردو ترجمہ، سیر الاقطاب، ص ۱۶۰۔ مصنف حضرت الہدایہ ابن شیخ عبدالرحیم، مترجم محمد معین الدین دردانی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔

(ب) "سیر الاولیاء" میں ص ۵۴۔ بیعت کا سنہ ۵۲۳ھ درج ہے جو درست نہیں ہے۔

۱۔ بحوالہ "دلی کے بامیں خواجہ" ص ۲۹۔

۲۔ (الف) "دلی کے بامیں خواجہ" ص ۳۱ (ب) سیر الاولیاء، ص ۶۸۔

بغداد گئے۔ بغداد میں آپ کو حضرت جلال الدین تبریزی سے معلوم ہوا کہ خواجہ معین الدین اجمیری ہندوستان تشریف لے گئے ہیں اور دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ یہ سن کر آپ شیخ جلال الدین تبریزی کے ہمراہ پھر ہندوستان کی جانب روانہ ہوئے اور راستے میں پھر ۶۱۱ھ میں جلال الدین تبریزی کے ہمراہ ملتان میں کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ اس زمانے میں ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا شاد ہدایت کافر فیضہ انجام دے رہے تھے اور قباچہ بیگ ملتان کا حاکم تھا۔ بزم ملوکیہ میں لکھا ہے کہ ۶۲۱ھ میں چنگیز خانیوں نے سندھ پر یورش کی تو بڑھتے ہوئے قباچہ کے دارالسلطنت ملتان تک پہنچ گئے۔ سراسیمگی کی حالت میں قباچہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ تینوں مشائخ اس وقت ملتان ہی میں یک جا جلوہ فرماتھے۔ قباچہ نے ان تینوں سے روحانی امداد کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ قطب الدین نے قباچہ کو ایک تیر دے کر کہا کہ لڑائی کے وقت اس کو اپنے برج حصار سے دشمن کی طرف پھینکو، پھر قدرت الہی کا تماشا دیکھو۔ دوسرے دن قباچہ نے ایسے ہی کیا اور اس کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی۔“ فوائد الفواد میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

”وقتی شیخ بہاء الدین زکریا و شیخ جلال الدین تبریزی و شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین در ملتان بودند لشکر کافری زیر پاسی ملتان آمد والی ملتان قباچہ بود شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ المبارک شہی تیری بدست قباچہ داد و گفت این تیر را عمیاء جانب کافر بفرست۔ قباچہ ہم چنان کرد چوں روز شد یکتن از کافر نماید ہمہ رفتہ بودند“ (۲)

۱۔ بحوالہ ”بزم ملوکیہ“ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمان، ص ۳۶، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۷۲ھ
 ۲۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) نقش ملتان، از علامہ عتیق فکری، ص ۴۳۸۔ (ب) سیر العارقیں (اردو ترجمہ) ص ۲۵، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔

۲۔ بحوالہ ”فوائد الفواد“ (فارسی) جلد سوم، مرتبہ حضرت امیر حسن علاء سنجرى المعروف بہ حسن دہلوی، ص ۱۰۸، مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۳۰۲ھ

جب بختیار کاکی اور جلال الدین تبریزی ملتان چھوڑنے لگے تو قباچہ نے انہیں ملتان میں روکنے کی بہت کوشش کی۔ بختیار کاکی نے فرمایا کہ جلال الدین غزنی جائیں گے اور وہ خود دہلی، ملتان کی سرزمین پر بہار الدین زکریا کا تصرف اور سایہ کافی ہے^(۱)۔ ملتان سے خواجہ صاحب دہلی تشریف لے گئے اور اپنے مرشد (معین الدین اجمیری) کے حکم سے کیلوکڑی کے مقام پر قیام فرمایا۔ یہ مقام شہر سے کافی فاصلے پر تھا اور لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف رہتی تھی۔ اس لئے آپ سلطان شمس الدین التمش کی درخواست پر پہلے مہرولی میں رہے۔ کچھ عرصہ قاضی حمید الدین ناگوری کے ہاں گزارا اور آخر اعزاز الدین کے قریب رہائش اختیار کر لی۔ جن دنوں خواجہ صاحب دہلی میں مقیم تھے۔ سلطان شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ تھا اور حضرت جمال الدین محمد بسطامی شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے انتقال کے بعد التمش نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے التجا کی کہ وہ شیخ الاسلام کا عہدہ قبول کر لیں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ آخر شیخ الاسلام کا عہدہ نجم الدین صغریٰ کے سپرد ہوا^(۲)۔ دہلی میں خواجہ صاحب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ لوگ ان کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ جس سے نجم الدین صغریٰ کو حسد پیدا ہوا^(۳)۔ چنانچہ جب خواجہ معین الدین اجمیری صاحب دہلی تشریف لائے تو آپ ان سے ملنے کے لئے نہ گئے۔ خواجہ معین الدین کو رنج ہوا تو آپ خود ملنے چلے آئے۔ لیکن شیخ الاسلام سرد مہری سے ملے۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) سیرالادلیار، ص ۵۰۔ (ب) دلی کے بانس خواجہ، ص ۳۵۔ (ج) ترجمہ تاریخ فرشتہ (اردو) جلد دوم، ص ۵۷، ۵۸، مطبع نامی گرامی منشی نوکشور (د) تذکرہ خواجگان چشت اردو ترجمہ، سیرالاقطاب، ص ۱۷۳۔ (د) سیرالعارفین (اردو ترجمہ) ص ۲۸۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) سیرالعارفین ص ۲۸، ۲۹، (ب) دلی کے ۲۲ خواجہ، ص ۳۸، ۳۹۔
 ۳۔ شیخ محمد اکرام کے مطابق — ”شیخ نجم الدین صغریٰ — ایک باخدا بزرگ تھے اور حضرت خواجہ بختیار کاکی سے ان کی نہ بن سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب کو سماع کا شوق تھا۔ اور شیخ الاسلام اس پر اعتراض کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیخ الاسلام کو یہ بھی ناگوار تھا کہ لوگ خواجہ صاحب کا ادب مجھ سے زیادہ کرتے تھے۔“
 (سوالہ ”آپ کوثر“ ص ۲۱۲)

۳۔ سیرالادلیار، ص ۶۱۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلامی کی شہرت نے تمہارے دماغ کو برہم کر دیا ہے۔ شیخ نجم الدین نے جواب دیا کہ حضرت میں تو آپ کا ویسا ہی مخلص اور بے ریا معتقد ہوں جیسا بیشتر تھا۔ لیکن آپ نے اس شہر میں ایک ایسا مرید رکھ چھوڑا ہے جس کے مقابلہ میں میری شیخ الاسلامی کوئی شخص جو کی مقدار بھی شمار میں نہیں لاتا۔“ (۱)

خواجہ صاحب نے یہ سُن کر فرمایا کہ وہ بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ لیکن یہ خبر سُن کر سلطان التمش اور دہلی کے باقی لوگ بہت رنجیدہ ہوئے۔ آپ نے ان کی آزر دگی کے پیش نظر قطب الدین بختیار کاکی کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سماع (۲) کے بہت شوقین تھے۔ چنانچہ دہلی میں حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے ساتھ مل کر سماع سنتے رہتے۔ ابتدائی زمانے میں سلطان شہاب الدین غوری نے سماع سنتے سے منع کیا۔ لیکن آپ نے انہیں کہلوا بھیجا،

”اے سنگ دل! تو سماع کا مرتبہ کیا جانے۔ تیرے لئے یہ حرام ہے لیکن ہمارے

لئے یہ مباح ہے۔ یہ اللہ کی خاص نعمت ہے جو ہر شخص کو عطا نہیں ہوتی۔ جس کو

یہ نعمت عظیم عطا ہوتی ہے وہی اس کی قدر جانتا ہے۔“ (۳)

سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں بھی شہر کے قاضی اور مفتی نے سماع سنتے سے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن قائل نہ کر سکے (۴)۔ سماع سے آپ کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی تھی (۵)۔ سماع کے دوران آپ پر وجد طاری رہتا، بے خود ہو جاتے۔ بعض اوقات تو کئی کئی دن بے ہوش رہتے لیکن نماز کے وقت ہوش آجاتا اور آپ نماز ادا کرتے۔ خواجہ صاحب کی سماع

۱- سیر الاولیاء، ص ۶۱۔

۲- سماع کے جواز اور طریق سے متعلق ملاحظہ ہو، علی الجویری لاہوری کی کتاب ”کشف المحجوب“۔

۳- بحوالہ، تذکرہ خواجگان چشت، اردو ترجمہ سیر الاقطاب، ص ۱۷۶۔

۴- تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے (۱) تذکرہ خواجگان چشت، اردو ترجمہ سیر الاقطاب، ص ۱۷۹-۱۷۷۔

۵- تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے روضۃ اقطاب، ص ۶۲، مصنفہ صاحبزادہ سید محمد بلاق، مطبع محب ہند دہلی، ۱۱۲۴ھ۔

سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی وفات بھی اسی عالم میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سماع کی محفل میں قوال نے شیخ احمد جام کا یہ شعر پڑھا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہرزمان از غیب جانِ دگیر است

(ترجمہ: خنجر تسلیم درضا کے شہیدوں کو ہر گھڑی غیب سے ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔)

خواجہ صاحب پراس شعر کا اتنا اثر ہوا کہ چار روز عالمِ تحیر میں رہے اور پانچویں روز پودہ ربیع الاول ۶۳۲ھ (۱۲۳۵ء) کو اسی عالم میں وفات پلگئے^(۱)۔ خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ وہی شخص پڑھائے جس نے کبھی حرام نہ کیا ہو اور عصر کی سنت و پہلی تکبیر کبھی نہ چھوڑے ہوں۔ ایسا شخص ملنا مشکل تھا۔ آخر سلطان التمش آگے بڑھے اور فرمایا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری حالت کسی پر ظاہر ہو لیکن اب مجبور سی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نماز

۱- (۱) فوائد الفواد (اردو) ص ۲۹۱، ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، ترجمہ پر و فیسر محمد سرور، مطبوعہ

علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۷۲ء (۱۳۹۳ھ)۔ (۲) سفینۃ الاولیاء (فارسی) ص ۹۶-۹۷ (۳)

معمولات منظریہ و محبوب العارفین، ص ۱۲۲-۱۲۳، جواہر فریدی از اصغر علی حسینی، ص ۱۷۷، مطبوعہ وکٹوریہ پریس

لاہور، ۱۳۰۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول ۶۳۲ھ (۵) تذکرہ خواجگانِ چشت، ص ۱۳۸، پر ۱۲ ربیع الاول ۶۳۵ھ

(۶) مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۱۳۵، اخبار الاخیار ص ۶۱، سیر الاولیاء ص ۶۳، سیر العارفین، ص ۴۱

اور دلی کے باتیں خواجہ، ص ۵۲، پر آپ کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۶۳۳ھ ہے۔

سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ

”قاضی محی الدین کاشانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں بیان کرتے تھے کہ جس

سنہ میں سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا اور اسی سال شیخ الاسلام قطب الدین بختیآ

کا کی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس دارِ ناپائیدار سے عالم جاودانی میں انتقال فرمایا۔ نیز اسی

سنہ میں مولانا قطب الدین کاشانی نے یہیں وفات پائی۔ اس نقل سے حضرت سلطان المشائخ

نے سلطان شمس الدین التمش کی تاریخ انتقال نکالی اور یہی تاریخ بیت ارشاد فرمائی۔

۶ بسال کشش صدوسی و سہ (۶۳۳ھ) بود از ہجرت نماز شاہ جہان شمس دین عالمگیر، لیکن شیخ الاسلام

قطب الدین قدس سرہ کا انتقال ۱۲ ربیع الاول سنہ مذکور کو واقع ہوا ہے۔ (سیر الاولیاء، ص ۶۳)

جنازہ پڑھائی اور آپ کو اسی جگہ دفن کیا جو زمین آپ اپنی قبر کے واسطے خرید فرما گئے تھے۔ (۱) آپ کے بہت سے خلفاء ہیں جنہوں نے آپ کی تعلیمات کو آگے بڑھایا۔ ان میں سرفہرست فرید الدین مسعود گنج شکر ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ بدر الدین غزنوی، شیخ بدر الدین موئے تاب، شیخ نجم الدین قلندر، مولانا برہان الدین حلوانی، مولانا فخر الدین حلوانی، شیخ ضیاء رومی، شیخ برہان الدین بلخی وغیرہ مشہور ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علمی ذوق بھی رکھتے تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ دلیل العارفین — اس کتاب میں آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ملفوظات اکٹھے کئے ہیں۔

۲۔ زبدۃ الحقائق — یہ کتاب شائع نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کی تفصیل ملتی ہے۔

۳۔ رسالہ — اس نام سے آپ نے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔

خواجہ صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ شاعر بھی تھے۔ ایک مثنوی آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک فارسی کا دیوان آپ کے نام سے منسوب ہے۔ جس میں آپ نے قطب الدین اور "قطب دین" کا تخلص استعمال کیا ہے۔ (۲)

خواجہ صاحب کی تعلیمات کو ان کے مرید فرید الدین گنج شکر نے "فوائد العالکین" کے نام سے کتاب میں جمع کیا ہے۔ آپ کی تعلیمات میں خصوصاً ان باتوں پر زور دیا گیا ہے کہ مرشد کو کمال ہونا چاہیے کہ جب کوئی مرید بیعت کے لئے اس کے سامنے حاضر ہو تو وہ اس کے دل سے تمام دنیاوی آلائش کو نکال دے۔ مرد کی کمالیت ان چار باتوں میں ہے کہ کم سوائے، کم بولے، کم کھائے اور خلوق سے کم صحبت رکھے، نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے تکبیر کہی جائے۔ درویش کا کھانا

۱۔ آپ نے عید کے دن عید گاہ سے واپسی پر مہرولی (نزد نئی دہلی) کے مقام پر اپنے مرقد کے لئے

زمین خریدی اور فرمایا مجھے یہاں سے بونے عشق آرہی ہے جو لے کے لئے دیکھئے (۱) سیر العارفین، ص ۴۱۔

(۲) سیر الاولیاء، ص ۶۲۔ (۳) دلی کے ۲۲، خواجہ، ص ۵۳۔ (۴) فوائد الفواد، ص ۲۶۲۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "دلی کے ۲۲، خواجہ" ص ۶۳ - ۶۲۔

بھی عبادتِ الہی کا ایک حصہ ہو اور وقتِ طعام کسی سے گفتگو نہ کرے۔ اس کے علاوہ آپ نے تصوف کے مختلف مراحل کے بارے میں بھی گفتگو فرمائی۔

قطب الدین بختیار کاکی سے اُردو کا ایک جملہ منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ کے مرید فرید الدین گنج شکرؒ جو اہر فریدیؒ میں قطب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ (بابا فرید) اپنے مرشد شیخ قطب الدین کو وضو کر رہے تھے۔ شیخ فرید نے اُشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھ پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ قطب الدین بختیار کاکی نے سبب دریافت کیا۔ آپ نے ہندی میں جواب دیا کہ ”آنکھ آئی ہے“

بختیار کاکی نے فرمایا

”اگر آنکھ آئی ہے اس راجہ بستہ اید ۹۔“ (۱)

۵۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ | ملتان کے صوفیاء میں سب سے

زیادہ شہرت حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کو حاصل ہوئی ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے مریدوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دوسرے اس لئے کہ ان کو سیاسی طور پر اقتدار حاصل رہا اور ان کے تعلقات بادشاہوں اور حکمرانوں کے ساتھ رہے (۲)۔ یعنی آپ ان بزرگوں میں سے تھے جو مذہب اور سیاست کے ملاپ کے لئے حکمرانوں سے تعلقات قائم کئے رہے

۱۔ جو اہر فریدی، ص ۲۸، مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور، ۱۳۰۱ھ (خواجہ صاحب کے اس جملے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، حکیم شمس اللہ قادری ”اُردوئے قدیم“ میں حافظ محمود شیرانی ”مقالات شیرانی“، ص ۱۳۸، جلد اول، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۶ء میں اور محمد غوث قلندری پانی پتی کے ملفوظ تذکرہ غوثیہ میں تو یہی جملہ درج ہے لیکن ڈاکٹر رضیہ سلطانیہ ”اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء“ میں ص ۲۶ پر اسے اس طرح لکھتی ہیں ”اگر آنکھ آئی ہے تو سو آئی ہے۔“

۲۔ ڈاکٹر شمیم زیدی لکھتی ہیں ”حضرت شیخ بہاء الدین زکریا دربار کے ساتھ رابطہ استوار رکھتے اور امراء و حکام کے ساتھ ان کی آمد و رفت تھی (ہو سکتا ہے کہ حضرت خود بھی تشریف لے جاتے ہوں) (ملاحظہ فرمائیے احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین ص ۲۸، مطبوعہ انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان)

اس طرح ایک طرف تو وہ حکمرانوں کو مذہب کی اعانت دیتے رہے۔ دوسری طرف خود بھی سیاسی طور پر مقتدر رہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ بطور صوفی بھی ملتان میں ان کی ولایت قائم رہی، مختلف صوفیاء نے ملتان میں ان کی سربراہی اور ولایت کو قبول کیا۔
ضیاء الدین برنی کے مطابق۔

”شیخ بہاء الدین زکریا کو سالکوں اور خدا طلبوں میں ”سفید باز“ کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بھی ان کے بازوؤں سے خود کو باندھ لیا وہ خدا تک پہنچ گیا!“

ملتان میں سہروردیہ سلسلے کے مؤسس اعلیٰ شیخ بہاء الدین زکریا ۲۴ رمضان ۵۶۶ھ کو ملتان کے نزدیک قصبہ کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق قریش مکہ^(۱) کے معزز

۱- تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) مترجم ڈاکٹر سید معین الحق، ص ۵۰۸، مرکزی اردو بورڈ لاہور، بار اول اکتوبر ۶۹ء

۲- ”آب کوثر“ ص ۲۵۵۔

۳- آپ کے سن ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (۱) تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتان از نور احمد فریدی

ص ۲۰-۲۱، سیر العارفین ص ۱۱۲-۱۱۳، اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۱۳-۱۴، تواریخ ملتان از حکیم چند، ص ۳۱

(۵) نزہت الخواطر، ص ۲۳۲-۲۳۳، تذکرہ اولیائے ہند از مولوی عبدالرحمن چشتی، ص ۱۳۱، مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۹۱۲ء۔

(۶) خلاصۃ الاحیاء (قلمی) ص ۴۲-۴۳، سفینۃ الاولیاء (قلمی نسخہ) ص ۱۷۶، مرقومہ یار محمد مرید حضرت خواجہ حافظ

غلام حسن شہید، ۳۰ رمضان المبارک ۱۲۸۰ھ — ان سبہ کتابوں کے مطابق آپ کا سن پیدائش ۲۴ رمضان ۵۶۶ھ

ہے جبکہ مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۱۳۱، مرقع ملتان از اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۲، اور آئین اکبری از ابوالفضل،

ص ۲۰، مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۸۸۲ء کے مطابق ۵۶۵ھ، اخبار الانبیاء، ص ۶۶۳ کے مطابق ۵۶۰ھ اور

تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۳۵۶، حدیقت الاولیاء، ص ۲۹، تحفۃ الابرار از نواب مرزا آفتاب بیگ

ص ۸ (مطبع رنجی دہلی ۱۳۲۳ھ) اور منبع البرکات (اردو ترجمہ از مخدوم عبدالرشید حقانی) ص ۶۹ (مطبع صادق الانوار

بہاولپور ۱۹۱۵ء) کے مطابق ۵۴۸ھ ہے اور حدیقت الاسرار فی اخبار الابرار، ص ۱۹۰ کے مطابق ۵۴۲ھ درج ہے

تذکرہ مشائخ کرام از محمد قاسم فرشتہ، ص ۴۴ کے مطابق ۵۸۴ھ ہے۔ لیکن اکثریت نے ۵۶۶ھ ہی کو قبول کیا ہے۔

۲- حکم چند ”تواریخ ملتان“ ص ۶۴ پر لکھتے ہیں کہ (باقی بر صفحہ ثانی)

قبیلہ "قریش الاسدی" سے تھا۔ آپ کے دادا شیخ کمال الدین علی شاہ مکہ معظمہ سے خوارزم آئے اور پھر وہاں سے ملتان تشریف لے آئے۔ ملتان میں انہوں نے اپنے صاحبزادے مولانا وجیہ الدین محمد غوث کی شادی قلعہ کوٹ کروڑ کے معزز شخص مولانا حسام الدین ترمذی جو تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے ملتان کے نواحی علاقے کوٹ کروڑ میں مقیم تھے، کی صاحبزادی سے کر دی۔ ان کے لطن سے بہاء الدین زکریا پیدا ہوئے۔

بہاء الدین زکریا نے ابتدائی تعلیم ملتان ہی میں حاصل کی۔ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید سات قرأتوں سے حفظ کر لیا تھا۔ منبع البرکات (قلمی نسخہ) میں لکھا ہے کہ "شیخ بہاء الدین حفظ قرآن مجید باہفت قرأت در کوٹ کروڑ از مولانا نسیر الدین بلخی حاصل کر دے" (۱)

آپ ابھی دس سال کے تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ اس کے بعد آپ خراسان تشریف لے گئے۔ سات برس تک وہاں علماء و مشائخ سے ظاہری و باطنی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ پھر بخارا گئے اور بہت سے اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔

نور احمد فریدی کے مطابق

"لیسے چار سو چوالیس (۴۴۴) باکمال اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذتہ کر کے سند

فضیلت حاصل کی جو علم و فضل اور زہد و ورع کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے" (۲)

بخارا میں آپ تقریباً آٹھ برس تک رہے۔ اس دوران میں تحصیل علوم کے ساتھ ساتھ آپ نے کتب کا ذخیرہ بھی اکٹھا کیا۔ نور احمد فریدی کے مطابق ان کتب کی تعداد دو ہزار

(بقیہ گذشتہ صفحہ) یہ خاندان اولاد بہاء الدین زکریا المعروف بہاء الحق ہے اور انکو قریشی کہتے ہیں، سید نہیں ہیں، قریشی کی وجہ تسمیہ ہی سنی جاتی ہے کہ قریش ایک قبیلہ پہاڑ کا نام تھا۔ اس قبیلہ کے نواح میں جو لوگ بہتے تھے انکو قریشی بولتے تھے۔ دم یہ مشہور ہے کہ ایک بڑا جانور قریش نامی تھا۔ وہ کسی سے مارا نہیں جاتا تھا۔ اس خاندان کے لوگوں نے اسے مارا۔ اسلئے قریشی مشہور ہوئے

۱۔ بحوالہ منبع البرکات (تذکرہ حقانیہ) قلمی نسخہ، ص ۴۵، مؤلف شیخ شرف الدین قریشی۔

۲۔ بحوالہ تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتان، از نور احمد فریدی، ص ۴۳، مطبوعہ حکمہ ادقاف لاہور طبع اول مئی ۱۹۸۰ء

سے زیادہ تھی۔ (۱)

ان تمام باتوں کو خلاصۃ العارفین (قلمی) میں یوں بیان کیا گیا ہے

”چوں بہ ہفت سال رسید جملہ قرآن باجملہ قرأت باو و جوہات قرآن بطریق قاریاں

شوانید بعد ازاں چہل سال در مدرسہ علم علوم ظاہر و باطن مطالعہ و ملاحظہ کرد تا دو

ہزار کتاب بخدمت ایشان جمعے شدہ و چہار صد و چہل و چہار اوستاواں ماہران

علم کہ در اطراف عالم و اکناف ارضی و آفاق بلاد با عالمیاتی کہ مشہود بعلم ظاہری و باطنی

و متشرع بودند بہ نسبت مصطفیٰ پیش ایشان ملاحظہ کردی علم ظاہری بایں طریق

خواندی بعد ازاں بیست سال مجاہدہ و ریاضت کشیدہ (۲)

بخارا کے لوگ آپ سے متاثر ہو کر آپ کو ”بہار الدین فرشتہ“ کہنے لگے تھے۔ بخارا کی تمام درس

گاہوں سے علم حاصل کرنے کے بعد بیس برس تک سخت مجاہدے میں مصروف رہے (۳)

بخارا سے آپ مکہ گئے۔ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں حرم نبوی کے

مجاہد بنے۔ انہی دنوں میں آپ مولانا کمال الدین محمد مینی سے حدیث کا درس لیتے رہے۔

سیر العارفین کے مطابق

۱- بحوالہ ”تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی“ ص ۴۴۔

۲- خلاصۃ العارفین فارسی (قلمی) ص ۱۲-۱۳ (ملفوظات حضرت بہار الحق زکریا ملتانی)۔ ضیاء الدین

بن حافظ مولوی عبدالقدادری ساکن ملتان بیرون بوہڑ دروازہ درگڑی افغاناں، ۲ شعبان بروز دو شنبہ ۱۲۹۰ھ

میں کتابت کی۔ اوراق ۵۸، صفحات ۱۱۶۔ جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئی

نوٹ: یہی عبارت ڈاکٹر زیدی کی مرتب کردہ خلاصۃ العارفین میں ص ۱۱۹ پر کچھ لفظوں کے فرق کے ساتھ درج ہے۔

۳- بحوالہ تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۴۴۔ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے مطابق

”انہوں نے بخارا میں نہ صرف اپنی تعلیم کو مکمل کیا بلکہ ۱۵ سال تدریس اور

افادہ علوم میں بھی مصروف رہے۔“

(بحوالہ مقالات دینی و علمی (جلد اول)، ص ۲۶۰، مطبوعہ مزدور پرنٹنگ پریس

لاہور۔

”جب حضرت بہاء الدین زکریا نے تمام علم حدیث مولانا (یمینی) سے پڑھ لیا اور اس میں کمال حاصل کر لیا تو مولانا نے حضرت کو اجازت نامہ لکھ کر دے دیا۔ اور حدیث کے درس دینے کی بھی اجازت دے دی۔ جیسا کہ محققین محدثین کی رسم ہے“

پانچ برس مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ اپنے استاد (مولانا یمینی) کے ساتھ ہر برس حج کے لئے مکہ جاتے رہے۔ مدینہ سے آپ بیت المقدس تشریف لے گئے وہاں انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت کرنے کے بعد آپ بغداد گئے جہاں آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

”حضرت سلطان المشائخ کی صحبت و ارادت کی برکت سے صرف سترہ روز میں یہ

دولت جاودانی اور سعادت دو جہانی حاصل کر لی۔“ (۲)

شیخ شہاب الدین سہروردی سے خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد مرشد کے حکم سے آپ (۳) ملتان تشریف لے آئے (۴) اور یہاں دین اسلام کی خدمت شروع کر دی۔

۱- بحوالہ ”سیر العارفين“ ص ۱۲۵

۲- بحوالہ ”سیر العارفين“ ص ۱۲۵، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) تواریخ ملتان، ص ۴۳-۴۲

مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۱۳۴-۱۳۵، آب کوثر، ص ۲۵۶-۲۵۷ (۲) فوائد الفوائد، ص ۱۱۹-۱۱۸ (۵) حیات صوفیہ تلخیص اور اُردو ترجمہ نضامات الانس از مولانا عبدالرحمن جامی، مترجم محمد ادریس انصاری، ص ۶۳۸، مطبوعہ ادارہ، تبلیغ اسلام، صادق آباد۔

۳- (۱) ”شیخ الشیوخ نے شیخ بہاء الدین زکریا کو وداع کیا اور رخصت کے وقت فرمایا کہ ملتان میں جا کر سکونت کرو۔ اس ملک کے باشندوں کی ہدایت تم سے رجوع ہوتی ہے۔“ (بحوالہ تذکرہ مشائخ کرام یعنی تاریخ فرشتہ مؤلف حکیم محمد قاسم فرشتہ، ص ۱۳۳، مطبوعہ احسن برادرزلا ہور ۱۹۶۵ء) (۲) مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے، روضہ اقطاب (فارسی) مصنفہ صاحبزادہ سید محمد بلال، مطبعہ محب ہندوہلی ۱۱۲۲ھ جمادی الاول۔

۴- شیخ محمد اکرام نے ”آب کوثر“ میں ص ۲۵۶ پر ”انوار غوثیہ“ کے حوالے سے لکھا ہے ”اسلامی ممالک کے سفر سے واپسی پر صوبہ سرحد کی ایک پہاڑی پر کچھ عرصہ تنہائی میں عبادت کی جسے اب کوہ شیخ بودین (کوہ شیخ بہاء الدین) کہتے ہیں۔“

سفینۃ الاولیاء کے مطابق

” ملتان کو جائے قیام بنانے کے بعد شیخ زکریا نے طالبانِ حق کی ہدایت اور ارشاد کی جانب بہت توجہ دی۔ اس شہر اور اطراف کے تمام لوگ آپ کے معتقد ہو گئے۔“ (۱)

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ملتان میں ایک ایسا علمی و دینی مدرسہ قائم کیا جس کے فارغ التحصیل اور تربیت یافتہ علماء، مبلغین اور واعظین نے نہ صرف برصغیر کے کونے کونے میں بلکہ بیرون ملک یعنی جاوا، ساٹرا، انڈونیشیا، فلپائن، خراسان اور چین تک اسلام کی روشنی پھیلانی۔ یہ مدرسہ ایک اقامتی یونیورسٹی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں ہر ملک کے فاضل جمع تھے۔ ان کا کام تدریس دینا تھا۔ انہیں معقول مشاہرہ ملتا تھا اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ طالب علموں کے رہنے اور کھانے پینے کا بھی معقول انتظام تھا۔ اس درس گاہ میں دو شعبے تھے۔ ایک کا کام علماء پیدا کرنا اور دوسرے کا مبلغین اور واعظین کی جماعت تیار کرنا تھا۔ مبلغین کو دوسرے ممالک میں تبلیغ اسلام کے لئے بھجوا یا جاتا تھا۔ اس لئے انہیں ان ممالک کی تہذیب و ثقافت اور زبان کے بارے میں خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی تاکہ انہیں تبلیغ میں دقت پیش نہ آئے۔ جب یہ مبلغین اور واعظین روانہ ہونے لگتے تو انہیں سامانِ تجارت دیا جاتا تاکہ وہ اپنی روزی کا وسیلہ خود بنیں۔

ڈاکٹر شمیم محمد زیدی لکھتی ہیں،

ترجمہ: ”شیخ بہاء الدین زکریا واعظوں اور مبلغین کے مختلف گروہ سندھ، مکران، کشمیر، دہلی اور افغانستان کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ فرماتے تھے۔ یہ گروہ سال کے خاتمے پر واپس آکر اپنی کارکردگی کی رپورٹ حضرت کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت ان کو ضروریات زندگی اور خرچ کے لئے تجارت

۱۔ سفینۃ الاولیاء از دار الشکوہ، ص ۱۵۱۔ سفینۃ الاولیاء فارسی (قلمی نسخہ) ص ۲، میں اصل عبارت

یوں ہے۔ ”حضرت شیخ الشیوخ بملتان آمدہ متوطن شدند و بادشاہ طالبان مشغول گشتند و خلق بسیار از برکت قدم ایشان ہدایت رسیدند و اہل ان دیار تمام مرید و معتقد ایشان گشتند۔“

کاسان دیتے تاکہ وہ اس کے ذریعے گزر بسر کریں؟ (۱)
 ان لوگوں کو سفر کی مشکلات اور خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے گھوڑ سواری، تلوار
 بازی، تیر اندازی اور نیزہ بازی کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ گویا اس مدرسے کے
 فارغ التحصیل علماء اور مبلغین دین و دنیا اور ظاہر و باطن کی امتزاجی تربیت سے مکمل انسان
 بن جاتے تھے (۲)۔ یہاں کے تربیت یافتہ علماء نے مختلف جگہوں میں مدارس قائم کئے جنہیں
 خانقاہوں کا نام دیا جاتا تھا۔

مولانا نور احمد فریدی کے مطابق

”ان میں ملتان کے مرکزی تبلیغی یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق انسانی کمال
 اور روحانی جلال کے حصول و عروج کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ ایسے روحانی
 سنٹر پنجاب اور سندھ کے چپہ چپہ پر قائم تھے“ (۳)

اس مدرسے میں مختلف فنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مثلاً خطاطی اور جلد سازی کا کام سکھایا
 جاتا تھا۔ علامہ عتیق فکری کے بیان کے مطابق

• محمد بلخی جیسا خطاط اس زمانے میں ملتان میں موجود تھا اور اس کے کئی
 اہل ملتان میں سے شاگرد تھے۔ غوث بہار الدین زکریا کے زمانے میں
 نستعلیق خط کو بڑا عروج ہوا۔ (۴)

یہ مدرسہ کم و بیش ساٹھ سال تک خود حضرت بہار الدین زکریا کی نگرانی میں چلتا رہا اور علامہ
 عتیق فکری کے مطابق

”آپ نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا۔ اس کا درس قریباً دو صدی تک

۱- بحوالہ احوال و آثار، شیخ بہار الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین (فارسی) ص ۴۷

۲- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) نقش ملتان، ص ۲۲۹ تا ۲۵۸ (ب) تذکرہ حضرت بہار الدین

زکریا ملتانی، ص ۱ تا ۵

۳- بحوالہ ”تذکرہ حضرت بہار الدین زکریا ملتانی“ ص ۴۷

۴- بحوالہ ”نقش ملتان“ ص ۲۵۲

ملتان میں جاری رہا! (۱)

شیخ بہار الدین زکریا ملتانی خود بھی درس فرماتے تھے۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی لکھتی ہیں،

(ترجمہ) "شیخ بہار الدین زکریا ملتانی کے بعد منبر پر بیٹھ جاتے اور قرآن حکیم

کی تفسیر بیان فرماتے اور حدیث کی تدریس کرتے۔ کبھی کبھی پچھلے بزرگوں کے

قول، حکایات اور اشعار سے بھی استفادہ کرتے! (۲)

غشی عبدالرحمان کی تصنیف "آئینہ ملتان" میں اس مدرسے کے تعارف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

"یہ سلسلہ سہروردیہ کا ملتان میں سب سے پہلا مدرسہ عالیہ تھا جو حضرت بہار الدین

نے تعلیم دین و دنیا کے لئے قائم کیا تھا۔ یہ موجودہ خانقاہ کے ساتھ واقع تھا۔

آپ بہ نفس نفیس اس میں درس دیا کرتے تھے۔ اس مدرسہ کے

کتب خانے کا شہرہ ہندوستان میں دور دراز تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے

ہر شعبہ حیات کے لوگ اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے ملتان کھنچے چلے آتے

تھے۔ اس دور میں علوم اسلامیہ کی تدریس میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ فقہ اور

اصول فقہ کے ساتھ منطق اور معمول کی کتابیں بھی داخل نصاب کر دی گئیں۔

یہ مدرسہ اور کتب خانہ لنگاہ خاندان کے زمانہ میں مرزا حسین ارغوانی کے حملہ ملتان

میں تباہ ہو گیا۔ اس کے بے بہے آثار سکھوں نے مٹا دیئے! (۳)

حضرت زکریا ملتانی کی دیکھا دیکھی ناصر الدین قباچہ نے بھی ملتان میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس

نے علامہ قطب الدین کاشانی کو کاشان سے بلا کر اس مدرسے کا مہتمم مقرر کیا۔ اس مدرسے

کا نام دارالعلوم تھا اور یہ مدرسہ بہائیہ کے مقابلے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسے میں منطق،

فلسفہ اور علم الکلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ طلبہ کی ایسی خاصی تعداد تھی جن کے قیام و طعام کا انتظام

سرکار کرتی تھی۔ اس کے لئے الگ عمارت تعمیر کی گئی۔ مولانا کاشانی کے بعد مولانا وجیہ الدین

۱۔ بحوالہ "نقش ملتان" ص ۲۵۵

۲۔ بحوالہ "احوال و آثار، شیخ بہار الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفين"، ص ۳۶۔

۳۔ بحوالہ "آئینہ ملتان" ص ۲۰۹، مطبوعہ اشرف المعارف، ملتان، ۱۹۰۸ء

اس مدرسے کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے (۱)۔

بہار الدین زکریا جس زمانے میں ملتان میں تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ ان دنوں ناصر الدین قباچہ ملتان کا حاکم تھا جو کہ ایک ترکی پہلوان اور جلا د تھا۔ لیکن ترقی کرتے کرتے سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں حاکم ملتان مقرر ہوا۔ دوسری طرف قطب الدین ایبک نے شمس الدین سے خوش ہو کر اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا اور دہلی کا سلطان بنایا۔ اور ناصر الدین قباچہ کو اس کی نگرانی میں دیا۔ قباچہ اس کو پسند نہ کرتا تھا اور التمش کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا۔ اس نے کوشش کی کہ بغاوت کر کے خود مختار ہو جائے۔ بہار الدین زکریا کو اس کی سازش کا علم ہو گیا۔ آپ التمش کو اس کے زہد و تقویٰ کے باعث بہت پسند کرتے تھے چنانچہ جب آپ کو اس سازش کا علم ہوا تو آپ نے اور ملتان کے قاضی شرف الدین نے اس بارے میں التمش کو خط بھیجا۔ لیکن وہ دونوں خط قباچہ کے ہاتھ آ گئے۔ قباچہ نے دونوں کو طلب کیا۔ قاضی شرف الدین کو تو اسی وقت قتل کر دیا۔ لیکن بہار الدین زکریا کو سامنے بٹھا کر خط پڑھ کر سنایا گیا۔ خط سن کر آپ بالکل نہ گھبرائے اور فرمایا کہ

” جو کچھ میں نے اس میں لکھا ہے وہ حکیم خدا سے لکھا ہے۔ تو کیا کر

سکتا ہے؟“ (۲)

قباچہ نے یہ سن کر معذرت کی اور آپ کو رخصت کر دیا۔

بہار الدین زکریا اپنے بے پناہ علم اور ذہانت کی بنا پر شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ آپ کو سلطان شمس الدین التمش نے ملتان پر قبضہ کے بعد شیخ الاسلام کے عہدے پر مامور کیا جس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ

۱- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) آئینہ ملتان، ص ۲۱ (ب) بزم مملوکیہ، ص ۶۰
 ۲- (۱) فوائد الفواد (فارسی) جلد چہارم، ص ۱۲ میں لکھا ہے کہ ”من ہرچہ نوشتہ ام حق بنشتہ ام و از حق بنشتہ ام تو ہرچہ خواہی بکن تو خود چہ توانی کرد بہت تو حیست“ — مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۲) میرالعارفین، ص ۱۵۸ (۳) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۱۴ (۴) آب کوثر، ص ۲۵۸۔
 (۵) بزم مملوکیہ، ص ۳۶ (۶) تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۱۳۱

”شیخ جلال الدین تبریزی جو حضرت بہار الدین زکریا کے بھی دوست تھے۔ جب دہلی شہر میں آئے تو وہاں کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو اس سے حسد پیدا ہوا اور وہ سلطان التمش کی لگا ہوں سے ان کو گرانے کے لئے مختلف طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ انہوں نے شیخ جلال الدین تبریزی پر کوئی الزام لگایا۔ سلطان التمش نے اس کی تحقیق کا حکم دیا۔ نجم الدین صغریٰ نے بہار الدین زکریا کو ثالث مقرر کیا۔ لیکن وہ سراسر بہتان ثابت ہوا۔ بہار الدین زکریا نے نہ صرف جلال الدین تبریزی کو بے گناہ قرار دیا۔ بلکہ نجم الدین صغریٰ کی سازش کو بھی بے نقاب کر دیا۔ اس واقعے کے بعد سلطان التمش نے نجم الدین صغریٰ کو شیخ الاسلام کے عہدے سے ہٹا کر بہار الدین زکریا کو شیخ الاسلام مقرر کر دیا۔“^(۱)

بہار الدین زکریا ملتانی نے اپنی ساری عمر لوگوں کی فلاح اور رشد و ہدایت کے لئے وقف کر دی آپ کے پاس بہت دولت تھی جسے آپ لوگوں پر خرچ کرتے رہتے تھے۔ ”گلزار فریدی“ میں لکھا ہے۔

(ترجمہ) ”ایک دفعہ حسن نامی قوال حضرت فرید الدین گنج شکر کی اجازت سے ملتان آیا اور حضرت غوث بہار الحق زکریا ملتانی کی زیارت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب وہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ حضرت مخدوم بہار الدین زکریا سنہری مرصع اور قائم و بنجاف کے بنے ہوئے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ سونے چاندی کے شاہانہ ظروف کھڑکیوں میں رکھے تھے۔ غرض یہ کہ سوائے سونے چاندی اور جواہرات کے کوئی دوسری چیز نظر نہ آتی تھی۔ حسن قوال حیران ہو گیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ درویش تو الفقیر فخری کا قائل ہوتا ہے جیسا کہ جناب گنج شکر ہیں کہ ان کے گھر میں سوائے بوسیدہ اور پرانے بوریوں کے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۱۸۲ (۲) اولیائے

ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۱۶-۱۸۔

کچھ بھی نہیں؟ (۱)

جناب عبدالباقی، لیکچرار اُردو، گورنمنٹ کالج شجاع آباد سے ہیں ایک منظوم سوال و جواب ملا ہے جو اس سلسلے میں ہے اور جس کا یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ یہ ایک قلمی کاپی میں تحریر ہے جو خواجہ محمد شاہ بخش عاصی ملتانی از اولاد عراقی حسین آگاہی ملتان کی بیاض ہے اور انہیں کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی ہے۔ ہم ان صفحات کو ہو بہو لکھ دیتے ہیں۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر اور حضرت بہار الدین زکریا ہم زمان بزرگ گزرے ہیں حضرت فرید الدین کی خانقاہ پر فقر و درویشی غالب تھی تو حضرت بہار الدین کی درگاہ میں شاہانہ انداز نمایاں تھا۔ درج ذیل سوال و جواب میں یہی چیز واضح کی گئی ہے۔

(سوال حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر از حضرت خواجہ بہار الدین زکریا ملتانی)

پوشش تو اطلس و دیبا حریر	نخبہ زدہ خرقہ پشمین ما
خواں خور صحنک سیمین تو	ثقب زدہ کاسک چوبین ما
خوردن تو مرغ نوشی و می	بی نمک نانک خستگین ما
قائم و سنجاب ترا تکیہ گاہ	غار خس و بستر بالین ما
اسپک تو نازی بازی از	بہت درازاں کفشک چرمین ما
باش کہ تا صبح قیامت وہ	ایں بنو کار یا آں بسار

ایات حضرت غوث بہار الدین زکریا ملتانی در جواب حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر

دنیا چہرا گاہ کینہ خران ماست	عقبی شکار گاہ شکار سگان ماست
معرش و لوح چچم زیر قدم نہیم	اسلام و کفر سوزیم ایں امتحان ماست
جلہ بشر کو اکب افلاک انجمن	جبریل یا ملائک از چاکران ماست
مرسل نبی طفیل من از انبیار شدند	عیسی و خضر و یونس از پیروان ماست

۱۔ بحوالہ "گلزار فریدی" (فارسی قلمی) ص ۴۱۔ مصنف مولوی گل محمد چشتی سن تحریر ۱۹۰۲ء

موضوع ملفوظات و مناقب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق صاحب کی ذاتی لائبریری

سے حاصل کیا گیا۔)

معبود خود بدید مرزا اولیا شدم
فرمان شد کہ جنت تو لامکان ماست
ما خود خدا شدیم خودی درخدا ماست
ہزارم از خدا کہ بیمہ خدا نہ بدست
بشنو تواز بہار سخنان بوا لعجب
واللہ مکان وحدت از سائبان بہت

حضرت غوث بہار الحق ملتانی کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ آپ کے دسترخوان پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ روزانہ قسم قسم کے کھانے کھاتے تھے۔ نور احمد فریدی کے مطابق ”حضرت محبوب الہی کے ہاں درویشوں، مسکینوں اور مہانوں کے لئے شاہانہ انتظام تھا۔ لنگر خانے میں ایسے عمدہ اور اعلیٰ کھانے پکتے کہ سلاطین اور امراء کو بھی نصیب نہیں ہوتے تھے۔ لنگر کے لئے اجناس کے ذخائر، انبار خانوں میں مغل تھے۔ چار پائیوں، بستروں اور برتنوں کا معقول انتظام تھا۔ اس کے باوجود لاکھوں کا ان داتا خود روزہ سے رہتا تھا۔“^(۱)

بزم صوفیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ ناصر الدین قباچہ کے عہد میں ملتان میں سخت قحط پڑا۔ بہار الدین زکریا کے لنگر خانے میں بہت سا اناج پڑا تھا۔ اس نے بہار الدین زکریا سے کچھ گند مانگی تو آپ نے فرمایا کہ اپنے نوکر دوں کو بھیج کر فلاں گودام سے گند اٹھوائیں۔ قباچہ کے نوکر جب گند لے گئے تو اس میں تقریباً سکوں کے سات کوزے برآمد ہوئے۔ قباچہ نے وہ بہار الدین زکریا کو بھجوا دیئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ ہمیں ان کوزوں کا پہلے سے علم تھا۔ اس لئے گند کے ساتھ یہ چاندی کے کوزے بھی بخش دیئے تھے^(۲)۔ لوگوں کو کھلانے پلانے کے علاوہ مشکل وقت میں بھی آپ اہل ملتان کے کام آئے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے،

”جب ۱۲۵۷ء میں منگول ملتان میں داخل ہو گئے اور برج اور مورچے گرا کر

۱۔ تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۸۹

۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے (۱) ”بزم صوفیہ“ ص ۹۴، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء (۲) فوائد القواد،

ص ۴۱۵-۴۱۹ (۳) خلاصۃ العارفین (قلمی) ص ۴۱-۴۲، خلاصۃ العارفین مرتبہ ڈاکٹر شمیم زیدی، ص ۱۲۶

شہر میں قتل و غارت شروع کرنے کو تھے تو حضرت مخدوم العالم شیخ بہار الدین
 زکریا ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور منگولوں کو یہ رقم ادا کر کے شہر کو ان کی
 تباہی سے بچایا۔^(۱)

حضرت غوث بہار الدین زکریا کے زمانے میں قرامطہ کے اثرات باقی تھے خصوصاً ملتان کے
 گرد و نواح اور دیہات کا علاقہ ان اثرات سے محفوظ نہ تھا۔ شیخ الاسلام نے قرامطیوں کے
 اثرات کو ختم کرنے کی طرف توجہ دی۔ اور نور احمد فریدی کے مطابق

”اس مرد کامل نے نصف صدی کے عرصے میں اس سرزمین کو نہ صرف
 قرامطہ کے اثرات سے پاک کیا بلکہ لاکھوں سرکش اور تند مزاج کافروں کو
 نور ایمان سے مالا مال کر کے مسلمانوں کی اقلیت کو اکثریت میں بدل دیا اور وہ
 لاکھوں خوں آشام تلواریں جو سال ہا سال تک غزنی کے مجاہدوں سے ٹکراتی رہی
 تھیں اسلام کی محافظ بن گئیں۔“^(۲)

حضرت غوث بہار الحق زکریا ملتانی کے ملفوظات میں علم و معارف کے موتی دستیاب ہوتے ہیں
 آپ نے عاشق کی آہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا
 ”چوں صاحب محبت از سینہ خود آہ زند آتش عشق جھلکی دنیا و آنچه در دنیا

۱۔ بحوالہ ”آب کوثر“ ص ۲۵۸، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی،
 ص ۲۹۹۔ جبکہ مولوی محمد شفیع نے آٹھویں صدی ہجری کے مورخ سیفی ہروی کی کتاب ”تاریخ نامہ ہرات“ طبع
 کلکتہ، ص ۱۵۷ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”شیخ الاسلام حاکم ملتان کی طرف سے تاریخوں سے بات چیت کرنے
 کیلئے گئے تھے اور یہ طے کیا کہ تاریخوں کو حاکم شہر لاکھ دینار دے دے تو وہ شہر سے چلے جائیں گے۔ دوسرے
 دن شیخ الاسلام لاکھ دینار لے کر شہر سے باہر آئے مگر یہ نہیں کہا کہ یہ رقم وہ اپنے خزانہ سے لئے۔

(بحوالہ ”مقالات دینی و علمی“ (جلد اول) ص ۲۶۳، علامہ عتیق فکری کا بیان ہے کہ

”ملتان کے عوام کو تباہی سے بچانے کے لئے آپ نے یہ رقم اپنے ذاتی خزانے سے ادا کی اور ملتان

کو تاریخوں کی غارت گری سے بچالیا۔“ (بحوالہ نقیض ملتان، ص ۲۵۸)

۲۔ بحوالہ ”تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی“ ص ۳۹۔

است ناچیز گرداند و خاکستر سازد۔ (۱)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا

”عشق آتش است کہ کثافت ہارا خاکستری گرداند۔ (۲)

زہد کی تشریح یوں فرماتے ہیں

”زہد سے حرف است، اول ”ز“ کہ مراد از آل کی ترک زیب و زینت دنیا

است، دوم، ”ھ“ کہ عبارت است از ترک ہوا و ہوس، سوم ”دال“ کہ در

گزر کردن از دنیا و دولت مطلوب است۔ (۳)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا

”سہ چیز موجب ہلاکت انسان می تواند باشد، اول ارتکاب گناہ بہ امید توبہ

دوم توبہ نہ کردن بہ امید درازی حیات، سوم گناہ بزرگ خود را بہ امید عفو و بخشش

ناچیز گرداندن۔ (۴)

اسی طرح فرمایا

”ترس از خدا چراغ قلب انسان است، اگر این نباشد انسان در تیرگی

ظاہری و باطنی بسر می برد۔ (۵)

صوفیاء کے ہاں عام طور پر سماع سے دلچسپی کے واقعات ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ قطب الدین

بختیار کاکی کا انتقال بھی اسی حالت میں ہوا۔ بہار الدین زکریا کو سماع سے زیادہ دلچسپی نہ

تھی۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے مرشد سماع کو اچھا سمجھتے تھے تو آپ نے بھی

سنا شروع کیا۔ حامد بن فضل اللہ جمالی اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں

”عبداللہ نامی ایک خوش گلو اور خوش کلام قوال روم کی طرف سے ملتان پہنچا

اور حضرت مخدوم المشائخ بہار الدین زکریا کی قدم بوسی سے مشرف ہوا۔ اس

نے عرض کیا کہ میں حضرت شیخ الشیوخ (شہاب الدین سہروردی) کی خدمت

۱۔ خلاصۃ العارفین، (قلمی) ص ۲۹، غالب نے کہا تھا۔ عہ میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا۔

۲ تا ۵۔ خلاصۃ العارفین، مرتبہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی، ص ۴۰ - ۴۱

سے مشرف ہو چکا ہوں اور حضرت نے میرے خوش گلو ہونے کی وجہ سے سماع میں شرکت فرمائی ہے۔ اس وقت شیخ الاسلام بہار الدین زکریا نے فرمایا کہ چونکہ حضرت شیخ نے سنا ہے، زکریا بھی سنے گا۔ اس کے بعد خادم کو حکم دیا کہ عبداللہ کو اس کے دونوں دوستوں کے ہمراہ جو اس کے ساتھ ہیں، فلاں حجرے میں لے جاؤ اور بٹھاؤ۔ یہ حکم عشاء کی نماز کے بعد دیا تھا خادم مذکور نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک پہر رات گزرنے کے بعد حضرت شیخ حجرے میں تشریف لے گئے وہاں بیٹھے۔ قرآن شریف کے دو سپارے نہایت لطیف مخرج اور انداز سے تلاوت فرمائے۔ پھر سماع کا حکم دیا۔ عبداللہ نے جب آواز نکالی تو اس شعر کو بار بار پڑھا۔

ہ۔ متاں کہ شراب ناب خوردند از پہلوئے خود کیا ب خوردند
حضرت شیخ نے سر ہلایا، اٹھے اور اس حجرے میں جو چراغ جل رہا تھا اس کو گل کر دیا۔ عبداللہ مذکور کا بیان ہے کہ جب حضرت ہمارے نزدیک آتے تھے تو ہم ان کے کرتے کا دامن دیکھتے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے کہ ان کے وجد کی کیا کیفیت تھی اور کس انداز پر تھا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت حجرے سے باہر چلے گئے۔ ہم اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ اسی حجرے میں رہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت کا خادم ایک پر تکلف خلعت اور چاندی کے بیس سکے لایا کہ حضرت شیخ نے انعام دیا ہے۔^(۱)

نور احمد فریدی کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے بخیار کاکلی کے ساتھ بھی سماع کی محفل میں شرکت کی^(۲)۔ آپ مشہور شاعر فخر الدین عراقی کے اشعار سن کر بھی وجد میں آجاتے تھے اور کتنی دیر

۱۔ بحوالہ "سیر العارفین" (اردو ترجمہ) ص ۱۶۰۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

(الف) فوائد الفواد، ص ۲۸۱-۳۸۲ (ب) تذکرہ مشائخ کرام، ص ۱۳۹-۱۴۰۔

(ج) فوائد الفواد (فارسی) ص ۱۳۸-۱۳۷

۲۔ بحوالہ "تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی" ص ۱۹۶۔

تک آنکھیں بند کر کے جھومتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں عراقی کی ایک غزل کا یہ مقطع
چوں خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چو باد نام کردند

سُن کر آپ پر کتنی ہی دیر و جد کی کیفیت طاری رہی۔ «

خلاصتُ العارفین“ فارسی (قلمی) میں لکھا ہے

”وقتی شیخ الاسلام شیخ بہار الدین با شیخ قطب الدین بختیار اوشی کاکی ملاقات

شده بود ہماں وقت سماع در دادند و در رقص در دادند و در رقص شدند۔

ہم چہنیں گویند کہ در ہوا یک شبانروز رقص میگردند خبر از خویش نداشتند

و چوں از آنکجا جدا شدند پس ملاقات نشہ و این مصرع بود کہ می گفتند،

حاجی بسوئی کعبہ رودن بسوئی دوست ^(۱) « (۲)

۱۔ بحوالہ (الف) احوال و آثار، بہار الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفین، ص ۳۲۔ (ب) تذکرہ بہار الدین

زکریا ملتانی، ص ۱۵۰ (ج) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۱۹۔ ۲۰۔ بشیر حسین ناظم نے اس موقع پر

پروقیسرا سی۔ جی براؤن کا اس واقعہ پر اختلاف درج کیا ہے جو یوں ہے

”جب فخر الدین ابراہیم عراقی حضرت شیخ کے ارادت کیشتوں میں شامل ہوئے تو آپ نے انہیں

مراقبہ کی تلقین فرمائی۔ لیکن عراقی اس ارشاد پر عمل پیرا ہونے کی بجائے شغل شعر و شاعری میں مہمک

رہنے لگے۔ چند پیر بھائیوں نے حضرت شیخ کی خدمت میں عراقی کی شکایت کی کہ وہ آپ کے

ارشاد کی چنداں پروا نہ کئے ہوئے ہر وقت عشقیہ اشعار لگناتا رہتا ہے۔ حضرت شیخ نے انہیں بلا بھیجا

اور پھر چند اشعار سنانے کے لئے حکم دیا۔ عراقی نے بڑے سوز سے اپنی غزل سنائی جسے سن کر شیخ

بہار الدین زکریا بے خود ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد حضرت نے عراقی کو خرقہ خلافت عطا

فرمایا اور اپنی دختر نیک اختر کا عقد بھی ان سے کر دیا۔

(بحوالہ ” اولیائے ملتان“ ص ۲۰۔ ۲۱۔

۲۔ خلاصت العارفین فارسی (قلمی) ص ۶۸۔ یہی عبارت خلاصت العارفین مرتبہ ڈاکٹر شمیم محمود زید

میں ص ۱۶۶ پر کچھ الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ درج ہے۔

(باقی بر صفحہ ثانی)

۱۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

بابا فرید گنج شکر سے روایت ہے کہ ایک قوال ابو بکر خراطیہ شیخ بہاء الدین زکریا کے پاس رہ کر سماع کرتا تھا۔^(۱) پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے "راگ دروین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"امیر خسرو کی طرح انہوں نے (حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی) بھی چند راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ مثلاً ملتانی دھنا سمری انہی کی ایجاد ہے جس میں دھنا سمری اور مالسری کو غلط کیا گیا ہے۔ آپ نے چھند کی طرز پر کسی نغمے اختراع کئے جن میں خدائے واحد کی ستائش اور داستانِ عشق اور بندگی کے طریق پر مجرود انکسار کی کیفیت بیان کی۔"^(۲)

اگرچہ مولانا نور احمد فریدی نے اپنی کتاب "تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتانی" میں "حضرت شیخ الاسلام اور موسیقی" کے عنوان کے تحت ان باتوں کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے^(۳) لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی حوالہ یا ثبوت فراہم نہیں کیا۔ میرے خیال میں موسیقی یا سماع میں دلچسپی سے حضرت شیخ الاسلام کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم خواہ مخواہ تاویلات بیان کرتے رہیں۔

بہاء الدین زکریا کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے چند مشہور ناموں میں سب سے پہلے فخر الدین عراقی کا نام آتا ہے جو آپ کے داماد بھی تھے۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے تھے۔ آپ ہمدان میں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کر کے وہیں مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کی قابلیت اور علمیت کا بڑا شہرہ تھا۔ آپ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اور

(بقیہ گذشتہ صفحہ) تو باش ایں جاد بایاراں در آمیز

کہ فن دارم ہوائے منزل دوست

۱۔ بحوالہ "احوال و آثار"۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفین (فارسی) ص ۳۲

۲۔ بحوالہ "مقالات دینی و علمی" (جلد اول) ص ۲۶۶ - ۲۶۷

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی"

زبان میں کافی سوز و گداز تھا۔ آپ قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ خراسان سے ہوتے ہوئے طمان پہنچے۔ حضرت شیخ الاسلام نے انہیں اپنا خرقہ پہنایا تھا اور اپنی بیٹی کا عقد بھی ان کے ساتھ کیا تھا۔^(۱)

آپ کے دوسرے خلیفہ سید جلال الدین سرخ بخاری تھے جو بخارا سے تشریف لائے اور اُج میں ان کا مزار ہے۔ میر علی حسینی جو کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ بھی آپ کے خلفاء میں شامل تھے۔ ان کی کتابوں میں نہ ہت الارواح، زاد المسافرین اور مشنومی کنز الموزین ان کے علاوہ شیخ کبیر الدین عراقی، لال شہباز قلندر، نواب موسیٰ، خواجہ حسن افغان، خواجہ کمال الدین مسعود شیردانی، خواجہ فخر الدین گیلانی، شیخ بدر سجستانی، شیخ عبدالستار، شاہ عالم (ان کا مزار ٹھٹھہ میں ہے) وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت بہار الدین زکریا ملتانی کی تصانیف میں "کتاب الاورداد" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کا قدیم ترین قلمی نسخہ جو ۲۹۰ صفحات پر مشتمل ہے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں موجود ہے۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد نے اسلامک بک فاؤنڈیشن کے تحت ۱۳۹۸ھ میں اسے زیور طبع سے آراستہ کرایا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اس میں نمازوں کی مختلف اقسام، طعام، کھانے کے طریقے، غسل، حرم، مختلف مہینوں کی فضیلت، تراویح، دعا، لباس پہننے کے طریقے، سفر کی کیفیت وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔^(۲) آپ کی دوسری کتاب کا نام "شروط اربعین فی جلوس اہل تکفین" ہے۔ اس کتاب کا متن عربی اور فارسی زبان سے مخلوط ہے۔ یہ کتاب "انوار غوثیہ" میں شامل ہے۔ جو مخدوم حسن بخش کی تصنیف ہے۔ الگ سے دستیاب نہیں ہے۔ اس کتاب

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے "خزینۃ الاصفیاء" جلد دوم از غلام سرور لاہوری ص ۳۲، مطبوعہ نوکشتور پریس کانپور۔

۲۔ ملاحظہ فرمائیں "الاورداد" اشاعت اولین مخطوطہ قدیم، تبصیح و تفسیر محمد میاں صدیقی، مطبوعہ مرکز

تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان اسلام آباد، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء

(لیکن اس کتاب کے بارے میں اکثر علماء شک کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ان کی تصنیف نہیں۔ ان میں جناب اسد

نظامی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، جناب ارشد ملتانی اور جناب حبیب فائق شامل ہیں۔)

میں اعتکاف اور اس سے متعلق احکامات، ہدایات وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔ جا بجا قرآنی آیات، احادیث اور بزرگان دین کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ ایک رسالہ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی بھی منسوب ہے۔ یہ کرم خوردہ قلمی نسخہ مولوی شمس الدین تاجر کتب لاہور کے پاس ہے اور ڈاکٹر شمیم محمود زیدی نے اسے دیکھا ہے یہ ۱۳ صفحات پر مشتمل نامکمل کتابچہ ہے۔ اسی رسالے میں مراحل سلوک، شرائط خلوت و مراتب و مراقبت کا ذکر ہے۔ (۱)

”خلاصۃ العارفين“ — حضرت غوث بہاء الحق ملتانی کے ان ملفوظات اور تقریروں پر مشتمل ہے جن کے راوی مخدوم جلال الدین بخاری، خواجہ فرید الدین شکر اور خواجہ نظام الدین اولیاء ہیں۔ اس کتاب کے دس قلمی نسخوں کا ذکر ڈاکٹر شمیم محمود زیدی نے کیا ہے اور اسے مرتب کر کے چھپوایا ہے (۲)۔ ”خلاصۃ العارفين“ کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کے ہاں بھی ہے جس کا ذکر موصوف نے نہیں کیا۔ مجھے یہ نسخہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے حاصل ہوا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کے مرتب کردہ نسخے اور اس نسخے کی عبارتوں میں کہیں کہیں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ یہ فرق تمام نسخوں میں موجود ہے اور ان کی طرف ڈاکٹر زیدی نے حاشیہ میں اشارہ کر دیا ہے۔ خلاصۃ العارفين کا ایک نسخہ سندھ یونیورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے (بحوالہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان) حضرت بہاء الدین زکریا کے ساتھ کچھ اشعار بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی نے مختلف تذکروں اور ملفوظات وغیرہ سے ان کے کچھ اشعار اکٹھے کئے ہیں جو سب کے سب فارسی زبان میں ہیں (۳)۔ مجھے جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ذاتی لائبریری سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا دیوان فارسی (قلمی) دستیاب ہوا ہے۔ اس کی فولیو سٹیٹ کا پی

۱۔ تصانیف کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) احوال و آثار، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفين

ص ۹۰-۱۰۹ (ب) تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی از نور احمد فریدی، ص ۲۶۹ تا ۲۹۴۔

۲۔ ملاحظہ فرمائیے ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفين” بہ تصحیح و تحشیہ و کوشش

از بانو ڈاکٹر شمیم محمود زیدی، مطبوعہ از اشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔

۳۔ ملاحظہ فرمائیے ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفين” ص ۱۰۹ تا ۱۱۱

میرے پاس موجود ہے۔ یہ اشعار مثنوی کی صورت میں ہیں اور ان کی کل تعداد ۲۱۰ ہے۔ اس کے علاوہ ایک قصیدہ عربی زبان میں در مدح سید المرسلین محمد خاتم النبیینؐ بھی شامل ہے جو غالباً نامکمل ہے۔ کیونکہ بہت مختصر ہے اور دس بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قلمی نسخے پر کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں ہے اور نہ ہی کاتب کا نام لکھا ہے۔ اس کتاب کا ذکر کسی مؤرخ یا سوانح نگار نے بھی نہیں کیا تاہم اس کے ٹائٹل صفحے پر لکھا ہے کہ "اس کتاب تصنیف حضرت شیخ غوث بہار الحق ملتانی" اس کے علاوہ جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کا دعویٰ ہے کہ یہ نسخہ ان کی دریافت ہے اور انہیں ایک دیہاتی سے دستیاب ہوا ہے اور واقعی غوث بہار الحق زکریا ملتانی کے فارسی کلام کا حامل ہے۔ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے ہم اس فارسی کلام سے استفادہ کر کے اس کو سامنے لارہے ہیں۔ اس فارسی کلام میں اخلاق اور تعلیمات مذہبی کی تلقین جا بجا موجود ہے، شریعت، طریقت، معرفت، ترک، فقر، خودداری اور محبوب حقیقی کی طرف رجوع اور توجہ کا ذکر اشعار میں بار بار آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے

شریعت ازار و طریقت قمیص	حقیقت عمامہ شنوائی حرلیص
ردا معرفت ترک باشد کلاہ	بدیں پنج جامہ شوی بادشاہ
ترا بادشاہی مسلم بود	چو بنیاد در فقر محکم بود

(دیوان فارسی قلمی، ص ۱)

دوسروں کی محتاجی اور دستگیری سے اجتناب، درویشی اور فقیری مسلک اختیار کرنے کی نصیحت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق خاطر پیدا کرنے کی تلقین ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے

تو محتاج غیر می مشور دیار	کہ محتاج غیر می بیاشد خوار
کسی را کہ فقرش بود استوار	بمیدان مردان بود شہسوار
کسی را کہ فقرش بگرد تمام	بصد ر سلاطین نشیند مدام
توجہ بہ سوتی دل آرام بہ	کہ در کنج بادوست آرام بہ

(دیوان فارسی قلمی، ص ۲)

دنیا میں تو نگر حرص و ہوس کی بدولت پریشان حال رہتا ہے۔ اسی طرح بادشاہوں کا اضطراب اور بے سکونی اور دنیا کے مسائل و معاملات کے ہاتھوں لوگوں کے غم اور دکھ کی

ستان بھی ان اشعار میں بیان ہوئی ہے

تو نگر ہمہ عمر حیدر ال بود
 ہوائی ملو کاں کسی کم شود
 نہ بنیں کہ شاہان چہ حیراں تراند
 غم ملک و آلام گنجی کشند
 کہ در کار دنیا پریشاں بود
 کہ بر پائی شاں جسد عالم بود
 کہ بہر ہوائے پریشاں تراند
 کہ از صبح تا شام رنج کشند
 کہ غم ہا پریشاں کند ہر زماں

(دیوان فارسی قلمی، ص ۴)

انسان دنیا میں آکر ہزاروں مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔ چونکہ صوفی ریاضتوں سے گزرتا ہے اس لئے زندگی کے دکھوں اور غموں کا تجربہ اسے سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت بہار الحق زکریا اپنے اس تجربے کو یوں بیان کرتے ہیں لیکن اس میں تعمیم کا رنگ شامل کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں

یہی آدم و صد ہزاراں بلا
 بر فرزند آدم غم روزگار
 ہمیشہ بود در بلا مبتلا
 کند ہر دمش در بلا باشکار (ص ۵)
 بہ ہر دو کہ گرد و بگرد و خوار (ص ۶)

علامہ اقبال نے فرمایا

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
 فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟
 حضرت غوث بہار الحق شکم پروری اور شکم سیرسی کے مضمون کو اس طرح بانڈھتے ہیں
 شکم رار ہا کن زبند بلا
 کہ مرد شکم پر چو گاؤ خراست
 شکم راندیدیم بجز این دوا
 نہ بل از سگ و خوک ہم بہ تراست (ص ۷)
 دنیا کی بے ثباتی، صبح شام کی گردش، تغیر کا عالمگیر نظام اور نفس انسانی کی بے حقیقتی کے مضامین
 بھی اس کلام میں موجود ہیں۔

چو در صبح آید نماںد بہ شام
 شباتی ندارد بسیار رود
 بیک حال ہرگز نماںد دوام
 بقاتی ندارد دشتا باں رود

بمشکل د ہر دست آساں رود
بمشکل بیاید شتاباں رود
چو خواب است دنیا نازد خیال
یکجی را بزینت نماز جمال
چو بند می دل خود بریں بے وفا
کہ آید گر یزد نہ بیند قفا (ص ۵۷)
صوفی کے اوصاف میں سے ایک پسندیدہ وصف قناعت اور توکل ہے۔ قناعت کا سبق
تصوف کے اولین اسباق میں سے ہے۔ اس مثنوی میں قناعت کی تلقین بھی ملتی ہے۔
نمونہ دیکھئے

بغیر از قناعت بگرد خوار
کہ عزت نہ بیند گہی در دیار
بگویم من این نکتہ باہر ہاں
قناعت رساند بہ تخت شہاں
قناعت بدرویش گنج خداست
گراں گنج دارد کسی باد شاست (ص ۵۸)
فقر اور قناعت کے ساتھ ساتھ صوفی صبر و تحمل سے بھی کام لیتا ہے کیونکہ صبر کی قوت انسانی
نفس کو مجاہد سے پر مائل کرتی اور اسے مشکلات کے مقابلے میں سرخرو بناتی ہے۔ قرآن اور
حدیث میں صبر کی خوبی کو سراہا گیا ہے۔ ایک مقام پر جا کر صبر اور فقر ہم معنی لفظ بن جلتے
ہیں۔ حضرت غوث بہار الحق ملتانی کے کلام میں صبر کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

ہمہ کار بستہ کشاید ز صبر
کہ ہر حاجت تو بر آید ز صبر
ترا صبر با دوست سازد بلند
کہ صبر است نزدیک وانا پسند
نماید ترا عقل حبس متیں
کہ اللہ باشد مع الصابین
اگر نقد با صبر باشد ترا
شود در جہاں ملک حاصل ترا
ترا "فقر فخری" نماید جمال
بدیں فقر فخری یہ یابی کمال (ص ۵۹)
عشق کی فضیلت کو کون نہیں جانتا۔ یہ جذبوں کا سرتاج اور تصوف کی اقلیم کا فاتح ہے۔ لیکن
عشق کا جام ہر بونہو کس کے لئے نہیں ہے اسے پینے والے زندان بلا نوش ہوتے ہیں
جن کے پاس ظرف بھی ہوتا ہے اور شوق بھی۔ بہار الحق ملتانی جذبہ عشق کی تمام کیفیتوں
سے واقف ہیں۔ اس لئے شعر کے حوالے سے حقائق بیان کرتے ہیں۔

بجز عشق یاری دگر هیچ نیست
کہ احوال عالم ، بجز یہی نیست
نہ ہر عشق از جلد فائق تراست
نہ ہر کس بدین شوق لائق تراست

نہ ہر مرد در زکھر خواص شد نہ ہر بندہ مرد خواص شد
 بعشاق حضرت بگیرد مقسیم مگر ایس کہ آید بقلب سلیم (ص ۱۳)
 ظاہر ہے عاشق ہمیشہ معشوق کی خوشنودی کا خواہاں رہتا ہے اور اس کے لئے ہر
 بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ عاشق صادق کا سارا عیش دراصل
 معشوق کے وجود کا مرہون منت ہوتا ہے۔ سوائے عشق کے اس کے لئے کچھ زیبا نہیں
 ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان تک اس راہ میں دے دیتا ہے لیکن یہ عشق دراصل
 حقیقت کا عشق ہے۔ وجود مطلق کو پانے کا عشق ہے۔ اور یہی عشق ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دیتا
 ہے۔ زکریا ملتانی فرماتے ہیں

ہمہ عیش عاشق بہ معشوق ہست کہ از بہر او ہر درد عالم شکست
 بجز عشق جانرا چہ زیبا بود بجز جاں دریں رہ کہ شید بود
 ہمہ وقت عاشق بہ تقویٰ بود زادنی گذشتہ بہ اعلیٰ بود
 ترا عشق باید کہ یا حق بود کہ عشاق در عشق مطلق بود
 چو چوگان عشقت بدست آوری تو کوئی سعادت ز سیداں بری (ص ۱۹)

عشق ہمیشہ ابدی ہوتا ہے اور اس کا تعلق بھی ابدیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ فانی اور عارضی
 چیزوں سے اس کا کوئی گزارا اور واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ دنیا تو چل چلائی کا
 مقام ہے اور اس کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ اس لئے زکریا ملتانی فرماتے ہیں،

اقامت نہ دارد کسی در جہاں سفر پیش آید بگرد درواں
 چینن رسم دنیا کہ فانی فناست دل خود بہ فانی بہ بستن خطاست (ص ۲۱)

غرض اس مختصر سی مثنوی میں اخلاق و معارف کے کتنے مضامین ادا ہوئے ہیں جو
 انسان کی فلاح کے لئے ایک مثالی لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ اسلوب نہایت سادہ،
 عام فہم اور رواں دواں ہے۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے۔ حیرانی اس بات پہ
 ہے کہ حضرت بہار الدین زکریا کے ساتھ پنجابی، ملتانی یا اردو کا ایک بھی جملہ منسوب نہیں
 ہے۔ حالانکہ ان کے ہم عصر اور دوست بابا فرید گنج شکر، حضرت جلال الدین سرخ بخاری
 حضرت راجو قال، حضرت شمس سبزواری سب کے یہاں مقامی اور دیسی زبانوں کے ذیل

فقرے اقوال یا اشعار ملتے ہیں۔ دراصل اس دور کی علمی و ادبی اور درباری و سرکاری اور تحریری زبان فارسی ہی تھی۔ اس لئے غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے یہاں بھی فارسی زبان کا استعمال ملتا ہے۔

بہاء الدین زکریا ملتانی نے طبعی عمر پائی تھی۔ انہوں نے نسّی سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ آپ نے ۶۶۱ھ بروز منگل اپنے حجرے میں وفات پائی۔ شیخ عمر عمروی نے آخری غسل دیا۔ اور نماز جنازہ آپ کے صاحبزادے صدر الدین عارف نے پڑھائی۔ آپ کے وصال کا ذکر مؤرخین اس طرح کرتے ہیں کہ آپ حسب معمول نماز ظہر کے بعد حجرہ میں عبادت میں مشغول تھے۔ باہر آپ کے صاحبزادے صدر الدین عارف خانقاہ اور حجرہ کا جائزہ لے کر آپ کے حجرے کی طرف آرہے تھے کہ ایک نورانی صورت بزرگ نے

۱۔ خلاصۃ الاحباب (قلمی) کی مطابق آپ نے سو سال کی عمر پائی کیونکہ آپ ۵۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۶ھ میں فوت ہوئے (بحوالہ خلاصۃ الاحباب (فارسی قلمی) از محمد افضل قریشی، ص ۴۲)۔
 ۲۔ سن پیدائش کی طرح آپ کے سن وفات کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے (۱) سپر العارفین، ص ۱۶۸ (۲) تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۳۲ (۳) آب کوثر، ص ۲۶ (۴) تاریخ سندھ از امجاز الحق قدوسی، ص ۳۵ (۵) اخبار الاخیار، ص ۶۳ (۶) معمولات مظہریہ و محبوب العارفین، ص ۱۲۵۔ ان سب نے متفقہ طور پر سن وفات ۶۶۱ھ لکھا ہے جبکہ (۱) نزہت الخواطر، ص ۱۳۲ (۲) تواریخ ملتان از حکم چند، ص ۳۲ (۳) مقالات و مینی علمی (جلد اول)، ص ۲۶۲ (۴) سفینۃ الاولیاء، ص ۱۱۵ (۵) حدیقۃ الاسرار فی اخبار اللہبار، ص ۱۹ (۶) خلاصۃ الاحباب، ص ۴۲، اور حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۲، میں سن وفات ۶۶۶ھ درج ہے۔ حدیقۃ الاولیاء مطبوعہ نوکشور میں ص ۴۲ پر تو یہ قطعہ تاریخ بھی درج ہے جو اس طرح ہے۔

پیر دنیا ہادی دور زمان	بادشاہ دین بہاء الدین ولی
عاشق صادق بگوتر جیل آن	عشق حق تالیب اور تھرید کن
نیز فتح دین بہاء الدین بخوان	شمع نور آمد وصال پاک او

اور (۱) مرات الاسرار (جلد دوم)، ص ۱۴۱ (۲) مرتق مولتان از اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۲ (۳) آئین اکبری، ص ۲۰۷ میں ۶۶۵ھ سن وفات لکھا ہوا ہے۔ تذکرہ مشائخ کرام، ص ۱۵۰، میں ۶۶۶ھ درج ہے۔

سبز رنگ کا سر بہر لٹافہ آپ کو دیتے ہوئے فرمایا اسے شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچادیں۔ آپ یہ خط لے کر اندر گئے اور شیخ الاسلام کی خدمت میں یہ خط پہنچا کر باہر قاصد کو دیکھنے آئے۔ اسے نہ پا کر آپ واپس حجرے کی طرف لوٹے تو چاروں طرف سے یہی آوازیں آرہی تھیں۔

”دوست بدوست رسید“

آپ نے گھبرا کر شیخ الاسلام کی جانب دیکھا تو آپ کا سر سجدے میں تھا اور روح فقس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس واقعہ کو خلاصۃ العارفين میں یوں بیان کیا گیا ہے،

” روزی پسر بزرگوار شیخ صدرالدین عارف پیشین در ایستادہ بود تا مردی بیامد سلام داد و مکتوب ہر کردہ پیش شیخ صدرالدین داد و گفت دریں مکتوب فرمان است کہ بدست شیخ بہارالدین بدہید تا بخواند شیخ صدرالدین چوں عنوان نامہ بخواند ہائی ہائی بگریست و گفت کہ طلب دوست آمدہ۔“ (۲)

آپ کا مزار ملتان میں قلعہ پر واقع ہے۔ اولاد علی گیلانی کے مطابق

” اپنا مقبرہ حضور نے خود تعمیر کرایا تھا۔ اس قسم کی عمارت کا صرف ایک نمونہ ہندوستان میں بمقام سونی پت موجود ہے۔ ۱۸۴۸ء کی جنگ کی وجہ سے یہ عمارت بھی بے حد خستہ ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں سرکار عالیہ سے درخواست کی گئی کہ مبلغ دس ہزار روپیہ اس روضہ کی مرمت کے واسطے منظور کیا جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مخدوم شاہ علی محمود صاحب کی کوشش سے چندہ جمع ہوا اور ضروری مرمت کرائی گئی۔“ (۳)

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) سیر العارفين، ص ۱۷۸، (ب) تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی،

ص ۳۰۱-۳۰۲ (ج) اولیائے ملتان، ص ۲۲ (د) فوائد الفواد (فارسی) ص ۲۲۱

۲۔ خلاصۃ العارفين فارسی (علمی) ص ۶۳۔ یہی عبارت لفظوں کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ

خلاصۃ العارفين مرتبہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی میں ص ۱۷۱ پر درج ہے۔

۳۔ بحوالہ ”مرقع مولتان“ ص ۲۱۳

۶۔ فرید الدین مسعود گنج شکر

انسان دوستی اور محبت کے جن جذبول کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے عام کیا تھا۔ بابا فرید الدین گنج شکر کی بدولت ان کی تکمیل ہوئی۔ وہ پہلے صوفی بزرگ ہیں جنہوں نے تصوف کو برصغیر میں ایک عوامی تحریک کی صورت دی اور صوفیانہ مسلک کو کسی ایک فرقے یا طبقے میں نہیں تمام طبقوں اور گروہوں میں بلا امتیاز مذہب و عقیدہ عام کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلیفہ اول حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی طرح بابا فرید گنج شکر کے یہاں بھی شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی اور میل پیدا کرنے کا رجحان غالب ہے۔ البتہ بابا فرید گنج شکر کے یہاں مقامی تہذیب و ثقافت کے اثرات اپنے ان دو عظیم پیش رو صوفیاء کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ انہوں نے ہندو مسلم ترکیبی تہذیب کو عام کرنے میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ بقول قاضی جاوید

” ایک لحاظ سے وہ تصوف کی اس صورت کی نمائندگی کرتے ہیں جسے ہندی

مسلم تصوف کا نام دیا جاسکتا ہے۔“ (۱)

وہ برصغیر کے پہلے صوفی ہیں جن کی شہرت برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی پہنچی۔ چنانچہ قاضی جاوید نے ” فلسطین کے مسلم اولیاء اور عبادت گاہیں“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

” فلسطین میں ایک ایسا زاویہ ہے جس کا نام بابا فرید الدین کے نام پر ہے۔“ (۲)

حافظ محمود شیرانی (۳) اور مولوی عبدالحق (۴) نے بابا فرید کو اردو کا اور مسعود حسن شہاب (۵)

نے پنجابی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ بابا فرید کے اشلوک خصوصی طور پر مقبول عام ہوتے :-

شیخ محمد اکرام کے مطابق ،

۱۔ ” برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار“ ص ۲۶

۲۔ ایضاً ص ۲۵

۳۔ ” پنجاب میں اردو“ ص ۷

۴۔ ” اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام“ ص ۱۱

۵۔ ” خطہ پاک ادب“ ص ۳۷

” مغربی پنجاب میں کامیاب اشاعتِ اسلام کرنے کے علاوہ آپ نے بڑے بڑے صاحبِ سطوت بزرگوں کی تربیت کی۔ چشتیہ سلسلے کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں رونق دی تھی۔ لیکن خطہ ہندوستان میں اس سلسلے کو اصل وسعت و استحکام بابا فرید کی ذات بابرکات سے نصیب ہوا۔ اور فی الحقیقت انہیں اس سرزمین میں سلسلہ چشتیہ کا موٹس ثانی کہا

جاسکتا ہے؟ (۱)

اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں

” حضرت شیخ فرید کی رشد و ہدایت سے نہ صرف مسلمان، مسلمان بنے بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً سترہ غیر مسلم قوموں نے آپ کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا۔“ (۲)

گلزار فریدی کے مطابق

” خلاصہ اولیاء کبار آن زیدۃ القیاء اخیار و آل شیر پشہ تقدیس ربانی و آل شمع شبستان تاسیس سبحانی و آل محرم اسرار مشیت احدیت و آل ہمد م انوار وحدت و فردیت — و آل موصوف نور صفات بی غایات و آل سرور ارباب توحید — آل صاحب کشف و کرامت و آل آرام بخش عرصہ زمین و زمان و آل انتظام وہ کون و مکان —“ (۳)

بابا فرید گنج شکر (۴) کا شمار چھٹی صدی ہجری کے کبار صوفیاء میں ہوتا ہے۔ اس دور کے

۱- ”آب کوثر“ ص ۲۲۳-۲۲۴

۲- بحوالہ ”تاریخ سندھ“ ص ۳۵۶

۳- بحوالہ ”گلزار فریدی“ از مولوی گل محمد چشتی، ص ۲، قلمی نسخہ (فارسی) سن تحریر ۱۹۰۲ء؛

(ملفوظات و مناقب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر) جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ذاتی لائبریری سے دستیاب

ہوا۔

۴- گنج شکر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف روایات مشہور ہیں۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

بارے میں خلیق نظامی لکھتے ہیں

”دنیا نے عجم میں بارہویں صدی عیسوی جنگ و جدل اور شور و ہنگامہ کا دور تھا۔ طاقتور ترک قبائل رہنے کے لئے جگہ کی تلاش میں جنوب کی طرف بڑھ کر اپنی سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ جو نہی مشرق کی طرف سے مزید دباؤ پڑتا وہ جنوب کی طرف اور بڑھ جاتے۔ ہر قبیلہ کی حرکت سے بڑی بڑی آبادیاں منتقل ہو جاتیں۔ اس طرح بے شمار حکمران خاندان تباہ ہو گئے اور

(بقیہ گذشتہ صفحہ) ایک روایت تو یہ ہے کہ جب کئی روز کی مسلسل فاقہ کشی کے بعد ایک رات بھوک کی شدت کی وجہ سے چند لکڑیاں منہ میں ڈالیں تو وہ شکر کی ڈلیاں بن گئیں — روضہ اقطاب (فارسی ص ۵۹ کے مطابق.....) در مدت کشتش روزانہ ہد ہمنش فرسید و ضعف گر سنگی ویرا غالب گردید چیزے از غیب پیدا نیامد کہ یکام بر و پس بے اختیار دست بر زمین کرد چند سنگر یزہ برداشت و بدین مبارک انداخت حق سبحانہ تعالیٰ آن را شکر ساخت — دوسری روایت کچھ یوں ہے کہ ایک روز ایک تاج اجدوہن آیا۔ اس کے پاس شکر تھی۔ لیکن اس نے بابا فرید کے سامنے جھوٹ بولا اور اس شکر کو نمک بتایا۔ لیکن جب اس نے بوریوں کھولیں تو اس میں شکر کی بجائے نمک برآمد ہوا۔ وہ شخص واپس آیا، معافی مانگی اور نمک کو شکر میں بدلنے کی درخواست کی جس پر وہ نمک شکر بن گیا۔ اس لئے آپ شکر گنج مشہور ہو گئے۔ اسی طرح ایک مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کو بچپن میں شکر کا بہت شوق تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں کہا کہ جو بچہ صبح کی نماز پڑھتا ہے اللہ سے شکر دیتا ہے۔ چنانچہ والدہ روزانہ رات کے وقت شکر کی پڑیاں بابا کے سر ہانے رکھ دیتی تاکہ وہ صبح کی نماز پڑھے۔ بارہ سال کی عمر تک تو یہی ہوتا رہا۔ بعد میں والدہ نے شکر کھنی بند کر دی لیکن قدرت کی طرف سے شکر کا اہتمام جاری رہا۔ یعنی انہیں پر وہ غیب سے شکر مل جاتی۔ اس لئے بابا فرید کا نام گنج شکر پڑ گیا۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے) (۱) سیرالاولیاء ص ۴۲، (۲) سوانح بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۴۴، (۳) تذکرہ خواجگان چشت، ص ۱۸۸ (۴) اخبار الاخبار (اردو ترجمہ) ص ۱۱۹-۱۱۸ (۵) سیرالعارفین، ص ۴۸-۴۷، (۶) تاریخ فرشتہ (جلد دوم)، ص ۳۳۸۔ (۷) جواہر فریدی، از اصغر علی چشتی، ص ۱۸۸، مطبوعہ، وکٹوریہ پریس لاہور،

کئی شاہزادے گھر بار چھوڑ کر محفوظ مقامات پر پناہ گزین ہو گئے۔ (۱)

بابا فرید کے آباؤ اجداد جو طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس افراتفری کے زمانے میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ بابا فرید کے دادا جناب قاضی شعیب، شہاب الدین غوری کے عہد میں کابل سے لاہور تشریف لائے اور وہاں سے قصور منتقل ہو گئے جہاں سے سلطان نے انہیں کھوتوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب کے تین صاحبزادے تھے جن میں سے ایک آپ کے والد جمال الدین سلیمان تھے۔ آپ کے والد سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے (۲)۔ ان کی شادی کہتوال کے شیخ وحید الدین خوجندی کی صاحبزادی محترمہ قرسم بی بی سے ہوئی۔ انہی کے ہاں ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء میں ایک ایسے بچے کی پیدائش ہوئی جس کا شمار آج کے چل کر قرون وسطیٰ کے معزز مشاہیر میں ہوا۔ یہ شخصیت حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی تھی آپ کے والد کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کو ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے ملی جو کہ ایک نہایت پارسا اور عابد و زاہد خاتون تھیں۔ آپ نے کہتوال میں گیارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا (۳)۔ اسی زمانے میں آپ کی تعلیم، ذہانت اور نیکی کا

-
- ۱۔ احوال و آثار، شیخ فرید الدین گنج شکر "مصنف خلیق احمد نظامی مترجم قاضی محمد حفیظ اللہ، ص ۴۰۔
المعارف گنج روڈ لاہور سال اشاعت ۱۹۸۳ء / ۱۲۰۳ھ
- ۲۔ بحوالہ (۱) تذکرہ خواجگان چشت، ص ۱۷۸ (۲) گلزار فریدی از مولوی گل محمد چشتی (قلمی نسخہ) فارسی مرقوم ۱۹۰۲ء
- ۳۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے (۱) سوانح بابا فرید الدین مسعود گنج شکر از وحید احمد مسعود، ص ۳ (مطبوعہ رضا پبلی کیشنز لاہور) (۲) نزہت الخواطر، ص ۳۱۲، ۵۶۹ھ لکھا ہے۔ جبکہ خلیق احمد نظامی نے فوائد القواد کے حوالے سے (۹۳ سال عمر بتائی ہے) عمر کا حساب لگا کر سن پیدائش ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) بیان کیا ہے۔ سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۱۳۱ میں بھی ۱۱۷۵ء درج ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (اردو نثر کا آغاز و ارتقاء، ص ۲۶) نے ۵۸۰ھ بیان کی ہے اور مولوی عبدالحق (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۳) ۵۶۹ھ درج کرتے ہیں اور تذکرہ مشائخ کرام از محمد قاسم فرشتہ، ص ۴۴ پر ۵۸۲ھ لکھی ہے۔
- ۴۔ بحوالہ "سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر" از وحید مسعود، ص ۳۵، مطبوعہ رضا پبلی کیشنز

چرچا پورے شہر میں ہو گیا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے
ملتان تشریف لائے۔ کیونکہ

” اس زمانے میں ملتان تمام عالم کا قہر اسلام تھا۔ اور علوم و فنون کا مرکز
بن گیا تھا۔ بڑے بڑے مشاہیر علماء اور بے نظیر فضلاء یہاں موجود تھے اور
ہر طرف طلبہ کے لئے درس گاہیں کھلی ہوئی تھیں۔“ (۱)

ملتان میں آپ نے مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں قیام فرمایا اور ان سے کتاب ”نافع“^(۲)
پڑھی۔ یہیں اسی مسجد میں کتاب ”نافع“ کے مطالعے کے دوران آپ کی ملاقات حضرت قطب الدین
بختیار کاکی سے ہوئی جو آپ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے آپ کو اپنے حلقہ ارادت میں
شامل کر لیا۔^(۳) بابا صاحب نے خواجہ بختیار کاکی کے ساتھ جانا چاہا لیکن انہوں نے روک دیا

۱۔ بحوالہ ”سیر الاولیاء“ تالیف سید محمد بن مبارک کرمانی میر خوردمترجم غلام احمد بریاں، ص ۶۷
الکتاب، گنج بخش زوڈ لاہور، سال اشاعت ۱۹۸۲ء

۲۔ حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) نزہت الخواطر، ص ۳۱۲ (۲) پنجاب کے صوفی دانشور، از
قاضی جاوید، ص ۲۵، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع اول ۱۹۷۹ء لاہور (۳) سیر العارفین، ص ۲۸
(۴) تذکرہ خواجگانِ حشت، ص ۸۷۔

۳۔ قطب الدین بختیار کاکی سے آپ کی ملاقات اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن آپ
مسجد میں تشریف لے گئے وہاں دیکھا کہ جناب گنج شکر صاحب کتاب پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا مولانا
کونسی کتاب ہے؟ بابا صاحب نے فرمایا یہ ”نافع“ ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا ”خدا کرے تمہیں
اس سے نفع حاصل ہو۔ بابا صاحب نے فرمایا اس کتاب سے تو نہیں البتہ مجھے آپ سے فیض پہنچے گا
اس واقعہ کو ردضہ اقطاب، ص ۵۸، میں یوں بیان کیا گیا ہے — ”حضرت شیخ؛ برالدین گنج
شکر برائے تحصیل علوم قدوم بملتان آدرود در مسجد مولانا منہاج الدین ترمذی قرار گرفت۔ روزے بمسجد
مذکورہ بمطالعہ کتاب ”نافع“ کہ در علم فقہ است مشغول بود کہ یکایک حضرت خواجہ قطب الدین ازادش
ہمدان مسجد و رد نمود دید کہ جو آنے نیکوے و پاکیزہ ردے بمطالعہ کتابے مشغولست فرمود ایچوان
پہ میخوانی وے التماس نمود نافع گفت میدانی کہ ازیں تو نفعے خواہد (باقی بر صفحہ ثانی)

اور فرمایا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو کیونکہ

”زاہد بے علم مسخرہ شیطان ہوتا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ پہلے علم حاصل کرو۔“^(۱)

کچھ عرصہ کے بعد آپ ملتان سے قذہار تشریف لے گئے اور وہاں پانچ برس تک مسلسل عبادت و ریاضت میں مصروف رہے اور اپنے عہد کے مروجہ ظاہری علوم کی تعلیم حاصل کی بھرپوری میں قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان کی باقاعدہ طور پر بیعت کریں۔ جس وقت بختیار کاکی نے بیعت سے سرفراز فرمایا اس وقت وہاں نامور مشائخ موجود تھے جن میں شیخ بدر الدین غزنوی، قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا علاء الدین کرمانی، مولانا شمس الدین ترک، خواجہ محمود موئینہ شیخ نظام الدین ابوالمود شامل ہیں۔ بابا صاحب کا شمار قطب الدین بختیار کاکی کے بہترین خلفاء میں سے ہوتا ہے کہ جن کو دیکھ کر خواجہ معین الدین اجمیری نے فرمایا تھا کہ

(بقیہ گذشتہ صفحہ) رسید سے عرضداشت کرد کہ مرا لفظی از لگاہ کرم حضرت شیخ خواہد گردید ہمین قدر بگفت و برخاست و در پافا دو معتقد شد^(۲)

یہی واقعہ منتخب مفوظ شریف فارسی (قلمی) میں یوں لکھا ہے کہ۔ ”خواجہ قطب صاحب بابا صاحب را در ملتان دیدند خود بخود پرسیدند کہ ای میاں درویش چه می خوانی؟ بابا صاحب کتاب نافع فرمودند کہ لفظی باب باشی“ (بحوالہ منتخب شریف فارسی (قلمی) مرتبہ یار محمد بن حضرت خواجہ تاج محمود حشتی، پاک تین شریف جناب اسد نظامی کی ذاتی لا تبری سے استفادہ کیا گیا۔)

المنتخب مفوظ شریف (قلمی) جو ڈاکٹر طاہر تونسوی سے دستیاب ہوا۔ اس میں بھی صفحہ ۲۵۶ میں یہی عبارت اسی طرح درج ہے۔ دونوں قلمی کتابیں ایک ہیں۔ صرف دونوں کے کاتب مختلف ہیں۔ حوالے کے لئے دیکھئے (۱) احوال و آثار شیخ فرید الدین گنج شکر، ص ۵۱- (۲) سیر اللادلیار، ص ۶۰- (۳) پنجاب کے صوفی دانشور، ص ۴۵- (۴) دلی کے بامیں خواجہ، ص ۳۰- (۵) سیر الغارفین، ص ۲۸- (۶) تذکرہ خواجگانے چشت، ص ۱۸۸- (۷) تذکرہ حضرت بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۱۳۶- (۸) تذکرہ مشائخ کرام، ص ۴۱-

۱- بحوالہ (الف) پنجاب کے صوفی دانشور از قاضی جاوید، ص ۴۵ (ب) تذکرہ حضرت بہار الدین

زکریا ملتانی، ص ۱۳۸-

”بابا بختیار! آپ ایک ایسے عظیم شہباز کو دام میں لائے ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ سے ورے کہیں ٹھکانہ نہیں کرے گا، فرید ایک شمع ہے جس سے درویشوں کا سلسلہ روشن ہوگا۔“ (۱)

قطب الدین بختیار کاکی نے بابا فرید کو چلہ معکوس^(۲) کا حکم دیا تو بابا صاحب ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں ان کی شہرت نہ ہو اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ چنانچہ اوچھ میں ”حاج“ یا ”حج“ کی جامع مسجد انہیں مناسب لگی۔ کیونکہ کنواں بھی تھا اور اس کے ساتھ درخت بھی اور وہاں کے مؤذن رشید الدین مینائی انہیں قابل اعتماد معلوم ہوئے چنانچہ بابا فرید نے وہاں چالیس راتیں چلہ معکوس کھینچا۔ وہ مؤذن رات کو آپ کا پاؤں رستی کے ساتھ درخت سے باندھ کر آپ کو کنویں میں الٹا لٹکا دیتے۔ آپ ساری رات عبادت کرتے اور صبح نماز فجر سے قبل آپ کو کنویں سے باہر نکال دیتے کچھ عرصہ آپ نے ہانسی میں بھی قیام فرمایا۔ قطب الدین بختیار کاکی نے وصیت فرمائی کہ

”این جامہ من وعصا و مصلا و فعلین جو ہیں بہ شیخ فرید الدین دہندہ“ (۳)

پھر آپ خواجہ قطب الدین کی وفات کے بعد دہلی تشریف لائے لیکن دہلی کے حالات کے

۱۔ اصل عبارت یوں ہے: ”بابا بختیار شہباز عظیم بقید آوردہ کہ جذبہ سدرۃ المنتہیٰ آشیان نگیرد
 این فرید شمعیت کہ خانوادہ درویشاں منور سازد“ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) سیر العارفین، ص ۲۳۔
 (۲) احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۵۹۔ (۳) سیر الاولیاء، ص ۷۹۔ (۴) پنجاب کے صوفی دانشور
 ص ۲۹۔

۲۔ قاضی جادید چلہ معکوس کو عبادت اور ریاضت کا ہندوانہ طریقہ قرار دیتے ہیں (ملاحظہ فرمائیے ”برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء“ ص ۲۶
 تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) احوال و آثار۔ شیخ فرید الدین گنج شکر، ص ۶۶ تا ۷۰۔ (۲) اخبار الاخبار،
 ص ۱۲۰۔ (۳) پنجاب کے صوفی دانشور، ص ۵۱۔ ۵۰۔ (۴) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۷۲۔
 البتہ مرتب مولتان، ص ۲۲۵، اور تاریخ ملتان از حکم چند، ص ۱۰۹ کے مطابق یہ کنواں حضرت دیوان
 چاؤلی کے مزار کے پاس واقع تھا۔

۳۔ بحوالہ ”فوائد الفواد“ از میر حسن سنجری (فارسی) جلد چہارم، ص ۱۸۷۔

پیش نظر وہاں قیام نہ فرمایا اور اجودہن (موجودہ پاکستان) تشریف لے گئے۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ

”بابا فرید کا دہلی قیام نہ کرنا چشتیہ سلسلہ کے حق میں اتنا ہی مفید ہوا جتنا قطب صاحب کا دہلی میں قیام کرنا التمش کی وفات کے بعد عرصہ تک دہلی کے حالات خراب رہے اور علماء و صوفیاء نے مل کر خوب سیاست میں حصہ لیا۔ مگر تھا کہ بابا صاحب بھی ان حالات میں رہ کر سلسلہ کا کام انجام دینے سے قاصر رہتے۔ ہانسی اور بعد کو اجودہن میں رہ کر ان کو سلسلہ کا کام کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔“ (۱)

اجودہن کے لوگوں کے بارے میں خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ

”یہاں (اجودہن) کے باشندوں کے عقائد نہایت گھٹیا تھے۔ وہ ان پڑھ بد مزاج اور ضعیف الاعتقاد تھے۔ ایک دلی اللہ کے عزت میں ریاضت و مجاہدہ کے لئے اس سے بہتر اور پرسکون کوئی جگہ نہ ہو سکتی تھی! (۲)

اسی طرح شیخ عبدالحق محدث کا بیان ہے کہ

”یہاں (اجودہن) کے باشندے تندخو، ظاہر پرست اور خاص کر فقیروں اور درویشوں کے دشمن تھے۔ آپ نے اس جگہ پہنچ کر فرمایا کہ یہ مقام میرے رہنے کے مناسب ہے۔ چنانچہ وہیں رہنے لگے۔“ (۳)

اجودہن کا علاقہ اگرچہ تھا تو مسلمانوں کے قبضے میں لیکن یہاں ہندوؤں کی آبادی بھی کثرت سے تھی۔ قاضی جاوید امین الدین (مصنف تذکرہ علی جویری) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

”اس زمانے میں ہندوؤں کا خاص علاقہ تھا جہاں ہندوؤں کا مشہور

۱۔ بحوالہ ”تاریخ مشائخ چشت“ از خلیق احمد نظامی، ص ۱۵۹-۱۵۸۔

۲۔ بحوالہ ”احوال و آثار“ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر“ ص ۸۸

۳۔ بحوالہ ”اخبار الاخیار“ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مترجمین مولانا سبحان محمود صاحب،

دارالعلوم، مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم، ص ۱۱، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی۔

راج جوگی رہتا تھا جس کا نام سمبھونا تھا۔ ہندوؤں پر اس کا بڑا اثر
 ورسوخ تھا۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مرشد گرامی نے ہدایت خلق اور تبلیغ
 اسلام کی خاص طور پر ہدایت فرمائی تھی۔ اس لئے آپ نے ہندوؤں
 کے اس علاقہ کو اپنی تبلیغ و ہدایت کا مرکز بنایا تاکہ کفر کی تاریکیوں کو اسلام
 کی ضیا باری سے منور کریں۔ چنانچہ آپ کی مساعی سے اس علاقہ کی کایا
 پلٹ گئی۔ ہندو جو درجہ قبول کر کے آپ کے حلقہ ارادت میں
 شامل ہوتے گئے۔ سمبھونا تھا بھی اسلام قبول کر کے درجہ ولایت کو پہنچا۔

بابا صاحب نے اجودھن میں صوفیانہ روایات کے مطابق ایک جماعت خانہ قائم کیا اور وہاں
 دس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس جماعت خانے کے بارے میں قاضی جاوید کا
 بیان ہے کہ

” اس کو ایسی خانقاہ قرار نہیں دینا چاہیے جس میں خارجی ماحول سے
 مطابقت اختیار کرنے میں ناکام رہنے والے مجہول افراد پناہ لیتے تھے۔
 اصل یہ ہے کہ یہ جماعت خانہ اس سماجی، معاشی نظریے اور آدرش کی
 تجسیم تھا جس کا پرچار چستی رہنا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک فعال
 اور تخلیقی مرکز تھا۔ قرون وسطیٰ کے برصغیر میں جب کہ سماجی تقسیموں پر بہت
 زیادہ زور دیا جاتا تھا اور اس قسم کے صوفیانہ مراکز انسان دوستی کے
 آدرش کو برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ رہ گئے تھے۔“ (۶)

بابا فرید کے قائم کردہ جماعت خانے کا دروازہ ہر شخص کے لئے دن رات کھلا رہتا تھا
 ” بابا صاحب ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور سمجھ کے مطابق گفتگو فرماتے
 تھے۔ امیر و غریب کا ان کے یہاں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہر نئے آنے
 والے سے اس طرح ملتے تھے گویا برسوں کا آشنا ہے۔ ظاہر و باطن

۱۔ بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۵۳۔

۲۔ بحوالہ ————— ایضاً ————— ص ۵۴۔

کی ہم آہنگی حیرت انگیز تھی؟ (۱)

گلزار فریدی میں لکھا ہے

”خواجه گنج شکر عجب تقریر دلپذیر و بیان شافی و کافی و فصیح و بلیغ

داشت۔“ (۲)

آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے کوئی بھی مسئلہ ہو آپ بڑے سادہ سے لفظوں میں آسانی کے ساتھ سمجھا دیتے تھے۔ بابا صاحب نے اپنے دور کے مردِ وہم ہر قسم کے علوم حاصل کئے تھے۔ جتنی مشکل کتابیں تھیں سب کو پڑھا ہوا تھا۔ حصولِ تعلیم کی خاطر انہوں نے بغداد اور خراسان کا سفر بھی اختیار کیا تھا۔ جعفر قاسمی کے مطابق ”یہ بات یقینی ہے کہ شیخ فرید ظاہری و باطنی علوم اسلامی کے عقلی ورثے کے پوری طرح مالک تھے۔ کیونکہ انہوں نے علم دین کی مکمل اور معیاری تعلیم حاصل کی تھی۔“ (۳)

بابا فرید نے قرآن مجید کا خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں آپ کا علم غیر معمولی تھا۔ نہ صرف خود مطالعہ کیا تھا بلکہ اوروں کو بھی پڑھایا تھا۔ نزہت الخواطر میں لکھا ہے کہ، ”حضرت نظام الدین اولیاء نے آپ سے قرآن مجید کے ۶ پارے پڑھے اور کتاب العوارف کا کچھ حصہ سبقاً پڑھا۔“ (۴) اور شیخ عبدالشکور سالی نے

۱۔ بحوالہ ”تاریخ مشائخ چشت“ از خلیق احمد نظامی، ص ۶۔

۲۔ گلزار فریدی (قلمی نسخہ) ص ۲۸

۳۔ ”بابا فرید الدین گنج شکر“ از جعفر قاسمی (اُردو ترجمہ از ظاہر اسدی) ص ۱۲۔ مطبوعہ المعارف لاہور

۴۔ فوائد الفواد میں حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں

”میں نے شیخ کبیر قدس اللہ سرہ العزیز سے چھ سپارے پڑھے تھے۔ اس کے

علاوہ ان سے تین کتابیں اور پڑھی ہیں۔“

(بحوالہ فوائد الفواد، اُردو) ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ہر تبہ امیر حسن علاء سنجر، ترجمہ پروفیسر

محمد سرور، ص ۳۲۰۔ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور، طبع اول ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء

کتاب التہید پڑھی۔ (۱)

بابا صاحب کو تصوف کے علم سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف المعارف" کے مطالعے کو ہر اس درویش کے لئے لازم خیال کرتے تھے جسے اس کا مرشد خلافت دینا چاہتا تھا۔ خلیق احمد نظامی کے خیال میں برصغیر میں سب سے پہلے بابا صاحب نے ہی اس کتاب کے مطالعے کو رواج دیا۔ اور تصوف کے نصاب میں شامل کیا۔ (۲) شیخ نظام الدین اولیاء، حضرت بابا سے "عوارف المعارف" پڑھنے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں،

"میں نے عوارف کے پانچ ابواب شیخ کبیر فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز سے پڑھے۔ بعد ازاں ارشاد ہوا کہ آپ عوارف کے نکات اس طرح بیان کرتے تھے کہ کسی اور سے ایسا بن نہ پڑے گا۔" (۳)

بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات کے دو تین مجموعے شامل ہو چکے ہیں ان میں سے ایک کا نام "راحت القلوب" ہے جس کو شیخ المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب کیا جاتا

۱- بحوالہ "نزہت الخواطر و بہجتہ المسامح والنواظر" (حصہ اول) مؤلفہ مولانا سید عبدالحی بریلوی، لکھنؤ، مترجم ابویحییٰ امام خان نوشہرودی، ص ۳۱۳، مطبوعہ مقبول اکیڈمی، بمبئی، اوقاف لاہور، طبع اول، ۱۹۶۵ء، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۱۰ تا ۱۰۵- (۲) آب کوثر، ص ۲۲۳-

۲- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "احوال و آثار، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۱۰۲

۳- بحوالہ "فوائد القواد" (اردو ترجمہ) ص ۱۰۲

۴- روضہ اقطاب میں ص ۲۹، کے مطابق شیخ نظام الدین اولیاء اپنے آپ کو حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کا خلیفہ اکبر کہتے تھے، الفاظ یہ ہیں۔ "در تصانیف خود ضبط مینماید وے مرید و خلیفہ اکبر حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر است۔"

حدیقۃ الاولیاء، ص ۳۶، میں بھی یہی لکھا ہے کہ "یہ حضرت کے بڑے خلیفہ شیخ فرید الدین گنج شکر پاک پتی کے تھے۔" (بحوالہ حدیقۃ الاولیاء از غلام سرور لاہوری، ص ۳۶، مطبع نوکشور، ۱۹۵۶ء)

ہے۔ دوسرے مجموعے کا نام "اسرار الاولیاء" ہے۔ جسے حضرت خواجہ بدرالدین اسحاق نے مرتب کیا۔ بابا صاحب کی شاعری جو اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ سکھوں کی مشہور زمانہ مذہبی کتاب "اوگرنتھ" میں ملتی ہے۔ ان تمام ملفوظات پر شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے (۲)۔ لیکن ان ملفوظات کے مندرجات کے حوالے بابا فرید گنج شکر پر لکھی گئی کم و بیش تمام کتابوں میں ملتے ہیں مجھے جناب حبیب فائق کی لاہری سے بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات پر مبنی ایسا قلمی نسخہ بعنوان "گنج الاسرار" دستیاب ہوا ہے جو ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ کا لکھا ہوا ہے اس کی چار فصلیں ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ در معرفت صنع دل

۲۔ در پاس انفاس

۳۔ در شرح ماہیت دل

۴۔ در اظہار وحدانیت و آفرینش حضرت آدم

یہ رسالہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق کے پختہ خط میں لکھا گیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت معرفت صنع دل میں قرآن کی اس آیت کے حوالے سے قلب مومن کی عظمت اور بزرگی بیان کی ہے

۱۔ یہ کتاب مطبع نامی منشی نو لکھنور کان پور نے شائع کی تھی اس کا ایک نسخہ مجھے جناب اسد نظامی کی لاہری سے ملا۔ یہ چھاپا ایڈیشن ہے جو مارچ ۱۹۱۷ء میں طبع ہوا۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ جیسا کہ اس نسخے کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب نادرا الوجود تھی۔ یہ کتاب چورانوے (۹۴) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی ۲۲ فصلیں ہیں۔

۲۔ اختلافی بحث کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) احوال و آثار، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر از خلیق احمد نظامی، ص ۲۳۳ تا ۲۳۹۔ (۲) بابا فرید گنج شکر ابراہیم اور فرید ثانی (مضمون) از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین جلد ۱۴، شماره ۲۰، عدد مسلسل ۵۲۔ فروری ۱۹۳۸ء، ص ۷۶۔ (۳) برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، ص ۲۸-۲۹۔ (۴) آب کوثر، ص ۲۲۴-۲۲۵۔ (۵) پنجاب کے صوفی، دانشور، ص ۵۸-۵۹۔ (۶) گلزار فریدی (قلمی نسخہ) فارسی، ص ۵۔

كما قال الله تعالى قلب المؤمن أكبر من العرش وواسع من الكرسي
 اس کے بعد لکھا ہے کہ "مراد ازین عظمت و بزرگی قلب مومن است کہ عشق الہی و اسرار
 الہی و معرفت ذکر الہی و ادست سوال اگر گویند کہ دل پارہ گوشت است بدین فراخی کہ نہ
 در آسمان و نہ در زمین با است چگونہ صورت بند و جواب گفتہ اند مراد از وسعت صلاح و راستی
 است ہر گاہ کہ دل مومن در صلاح اید از زمین و آسمان وسیع تر است۔ (ص ۲-۳)۔
 اسی طرح در پاس انفاس کے ضمن میں ذکر و فکر کو ضروری قرار دیا ہے اور ذکر
 جلی سے باطن کی پاکیزگی بیان کی ہے۔ دل کے اندر سات پہلو بیان کئے گئے ہیں جن کی
 تفصیل اس طرح ہے

"گوہر اول ذکر است، دوم گوہر محبت است، سوم گوہر عشق، چہارم گوہر
 سراسر است، پنجم گوہر روح است، ششم گوہر معرفت است، ہفتم گوہر
 فقر است دل را بسبب این گوہر با گنج گفتہ اند" (ص ۱۰)

تیسری فصل در شرح ماہیت دل میں سالک کے لئے ذکر جلی و ذکر خفی کی کثرت کو ضروری
 قرار دیا گیا ہے۔ جس کی بدولت یہ سات گوہر جن کا ذکر دوسری فصل میں کیا گیا ہے۔ روشن
 ہو جاتے ہیں اور پھر سالک سوائے حق کے کچھ پسند نہیں کرتا۔ سوائے حق کے کچھ نہیں
 سنتا۔ سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا اور سوائے حق کے کچھ نہیں کرتا۔ (ص ۱۲-۱۵)
 فصل چہارم کی تشریح کرتے ہوئے یہ حدیث درج کی گئی ہے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم انما من نور الله تعالى والمؤمنون

من نوري، قال الله تعالى نور السموات والارض اي منورها و

عادي اصلها

(ص ۱۵)

اس کے بعد تخلیق آدم کا واقعہ بیان کیا ہے، ملائک کے سجدے، ابلیس کی سرتابی،
 دنیا میں انسان کی نیابت وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ آخر میں آدم کی آفرینش کا مقصد و حداثیت
 کا اظہار قرار دیا ہے۔ (ص ۱۶ تا ۲۲)

اردو زبان کی ابتدائی تشکیل و تعمیر کے دور میں جن صوفیاء کا نام آتا ہے ان میں
 حضرت بابا فرید سرفہرست ہیں۔ ان کے ساتھ نہ صرف جملے اور فقرے منسوب ہیں بلکہ
 شعر و شاعری کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ بھی ان کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری

اس زبان میں ہے جو اس دور میں مروج تھی اور عوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس زبان کو جو نام بھی دیا جائے بہر حال اس میں ملتان، پنجابی اور ہندی کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی ابتدائی ہیئت میں ان زبانوں کو کتنا گہرا دخل رہا ہے۔ بابا صاحب کے جملوں اور شاعری کے نمونوں کو اردو، سرسلیکی اور پنجابی شاعری کے ارتقاء اور اردو زبان کی ابتدائی نشوونما کے سلسلے میں تاریخی تقدم حاصل ہے اور کم و بیش تمام ماہرین لسانیات نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بابا فرید کے جملوں اور شعروں کی مثالیں درج کی ہیں^(۱)۔ ان میں سے کچھ اہم مثالیں یہ ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا

”پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے“۔ (۲)

خواجہ بختیار کاکی کے استفسار پر فرمایا

”آنکھ آتی ہے“۔ (۳)

بابا فرید سرسہ کے مقام پر ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ ایسے میں ہی کسی موقع پر فرمایا،

”سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ“۔ (۴)

۱۔ ملاحظہ فرمائیے (۱) پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۲۹۹ تا ۳۰۲۔ (۲) تاریخ ادب اردو (جلد اول) از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۳۶-۳۷، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۹-۱۳۔ (۳) ملتان زبان اور اس کا تعلق اردو کے ساتھ، ص ۲۲۵-۳۳۸۔ (۴) اردو نثر کا آغاز و ارتقاء از ڈاکٹر رفیع سلطانہ، ص ۲۶-۳۳۔ (۵) سیرالاولیاء، ص ۱۸۲-۱۸۵۔

۲۔ بحوالہ (۱) اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۰۔ (۲) پنجاب میں اردو، ص ۳۱۔ (۳) اردو نثر کا آغاز و ارتقاء، ص ۲۶۔ (۴) خواجہ فریدی از اصغر علی چشتی، ص ۲۶۹۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس

لاہور، ۱۳۰۱ھ۔

۳۔ ”اردو نثر کا آغاز و ارتقاء“، ص ۲۶۔

۴۔ بحوالہ ”پنجاب میں اردو“، ص ۳۰۱۔

ایک دفعہ ایک مرید نے بابا فرید سے عقل کا مقام دریافت کیا تو فرمایا
" بیچ سر کے " (۱)

اسی طرح فرمایا

" ایک دو تین چار پنج چھ ہفت ؛ (۲)

پھر فرمایا

" خواہ کھوہ کھاہ خواہ دوہ کھاہ ؛ (۳)

وحید احمد مسعود لکھتے ہیں

" بہر حال نثر کے ان چند فقروں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت والا
کا مذاق کس قدر بلند تھا اور شستگی کتنی تھی۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا
ہے کہ وہ اردو کے معمار اول تھے اور ساتویں صدی میں یہ زبان اپنے امتیازی
خود غالب نمایاں کر چکی تھی " (۴)

اسی طرح بہت سے اشعار اور کافیاں بھی بابا فرید سے منسوب کی جاتی ہیں۔ جناب ڈاکٹر
مہر عبدالحق سے مجھے " گلزار فریدی (فارسی) کا قلمی غیر مطبوعہ نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ میں
اس کتاب سے کچھ مثالیں درج کرتی ہوں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت
بابا فرید نے ایک کنویں میں چلہ معکوس کاٹا تھا۔ اسی دوران میں ایک کوآ آپ کے جسم
پر آبیٹھا اور چونچیں مارنے لگا۔ آپ نے منع نہ کیا۔ لیکن جب کوٹے نے ان کی آنکھ پر
چونچ ماری تو آپ نے فرمایا (۵)

کانوا کرنگ ٹکیندیاں سب چن کھائیو ماس

۱۔ بحوالہ " اردو نثر کا آغاز و ارتقاء " ص ۲۹

۲۔ بحوالہ جواہر فریدی از مولوی اصغر علی حشتی، ص ۲۸، مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور، ۱۳۰۱ھ

۳۔ " سوانح حضرت بابا فرید الدین گنج شکر " مرتبہ وحید احمد مسعود، ص ۲۲۱

۴۔ اس واقعہ کی اصل عبارت یوں ہے " نقل است کہ روزے زاغ بدن مبارک در چلبے کہ آویزاں

بود ہے کندید۔ شیخ متع نفرمود تا بہ چشماں منتقار زدن آغا ز نہاد شیخ فرمود " (گلزار فریدی، ص ۸)

ایہہ دونین مت کھائیو ملن دی ہاسے آس
 (یعنی اے کوئے! تو (میرے) بدن کو کاٹتے ہوئے میرا سارا گوشت چن چن کر کھا لو
 لیکن میری ان دو آنکھوں کو مت کھانا کہ مجھے (دوست سے) ملن کی آس ہے)
 روایت ہے کہ آپ لاہور سے روانہ ہو کر اجودھن (پاک پٹن) پہنچے تو آپ نے
 اس جگہ کو پسند فرمایا۔ حالانکہ وہاں کے لوگ ناقدِ رشناس اور بد ذوق و بد مزاج تھے
 چنانچہ آپ نے فرمایا

فرید ا اتھاں ٹکیے جتھاں دسن انھے

نہ کو سا کون جانے نہ کو سا کون منے (۱)

(یعنی اے فرید! وہاں رہنا چاہیئے جہاں اندھے رہتے ہوں تاکہ نہ کوئی ہمیں جان سکے
 اور نہ ہی کوئی ہم کو مان سکے۔)

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی کا معمول تھا کہ وہ ہر سال
 بابا فرید کو تحفے کے طور پر گاجریں بھیجا کرتے تھے۔ جبکہ بابا فرید انہیں بیر بھجواتے تھے۔ یہ
 سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ایک سال زکریا ملتانی نے گاجریں نہ بھجوائیں تو بابا نے
 بھی بیر نہ بھجوائے۔ چنانچہ زکریا ملتانی نے شکایت کی تو اس کے جواب میں بابا فرید
 نے فرمایا

ہتھڑیں وٹوں ہتھڑے پیراں وٹوں پیر

تساں نہ متیاں گاجراں اساں نہ متے بیر (۲)

۱- بحوالہ "گلزار فریدی" ص ۲۸

۲- حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور بابا گنج شکر کے درمیان موانست اور محبت کا رشتہ قائم
 تھا۔ مولانا نور احمد خان فریدی کے مطابق "ساہا سال تک دونوں نے یکجا بسر کئے اور سفر و حضر میں
 ایک دوسرے کے شریک حال رہے۔ ان کا باہمی اخلاق دنیاوی راہ و رسم سے وراہ الورا تھا۔"
 (ملاحظہ فرمائیے "تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۱۲۱)

۳- اصل عبارت یوں ہے۔ نقل است مکتوب است کہ مخدوم بہاء الدین ملتانی۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

(یعنی ہاتھوں کے بدلے ہاتھ اور پیروں کے بدلے پیر۔ آپ نے گاجریں نہیں بھجوائیں ہم نے
بیر نہیں بھجوائے۔)

منشی حبیبی رام مشتاق فرید کوئی چشتی، بدری صابری قادری نے بابا فرید کے کچھ
اشلوک گورو گرنہ سے منتخب کر کے ان کی شرح لکھی ہے۔ یہ کتاب الہد والے قومی کشمیری
بازار لاہور سے ۱۹۲۷ء بمطابق ۲۷ شوال ۱۳۴۵ھ شائع ہوئی۔ اس کے پہلے چار صفحے
غائب ہیں۔ یہ کتاب مجھے جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئی ہے
چند اشلوک درج کرتی ہوں جن سے اس زمانے کی زبان کا انداز معلوم ہوگا۔

فریداجے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ

آن پڑے گریوان میں سر نیوال کر کے دیکھ (۱۱۴)

دیکھ فریداجو تھیا داہڑی ہوئی بھور

آگانیڑے آیا پچھارہیا دور (ص ۱۶)

اپنالایا پریم نہ لاگے جی لوچے سب کو لے

(عشق الہی نہیں لگتا اگر ہر کوئی)

اے پریم پیالہ خیم کا جس بھاوے نس وے (ص ۱۹)

فریدا خاک نہ تندے خاکوں جیڈ نہ کو لے

جیوندیاں پیراں تلے مویاں اپر ہوتے (ص ۲۲)

فریدا میں بھلاواپگ دامت میلی ہو جائے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) بطریق تحفہ میوہ ہازرد کی بظرف جناب گنج شکر میفرستادی و جناب گنج شکر در موسم

بہار فیوض دلخواہی مخدوم میوہ ہاکنار بجانب مخدوم بہاء الدین ابلاغ دلشتے۔ مدتے بدیں گونہ روشی

داشتندے۔ آخریکے سال مخدوم زرد کی ہانفرستاد آنجناب کنار ہانیز نفرستاد۔ مخدوم بعد گذشتی موسم

کنار شکایت بدینگو نہ نوشت کہ ای مولانا فرید الدین این بار۔ میوہ ہاکنار نفرستادہ اند جناب

گنج شکر این جواب نوشت کہ ای برام بہاء الدین ہتھیریں دٹوں ہتھیرے پیراں دتوں پیر۔ تسان نہ

متیاں گاجراں اسان نہ متے بیر۔ (بحوالہ "گلزار فریدی، ص ۳۷)

- (۴۰ ص) بکھلا روح نہ جاندا سر بھی مٹی کھائے
 مڑھی سکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پیو
- (۴۱ ص) فریدا دیکھ پرانی چو پڑھی نہ ترسائیں جیو
 فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں اسارے بھی گئی
- (۴۲ ص) کوڑ سو دا کر گئے گوریں جا پیتے
 فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائے چت
- (۵۶ ص) مٹھی پتی اتو کوئی نہ ہو سی مست
 فریدا کالے مینڈے کپڑے کالا مینڈا بھیس لیس
- (۵۹ ص) گہنی بھریا میں پھراں لوک کہن در ویش
 فریدا میں نول مار کے منج کرنکی کر کے کٹ
- (۷۷ ص) بھرے خزانے رب نے جو بھاوے سولٹ
 کاگا کرتنگ ڈھنڈ ہو لیا سگلا کھایا ماس
- (۹۲ ص) ایہہ دوئے نیناں مت جھوہو پر دیکھن کی آس
 کاگا سب تن کھائیوں چن چن کھائیوں ماس
- (۱۰ ص) دو نین مت کھائیو پر دیکھن کی آس
 کہے فرید سہیلیو سوہ آلائے سی^۵
- (۱۶۰ ص) ہنس چلی ڈھنا ایہہ تن ڈھیری تھے سی
- فنون لطیفہ میں شاعری کے علاوہ موسیقی سے ان کو خاص شغف تھا۔ سماع میں

۱۔ حق ارشادات فریدی یعنی اشوک فریدی مولفہ منشی حبیبی رام مشتاق فریدی کوٹی، مطبوعہ الندوالے
 قومی دکان کشمیری بازار، لاہور، یکم مئی ۱۹۲۷ء بمطابق ۲۷ شوال ۱۳۴۵ھ۔ کیفی جام پوری
 مرحوم نے اپنی تصنیف "سرائیکی شاعری" میں بابا فرید کی شاعری کے کچھ نمونے درج
 کئے ہیں جو اشوک بابا فرید سے لئے گئے ہیں (ملاحظہ فرمائیے "سرائیکی شاعری" مطبوعہ برہم
 ثقافت، ملتان، طبع اول ۱۹۶۹ء)

ان کی دلچسپی ضرب المثل بن چکی تھی۔ اس سلسلے میں کئی ایک روایات مشہور ہیں۔
 اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ

” ایک محفل میں بابا فرید الدین گنج شکر بھی موجود تھے اور لوگ سماع کے
 جواز اور عدم جواز کے متعلق علمائے کرام کے اختلاف کا ذکر کر رہے تھے۔
 ان لوگوں کی تمام تر گفتگو سننے کے بعد آپ نے فرمایا، سبحان اللہ ایک جل
 کر رکھ ہو چکا ہے اور دوسرے ابھی تک اختلاف میں پڑے ہوئے
 ہیں۔“ (۱)

ایک موقع پر فرمایا کہ

” اہل سماع وہ گروہ ہے کہ جب وہ سماع اور تحیر میں مستغرق ہوتے
 ہیں اس وقت لاکھ تلوار بھی اس کے سر پر ماری جاوے تو انہیں خبر
 نہیں ہوتی۔“ (۲)

بابا فرید سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ

” رحمت باری تعالیٰ کا نزول تین مواقع پر ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک
 سماع، دوسرا درویشوں کے احوال بیان کرنے کا موقع، اور تیسرا عاشقوں
 کے انوار تجلی کے عالم میں غرق ہو جانے کا موقع ہے۔“ (۳)
 بابا فرید گنج شکر کے سن وفات کے بارے میں اختلاف موجود ہے۔

حدیقۃ الاولیاء، ص ۷۷، نزهت الخواطر، ص ۳۱۲، سیر الاولیاء، ص ۹۱، سفینۃ الاولیاء
 ص ۱۳۳، اور احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۱۲۳، معمولات مظہر یہ اور
 محبوب العارفین ص ۱۲۲، کے مطابق ۵ محرم ۶۶۲ھ (۱۵ اکتوبر ۱۲۶۵ء) سوانح حضرت

۱۔ بحوالہ ” اخبار الاخیار “ ص ۱۲۲

۲۔ راحت القلوب، مرتبہ حضرت خواجہ نظام الدین مترجم ملک فضل الدین نقشبندی مجددی،

ص ۲۲، مطبوعہ اللہ واے قومی دکان، کشمیری بازار، لاہور۔

۳۔ بحوالہ ” پنجاب کے صوفی دانشور “ از قاضی جاوید، ص ۷۲۔

فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۱۸۱، پر ۵۔ محرم ۶۶۱ھ (۱۲۶۵ء) درج ہے۔ اخبار الانبیاء ص ۱۲۳ کے مطابق ۵۔ محرم ۶۶۵ھ تذکرہ خواجگان چشت، ص ۱۹۸۔ میں ۵۔ محرم بروز ۵۔ شنبہ ۶۶۹ھ اور تذکرہ مشائخ کرام، ص ۶۷، پر ۶۷۹ھ مرقوم ہے۔ لیکن ۵۔ محرم ۶۶۳ھ صحیح تاریخ وفات ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر فقیر محمد کی تحقیق کے مطابق یہی تاریخ درست ہے (۱)۔

۷۔ مخدوم عبدالرشید حقانی سلسلہ عالیہ قادریہ کے ایک نامور صوفی بزرگ مخدوم عبدالرشید حقانی ہیں جو بہار الدین زکریا کے ہم عصر اور عم زاد تھے۔ ان کے سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ نور احمد فریدی کے مطابق،

”حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کو تین سال گزرے تھے کہ

اس خانوادے کے مطلع پر شریعت و طریقت کے ایک اور آفتاب نے طلوع کیا۔ یعنی شیخ احمد غوث کے مشکوئے معلیٰ میں حضرت مخدوم عبدالرشید

تولد ہوئے (۲)۔

۱۔ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۱۳، ص ۲۵۶، مرتبہ سید فیاض محمود، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۲۔ بحوالہ تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۴۱۔

نور احمد فریدی کے مطابق بہار الدین زکریا ملتانی کا سن ولادت ۵۶۶ھ ہے اور عبدالرشید حقانی ان کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ اس طرح آپ کا سن ولادت ۵۶۹ھ بنتا ہے جس کا ذکر کسی اور مؤرخ نے نہیں کیا۔ لیکن میرے پاس خلاصۃ الاحباب کے قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ موجود ہے جو میں نے مخدوم عبدالرشید حقانی کے سجادہ نشینوں سے حاصل کیا۔ اس کے صفحہ نمبر ۵ پر لکھا ہے کہ جب حضرت غوث بہار الحقی کے والد فوت ہوئے تو آپ کی عمر بارہ برس کی تھی۔ آپ کے والد کی وفات ۵۹۰ھ میں ہوئی۔ حضرت عبدالرشید حقانی اس وقت ۹ برس کے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کی پیدائش ۵۸۱ھ میں ہوئی۔ (بحوالہ خلاصۃ الاحباب از محمد افضل اسدی، ص ۵۔ میری تحویل میں ہے۔) منبع البرکات (قلمی) میں بھی یہی لکھا ہے کہ۔ ”آں وقت در عمر حضرت شیخ بہار الدین دو ازده ساله بود و در عمر مخدوم عبدالرشید نہ ساله بودند“ (منبع البرکات (تذکرہ حقانیہ) فارسی قلمی نسخہ از مؤلف شیخ شرف الدین قریشی، ص ۲۵، میری تحویل میں ہے۔)

حضرت مخدوم عبدالرشید حقانی کے جد امجد حضرت ہسپار بن اسود اسدی قریشی حضور اکرم کے صحابی تھے جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ وہ صحابی کی نسل کے ایک ممتاز شخص تاج الدین محمود غزنوی کے ساتھ ملتان آئے اور سرزمین ملتان کے ایک مفتوحہ علاقے کے حاکم مقرر ہوئے۔ ان کی پانچویں نسل سے ایک بزرگ حضرت کمال الدین کے یہاں دو بیٹے شیخ احمد اور شیخ محمد پیدا ہوئے۔ شیخ احمد کے یہاں حضرت مخدوم عبدالرشید اور شیخ محمد کے گھر حضرت بہاء الدین زکریا تولد ہوئے۔ اس عہد کے معروف علماء، مشائخ اور فقہار سے تعلیم حاصل کی اور بہت جلد بزرگی کے درجے پر پہنچے۔

آپ پہلے کوٹ کروڑ میں رہتے تھے جن دنوں بہاء الدین زکریا حصول علم کی خاطر سفر پر گئے تھے۔ آپ نے اس عرصے میں پہلے کوٹ کروڑ میں قیام فرمایا۔ پھر ملتان تشریف لے آئے اور قلعہ میں اس مقام پر قیام فرمایا جہاں اب بہاء الدین زکریا کا مزار ہے۔ ملتان میں آپ کے علم رشد کا شہرہ دور دور تک ہوا اور لوگ آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔ تقریباً ۶۱۵ھ کے اوائل میں بہاء الدین زکریا ملتان واپس آئے۔

بہاء الدین زکریا کے ملتان واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد آپ نے والد کی وصیت^(۱) کے مطابق اپنی ہمیشہ رشیدہ خاتون کی شادی بہاء الدین زکریا سے کی اور بہاء الدین کی جتنی جائیداد تھی سب آپ کے حوالے کی اور ان سے حرم نبوی جانے کی اجازت طلب کی اور سات ساتھیوں کے ہمراہ مزید علم حاصل کرنے کے لئے حرمین کی طرف روانہ ہوئے۔

۱۔ بحوالہ "تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتان" از نور احمد فریدی، ص ۶۲

۲۔ منبع البرکات (قلمی) کے مطابق مخدوم عبدالرشید حقانی کو والد نے یہ ہدایت خواب میں کی تھی۔ (بحوالہ کتاب مذکورہ، ص ۲۷-۲۸)

۳۔ منبع البرکات (قلمی) ص ۲۸ کے مطابق ان کی ہمیشہ کا نام بصران خاتون تھا۔ ان کے بطن سے سات فرزند تولد ہوئے (۱) شیخ صدر الدین عارف (۲) مولانا برہان الدین (۳) مولانا قدرت الدین (۴) مولانا شمس الدین (۵) مولانا شہاب الدین (۶) مولانا ضیاء الدین (۷) مولانا علاء الدین۔

راستے میں شیخ نصیر الدین سے جو صاحبِ مراتب و کشف و کرامات تھے، ملاقات ہوئی انہوں نے سات روز تک ہمان ٹھہرایا۔ توجہ کی اور پھر تبریزی کی طرف روانہ کیا۔^(۱) مخدوم عبدالرشید تبریزی پہنچے۔ وہاں سید حسینی سے جو کاملوں اور واصلانِ حق میں سے تھے، صحبت رہی۔ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد حرمین شریف پہنچے، حج ادا کیا۔ پھر روضہ سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دی۔ تین سال تک وہاں کی مجاہوری کی اور شیخ کمال الدین کی خدمت میں رہے۔ ایک رات خواب میں حضور کی طرف سے ارشاد ہوا کہ سید علی ہمدانی کی خدمت میں حاضری دی۔^(۲) چنانچہ آپ نے ہمدان کی راہ لی۔ اسکندریہ میں ان کی ملاقات ایک سردپا برہنہ فقیر سے ہوئی جو مخدوم عبدالرشید کے عزم سے اپنے کشف کی بدولت پہلے ہی سے واقف تھا۔ اس نے دعادی، مخدوم آگے بڑھتے گئے اور آخر منزل مقصود تک جا پہنچے۔ سید علی ہمدانی کے مرید کثرت سے تھے جو زمانہ قدیم سے ان کی خدمت میں تھے لیکن انہیں وہ مرتبہ اعلیٰ نہ مل سکا جو حضرت مخدوم عبدالرشید حقانی نے چند ہی روز میں حاصل کر لیا۔ آپ اپنے مرشد کی خدمت میں تین سال رہے۔ خلافت حاصل کی۔ قادریہ سلسلے میں منسلک ہوئے اور انہیں کی ہدایت پر ملتان واپس آگئے۔^(۳) اور بہا الدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہا الدین زکریا نے آپ کے واپس آنے کے بعد آپ دونوں کی جتنی مشترکہ جائیداد تھی۔ سب تقسیم کر لی۔ اراضی کا ایک حصہ دریائے راوی کے مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف تھا، قرعہ ڈالا گیا۔ مخدوم عبدالرشید کے حصے میں مشرقی حصہ آیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک کروڑ اشرفیاں دونوں کے حصے میں آئیں۔ اجناس اور دیگر سامان علاوہ تھا۔^(۴)

آپ اپنے مرشد کے اثر سے دنیا کی ہر قسم کی آرام و آسائش کی چیزوں سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی ساری دولت اور اراضی محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم

۱-۲۔ بحوالہ "منبع البرکات" فارسی (طبعی) ص ۲۸ تا ۳۱ (میری تحویل میں ہے۔)

۲۔ بحوالہ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۳۳۔

کردی۔ نور احمد فریدی کے مطابق

”دُور دُور تک آپ کی فیاضی کی دھوم مچ گئی۔ چند ایام میں ہی سارے ترکہ کی کوڑی کوڑی محتاجوں مسکینوں میں بانٹ دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔“

(بحوالہ تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۱۵۲)

اور دریائے راوسی کے مشرقی حصے میں اپنے لئے حجرہ بنا کر رہنے لگے۔ آٹھویں روز حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملاقات کے لئے آئے اور فرمایا آپ کا قبیلہ اور بھائی بہت ہیں ان کے لئے رہائش کا بندوبست ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص آرام سے زندگی گزار سکے۔ چنانچہ ان کے کہنے پر اپنے عزیزوں اور متوسلین کو وہاں سے دس کوکس کے فاصلے پر اراضی خرید کر دی۔ آپ کی مناسبت سے وہ علاقہ مخدوم رشید کہلوا یا۔ آپ نے رعایا کی فلاح کیلئے وہاں ایک کنواں بھی بنوایا تھا۔^(۲)

کہا جاتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے ملتان کے نواحی علاقے راجہ رائے کیتل سے زرعی اراضی خرید کر اس پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ بعد میں جب رشید آباد منتقل ہوئے تو یہ مدرسہ بھی وہاں لے گئے۔ اس مدرسے میں سینکڑوں طالب علم علوم دینی و روحانی حاصل کرتے تھے۔ حضرت مخدوم رشید نے اپنی ساری عمر یہیں درس و تدریس میں صرف کی

(بحوالہ مضمون ”حضرت پیر مخدوم عبدالرشید حقانی“ از محمد اسلم چوہدری، مطبوعہ

روزنامہ جنگ لاہور، ۲۴ جولائی ۱۹۸۲ء)

عبدالرشید حقانی نے چار شادیاں کیں۔ پہلی شادی اپنی عم زاد یعنی بہاء الدین زکریا

۱۔ بحوالہ ”منبع البرکات“ فارسی (قلمی) ص ۳۳ - (میری تحویل میں ہے)

۲۔ اس کنویں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جو کوئی بھی اس کنویں کا پانی پیتا ہے۔ وہ ہر قسم کے مرض

سے شفا پاتا ہے۔ یہ کنواں ہر سال عرس کے موقع پر کھولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سارا سال بند رہتا ہے۔

(حولے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۹۲۔ (ب) مرقع مولتان، از

اولاد علی گیلانی، ص ۲۲۲۔ (ج) اولیائے ملتان از فرحت ملتانی، ص ۱۹۳۔

کی ہمشیرہ بی بی کمال خاتون سے، دوسری شاہ تعلق کی صاحبزادی معظم خاتون سے تیسری رائے لونا کی لڑکی راج کنول سے اور چوتھی قوم مڑل کی ایک خاتون سے ہوئی۔ آپ کے چار فرزند تھے جن کے نام یہ ہیں۔ مخدوم ابو بکر، مخدوم محمد، مخدوم حسن اور مخدوم صدر الدین^(۱)۔ ان میں سے مخدوم حسن کی خالقاہ کہروڑ میں واقع ہے۔ آپ کے خلقاء کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ مخدوم عبدالرشید بھی سماع سے شوق فرماتے تھے۔ فرید الدین گنج شکر فرماتے ہیں کہ

” ایک روز میں اور بھائی عبدالرشید قلعہ ہانس میں بیٹھے تھے۔ عبداللہ قوال نے

یہ بیت پڑھا

آنکس کہ باعبود سمراسر نزدیک ست از جان عدم گشت زموئے باریک

۱۔ ان کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ شاہ تعلق کو کھانے میں کرم نظر آتے تھے۔ آپ کی دعا سے یہ شکایت دور ہوئی تو انہوں نے ازراہ عقیدت اپنی صاحبزادی کا عقد آپ سے کر دیا۔ (حولے کے لئے دیکھئے ”مرقح مولتان“ ص ۲۲۲۔

(ب) ”اولیائے ملتان“ از فرحت ملتان، ص ۱۹۲۔

(ج) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۹۱۔ لیکن منبع البرکات (قلمی) ص ۳۷-۳۸ میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے سامنے جو بھی کھانا پینا رکھا جاتا وہ سارا کا سارا غلاطت میں تبدیل ہو جاتا۔ یہاں تک کہ بادشاہ جاں بلب ہو گیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا کے پاس اپنی بھجوا گیا کہ اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ وہ اپنی سمیت مخدوم عبدالرشید حقانی کی خدمت میں پہنچے۔ دونوں نے دہلی جانے کا قصد کیا۔ ابھی لاہور پہنچے تھے کہ تعلق کو اس مصیبت سے چھڑکا رامل گیا۔ دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور بادشاہ نے اپنی صاحبزادی کو ان کے عقد میں دے دیا۔ ان کے لطن سے مخدوم حسن پیدا ہوئے۔

۲۔ (الف) اولیائے ملتان، از بشیر حسین ناظم، ص ۹۲۔

(ب) مرقح مولتان، ص ۲۲۲۔ اور اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۱۹۳ میں صدر الدین

کی بھانے حضرت ایوب قتال کو مخدوم رشید حقانی کا چوتھا فرزند بتایا گیا ہے۔ جبکہ منبع البرکات فارسی قلمی نسخہ، ص ۵۵ کے مطابق حضرت ایوب قتال مخدوم عبدالرشید حقانی کے فرزند ابو بکر کے بیٹے تھے گویا ایوب قتال مخدوم رشید کے پوتے تھے۔

یہ شعر سن کر بھائی عبدالرشید کا حال متغیر ہو گیا اور بے خودی کی حالت میں رقص کرنے لگے۔ (۱)

مخدوم عبدالرشید حقانی نے ۶۶۹ھ میں وفات پائی اور مخدوم رشید میں ہی آپ کا مزار ہے۔ آپ کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے اور اس موقع پر عقیدت مند بہت سے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ حکومت نے یہاں ایک فنڈ قائم کر رکھا ہے جس کی آمدنی سے آپ کا روضہ بہت عالی شان بن چکا ہے اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی بنوائی گئی ہے۔ (۲)

۸۔ شاہ شمس سبزواری | شاہ شمس سبزواری ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) میں ایران

کے شہر سبزواری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید صلاح الدین محمد نور بخش مبلغ تھے اور اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے والد کے علاوہ اپنے چچا عبدالہادی غزنوی سے جو شاہ مراکش کے پوتے تھے، تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے آپ کو تفسیر، فقہ، حدیث اور دوسرے ظاہری علوم اچھی طرح سے پڑھائے۔ ۵۷۹ھ میں ۱۹ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ تبلیغ کے لئے بدخشان گئے۔ پھر وہاں سے تبت چلے گئے۔ وہاں لوگوں کو اسماعیلی عقائد کا درس دیتے رہے۔ کچھ عرصے بعد اپنے وطن سبزواری واپس آئے

۱۔ بحوالہ "اولیائے ملتان" از فرحت ملتان، ص ۱۹۳۔

۲۔ حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۱۹۵۔ (ب) مرقع مولانا

ص ۲۲۲۔ (ج) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۹۲۔ اگر نور محمد فریدی کے بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ آپ ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے تھے تو اس لحاظ سے آپ کی عمر ایک سو سال بنتی ہے۔

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "مرقع مولانا" ص ۲۲۲

۴۔ اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم میں ص ۶۰ پر آپ کا سن پیدائش ۵۴۰ھ درج ہے جبکہ

مندرجہ ذیل کتب میں ۵۶۰ھ بیان کیا گیا ہے۔ (۱) تواریخ ملتان از حکم چند، ص ۷۵۔ (۲) اولیائے ملتان

از فرحت ملتان، ص ۸۹۔ (۳) آئینہ ملتان از منشی عبدالرحمن، ص ۱۳۶۔ مکتبہ اشرف المعارف، ملتان۔ (۴)

ارض ملتان، از اکرام الحق، ص ۲۲۵۔

اور مختصر قیام کے بعد تبلیغ کے لئے تبریز تشریف لے گئے جس کی وجہ سے اکثر لوگ آپ کو شمس تبریزی کہنے لگے۔ تبریز، عراق، عرب اور مصر میں کچھ عرصہ اسماعیلی مذہب کی تبلیغ کی۔ اسی دوران مرکز میں عباسی حکومت ختم ہو گئی تو ۶۶۲ھ میں آپ کے والد کو ان کے عقائد کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ آپ واپس آئے اور والد کی تجہیز و تکفین کے بعد بغداد شریف لے گئے۔ لیکن وہاں کے علماء آپ کے خیالات کی وجہ سے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ قاضی شرع کے کہنے پر وہاں سے نکل کر کاظمین پہنچے۔ پھر ہندوستان کا رخ کیا اور دیبل (کراچی) کے رکنے عمر کے آخری حصے میں ملتان پہنچے۔ آپ کے ملتان آنے کی ایک اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک زمانے میں ملتان قرامطیوں کا گڑھ تھا۔ تقریباً دو سو برس تک قرامطیوں نے ملتان پر حکومت کی۔ اگرچہ محمود غزنوی اور اس کے بعد کے حکمرانوں نے قرامطہ فرقے کو ختم کرنے اور ملتان

۱۔ شاہ شمس سبزواری اور شاہ شمس تبریزی کے بارے میں اکثر لوگ غلطی کر جاتے ہیں اور انہیں ایک ہی شخصیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شاہ شمس تبریزی اور شخصیت ہیں۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ ملتان (پاکستان) میں جس بزرگ شمس الدین تبریزی کی قبر ہے وہ شمس الدین سبزواری تھے۔ ان کا شمس تبریزی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شمس سبزواری سادات موسوی میں سے تھے۔ ان کی اولاد نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہی لوگ لاہور میں آکر بسے تو اپنے آپ کو شمس سبزواری کی نسبت سے شمسی کہلانے لگے۔

بحوالہ خزینۃ الاصفیاء۔ از مفتی غلام سرور لاہوری مترجم پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، ص ۳۹۰، مکتبہ نبویہ لاہور، یہی قضیہ حکایت پنجاب (حصہ سوم) میں اس طرح ہے۔

”ملتان میں ایک مشہور شیعہ خاندان ہے جو اپنے آپ کو ملتان کے ایک بزرگ شمس تبریزی نامی کی اولاد بتاتا ہے۔ ۱۷۸۷ء میں اس خاندان کے ایک فرد نے اسی بزرگ کے مزار پر ایک بڑا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مقامی شمس تبریزی اصل شمس تبریزی سے خلط ملط ہو گیا اور اس کے مقبرے اور اس کے متولیوں کو بہت منافع ہوا اور غالباً اس مقبرے کو تعمیر کرنے والے کا مقصد بھی یہی تھا“

بحوالہ حکایات پنجاب (حصہ سوم) مرتبہ آنر سٹیل ترجمہ میاں عبدالرشید، (باقی بر صفحہ ثانی)

پران کے اقتدار کو مٹانے کی پوری کوشش کی۔ ان کی کوششوں سے ان کی حکومت تو ختم ہو گئی۔ مگر ان عقائد سے تعلق رکھنے والے ابھی ملتان اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں موجود تھے۔ عقائد کی یہی کوشش شاہ شمس سبزواری کو ملتان لے آئی اور وہ یہاں اسماعیلی نقطہ نظر کی اشاعت کرنے لگے۔ ملتان میں اس زمانے میں بہاء الدین زکریا قاضی القضاہ کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کے اور بہاء الدین زکریا کے عقائد میں بہت فرق تھا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ بہاء الدین زکریا کو آپ کی آمد ناگوار گزری۔ ملتان میں اگرچہ آپ کی زیادہ پذیرائی نہ ہوئی تاہم آپ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے اور بہت سے ہندوؤں کو مسلمان کیا جو شمسی کہلاتے۔ خزینۃ الاصفیاء کے مطابق

”شمس الدین تبریزی سبزواری نے ملتان کے ارد گرد کے علاقوں کے کہاروں

اور سناروں میں اپنا طریقہ رائج کیا۔ اور لوگوں کو ”ہندو شمسی“ کا لقب دیا۔

ان دنوں شمسی ہندو بھی آغا خاں اسماعیلی کے معتقد ہیں اور اب ان کی نذر دنیا

کا رخ سر آغا خان کی اولاد کی طرف گیا ہے۔“

اس بات کو شیخ محمد اکرام اس طرح لکھتے ہیں

”پنجاب کی ایک جماعت، جو بظاہر ہندوؤں میں شامل ہیں اور خوجوں کے

موجودہ امام آغا خاں کو اپنا دیوتا تسلیم کرتی ہے۔ اپنے آپ کو شاہ شمس کے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) ص ۱۳۸-۱۳۹۔ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۲ء

۲۔ بحوالہ (الف) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۶۳۔

(ب) آئینہ ملتان از منشی عبدالرحمن خاں، ص ۱۳۷۔ مکتبہ اشرف المعارف ملتان۔ فرحت ملتان نے

ملتان آمد ۵۷۴ھ میں بتائی ہے جو کہ قرین قیاس نہیں ہے۔ آپ بہاء الدین زکریا کے عہد میں ملتان تشریف

لائے تھے۔ ویسے بھی آپ کی تاریخ پیدائش ۵۶۰ھ ہے۔ اور آپ ۵۷۹ھ میں ۱۹ سال کی عمر میں اپنے

والد کے ساتھ پہلی مرتبہ تبلیغ کے لئے بدخشاں تشریف لے گئے تھے۔

۱۔ بحوالہ ”خزینۃ الاصفیاء“ ص ۲۴۰۔

نام پر شمسی کہتی ہے۔^(۱)

آپ کے معتقدین میں اسماعیلیوں کے ساتھ ساتھ خوبے بھی شامل ہیں جو اسماعیلی فرقے کے امام پدیس کریم آغا خان کو اپنا امام سمجھتے ہیں، شیخ محمد اکرام کے مطابق ”خوجوں کے دوسرے مبلغ شاہ شمس تھے جو ملتان میں ایک بڑے شاندار روضے میں آرام فرما ہیں۔ انہیں عام طور پر شاہ شمس تبریز کہا جاتا ہے۔ لیکن خوجہ روایات کے مطابق وہ ایران کے شہر سبزوار سے تشریف لائے۔“^(۲)

اسماعیلی عقائد کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں آپ نے بہت سے لوگوں کو اپنے فرقے میں شامل کیا۔ اور پروفیسر محمد امین کے مطابق آپ نے ملتان میں اسماعیلی تصوف کو رائج کیا۔^(۳)

شاہ شمس سبزوارسی کے بارے میں غضنفر مہدی اور عین الحق فرید کوٹی کا کہنا ہے کہ آپ شاعر بھی تھے۔ غضنفر مہدی کے مطابق

” بہار الحق زکریا کے دور میں فارسی، ہندی، کشمیری زبانوں کے بلند پایہ اور سرائیکی زبان کے پہلے شاعر حضرت شاہ شمس تبریزی سبزوارسی ملتان تشریف لائے۔“^(۴)

عین الحق فرید کوٹی نے تو آپ کے سرائیکی کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔

۱۔ بحوالہ ”آب کوثر“ از شیخ محمد اکرام، ص ۳۲۲

۲۔ خوجوں کے پہلے مبلغ کا نام نور الدین یا نور شاہ تھا جو نورست گرو کے نام سے مشہور تھے پہلے انہوں نے گجرات میں تبلیغ کی۔ پھر ایران چلے گئے اور وہاں سے آنے کے بعد ریاست بڑودہ کے شہر نوساری کے قرب دجوار میں ارشاد و ہدایت شروع کی۔ انہوں نے اپنا ہندوانہ نام رکھا۔ لیکن مسلمان نہیں نور الدین یا سید سعادت کہتے ہیں۔ انہوں نے کنہی، کہا ر اور کولی جیسی گجرات کی نیم ذاتوں کو اسماعیلی مذہب میں شامل کیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”آب کوثر“ از شیخ محمد اکرام، ص ۳۲۰۔)

۳۔ بحوالہ ”آب کوثر“ ص ۳۲۳

۴۔ بحوالہ ”تصوف اور ملتان“ امروز ملتان نمبر، ص ۶، ۲۸ جون ۱۹۷۸ء

۵۔ بحوالہ ”ملتان کے قدیم علمی و ادبی محسن“، امروز ملتان نمبر، ص ۵، ۲۸ جون ۱۹۷۸ء

من میرا مصلیٰ اور اللہ میرا قاضی

کایا ہماری مسیتاں

اندر بیٹھ میں نماز گزاروں

مور کھ کا جانے طاعت ہماری (۱)

ایک جگہ ہنود کو بت پرستی سے منع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ما تھوں پتھر سوں کیوں بھنود دے ہندوؤ

اور کھو نر قاسم شاہ اوتار

کیک نگر سی ماں رہے چھے ہندوؤ

تے صاحب در داتا

آپ کے دو بیٹے تھے۔ ایک سید نصیر الدین اور دوسرے سید علامہ الدین جو بے اولاد تھے اور زندہ پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ سید نصیر کا مزار لاہور میں ہے۔ ان کے بیٹے کبیر الدین حسن نے بھی تبلیغ کا کام کیا۔ آپ کا مزار اوج شریف میں ہے (۲)۔ ان کے فرزند عالم شاہ المعروف جتو شاہ شاہ شمس کے مزار کے مغربی حصے میں مدفون ہیں۔

شاہ شمس سبزوار سی نے تقریباً دس سال ملتان میں تبلیغ و اشاعت کا کام کیا۔ اور ۶۷۵ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد آپ کو یہیں عام خاص باغ کے نزدیک دفن کیا گیا آپ کا مزار ہمیشہ شیعوں اور اسماعیلیوں کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا۔ آج کل یہ مزار

۱۔ بحوالہ "اسماعیلی بزرگوں کا عارفانہ کلام" مطبوعہ ماہ نو، اکتوبر ۱۹۸۱ء، ص ۸۔ (یہی مضمون

رسالہ "خاتون" خاتون پبلی کیشنز فریڈ گیٹ بہاولپور میں بھی شائع ہوا ہے۔)

۲۔ حوالے کیلئے دیکھئے (الف) تاریخ اوج از مولوی حفیظ الرحمن، ص ۱۵۱۔ (ب) اسماعیلی بزرگوں

کا عارفانہ کلام از عین الحق فریڈ کوٹی، مطبوعہ ماہ نو، ص ۱۰۔

۳۔ حوالے کے لئے دیکھئے (۱) اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۹۱-۹۲ (۲) اولیائے ملتان، از

بشیر حسین ناظم، ص ۴- (۳) تاریخ ملتان از حکم چند، ص ۷۶- (۴) آئینہ ملتان از منشی عبدالرحمن،

ص ۱۱۷- (۵) ارض ملتان، ص ۲۷۷۔

اہل تشیع کے قبضے میں ہے۔

۹۔ شیخ صدرالدین عارف | ملتان میں سلسلہ سہروردی کے صوفی بزرگ

حضرت بہار الدین زکریا کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے شیخ صدرالدین عارف خلیفہ بنے^(۱) جو کہ حضرت زکریا کے عم زاد مخدوم عبدالرشید حقانی کی ہمیشہ بی بی رشیدہ بانو حبیبی عفت مآب بی بی کے لطن سے ۶۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ صدرالدین نے ابتدائی تعلیم اپنے والد غوث العالمین حضرت بہار الدین زکریا سے حاصل کی۔ جن سے ایک زمانہ علم حاصل کرنے آتا تھا۔ بہار الدین زکریا نے اپنے تمام فرزندوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ نہ صرف خود تعلیم دیتے بلکہ ان کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے کی خاطر نامور اساتذہ بھی مقرر کئے۔ جن کی حوصلہ افزائی کے لئے آپ انہیں وقتاً فوقتاً انعام و اکرام دیا کرتے تھے۔ صدرالدین کی ابتدائی تعلیم کے متعلق "انوار غوثیہ" میں ہے کہ

"حضرت صدرالدین عارف کی تعلیم و تربیت اپنے قبلہ گاہ حضرت غوث العالمین کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہی آپ کے علوم ظاہری و باطنی کے استاد تھے۔ قرآن مجید کے آپ حافظ تھے۔ اور علوم دینیہ میں کوئی شخص آپ کا

۱۔ شیخ محمد اکرام "آب کوثر" ص ۲۶۲ پر لکھتے ہیں کہ "شیخ بہار الدین کی وفات ۱۲۶۲ء میں ہوئی اور آپ کے صاحبزادہ شیخ صدرالدین جانشین ہوئے۔ (غالباً ہندوستان میں موروٹی سجادہ نشینی کی یہ پہلی اہم مثال ہے، جس پر بعد میں اوچے کے قادری پیروں نے بھی عمل کیا" ڈاکٹر شمیم محمود زیدی لکھتے ہیں کہ "شیخ صدرالدین پسر شیخ بہار الدین زکریا ملتان میں بعد از وفات پدر برمسند ارشاد نشست" (بحوالہ احوال و آثار شیخ بہار الدین زکریا، ص ۵۲۔)

۲۔ بحوالہ (الف) تذکرہ صدرالدین عارف، جلد اول از نور احمد خان فریدی، ص ۱۰، مطبوعہ قصر الادب، گلکووالا تحصیل شجاع آباد۔ (ب) مخدوم جہانیاں جہاں گشت "از ایوب قادری، ص ۷۰، جبکہ اخبار الاخبار، ص ۱۳، اور اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۵، میں آپ کا سن ولادت ۵۹۹ بتایا گیا، قلمی کتاب خلاصۃ الاحباب (فارسی) از محمد افضل اسدی۔

ہم پڑھ نہ تھا۔ جب علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہوئے تو آپ کے والد بزرگوار نے جو آپ کے پیر و مرشد بھی تھے، آپ کو علوم باطنی اور اسرار معرفت کی تعلیم دینا شروع کی۔ تھوڑے سے عرصہ میں والد بزرگوار کی نگاہ فیض سے وہ مقام حاصل کر لیا جو دوسروں نے ساہا سال کے مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد پایا تھا۔^(۱)

بہار الدین زکریا نے آپ کی تعلیم و تربیت اور اخلاق و عادات سنوارنے کے لئے بچپن سے ہی خیال رکھا۔ نزہت الخواطر میں لکھا ہے

” نہایت مناسب ماحول میں تربیت علمی و روحانی حاصل کی۔ اوائل بلوغ ہی سے غور و نوکوش اور لباس میں توسط تھا۔ جس پر صدائے قائم رہے۔ ورع و تقویٰ اور نماز و روزہ داری ہر ایک میں کمال تھا۔ ہر حال میں اللہ کا ذکر زبان پر جاری رہتا۔ امور شرعیہ اور ادا مرد و نواحی سب کا خیال رکھتے۔“^(۲)

آپ کا نام تو صدر الدین تھا لیکن شیخ عارف کہلاتے تھے جس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے

” کہ جب وہ کلام اللہ پڑھتے تھے تو اس پر بہت غور و فکر فرماتے اور جس وقت بھی قرآن کریم تلاوت کرتے تو ان پر دوسرے معانی و مطالب ظاہر ہوتے۔“^(۳)

۱۔ بحوالہ ”تذکرہ صدر الدین عارف“ جلد اول، ص ۲۰۔

۲۔ بحوالہ ”نزہت الخواطر“ ص ۲۸۸۔

۳۔ بحوالہ ”تاریخ فرشتہ“ (جلد دوم) ص ۲۰۸۔ اسی بات کو مخدوم جہانیاں بیان کرتے

ہوتے لکھتے ہیں کہ

” شیخ عارف صدر الحق کو ہر بار کلام اللہ پڑھنے میں دوسرے معانی ظاہر ہوتے تھے۔ سوائے ان معانی

کے جو اس سے پہلے ظاہر ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے شیخ کبیر (حضرت غوث العالمین) سے عرض کی کہ

اگر اجازت ہو تو ان معانی کو محیط تحریر میں لے آؤں حضرت نے منع فرمایا کہ لوگ سمجھ نہیں سکیں گے اور چونکہ یہ

معانی بجلے غور و دست ہونگے اگر کسی نے انکار کر دیا تو گہنگار ہوگا؟ (بحوالہ الدر المنظوم، ص ۵۰۸)

ڈاکٹر شمیم محمود زیدی کے مطابق

”چوں ہر بار ختم قرآن مجید می کرد یا معانی تازہ اسی روبرومی شد یا اسم عارف

نام برادر شد“ (۱)

شیخ صدرالدین عارف ذاتی کردار اور شخصی اوصاف کی بدولت اپنے والد گرامی سے اس اعتبار سے مختلف تھے کہ آپ دنیاوی جاہ و جلال اور مال و دولت کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ بابا فرید گنج شکر کی قلندرانہ روش اور صوفیانہ روایت کے زیادہ قریب تھے۔ چنانچہ شیخ صدرالدین عارف نے ساری عمر اپنے لئے کوئی دولت جمع نہ کی بلکہ سخاوت کی وجہ سے قرض ہی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ تاریخ فیروز شاہی کی مطابق شیخ صدرالدین اپنے روحانی کمالات اور تکمیل کے ساتھ انتہا درجے کے سخی تھے۔ ان کی بخشش اس قدر زیادہ تھیں کہ باوجود اس کثیر دولت کے جو ان کو اپنے والد سے ترکے میں ملی تھی۔ وہ اکثر مقروض رہتے“ (۲)

اگرچہ بے شمار نذرانے ان کی خالقاہ میں آتے تھے۔ لیکن آپ انہیں فوراً دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے۔ کبھی اپنے پاس کچھ نہ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے والد بہار الدین زکریا سے جو دولت ورثے میں ملی تھی وہ بھی آپ نے فوراً لوگوں میں بانٹ دی۔ نزہت الخواطر کے مطابق

”اپنے والد مرحوم سے جو مال و زر اور سامان و مکانات ملے ان میں ستر لاکھ دینار بھی تھے۔ آپ نے یہ سب نقد و وجاہت اور غیر منقولہ اور سامان مساکین اور دوسرے حق داروں کو لٹا دیا۔ اور اپنے اہل و عیال کے لئے تن کے لباس کے سوا کچھ نہ رہنے دیا۔ اس پر ایک مرید نے عرض کیا کہ آپ کے والد نے سونے چاندی کے ڈھیر جمع کر لیے، نامی گرامی گھوڑے، مولشی

۱۔ بحوالہ ”احوال و آثار“ شیخ بہار الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفین (حاشیہ) صلا ۵۔

۲۔ بحوالہ ”تاریخ فیروز شاہی“ از ضیاء الدین برنی (اردو ترجمہ) ص ۵۰۸۔ مطبوعہ مرکزی

اردو بورڈ لاہور، پاراول، اکتوبر ۱۹۶۲ء

اور مال اور جوئلیاں سربفلک چھوڑیں۔ مگر آپ نے سب مال و منال ایک دن میں ضائع کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ نہ رہنے دیا! جواب (ہنس کر فرمایا) میرا باپ دنیا پر اس قدر غالب آیا کہ اس کے حصول میں کبھی ان کے پاؤں نہ ڈگمگائے۔ مگر میں کبھی اس منزل تک نہ پہنچ سکا کہ مبادا دنیا مجھ پر غالب آجائے۔^(۱)

ساری دولت غریبہ و مساکین پر لٹانے کے باوجود آپ نے بہاء الدین زکریا کی جہان نوازی فیاضی اور دسترخوان کی درازی والی روایت کو ختم نہ ہونے دیا۔ شیخ عارف کا دسترخوان بھی سلاطین سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ آپ اگرچہ خود بہت کم غذا کھاتے لیکن اسے بھی اتنا آہستہ آہستہ کھاتے کہ اگر انہوں نے جلدی دسترخوان سے ہاتھ اٹھالیا تو لوگ بھی ان کی تقلید میں کھانا کھانا ختم کر دین گے۔

شیخ عارف نے نہ صرف کھانے کے معاملے میں شیخ زکریا کی تقلید کی بلکہ والد کے بعد ان کے درس و تدریس کے سلسلے کو بھی جاری رکھا اور انہی کی مسند پر بیٹھ کر آپ لوگوں کو درس دیا کرتے۔ جہانیاں جہاں گشت کے مطابق

”شیخ عارف ہر مبتدی اور منتہی کو بلا کسی امتیاز کے تعلیم دیتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی سچو یا صرف پڑھتا تو پڑھتا تھے۔ تصریفِ جدولی ان کی ہی

تصنیف ہے؟^(۲)

ڈاکٹر شمیم محمود زیدی لکھتی ہیں

”شیخ صدرالدین عارف مانند پدر بزرگوارش بعد از فراغت از اوزاراد،

و افکار بہ درس و تدریس مشغول می شد۔^(۳)

۱۔ بحوالہ ”نزہت الخواطر“ ص ۲۸۸، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) سیر العارفين

(د اُردو ترجمہ) ص ۸۱۔ (ب) تذکرہ صدرالدین عارف (جلد اول) ص ۲۶ - ۲۷۔ (ج) بزم صوفیہ ص ۱۰۷۔

۲۔ بحوالہ ”الدر المنظوم“ ص ۲۸۔

۳۔ بحوالہ ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفين“ ص ۵۲۔

حدیقۃ الاولیاء کے مطابق

” شیخ عارف کی محفل درس و تدریس میں بھی ہمیشہ ہجوم رہتا تھا۔ انہوں

نے ہزاروں طالبانِ خدا کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔“ (۱)

صدرالدین عارف کو ابنِ عربی کے نظریات سے بھی کچھ واقفیت تھی۔ بقول شیخ محمد اکرام

” ہندوستان کے مشائخ میں شاید سب سے پہلے آپ تھے جنہیں شیخ ابن

عربی کے نظریوں اور تصانیف کے متعلق اطلاع ملی۔“ (۲)

اس کا سبب آپ کے بہنوئی اور مشہور شاعر فخر الدین عراقی بتاتے جاتے ہیں جو ملتان سے

بلاد روم کی طرف واپس گئے تو قونیہ میں ان کی ملاقات ابنِ عربی کے خلیفہ شیخ صدرالدین

قنوسی سے ہوئی۔ ان کی صحبت میں رہ کر آپ کو ”فصوص الحکم“ کے بارے میں معلومات

ہوتی رہیں۔ عراقی نے اس سے متاثر ہو کر ایک کتاب ”لمعات“ لکھی۔ عراقی ہی نے

خط و کتابت کے ذریعے شیخ عارف کو اس کتاب سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی

کے مطابق،

” شیخ صدرالدین عارف از مشائخ شہ قارہ پاکستان و ہند اولین کسی

بودہ باشد کہ از نظریات ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ آگاہی پیدا کردہ بود چوں

او با عراقی مکاتبہ داشت و تصانیف ابن عربی را ہم خواندہ بود۔“ (۳)

شیخ عارف کو بھی اپنے والد ہی کی طرح شیخ الاسلام کا خطاب ملا تھا۔ تاریخ فرشتہ اور

تاریخ معصومی^(۴) کے مطابق فیروز شاہ تغلق نے شیخ صدرالدین عارف کو شیخ الاسلام کا خطاب

عطا کیا۔ لیکن ”تذکرہ صدرالدین عارف“ (۵) کے مطابق جس صدرالدین کو فیروز شاہ تغلق نے

۱- حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۵۰۔

۲- بحوالہ ”آب کوثر“ ص ۲۶۲، مزید تفصیل کیلئے دیکھئے ”تذکرہ صدرالدین عارف“ ص ۱۱۵

۳- ”احوال و آثار“ شیخ بہار الدین زکریا ملتانی، و خلاصت العارفین“ ص ۵۲۔

۴- (الف) تاریخ فرشتہ (اردو) جلد اول، ص ۲۵۶۔ (ب) تاریخ معصومی، ص ۶۹۔

۵- بحوالہ ”تذکرہ صدرالدین عارف“ جلد اول، ص ۲۸۴۔

شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا تھا وہ شاہ رکن عالم کے بھتیجے اور شیخ صدر الدین عارف کے پوتے۔ شیخ صدر الدین محمد تھے۔ فیروز شاہ تغلق کی حکومت کا زمانہ ۲۳ محرم ۷۵۲ھ تا ۱۳ رمضان ۷۹۹ھ ہے۔ جبکہ صدر الدین عارف کا ۶۸۴ھ میں وصال ہوا تھا۔ اس لئے تاریخ فرشتہ اور تاریخ معصومی کی یہ روایت درست نہیں کہ شیخ عارف کو فیروز شاہ تغلق نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا۔ آپ کو بھی شیخ الاسلام کا خطاب ملا تھا۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خطاب کس نے دیا تھا۔ بہر حال بہاء الدین زکریا کے عہد سے ہی یہ خطاب اسی خاندان میں چلا آتا رہا۔

شیخ صدر الدین عارف کی ایک زوجہ فرغانہ کی شہزادی تھیں جو آپ کے تقویٰ و پرہیزگاری اور عبادت گزاری سے متاثر ہوئی تھیں اور بی بی راستی پاک دامن کے نام سے مشہور ہوئیں۔ قطب الاقطاب شیخ رکن الدین ابوالفتح آپ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی کے مطابق

” بی بی راستی بخاطر زہد و طاعت خود بہ رابعہ عصر معروف بود۔“ (۲)

آپ کی دوسری بیوی شہر کے قاضی کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے آپ کے دوسرے فرزند شیخ عماد الدین اسماعیل پیدا ہوئے جن سے آپ کی اولاد کا سلسلہ چلا۔ اس کے علاوہ ایک اور صاحبزادے شیخ شہاب الدین بھی پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا کبسنی میں ہی انتقال ہو گیا۔ شیخ عارف کا نکاح سلطان شمس الدین التمش کی پوتی سے بھی ہوا۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا خضر خان جو خان شہید کے لقب سے مشہور ہوا۔ جب ملتان کا حاکم بن کر آیا تو اس زمانے میں شیخ صدر الدین عارف بھی ملتان میں تھے۔ خان شہید نے ایک دن نشے کی حالت میں بیوی کو جو التمش کی پوتی تھی طلاق دے دی۔ لیکن لہجہ میں بہت کچھ بتایا اور علماء سے رجوع کیا جنہوں نے بتایا کہ حلالہ کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ خان شہید بہت پریشان ہوا۔ آخر کار اپنے قاضی اشیر الدین

۱۔ آپ کا مزار ملتان میں پاک مانی کے نام سے سٹی ریلوے اسٹیشن کے پاس موجود ہے۔

۲۔ بحوالہ احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین ص ۵۲۔

خوارزمی کے کہنے پر شیخ عارف سے اس کا نکاح کرنے پر اس صورت میں راضی ہوا کہ وہ دوسرے دن اسے طلاق دے دیں گے۔ چنانچہ شیخ عارف نے نکاح کر لیا۔ دوسرے دن وہ بی بی شیخ عارف کے پیروں پر گر پڑی اور کہا کہ مجھ کو اپنی خدمت سے علیحدہ نہ کریں میں اس شخص کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی۔ چنانچہ شیخ عارف نے اسے طلاق نہ دی خان شہید کو علم ہوا تو وہ آپ کا دشمن ہو گیا اور آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے ہی مغلوں کے حملے میں مارا گیا۔^(۱)

مولانا نور احمد خان فریدی کا خیال ہے کہ ”شہزادہ خضر اور حضرت صدر الدین عارف کے درمیان یہ جھگڑا دراصل سیاسی نوعیت کی تھی۔ کیونکہ ”خانقاہ غوثیہ“ پر ہر وقت ڈیڑھ دو ہزار آدمی مقیم رہتے تھے اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شہزادے کو ان سے بغاوت کا خدشہ لاحق ہوا۔ حاسدین نے واسمہ کو یقین سے بدل دیا اور جب شیخ الاسلام کو شہزادے کے ان خیالات کا پتہ چلا تو انہوں نے اس کے دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ یہ شکر رنجی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شہزادہ ان کی جان کا دشمن ہو گیا۔^(۲)

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فقر و شاہی میں تصادم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ، ”شہزادہ خضر نے کسی بات پر ناراض ہو کر امیر حسن سنجرمی کو تازیانے سے پٹوایا تھا۔ شیخ عارف کو یہ بات برسی لگی اور انہوں نے شہزادے کو برا بھلا کہا۔ اس سے بات بڑھتی چلی گئی۔“^(۳)

بہر حال سبب کوئی ہو یہ تصادم ہوا۔ حالانکہ شیخ صدر الدین عارف اپنے والد بزرگوار کی طرح معتدربطقتے سے اچھے روابط اور تعلقات قائم رکھنے کی حکمت عملی کے قائل تھے۔ شیخ صدر الدین عارف کے بھی کئی خلفاء ہیں۔ جن میں سب سے مشہور شیخ

۱- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) سیر العارفین (اردو ترجمہ) ص ۱۹۰ تا ۱۹۲۔ (۲) تاریخ معصومی ص ۵۷

۵۷- (۳) مرآت الاسرار (جلد دوم) ص ۲۵۷-۲۶۰ (۴) ارض ملتان ص ۲۶-۲۷ (۵) پنجاب کے صوفی دانشور، ص ۱۰۴-

۲- بحوالہ تذکرہ صدر الدین عارف، جلد اول، ص ۲۲۵

۳- بحوالہ پنجاب کے صوفی دانشور، از قاضی جاوید، ص ۱۰۳-

جمال الدین اچھی تھے۔ آپ کے دوسرے مرید خود آپ کے صاحبزادے ابوالفتح رکن الدین تھے۔ ان کے علاوہ شیخ احمد بن محمد قندھاری، شیخ علاء الدین جھندی، شیخ حسام الدین ملتانی اور صدر الدین سیستانی کا نام آتا ہے جو کشمیر کی پہاڑیوں کے رہنے والے تھے۔ میر حسین کا شمار بھی آپ کے مریدوں میں ہوتا ہے جو آپ کے والد کے بھی خلیفہ تھے انہوں نے اپنی مشہور مثنوی "کنز الرموز" میں بہاء الدین زکریا اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے ساتھ ساتھ آپ کا بھی ذکر کیا ہے۔

شیخ صدر الدین نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان کے مرید شیخ خواجہ ضیاء الدین نے ان کے ملفوظات کو ایک مجموعے "کنز الفوائد" میں جمع کیا۔ اس کتاب میں پند و نصائح اور اسرار و معارف کا وہ خزانہ ہے جو آپ اپنے مریدوں اور شاگردوں پر نچھاور کیا کرتے تھے۔ اس کے اقتباسات "اخبار الاخیار" از شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں درج ہیں لیکن اصل کتاب ناپید ہے۔ انہوں نے مبتدیوں کے لئے ایک رسالہ "تصرف جدولی" بھی لکھا جو اس زمانے کے مدارس میں شامل تھا۔ لیکن افسوس کہ اب یہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ حضرت شیخ صدر الدین عارف کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ میر محمد معصوم بکھری نے بلبن کے زمانے کی ایک روایت درج کی ہے جس کے مطابق "شیخ عثمان اور شیخ بہاء الدین زکریا کے فرزند ارجمند شیخ صدر الدین ایک محفل میں موجود تھے۔ وہاں بہترین اشعار سن کر وہ اور دوسرے درویش وجد میں آگے۔ اور سب رقص کرنے لگے۔ اس موقع پر بادشاہ

شیخ جمال الدین خنداں رو۔ ارج کے رہنے والے تھے، وہاں انہوں نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ جہاں بہت سے لوگ درس لینے آیا کرتے تھے۔ ان میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت نمایاں ہیں جنہوں نے ابتدائی تعلیم آپ سے حاصل کی تھی۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی آپ کا مرید تھا۔

۲۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و

خلاصت العارفین، ص ۵۲-۵۳۔ (ب) تذکرہ صدر الدین عارف، ص ۲۵۶-۲۶۰۔ (ج) پنجاب کے صوفی دانشور از قاضی جاوید، ص ۹۹-۱۰۰۔

سینے پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے کھڑا رہا اور زار و قطار روتا رہا۔^(۱)
 آپ نہ صرف یہ کہ شاعری کو پسند فرماتے تھے بلکہ خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر
 شمیم محمود زیدی لکھتی ہیں کہ

”شیخ صدرالدین عارف بہ شعر ہم علاقہ داشت و شعر ہم گفتہ است عراقی

در اشعار خود (نور عرب) و (سہ بیت) شیخ عارف راستودہ است۔“^(۲)

نور احمد خان فریدی نے حضرت شیخ العارف کے ایک عربی قصیدے کا ذکر بھی کیا ہے جو
 انہوں نے حضرت سلطان التارکین حمید الدین حاکم سے متعلق موزوں کیا تھا۔ اس کے علاوہ
 انہوں نے ”نور عرب“ اور ”سہ بیت“ کے عنوان سے بھی چند اشعار موزوں فرمائے۔
 اس کلام کو عراقی نے خراج تحسین ادا کیا^(۳)۔ لیکن اب یہ کلام دستیاب نہیں ہے۔
 شیخ صدرالدین عارف نے ۳ ذوالحجہ ۶۸۲ھ میں وفات پائی اور اپنے والد کے
 پہلو میں دفن ہوئے۔ خلاصۃ الاحباب کے مطابق آپ نے ایک سو دس سال کی عمر پائی

۱- بحوالہ ”تاریخ مصوفی“ از میر محمد معصوم بکھری مترجم اختر رضوی، ص ۵۶۔ مطبوعہ سندھی ادبی

کراچی، اشاعت اول، ۱۹۵۹ء

۲- بحوالہ ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفین، ص ۵۳۔ شعر یہ ہیں

زندہ کردی شکستہ را بسہ بیت کز دم عیسوی نشان دارد

حرز جان ساختم سہ بیت ترا کم ز صد فتنہ در امان دارد

۳- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”تذکرہ صدرالدین عارف“ ص ۲۴۰ تا ۲۴۳۔

۴- بحوالہ (۱) مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۲۵۴۔ (۲) سفینۃ الاولیاء، ص ۱۵۳۔ (۳) نزہت الخواطر،

ص ۲۹۰۔ (۴) اخبار الاحیاء، ص ۱۳۸۔ (۵) بزم صوفیہ، ص ۱۱۹۔ (۶) معمولات مظہریہ و محبوب العارفین، ص ۱۲۵۔

ان سب نے آپ کا سن وفات ۶۸۲ھ لکھا ہے۔ لیکن ارض ملتان از محمد اکرام الحق، ص ۲۰۸۔ پر سنہ وفات

۷۰۹ھ درج ہے۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی نے اپنی کتاب ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی

و خلاصۃ العارفین، ص ۵۳۔ پر ۶۸۶ھ لکھا ہے اور قلمی نسخہ خلاصت الاحباب (فارسی) میں ۶۸۲ھ

درج ہے۔ تذکرہ مشائخ کرام از محمد قاسم فرشتہ نے ص ۱۵۹۔ پر ۷۰۶ھ لکھا ہے۔

کیونکہ اس قلمی نسخے کے مطابق آپ کی ولادت ۵۷۲ھ اور وفات ۶۸۲ھ میں ہوئی^(۱) ہم صدر الدین عارف کا ذکر قاضی جاوید کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں کہ
 ”اس عظیم شخصیت نے پنجاب کے ہزاروں لوگوں کو راست بازی، نیکی، خیر، اخلاقی جرات اور اصلاح و تبلیغ کی راہ پر لگا دیا تھا۔ پنجاب بلکہ پورے برصغیر میں صوفیانہ مابعد الطبیعات کی تشکیل میں ان کا یہ کردار قابل ذکر ہے کہ شیخ صدر الدین عارف ہی اول اول شیخ محی الدین ابن عربی کے افکار سے متعارف ہوئے تھے“^(۲)

۱۰۔ خواجہ حسن افغان

بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلقاء میں خواجہ حسن افغان ایک خاص اہمیت کے حامل تھے جن کا ذکر خود بہاء الدین زکریا بھی اس انداز میں کرتے ہیں کہ

”اگر قیامت کے دن مجھ سے پوچھا گیا کہ تم دنیا سے کیا تحفہ لاتے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ خواجہ حسن کا صدق اور اعتقاد راست لایا ہوں۔“^(۳)
 خلاصۃ العارفین (فارسی) قلمی میں لکھا ہے

۱۔ اصل الفاظ یہ ہیں، ولادت ایشان در سال پانصد و چہار ہجری و وفات ایشان روز سہ شنبہ و بقولی روز چہار شنبہ ماہ ذی الحجہ سال ششصد و ہشتاد و چہار ہجری و مدت عمر شریف ایشان یک صد و دو سال و قبر مبارک ایشان متصل قبر پد بزرگوار خود طرف مشرقی واقع است (ملاحظہ فرمائیے کتاب خلاصۃ الاحباب (فارسی) از محمد افضل قریشی اسدی از اولاد حضرت بہاء الدین زکریا، ص ۷۵، سن تالیف ۱۱۶۲ھ (قلمی نسخہ خالقہ عبدالرشید حقانی کے سجادہ نشینوں سے حاصل کیا گیا۔)

۲۔ بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۱۰۱۔

۳۔ بحوالہ تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتانی از نور احمد فریدی، ص ۱۵۔ (مزید حوالے کے لئے ملاحظہ

فرمائیے (۱) فوائد الفواد، ص ۵۸-۶۲ اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۸۲-۸۳ (۲) اولیائے ملتان از فرحت ملتانی، ص ۲۱۹-۲۲۰ (۳) آب کوثر، ص ۲۷۳۔

” شیخ بہاء الدین فرمود کہ اگر فردا قیامت مرا گویند کہ در درگاہ ماچہ

آوردی من بگویم کہ صدق حسن افغان آوردی ام؟ (۱)

ڈاکٹر شمیم محمود زیدی کے الفاظ میں

” حسن افغان درز ہد و عبادت و ذوق و شوق و عشق و محبت نظر نہداشت۔

مدتی ریاضت کشید و در خدمت پیر خود بسر برد تا آنکہ بہ مرتبہ ” ولایت رسید“ (۲)

خواجہ حسن افغان بالکل اُن پڑھتے لیکن علوم باطنی میں کامل ہونے کی وجہ سے قرآنی آیات کو باآسانی پہچان جاتے۔ لوگ آپ کے پاس اس قسم کی تحریر لاتے جس میں کسی سطر پر قرآنی آیت ہوتی اور کہیں غیر قرآنی سطر میں ہوتیں۔ مگر آپ اپنے فہم و فراست اور ذوق و شوق کی بدولت بڑی آسانی سے قرآنی آیت کو پہچان جاتے اور فرماتے کہ قرآنی آیت کو دیکھ کر مجھے ایسا نور نظر آتا ہے جو لامکاں تک پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت الاسرار فی اخبار اللہ میں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ

(ترجمہ) ” ان کا ظاہر و باطن صاف اور دل روشن تھا۔ اگرچہ ظاہری علوم

سے لاچار تھے۔ لیکن ان کا باطن اس قدر روشن تھا کہ کوئی چیز اس سے

پوشیدہ نہ تھی۔ ایک دفعہ ان کا امتحان لینے کی خاطر تین سطر لکھ کر ان

کے سامنے رکھی گئیں۔ پہلی سطر میں قرآن کی آیت تھی۔ دوسری میں حدیث

شریف اور تیسری میں مشائخ عظام کے اقوال و احوال درج تھے۔ ان

سے پوچھا گیا کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ فرمایا پہلے قرآن کی آیت ہے کیونکہ

اس کا نور عرش سے بھی بڑھ گیا ہے۔ دوسری حدیث ہے۔ کیونکہ

اس کا نور ساتویں آسمان تک ہے اور تیسری مشائخ کے احوال کے

بارے میں ہے کہ اس کا نور آسمان تک ہے۔ سب حیران ہو گئے اور

۱۔ خلاصۃ العارفین (قلمی) ص ۷۷۔ یہی عبارت خلاصۃ العارفین، مرتبہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی

کے ص ۱۶۹ پر دو ایک لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ درج ہے۔

۲۔ احوال و آثار۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین، ص ۷۰۔

مجھ گئے کہ آپ کامل ولی ہیں ۴

(بحوالہ حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار (فارسی) چمن ششم، ص ۱۹۲)

خواجہ حسن افغان کی پیدائش ۶۰۲ھ میں ملتان میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کے بارے میں شیخ محمد اکرام "محزن افغانی" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "حسن اصل میں خوجند کے ایک سید زادہ تھے۔ وہاں کی ایک خاتون کے ساتھ جس کی ہمیشہ ملتان میں بیاہی ہوئی تھیں۔ آپ قحط سالی کے زمانے میں یہاں آئے۔ اس خاتون نے غرغشتی قبیلہ کے ایک افغان (دادی) سے شادی کر لی اور حسن بھی افغانوں میں بس کر اور شادی بیاہ کر کے افغان ہی ہو گئے۔ ان کی اولاد کو خوندمی، خوندمی یعنی خوجندی کہتے ہیں۔ محزن افغانی میں لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں ان بچوں کی طرح جو ماں باپ کی نگرانی سے محروم رہ گئے ہوں، ادارہ و آزاد ہو گئے بلکہ چوری اور ڈکیتی کا پیشہ شروع کیا اور غرغشتی قبیلے کے لوگوں نے پشتو میں آپ کا عرف ہی ہچو یعنی چور رکھ دیا۔ لیکن پھر عنایت الہی شامل حال ہوئی۔ گناہوں سے یک قلم توبہ کی اور شیخ بہاء الدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔ ایک عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بالآخر ایک کامل ولی ہو گئے۔ اس کے بعد مرشد نے حکم دیا کہ جا کر افغانوں میں ہدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کرو۔ چنانچہ وہ اپنے وطن واپس آئے اور غرغشتوں میں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا؟ (۲)

خواجہ حسن افغان کو جب بہاء الدین زکریا سے ولایت ملی تو آپ ان کے حکم سے غرغشتوں کی اصلاح کے لئے تشریف لے گئے۔ ان قبائل کو نیکی اور ہدایت کا راستہ دکھایا اور بقول

۱- بحوالہ "اخبار الاخبار" (اردو) از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۸ -

حدیقۃ الاسرار، ص ۱۹۲ کے مطابق آپ ملتان میں پیدا ہوئے۔

۲- بحوالہ "آب کوثر" ص ۲۵۵-۲۶۶ -

نور احمد خاں فریدی

”اپنے زہد و ورع کے سبب خوندمی کے لقب سے مشہور ہوئے؟“
خواجہ نظام الدین اولیاء آپ کی بزرگی و عظمت کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کرتے
ہیں کہ،

”ایک دفعہ یہی حسن ایک گلی میں جا رہے تھے کہ ایک مسجد کے پاس پہنچے
مؤذن نے تکبیر کہی۔ امام آگے بڑھا اور لوگ اس کے پیچھے جماعت میں
کھڑے ہو گئے۔ خواجہ حسن بھی مسجد میں داخل ہوئے اور امام کے پیچھے
کھڑے ہو گئے۔ جب نماز ہو گئی اور لوگ فارغ ہو کر چلے گئے تو خواجہ
حسن امام کے قریب گئے اور اس سے کہا: خواجہ! جب تم نے نماز
شروع کی تو میں تمہارے پیچھے صف میں تھا۔ تم نماز کے دوران میں یہاں
سے دہلی گئے۔ وہاں لونڈی غلام خرید کئے۔ وہاں سے واپس آئے اور
ان لونڈی غلاموں کو خراسان لے گئے وہاں سے تم ملتان لوٹے اور پھر
اس مسجد میں آ گئے۔ میں تمہارے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر یہ کیا
نماز ہے؟“ (۱)

امام صاحب آپ کی یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔ خواجہ حسن افغان کے ساتھ کوئی
تصنیف منسوب نہیں ہے۔ انہوں نے ۶۸۹ھ میں وفات پائی اور ملتان میں بہار الدین
ذکر یا کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

۱۱۔ سید جلال الدین سرخ بخاری | قصبہ اوج^(۲) کی ایک اہم شخصیت

۱۔ بحوالہ ”فوائد الفوائد“ (اردو ترجمہ) ص ۵۸

مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) اخبار الاخبار، ص ۱۶۹۔ (۲) تذکرہ بہار الدین ذکر یا ملتان،

ص ۵، (۳) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۸۲۔ (۴) آب کوثر، ص ۵۵، (۵) اولیائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۲۲۰۔

۲۔ بستی اوج، ریاست بہاولپور کا اہم تاریخی، مذہبی اور ایسا روحانی شہر ہے... (باقی بر صفحہ ثانی)

حضرت جلال الدین سرخ بخاری اپنے دور کے نامور بزرگ اور ولی کامل تھے۔ آپ ۵۹۵ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بخارا ہی میں اپنے والد حضرت سید علی ابوالموتد بن جعفر حسینی کی نگرانی میں حاصل کی۔ بخارا میں سید قاسم بخاری کی صاحبزادی فاطمہ سے آپ کی شادی ہوئی جن کے لطن سے آپ کے دو بیٹے سید علی اور سید جعفر پیدا ہوئے۔ بیوی کی وفات کے بعد ۶۳۵ھ میں بخارا سے پہلے ملتان اور پھر وہاں سے بھکر پہنچے۔ وہاں کے ایک رئیس بدرالدین بن صدرالدین خطیب کی بیٹی سے شادی کی

(ایضاً گذشتہ صفحہ) جو ایک زمانے میں بڑا تجارتی اور فوجی مرکز تھا۔ مسعود حسن شہاب اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ شہر (اوج) ریاست بہاولپور کی حدود میں پنجاب اور راوی کے سنگم کے قریب ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ سیاست، تمدن، تجارت اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ سیاحوں نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ تاجمین نے یہاں ڈیرے ڈالے۔ راجاؤں، ہمارا جاؤں اور امرار و سلاطین کے عروج و زوال کی داستانیں اسی سرزمین پر مرتب ہوتی رہیں۔ علم و عرفان کے سوتے یہاں سے پھوٹے۔ روحانیت کے چشمے یہاں جاری ہوئے اور وہ کونسی دنیا کی دولت اور علم و عرفان کی نعمت تھی جو اسکے حصہ میں نہیں آئی؟"

(بحوالہ "خطہ پاک اوج" از مسعود حسن شہاب، ص ۲، اردو اکیڈمی بہاولپور، طبع اول ۱۹۶۷ء)

۱۔ محمد ایوب قادری نے خزینۃ الاصفیاء جلد دوم کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ بزرگ مختلف القاب اور اسما، میر سرخ، شریف اللہ، ابوالبرکات، ابوالاحد، میر بزرگ، مخدوم اعظم، جلال اکبر اور عظیم اللہ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔" (بحوالہ، مخدوم جہانیاں جہاں گشت از محمد ایوب قادری، ص ۵، مطبوعہ ادارہ تحقیق و تصنیف، باراؤل ۱۹۶۳ء کراچی)۔

۲۔ بحوالہ "خطہ پاک اوج" از مسعود حسن شہاب، ص ۲۰۳۔

۳۔ بحوالہ ————— ایضاً ————— ص ۲۰۳۔

۴۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۵۔ (۷) تحفۃ الکرام، ص ۳۶۷۔ (۳) سیر العارفين کے مطابق آپ پہلے ملتان تشریف لاتے پھر وہاں سے بھکر گئے جبکہ (۱) خطہ پاک اوج، ص ۲۰۳۔ (۲) اخبار الاخبار، ص ۱۳۷۔ (۳) گلزار ابرار، ص ۵، کے مطابق آپ پہلے بخارا سے بھکر تشریف لاتے۔

میر علی شیر قانع ٹھٹھوسی آپ کی آمد اور عقد کے بارے میں لکھتے ہیں

”سید جلال الدین ایک دلی کامل ہیں (ایک بار) وہ اپنے دو فرزندوں سید علی اور سید جعفر کے ساتھ ملتان سے بھکر آئے ہوئے تھے۔ جہاں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خواب میں سید بدر الدین کی دو بیٹیوں سے یکے بعد دیگرے شادی کرنے کا حکم دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سید (بدر الدین) کو بھی خواب میں ایسا ہی ارشاد ہوا۔

(چنانچہ) سید جلال نے اس قرابت کا شرف حاصل کیا! (۱)

بخارا سے ملتان آکر آپ نے شیخ بہاء الدین زکریا سے بیعت کی۔ محمد غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ ”آپ شیخ بہاء الدین زکریا کے مرید اور مخدوم جہانیاں کے دادا ہیں۔ قدس سرہم کہتے ہیں کہ تقدیر الہی آپ کو بخارا سے بھکر (۲) کھینچ لائی تھی۔“ (۳)

جناب جلال سرخ بخاری کے بہاء الدین زکریا کے پاس آنے کی وجہ مسعود حسن شہاب یہ بتاتے ہیں کہ جب بہاء الدین زکریا حصول علم کی خاطر بخارا تشریف لے گئے تو وہاں

۱۔ بحوالہ تحفۃ الکرام، از میر علی شیر قانع ٹھٹھوسی، مترجم اختر رضوی، ص ۳۶۷، مطبوعہ

سندھی ادبی بورڈ کراچی ۱۹۵۹ء

۲۔ بھکر میں آپ کی شہرت اور مقبولیت سے لوگ حسد کرنے لگے تو آپ کو وہ علاقہ چھوڑنا

پڑا۔ محمد غوثی شطاری کے مطابق

”آسمانی گردش سے بھائیوں کے دلوں میں حسد اور کینہ پیدا ہوا۔ اس سبب سے سید جلال الدین بہ ترک سکونت اور چہ معین آکر گوشہ گزین ہوئے۔ بہت مدت تک خدا پرستی میں مشغول رہے اور رحلت کے بعد بھی یہی شہر آپ کی خواب گاہ بنا۔“

(بحوالہ گلزار ابرار، ص ۵۸)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (الف) اخبار الاخبار، ص ۱۳۷-۱۳۸۔ (ب) آب کوثر، ص ۲۰۰۔

۳۔ بحوالہ گلزار ابرار، از محمد غوثی شطاری، منڈوی، مترجم فضل احمد جیوری، ص ۵۷۔

جلال الدین بخاری کے والد سید علی آپ سے بہت متاثر ہوئے۔ والد کی طرح سید جلال بھی آپ کو پسند کرتے تھے اور یہی پسندیدگی آپ کو ملتان لے آئی۔ اس کے علاوہ آپ بہاء الدین زکریا کے مرشد شیخ شہاب الدین سہروردی کے عقیدت مند بھی تھے (۱)۔ سید جلال، بہاء الدین زکریا کے بہترین خلفاء میں سے تھے جو خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوسی لکھتے ہیں

”سید جلال بخاری جنہیں سید جلال سرخ کالقب حاصل ہے۔ وہ شیخ

بہاء الدین ملتانی کے مرید اور یار ہیں۔ یہ (بزرگ آپس میں) چار یار

(کہلاتے) ہیں — شیخ بہاء الدین، شیخ فرید الدین، سید عثمان

مروندی (قلندر شہباز) اور سید جلال سرخ — (۲)

آپ بہاء الدین زکریا کی خدمت میں تیس سال تک رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند شیخ صدر الدین عارف کے کہنے پر اوج شریف منتقل ہو گئے جہاں آپ آخری وقت تک رہے۔ محمد ایوب قادری آپ کے پوتے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی کتاب ”الدر المنظوم“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

”شیخ کبیر بہاء الحق والدین نے دعاگو کے دادا کو بعد تیس برس کے

اچھ کی طرف بھیجا بعد وفات شیخ کبیر کے شیخ صدر الدین نے چند زمانہ رکھا

بعد اس کے اجازت دی کہ اچھ میں ساکن ہو۔ (۳)

جس زمانے میں سید جلال الدین بخاری اوج شریف لائے۔ ان دنوں اوج کے گرد و نواح میں ہندوؤں کا تسلط تھا جو مسلمانوں کی دل آزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ لیکن سید جلال نے ہمت و حوصلے سے کام لیتے ہوئے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ اور ان کفار کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری قبول کی

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”خط پاک اوج“ از مسعود حسن شہاب، ص ۲۰۲۔

۲۔ ”تحفۃ الکرام“ ص ۲۶۷۔

۳۔ ”مخدوم جہانیاں جہاں گشت“ از محمد ایوب قادری، ص ۷۹۔

اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی حاصل کی۔ مولوی حفیظ الرحمن لکھتے ہیں کہ
 ”حضرت جلال سمرخ نے اوج میں قیام کے بعد اصلاح و تبلیغ کا کام پوری
 مستعدی کے ساتھ شروع کیا۔ علاقہ اوج کی چدھر، ڈہرا اور سیال
 وغیرہ نے حضرت کی ہدایت پر متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔“^(۱)

ان کے علاوہ مولانا نور احمد خان فریدی نے ”تذکرہ صدرالدین عارف“ میں اسی علاقہ کے
 راجہ گھلو کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے

”جس کی اولاد ٹھٹھ گھلوں، اوبارہ، چھنڈہ میانی، بیٹو واہی، چوٹالہ،
 خان واہ، ملک پور، صبرا، کرام علی والا اور سعد اللہ پور (ضلع ملتان) کے
 مواضع میں پھیلی ہوئی ہے۔“^(۲)

مسعود حسن شہاب نے خزینۃ الاصفیاء (جلد دوم) کے حوالے سے یوں ذکر کیا ہے۔
 ”ہزار ہا مخلوق خدا را بہ ہدایت ہادی حقیقی براہ راست آورد و شہر جھنگ
 سیالوں کے در پنجاب مشہور و معروف است بنا فرمود،

ترجمہ — ہزاروں لوگوں کو ہدایت حق سے راہ راست پر لائے اور
 شہر جھنگ سیالوں کی جو پنجاب کا مشہور ضلع ہے۔ بنیاد بھی آپ ہی نے رکھی۔“^(۳)

سید جلال بخاری جب اوج تشریف لے گئے تو اصلاح و تبلیغ کے کام کے لئے انہوں نے
 ایک ”خانقاہ بخاریہ“ کی بنیاد رکھی۔ مسعود حسن شہاب کے مطابق

”اوج میں حضرت سید جلال سمرخ بخاری نے خانقاہ بخاریہ کی بنیاد رکھی
 اس خانقاہ میں علمی اور روحانی استفادہ کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور
 اس کثرت سے رجوع خلق حضرت شیخ کی جانب ہوا کہ بہت جلد اوج
 کا وہ حصہ جہاں حضرت والا فرودکش ہوئے تھے، اوج بخاری کے نام

۱۔ بحوالہ ”تاریخ اوج“ ص ۹۸۔

۲۔ بحوالہ ”تذکرہ صدرالدین عارف“ ص ۱۷۱۔

۳۔ بحوالہ ”خط پاک اوج“ ص ۲۱۰۔

سے دور و نزدیک مشہور ہو گیا! (۱)

اس خاتماہ کے علاوہ مسعود حسن شہاب اوج مرکز علم و عرفان کے ضمن میں ایک اور خاتماہ جلالیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حضرت سید جلال سرخ بخاری کی آمد پر یہاں خاتماہ جلالیہ کی بنیاد پڑی جس میں خود حضرت مخدوم اور ان کے بعد ان کے فرزند حضرت سید احمد کبیر زبیر مسند رہے۔"

اس درس گاہ کو غیر معمولی شہرت حضرت سید احمد کبیر کے فرزند اور حضرت مخدوم جلال سرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ اس عہد میں ہند اور بیرون ہند سے یہاں اس قدر طلباء جمع ہوئے کہ اس کی مثال دہلی کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ان طلبہ میں بعض حضرات اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم و فضل اور نامور اصحاب شریعت تھے اور جن جن علاقوں میں گئے وہاں ایک دنیا ان کے فیوض علمی و عملی سے بہرہ ور ہوئی۔" (۲)

جلال الدین سرخ بخاری اپنی عمر کے آخری حصے تک اوج میں مقیم رہے اور یہیں ۱۹ جمادی الاول بمطابق ۲۰ مئی ۱۶۹۱ء (۶۹۰ھ) میں وفات پائی۔ حدیقۃ الاولیاء میں دئے ہوئے قطعہ تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

چو رفت از جہان در بہشت بریں جلال ولی صاحب حال و قال
بتاریخ او میر دولت بگو و گر قبلہ اہل جنت جلال (۳)

۱- بحوالہ "خطہ پاک اوج" ص ۲۱۱۔

۲- بحوالہ ایضاً ص ۱۶۷۔

۳- حوالے کیلئے دیکھئے (۱) مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۸۱- (۲) خطہ پاک اوج، ص ۲۱۲ (۳) آب کوثر از شیخ محمد اکرام

ص ۲۴ (۴) سیر العارفین ص ۲۱۲ (۵) تذکرہ اولیائے ہند و پاک ص ۸۱، البتہ اخبار الاخیار از مولوی عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۲۴ پر آپ کا سن ۱۶۵۲

۱۶۵۲ء لکھا ہے۔ ۲- حدیقۃ الاولیاء، از غلام سرور لاہوری، ص ۴۲، مطبوعہ نو لکچور۔

آپ کے پانچ فرزند تھے جن میں سے سید احمد کبیر سہروردی کو شہرت حاصل ہوئی۔ آپ نے اپنے والد اور صدر الدین عارف دونوں سے خلافت حاصل کی تھی۔ سید احمد کبیر ہی کے دو فرزند سید صدر الدین راجو قتال اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت، اویچ شریف کی وہ عظیم شخصیتیں ہیں جنہیں دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

وصال کے بعد سید جلال بخاری کو قصبہ چناب رسول پور میں، جہاں وہ رہتے تھے دفن کیا گیا۔ لیکن دریا کی طغیانی کے سبب یہ حصہ متاثر ہوا تو آپ کو سیونک سیلا منتقل کر دیا گیا۔ یہ علاقہ بھی دریا کی زد میں آیا تو آپ کے جسد مبارک کو آپ کے پوتے سید راجو قتال کے مزار کے ساتھ دفن کیا گیا۔ پھر مخدوم محامد نو بہار اول نے ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) میں زبردست مخالفت کے باوجود آپ کے جسد مبارک کو وہاں سے نکال کر اس جگہ دفن کیا جہاں اب ان کا مزار موجود ہے۔ آپ کے مقبرہ کی موجودہ عمارت کو نواب بہاول خاں ثالث رئیس بہاولپور نے پختہ بنوایا اور اعلیٰ میں ایک کنواں اور تالاب بھی بنوایا۔ ۱۳۰۰ھ میں نواب صادق محمد خاں رابع نے اس کو وسیع کرتے ہوئے اسکی مرمت بھی کروائی۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح | قاضی جاوید کے مطابق شیخ رکن الدین ابوالفتح مدنی

”ایک لحاظ سے شیخ زکریا کے خاندان کے آخری نامور بزرگ تھے انہوں نے دینی اور دنیاوی معاملات میں اپنے خان وادے کی روایات کو برقرار رکھا۔ شیخ بہار الدین زکریا نے تصوف اور سیاست میں قریبی ربط پیدا کرنے کی جس کوشش کا آغاز کیا تھا۔ ان کے پوتے کے زمانے میں وہ نصب العین بن کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ اسے صوفیانہ آدرش پر بھی ترجیح دی جانے لگی؟“

غوث بہار الحق کے پوتے اور شیخ صدر الدین عارف کے بیٹے شیخ رکن الدین ابوالفتح

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے (الف) مخدوم جہانیاں جہاں گشت (ب) خط پاک اویچ، ص ۲۱۲۔

۲۔ بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۱۰۵ - ۱۰۶۔

اپنے والد کی وفات کے بعد مسند سجادگی پر بیٹھے اور ۵۲ سال تک سجادہ نشین رہے
”سفیۃ الاولیاء“ میں لکھا ہے کہ

” پنجہ و دو سال بر سجادہ پدر وجد بزرگوار نشستہ بادشاہ طالبان قیام
داشتند“ (۱)

آپ محترمہ بی بی راستی، جو بی بی پاک دامن کے نام سے مشہور ہیں کے اکلوتے فرزند
تھے جنہیں حضرت بہاء الدین نے آپ کی پیدائش سے دو ماہ قبل خوشخبری سنادی تھی کہ
ان کے ہاں ایسا بچہ پیدا ہوگا جو ہمارے خاندان کا چراغ اور ہمارے خانوادے کی شمع^(۲) ہے
آپ ۹ رمضان المبارک ۶۲۹ھ (۱۲۵۱ء) بروز جمعہ کو پیدا ہوئے تو آپ کے
دادا بہاء الدین زکریا نے آپ کا نام رکن الدین رکھا۔ بعد میں آپ ”ابوالفتح“^(۳) کے لقب
سے مشہور ہوئے۔ خواجہ شمس سبزواری نے آپ کی سعادت مندی سے متاثر ہو کر
آپ کے نام کے ساتھ ”والعالم“ کا اضافہ کیا۔ اسی نسبت سے آپ رکن عالم بھی کہلائے^(۴)

۱- بحوالہ سفیۃ الاولیاء فارسی (قلمی) ص ۱۷۷، مرقومہ یار محمد مرید حضرت شیخ خواجہ حافظ غلام حسن مرقومہ ۱۲۸۰ھ

۲- بحوالہ سیر العارین ص ۲۴، سفیۃ الاولیاء (فارسی) از دار الشکوہ ص ۱۸۶، مطبوعہ نوکلتور میں ”شمع“ کی

جگہ ”شمع“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جملہ یوں ہے۔ ”اور چراغ خاندان و شمع دو دمان ما است“

۳- حوالے کیلئے دیکھئے (الف) ”قطب الاقطاب شاہ رکن عالم“ از نور احمد فریدی، ص ۱۸، مطبوعہ

مقصر الادب، جگہ والا ضلع ملتان (ب) مخدوم جہانیاں جہاں گشت از محمد ایوب قادری، ص ۱۷ (ج) اولیائے

ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۳۷، البتہ حدیقت الاسرار فی اخبار الابرار، ص ۱۹۵، اخبار الاخبار، ص ۱۲۲

پر ۶۳۵ھ درج ہے۔ جبکہ احوال و آثار، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارین، از ڈاکٹر شمیم محمود

زیدی، ص ۵۴، میں سن پیدائش ۶۳۷ھ دیا گیا ہے۔

۴- بشیر حسین ناظم کے مطابق ”آپ ابوالفتح کے گرامی لقب سے بدیں باعث مشہور ہوئے کہ آپ

اپنے باطنی اتوار و تجلیات سے اپنے تمام متوسلین اور ارادت مندوں کے دلوں کے احوال و خطرات معلوم

کر لیتے تھے۔ (بحوالہ ”اولیائے ملتان“ ص ۵۰)

۵- بحوالہ ”قطب الاقطاب شاہ رکن عالم“ ص ۱۹۔

حضرت بہاء الدین زکریا نے جس طرح اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ اسی طرح شاہ رکن عالم کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ آپ نے اپنے والد اور چچاؤں کی طرح اپنے دادا کی قائم کی ہوئی درس گاہ، مدرسہ بہائیہ میں تعلیم حاصل کی جہاں جید علماء ہزاروں طالبان علم کی پیاس بجھانے کو موجود تھے۔ قرآن مجید ساتوں قرأتوں کے ساتھ والد محترم صدر الدین عارف سے پڑھ کر حفظ کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی تربیت کا بھی خیال رکھا جاتا۔ چنانچہ آپ کے والد تہجد، اشراق چاشت، زوال، بین العشائین اور دیگر نوافل ادا کرتے وقت آپ کو بھی ساتھ شامل رکھتے نور احمد خاں فریدی بزم صوفیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

”انہوں نے مکاشفہ و محاسبہ سے اتنے مدارج طے کر لئے تھے کہ ان کو مخزن شہود الہی، منبع جود لا تمنا ہی، ادریس خلوت و وحدت، برج معرفت، گوہر معدن صفات لاریب، لولوتے بسجۃ دریائے غیب زبدتہ المشائخ، مفتاح کل اور حق الیقین کے القابات سے یاد کیا جانے لگا تھا۔“ (۱)

مدرسہ بہائیہ میں آپ نے اس زمانے میں مروجہ تمام دینی کتابوں پر کامل عبور حاصل کر لیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت پر جو خصوصی توجہ دی گئی اس نے آپ کی شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ آپ

”عبادت و ریاضت، تقویٰ و طہارت، پاکیزگی و پرہیزگاری میں یکتائے زمانہ تھے۔ پند و نصائح، شفقت و موافقت، الفت و محبت، مروت و مودت، بردباری و تحمل، حسن خلق اور حسن ظن میں لاثانی تھے۔ رب العزت نے آپ کو حلم و حیا، صدق و وفا، عفو و وفا اور جود و سخا کا ایک بحر بکراں بنا دیا تھا۔ آپ کا اکثر وقت ذکر خفی

اور ذکر جلی

میں گزرتا۔ ریاضت و مجاہدہ میں اس

۱۔ بحوالہ ”قطب الاقطاب شاہ رکن عالم“ ص ۳۳۔

جفا کشی اور جانفشانی سے کام لیتے کہ دیگر اہل مجاہدہ حیران و ششدر رہ جاتے۔ دس برس کی عمر میں احوال و کشف قبور اور کشف قلوب میں فائق ہوئے اور اس کے پندرہ برس بعد کمالات صوری اور معنوی کا اسوۃ کاملہ بن گئے۔ (۱)

قطب الاقطاب شاہ رکن عالم کو وہ خرقہ خلافت اپنے والد کی طرف سے ملا جو بہار الدین زکریا کو شہاب الدین سہروردی کی طرف سے عطا ہوا تھا اور آپ نے بہار الدین زکریا کی وہ دستار پہنی جو بچپن میں کھلتے ہوئے آپ نے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی تو صدر الدین عارف نے آپ کو ٹوکا۔ لیکن بہار الدین زکریا نے فرمایا کہ اسے نہ روکو۔ یہ حقیقت میں اس کے مستحق ہیں۔ چنانچہ بہار الدین زکریا نے وہ دستار صندوق میں رکھوا دی جو بڑے ہو کر آپ کے سر پر رکھی گئی۔ (۲)

شاہ رکن عالم سخاوت اور غرباء پر روزی میں بھی اپنے والد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ آپ نے ساری زندگی اپنے لئے کوئی مال و دولت جمع نہ کیا بلکہ آپ کو جہاں کہیں سے بھی جو کچھ ملتا اسے فوراً مستحقین میں تقسیم فرما دیتے۔ آپ نے دہلی کا سفر بھی اختیار کیا اور جب آپ دہلی تشریف لے گئے تو سلطان علاء الدین نے آپ کی خدمت میں پہلے دو لاکھ تنکے پیش کئے جو آپ نے فوراً تقسیم فرما دیئے۔ پھر واپسی کے وقت اس نے تین لاکھ تنکے پیش کئے وہ بھی آپ نے فوراً تقسیم فرما دیئے۔ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) میں لکھتے ہیں

”شیخ دو مرتبہ علاء الدین کے عہد میں دہلی آئے۔ ہر مرتبہ سلطان نے آتے وقت دو لاکھ اور واپسی کے وقت پانچ لاکھ تنکے پیش کئے۔ یہ سب

۱۔ بحوالہ ”ادویائے ملتان“ از بشیر حسین ناظم، ص ۳۹-۴۰۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ (الف) سیر العارفین، ص ۲۰۰۔

(ب) ادویائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۳۹۔ (ج) تذکرہ قطب الاقطاب

شاہ رکن عالم، ص ۲۲-۲۳۔

رقوم شیخ نے فقراء میں تقسیم کر دیں؛ (۱)

شاہ رکن عالم کے تعلقات نہ صرف علماء مشائخ سے تھے بلکہ آپ سلاطین کے ساتھ بھی تعلق رکھا کرتے تھے (۲)۔ اس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ لوگوں کی شکایات کو سلطان تک پہنچایا جائے اور ان کی مشکلات کو حل کیا جائے۔ حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار کے مطابق

” رفتن حضرت نزد بادشاہ محض برائے حاجت براری اہل حاجات بودے کہ ذات پاک ایشان محض خیر خواہ خلق اللہ ست۔“ (۳)

چنانچہ اس سلسلے میں آپ کا خصوصی طریقہ تھا۔ ”سیر الاولیاء“ کے مصنف اپنے والد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

”جب میں ان بزرگواروں کے سامنے کھانا لے گیا تو شیخ رکن الدین کے ڈولے پر محتاجوں کی عرضیوں اور کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا۔ میں روٹیاں رکھنے اور جگہ وسیع کرنے کے لئے ان کاغذات کو ایک جگہ جمع کر رہا تھا کہ اسی اثناء میں شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز نے سلطان المشائخ کی طرف متوجہ ہو کر کہا تم جانتے ہو کہ یہ کاغذ کیسے ہیں۔ بعدہ خود فرمایا کہ اس زمانہ کے مساکین کی عرضیاں ہیں جب میں بادشاہ

۱۔ بحوالہ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۸، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور، بار اول، اکتوبر ۱۹۶۹ء

۲۔ آپ کے خاندان کے بزرگ شیخ الاسلامی کے منصب کے باعث دہلی کی حکومت کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے سیاست میں بھی آپ کے والد اور دادا کا خاص کردار ہوتا تھا۔ قاضی جاوید کے مطابق ”سہروردیہ مکتبہ فکر کی توجہ کا مرکز حکمران تھے۔ ان کے ہی مفادات انہیں عزیز تھے۔ اصل یہ ہے کہ سہروردی اکابرین اور خصوصاً شیخ رکن الدین بنیادی طور پر ایسے جاگیردار تھے جنہیں درشے میں روحانی اقتدار بھی ملا۔ اس اقتدار کو انہوں نے اکثر و بیشتر دنیاوی حاصلات کے لئے استعمال کیا۔“

(بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“، ص ۱۱۲)

۳۔ حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار (فارسی) ص ۱۹۵ -

کے پاس جاتا ہوں تو محتاج لوگ اپنی عرضیاں دیتے ہیں تاکہ ان کی مہمات انجام کو پہنچیں؟ (۱)

آپ کے سامنے سلطان خادم سے عرضیاں پڑھواتا اور مناسب فرمان جاری کروانا حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے عہد کی اہم سیاسی و مذہبی شخصیت تھے۔ سلاطین کے درباروں میں بھی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی لکھتی ہیں کہ

”شیخ رکن الدین در زمان خود شخصیت ارجمندی بشمار میرفت سلطان علاء الدین خلجی و پسرش قطب الدین خلجی احترام زیاد سی برای او قابل بودند۔ شیخ با سلاطین تعلق ہم روابط خوبی داشت؟ (۲)

ایک مرتبہ جب سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ نے ملتانوں کے قتل عام کا حکم دیا تو آپ برہنہ سر سلطان کے دربار میں پہنچے۔ سلطان نے انہی تعلقات کی بنا پر قتل عام کا حکم روک دیا۔ (۳) قاضی جاوید لکھتے ہیں

• اس واقعہ کے بعد شیخ رکن الدین ملتان میں مقیم رہے۔ یہ ان کی زندگی کے سب سے زیادہ پرسکون دن تھے۔ ان کی روحانیت اور سیاسی اہمیت کے چرچے پورے مسلم ہند میں پھیل چکے تھے۔ ان کے

۱- بحوالہ ”سیرالاولیاء“ ص ۱۲۵-۱۲۶۔

۲- بحوالہ ”احوال و آثار“ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصت العارفین“ ص ۵۵۔

۳- سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ کے زمانے میں کشلوخاں نے ملتانوں اور بلوچوں کے ساتھ مل کر ملتان اور بھکر میں بغاوت کر دی۔ ۲۸ھ میں سلطان نے خود حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔ کشلوخاں اس حملے میں مارا گیا اور اس کی فوج بکھر گئی۔ بادشاہ نے ملتانوں کے قتل عام کا حکم دیا تو شیخ الاسلام شیخ رکن الدین ملتانوں کی سفارش کے لئے برہنہ سر سلطان کے دربار میں آکھڑے ہوئے آخر سلطان نے آپ کی سفارش مان کر ملتانوں کا قصور معاف کر دیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) تاریخ معصومی، ص ۶۵ (۲) آب کوثر، ص ۲۶۴ (۳) قطب الاقطاب رکن عالم، ص ۱۲۸-۱۲۹۔

••• مرقع مولتان، از اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۴۔

ارادت مندوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ملتان اور اس کے گرد و نواح میں ان کی جاگیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطان محمد تغلق بھی ملتان کے واقعہ کے بعد دہلی جاتے ہوئے شیخ کی خدمات کے عوض اپنے باپ کا تعمیر کردہ پڑ سکون مقبرہ اور سو دیہات نذرانے کے طور پر دے گیا تھا۔^(۱)

شاہ رکن عالم کی دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے پانچ مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ دہلی کے سلطان قطب الدین خلجی کے دل میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی طرف سے کچھ رنجش پیدا ہوئی تو انہوں نے دہلی میں ان کا اثر و رسوخ کم کرنے کے لئے ملتان سے شاہ رکن عالم کو بلوایا۔ شاہ رکن عالم جب دہلی پہنچے تو سب سے پہلے آپ کی ملاقات نظام الدین اولیاء سے ہوئی جو آپ کے استقبال کے واسطے حوض علانی کے مقام پر تشریف لائے تھے۔ شاہ رکن عالم کی جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ آپ کی ملاقات اس شہر کے بزرگوں میں سب سے پہلے کس سے ہوئی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ

”جو اس شہر کے تمام باشندوں میں زیادہ بہتر و بزرگ تھا۔“^(۲)

کہا جاتا ہے کہ یہ سن کر سلطان قطب الدین خلجی کے دل میں خواجہ نظام الدین اولیاء کی طرف سے جو رنجش تھی وہ دور ہو گئی۔ اس کے بعد آپ جب بھی دہلی تشریف لاتے تو خواجہ صاحب سے ضرور ملاقات کرتے۔ اس دوران آپ دونوں کے درمیان علمی

۱- ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۱۱۳۔

۲- سید خوردمبارک کرمانی نے ”سیرالاولیاء“ میں آپ دونوں کی پانچ ملاقاتوں کا ذکر

کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے ”سیرالاولیاء“ ص ۱۴۳ تا ۱۴۸)۔

۳- بحوالہ ”سیرالاولیاء“ ص ۱۴۳۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) قطب الاقطاب

شاہ رکن عالم، ص ۱۴۵ تا ۱۴۸۔ (۲) گلزار ابرار، ص ۵۸-۵۹۔ (۳) اخبار الاخبار، ص ۱۴۶ تا ۱۴۹

(۴) ”آب کوثر“ ص ۲۶۳۔

لکات کا تبادلہ بھی ہوتا جسے سننے کے لئے کئی لوگ جمع ہوتے۔

قیام دہلی کے دوران ہی میں ایک مرتبہ آپ نے سماع کی محفل میں شرکت فرمائی آپ دہلی میں تھے کہ بابا فرید کے عرس کا زمانہ آگیا تو خواجہ نظام الدین اولیا نے دہلی میں ہی عرس کا انتظام کیا جس میں شاہ رکن عالم بھی شامل ہوئے۔ اسی عرس کے موقع پر محفل سماع کا بھی انتظام کیا گیا۔ سماع کے دوران وجد میں آکر خواجہ نظام الدین اولیا اٹھنے لگے تو رکن عالم نے انہیں پکڑ کر بٹھالیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اٹھے تو آپ نے انہیں نہیں روکا بلکہ خود بھی دوسرے مشائخ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے بعد میں مولانا علم الدین نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ

” میں نے حضرت کو پہلی مرتبہ عالم ملکوت میں پایا۔ میرا ہاتھ وہاں تک پہنچ گیا اور دوسری مرتبہ میں نے ان کو عالم جبروت میں دیکھا اور اپنا ہاتھ روک لیا۔“^(۱)

شاہ رکن عالم کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو حاصل ہے جو ابتدائی تعلیم اورچ سے حاصل کرنے کے بعد آپ کے مدرسہ میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملتان میں کافی عرصہ قیام پذیر ہے ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ آپ کے خلفاء میں شیخ وجیہ الدین عثمان سامی کا نام بھی آتا ہے جن کا مزار دہلی میں ہے۔ آپ شاہ رکن عالم کے ساتھ ملتان تشریف لے آئے اور دو سال یہاں قیام فرمایا۔ اسی دوران قرآن مجید حفظ کیا اور آپ سے عوارف المعارف پڑھی۔ پھر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے ہوتے ہوئے شیخ کے حکم سے دہلی میں قیام فرمایا جہاں خواجہ نظام الدین اولیا رہتے تھے۔ آپ سماع کے بہت شوقین تھے۔ حالانکہ سلطان نغیث الدین تغلق نے اس پر پابندی لگائی ہوتی تھی۔ شیخ مجد الدین طاہر بھی آپ کے مرید تھے جن کا مزار قصبہ کنور میں ہے۔ ان کے علاوہ آپ کے خلفاء میں حمید الدین حاکم، حاجی صدر الدین چراغ ہند جون پوری،

۱۔ بحوالہ ”سیر العارفین“ ص ۲۰۴۔

مولانا ظہیر الدین محمود سہروردی اور حضرت علی بن احمد غوری شامل ہیں۔ انہوں نے بہاء الدین زکریا کی کتاب "الادراہ" کی شرح "کنز العباد" کے نام سے لکھی۔ شیخ رکن الدین نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ قاضی جاوید نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے "شیخ رکن الدین ابوالفتح کی زندگی زیادہ تر سیاسی ہنگاموں کی نذر ہو گئی تھی۔ درس و تدریس سے انہیں زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ ان کی یادگاروں میں کوئی تصنیف بھی موجود نہیں۔ صوفیانہ مسائل اور فلسفیانہ نکتہ طراز یوں سے انہیں دلچسپی نہیں تھی۔"

(بحوالہ "پنجاب کے صوفی دانشور"، ص ۱۱۴۔)

البتہ اخبار الاخیار، ص ۴۲، پر "مجمع الاخیار" کے نام سے ایک کتاب ان سے منسوب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی کا بیان ہے کہ

"دربارہ تصانیف شیخ تذکرہ لویساں چنیزی نوشتہ اند۔ فقط در کتاب اخبار الاخیار، ص ۴۲، اسمی از "مجمع الاخیار" بردہ شدہ منتہی از آل نقل شدہ است و ایں کتاب را یہ شیخ رکن الدین نسبت دادہ اند۔" (۱)

شاہ رکن عالم نے اپنی عمر کے آخری دس سال خالقاہ نشین ہو کر گزارے اور اس دوران آپ کے خلفاء آپ کے گرد جمع رہے۔ وفات سے کچھ مہینے قبل آپ نے سب کو جمع کر کے دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کے بارے میں وعظ فرمایا اور اس کے بعد اپنے بھتیجے اور شیخ عماد اسماعیل کے بیٹے شیخ صدر الدین محمد کے سر پر وہی دستار مبارک رکھ کر انہیں اپنا جانشین مقرر فرمایا جو آپ کو آپ کے دادا نے دی تھی۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی کا بیان ہے

"شیخ رکن الدین چوں صاحب فرزند سی نمود بعد از او خلفائی عظام او بہ جانشینی اور رسیدند و حقیقتاً بادر گذشت او سلسلہ سہروردیہ از ملتان بہ

۱۔ بحوالہ "احوال و آثار۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین" ص ۵۵

۲۔ بحوالہ (الف) مرآت الاسرار، جلد دوم، ص ۲۶۳ (ب) قطب الاقطاب شاہ رکن عالم، ص ۲۵۰۔

ادج منتقل شدہ واپس خط بصورت مرکز روحانی ہندو پنجاب درآمد؟ (۱)

اس کے بعد وصال تک تقریباً تین ماہ کا عرصہ آپ نے زیادہ تر اپنے حجرے میں عبادت کرتے ہوئے گزارا۔ صرف فرض نمازوں کے لئے باہر تشریف لاتے۔ وصال والے دن مولانا ظہیر الدین محمد کو جو آپ کو وضو کرا رہے تھے فرمایا کہ جاؤ میری تجہیز و تکفین کا انتظام کرو۔ وہ سن کر باہر آئے اور دوسرے خلفاء کو بھی یہ بات بتائی۔ سب سمجھ گئے کہ آپ کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ آپ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد صلوٰۃ اوابین ادا کر رہے تھے۔ فارغ ہوئے تو سجدے میں سر رکھا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کی وفات ۷۳۵ھ (۱۳۳۲ء) میں ہوئی۔ آپ کا روضہ قلعہ قدیم پر ہے۔ جہاں آپ کے دادا اور آپ کے والد محترم کے مزار بھی ہیں۔ آپ کے مزار کی عمارت غیاث الدین تغلق نے اپنے مقبرے کے لئے تعمیر کرائی تھی لیکن وہ دہلی میں فوت ہوا اور اسے وہیں دفن کیا گیا۔ اس کے بیٹے محمد بن تغلق نے یہ عمارت آپ کے روضے کے لئے دے دی (۲) ڈاکٹر شمیم محمود زیدی لکھتی ہیں

در مقبرہ اسی کہ سلطان غیاث الدین متوفی ۱۳۳۰ء برائی خودش بود مدفون شدہ (۳)

آپ کے مقبرہ کی عمارت کافی اونچی ہے اور شہر میں دور دور سے نظر آتی ہے۔ اولاد علی

-
- ۱۔ "احوال و آثار" شیخ بہار الدین زکریا ملتانی و خلاصۃ العارفین، ص ۵۵ - ۵۶۔
 - ۲۔ بحوالہ (۱) سیر العارفین، ص ۲۰۹ (۲) قطب الاقطاب شاہ رکن عالم، ص ۲۵ - (۳) آب کوثر، ص ۲۶۷ - (۴) غنوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۴۳ - (۵) مرآت الاسرار، ص ۲۶۳ - (۶) سفینۃ الاولیاء ص ۱۵۴ - (۷) اولیائے ملتان، ص ۵۱۰ - (۸) تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۸ - (۹) تذکرہ اولیائے ہندوپاک، ص ۴۸۴ - (۱۰) معمولات منظر یہ و محبوب العارفین، ص ۱۴۵ جیکہ اخبار الاخبار، ص ۱۴۲، پرسنہ وفات ۶۹۰ھ اور احوال و آثار۔ شیخ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۵۶، پر ۷۳۲ھ درج ہے۔

۳۔ حوالے کیلئے دیکھئے (الف) آب کوثر، ص ۲۶۶ - (ب) مرقع مولتان، ص ۲۱۵۔

۴۔ "احوال و آثار" شیخ بہار الدین زکریا ملتانی، ص ۵۵۔

گیلانی کے مطابق

” آپ کے روضہ مبارک کی عمارت ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ عظیم الشان عمارت مٹمن شکل کی ہے۔ اس کا مرکزی قطر ۵۰ فٹ ۹ انچ لمبا ہے۔ ہر ایک زاویہ پر عمودی ستون کھڑے ہیں اس سے اوپر کے حصہ میں ایک اور مٹمن شکل کی عمارت استادہ ہے۔ جس کا باہر کی طرف کا گھیر تقریباً ۲۵ فٹ کا ہے اور اونچائی میں ۲۶ فٹ ہے۔ اوپر کے گنبد کی بیرونی گولائی ۵۸ فٹ ہے اور کل مقبرہ کی بلندی سو فٹ اور دو انچ ہے۔ چونکہ مقبرہ بہت بلندی پر واقع ہے۔ اس لئے اردگرد کی آبادی سے یہ کوئی ڈیڑھ سو فٹ کے قریب بلند ہے۔ ملتان سے ۱۲ یا ۱۵ میل کے فاصلے سے یہ عمارت نظر آتی ہے۔“ (۱)

۱۳۔ شیخ حسام الدین ملتانی | مولانا حسام الدین ملتانی کا تعلق سلطان

المشاخ نظام الدین اولیاء کے دس خلفاء میں ہوتا ہے (۲) آپ ۶۸۷ھ (۱۲۶۸ء) (۳) میں پیدا ہوئے۔ چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام سے تعلق رکھتے تھے (۴) آپ علوم ظاہر و

۱۔ بحوالہ ”مرقح مولتان“ از سید محمد اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۴ - ۲۱۵۔

۲۔ (الف) مرآت الاسرار (جلد دوم) ص ۳۱۳۔ (ب) شیخ محمد اکرام کے مطابق، ”حضرت سلطان المشاخ کے تین خلفاء کے نام (سید موسیٰ وراق الحسنی و الحشتی مخدوم سید حسین خنگ سوار، شیخ حسام الدین عثمانی، پٹن کے بزرگوں میں ملتے ہیں۔ لیکن اولیت کا شرف شیخ حسام الدین کو حاصل ہے۔ ان کا وطن ملتان تھا اور حضرت سلطان المشاخ کے خاص خلیفہ تھے۔“ (بحوالہ آب کوثر، ص ۳۳۱)

۳۔ ”نزہت الخواطر و بہجتہ المسامح والخواطر“ مؤلف علامہ سید عبدالحی بن فخر الدین الحسنی مترجم البوکی

۱۶۱۶ خاں، ص ۲۱۶۔ مطبوعہ مقبول اکیڈمی، لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء۔

۴۔ بحوالہ ”تاریخ مشاخ چشت“ از خلیق احمد نظامی، ص ۱۷۸۔

باطن میں مشہور تھے۔ مصنف سیرالادلیا کہتے ہیں کہ

” زاہد روحانی عابد سبحانی مولانا حسام الملّٰتہ والدین ملتانی سلطان المشائخ کے ممتاز و اولوالعزم خلیفہ ہیں جو علم تقویٰ اور ورع و زہد میں ایک کامل آیت تھے۔ آپ کو علم فقہ میں اتہاد درجہ کی مہارت تھی۔ ہدایہ کی دونوں جلدیں حفظ تھیں اور ان کے تمام مطالب نوک زبان تھے۔ علم سلوک میں قوت القلوب اور احیاء العلوم دونوں جامع جلدیں از بر تھیں اور باوجود ان تمام بزرگوں اور فضائل کے زائر الحرمین اور صاحب نصیبین تھے۔“ (۱)

شیخ حسام الدین نے اپنی عبادت گزار سی اور درویشی کی زندگی کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ان کے ذریعہ معاش کے بارے میں گلزار ابرار میں لکھا ہے

” ہمیشہ ٹاٹ بیچنے سے روز مرہ کی قوت پہنچاتے تھے اور جو کچھ بہم پہنچتا تھا اس میں سے بھی آدھوں آدھ کسی اور شخص کو دے دیا کرتے تھے جو مستحق ہوتا تھا اور رسمی علوم کے درس میں مشغول رہتے تھے۔ رحلت کے وقت یہی روش و رفتار اور کاروبار رہا۔“ (۲)

مولانا نے اپنی باعمل زندگی سادگی اور درویشی میں گزار سی۔ محنت سے کام لیتے اور جتنا وقت بچتا عبادت میں گزار دیتے۔ آپ نے کبھی ضرورت سے زائد اپنے گھر میں نہیں رکھا تھا۔ بعض اوقات تو جب کچھ نہ ملتا تو کئی کئی دن فاقے میں گزار دیتے۔ لیکن کبھی کسی سے کچھ لینا گوارا نہ کرتے بلکہ جو کچھ بھی کہیں سے حاصل ہوتا اسے لوگوں پر خرچ کر دیتے آپ نے بہت عرصہ تک خود کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھا تاکہ لوگوں کو آپ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے اور جب لوگوں کو آپ کے بارے میں علم ہوا (۳) تو

۱۔ بحوالہ ”سیرالادلیا“ اردو ترجمہ غلام احمد بریاں مؤلفہ سید محمد مبارک کرمانی ”میر خورد“ ص ۲۵۷۔

۲۔ بحوالہ ”گلزار ابرار“ از محمد غوثی شطاری (اردو ترجمہ) ص ۱۰۳۔

۳۔ آپ کی کیفیت ظاہر ہونے کا واقعہ اس طرح ہے کہ ۳۵ھ میں ایک شخص سلطان نظام الدین

اولیاء کے پاس دہلی گیا اور عرض کیا کہ میرا گھر نہروالا (پن گجرات) (باقی بر صفحہ ثانی)

پھر کھل کر لوگوں کی خدمت بھی کی اور ان کی رہنمائی کو اپنا شعار بھی بنا لیا۔ آپ کے زہد و تقویٰ، درویشی، پارسائی اور بزرگی کی وجہ سے ہی نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ شہر دہلی شیخ حسام الدین کی حمایت میں ہے^(۱) جب آپ کے مرشد سلطان المشائخ کا وصال ہوا تو اس کے بعد سلطان محمد شاہ تغلق نے تمام مشائخ کو اکٹھا کیا اور دہلی سے "دیوگیر" کی طرف بھجوا دیا جہاں اس نے دولت آباد کے نام سے نیا شہر بسایا تھا^(۲) لیکن مولانا حسام الدین ملتانی گجرات تشریف لے گئے جہاں آپ نے آخری عمر تک قیام فرمایا۔ شیخ محمد اکرام کے مطابق

"شیخ حسام الدین کے وجود مسعود سے ملتان اور اچھ کے کئی اور بزرگ

یہاں تشریف آور ہوئے۔" (۳)

پن گجرات^(۴) میں آپ نے آٹھ ذیقعد ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔ اور آپ کا مزار پن گجرات^(۵)

(بقیہ گذشتہ صفحہ) میں ہے لڑکی کی شادی اتنی نزدیک آگئی ہے کہ مدت معلوم اس قدر مسافت طے کرنے کے واسطے کافی نہیں۔ آپ نے فرمایا شیخ حسام الدین نہروالا کے رہنے والے ہیں۔ ہر روز صبح نماز کے واسطے ہماری مسجد میں آتے ہیں اور پھر چاشت کے وقت اپنے مکان پر پہنچ جاتے ہیں تم ان کے ساتھ جانا تا کہ جلد گھر پہنچ جاؤ۔ دوسرے روز وعدہ پورا ہوا اور یہ بات کرامت حسامیہ کو ظاہر کرنے کا باعث ہوئی۔

(حوالے کے لئے دیکھئے "گلزار ابرار" ص ۱۰۳)

۱۔ بحوالہ "سیر الاولیاء" ص ۲۵۸۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "تاریخ فرشتہ" جلد اول، از محمد قاسم فرشتہ، مترجم عبدالحی

خواجہ، ص ۲۳۲، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

۳۔ بحوالہ "آب کوثر" ص ۳۳۱۔

۴۔ پن گجرات کا قدیم نام "نہروالا" ہے۔ بحوالہ گلزار ابرار، ص ۱۰۳۔

۵۔ بحوالہ "مرآت الاسرار" (جلد دوم) ص ۳۱۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

میں ہے۔ آپ کے خلفاء اور مشہور ساتھیوں میں شیخ حسن بدایونی شامل ہیں جو آپ کے شاگرد تھے۔

شیخ حسام الدین متانی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے بزرگ تھے جو سلطان محمد بن تغلق شاہ کے بعد تخت نشین ہوئے۔ بزم ملوکیہ کے مصنف بلبن کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

”اس (بلبن) کا عہد نہ صرف سیاسی حیثیت سے ممتاز تھا بلکہ اس زمانہ میں اتنے مشائخ و سادات جمع ہو گئے تھے کہ مؤرخوں نے ان کے وجود سے اس عہد کو ”خیر الاعصار“ لکھا ہے۔ حضرت بابا گنج شکر کے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) لیکن اخبار الاخیار، ص ۱۹۵ میں آپ کی تاریخ وفات ۵۳ھ درج ہے۔ تذکرہ اولیائے ہند و پاک، ص ۱۲۴ پر سن وفات ۲۵ھ دیا ہے۔

۶۔ ”نزہت الخواطر و بہجتہ المسامح والنواظر“ ص ۲۱۶ میں آپ کی جائے وفات بدایوں لکھی ہے اور فوائد الفواد کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے

”انہوں نے روایا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، وضو فرما رہے ہیں اور اس کا پانی شہر سے باہر نالیاں نالی سے گزر رہا ہے۔ جو نہی آنکھ کھلی بھاگ کر اس مقام پر آئے تو پانی کا اثر پایا۔ اور اپنے احباب سے وصیت کی کہ میرے انتقال پر مجھے اسی جگہ دفن کریں اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔“

لیکن یہ روایت درست نہیں ہے ”فوائد الفواد“ کی جلد چہارم کی انسٹھویں مجلس میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے بدایوں کی جس بزرگ شخصیت کے حوالے سے یہ قصہ بیان فرمایا ہے ان کا نام قاضی جمال متانی، (بحوالہ ”فوائد الفواد“ ص ۳۹۲، ترجمہ پروفیسر محمد سرور، مطبوعہ علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۷۳ء) مولانا حسام الدین متانی کا مزار گجرات میں ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے (۱) گلزار ابرار، ص ۱۰۳- (۲) مرآت الاسرار (جلد دوم) ص ۳۱۷- (۳) تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۷۸- (۴) سیرالاولیاء، ص ۲۶۳-

۱۔ بلبن کے عہد کو ”خیر الاعصار“، تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی، ص ۲۶-۲۷ کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

علاوہ خواجہ علی چشتی، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، ان کے صاحبزادے
 شیخ صدر الدین، شیخ بدر الدین غزنوی، شیخ ابوالموئذ، نظام الدین، شیخ
 جمال الدین ہانسوی، خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر، سیدی مولہ، شیخ
 حام الدین ملتانی، شیخ نجیب الدین سہروردی، شیخ ابوبکر حیدر طوسی
 وغیرہ کے انوار سے ہندوستان منور ہو گیا تھا۔^(۱)

۱۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت | سرزمینِ متان کے بزرگ صوفیاء

میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو بطور ایک روحانی پیشوا بلند پایہ سیاست دان،
 مصلح دین اور مذہبی دانشور، ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے تصوف کی آغوش
 میں آنکھ کھولی۔ کیونکہ ان کا خاندان کئی پشتوں سے مسلک تصوف کا پیروکار رہا۔ سیر و سیاحت
 تعلیم و تعلم، حکمرانوں سے روابط، دینی اور دنیاوی مشاغل میں انہماک نے ان کے علم و عمل
 کو ایک خاص گہرائی اور گیرائی عطا کی۔

سید جلال الدین حسین مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سید جلال الدین سرخ بخاری
 کے پوتے اور سید احمد کبیر کے بڑے فرزند تھے^(۲)۔ آپ ۱۲ شعبان المعظم ۶۰۷ھ (۱۲۰۸ء)

۱۔ بزمِ ملوکیہ، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن، ص ۲۲۸، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء۔
 ۲۔ کیفیت سلسلہ حضرات سہروردیہ حضرت مخدوم جہانیاں را اجازت این طریقہ از جد خود حضرت
 سید جلال الدین بخاری و ایشانرا از رکن الدین شاہ رکن عالم و ایشانرا از پدر خود شیخ صدر الدین و ایشانرا
 از پدر خود بہاء الدین بہاء الحق زکریا ملتانی و ایشانرا از شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی
 و ایشانرا از شیخ ضیاء الدین ابونجیب عبدالقادر سہروردی و ایشانرا از شیخ مشاد دینوری
 و ایشانرا از ابوالقاسم سید الطائف جنید بغدادی و ایشانرا از حال خود سری سقطی و ایشانرا از
 معروف کرخی را در تصوف و نسبت ست یکے با امام علی موسیٰ رضاتا بہ پیغمبر خدا
 صلی اللہ علیہ وسلم۔

(بجوالہ معمولات مظہریہ و محبوب العارفین، ص ۲۰، مطبع محمدی، لاہور ۱۳۱۰ھ)

کو اوج میں پیدا ہوتے " آپ کا نام آپ کے دادا سید جلال الدین سرخ بخاری کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن آپ عام طور پر اپنے لقب "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ اکرام نے اس کی وجہ بیان کی ہے کہ

"آپ کا بہت سا زمانہ سیر و سیاحت میں گزارا۔ اس لئے آپ کو

"مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کہتے ہیں۔" (۱)

حقیقت الاولیاء کے مصنف کے بقول

"آپ نے تمام روئے زمین کی سیاحت کی تھی۔" (۲)

۱۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو اے کیلئے دیکھئے۔ (۱)
سیر العارفین (اردو ترجمہ) ص ۲۲۴-۲۲۵) مخدوم جہانیاں جہاں گشت از ایوب قادری، ص ۸۸ (۳) خط پاک اوج از مسعود حسن شہاب، ص ۲۲۴-۲۲۵) تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۴۰۳-۴۰۴ (۵) گلزار ابرار (اردو ترجمہ) مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۲۱۵-۲۱۶) اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) ص ۳۰۰، لیکن "معمولات مظہریہ و محبوب العارفین" میں تاریخ پیدائش چہار شنبہ ذوالحجہ ۷۰۵ھ درج ہے (بحوالہ معمولات مظہریہ و محبوب العارفین، ص ۱۴۵، مطبوعہ مطبع محمدی لاہور، ۱۳۱۰ھ)

۲۔ بحوالہ "آب کوثر" ص ۲۷۸، لیکن تحفۃ الکرام، ص ۳۶۸ کے مطابق "انہیں مخدوم جہانیاں اس وجہ سے کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) عید کے دن انہوں نے شیخ بہاء الدین کے روضہ پر جا کر عیدی طلب کی (اس پر) آواز آئی کہ خدائے تعالیٰ نے تجھے مخدوم جہانیاں، بنایا ہے۔ یہی عیدی تیرے لئے کافی ہے؟ (پھر وہاں سے) جب وہ شیخ صدر الدین کے روضہ پر گئے تو وہاں بھی یہی سنائی دیا۔ (چنانچہ جب وہ) باہر آئے تو ہر شخص انہیں "مخدوم جہانیاں، کہنے لگا۔" سفینۃ الاولیاء (فارسی قلمی) ص ۱۷۹، میں بھی یہی واقعہ درج ہے، لکھا ہے۔ "روز عید بروضہ شیخ بہاء الدین و صدر الدین رفتہ التماس عیدی کر دند آواز آمد کہ حق تعالیٰ ترا مخدوم جہانیاں کردہ عید تو اس است چوں بروضہ شیخ رکن الدین رفتند از آنجا نیز ہمیں آواز آمد چوں بیرون آمدند ہمہ کس مخدوم جہانیاں میگفتند۔" مزید حوالے کیلئے ملاحظہ فرمائیے (۱) خط پاک اوج، ص ۲۲۸-۲۲۹) مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۹۰-۹۱ (۳) تاریخ سندھ، ص ۴۰۳-۴۰۴ (۴) سیر العارفین ص ۲۲۸-۲۲۹ (۵) تذکرہ اولیائے ہند و پاک، ص ۴۸۹۔

۳۔ بحوالہ "حقیقت الاولیاء" از مفتی غلام سرور لاہوری، ص ۱۵۶

مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی تعلیم و تربیت پران کے والد سید احمد کبیر نے
 خصوصی توجہ دی۔ جب آپ سات برس کے ہوئے تو وہ آپ کو ادراج کے مشہور
 عالم بزرگ شیخ جمال خنداں رو کی خدمت میں لے گئے۔ آپ بچپن سے ہی ذہین اور
 حاضر جواب تھے۔ جب آپ جمال خنداں رو کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے
 حاضرین کے سامنے کھجوریں پیش کیں۔ آپ کے حصے میں جو کھجوریں آئیں وہ آپ گٹھلیوں
 سمیت کھا گئے۔ یہ دیکھ کر شیخ جمال خنداں رو نے مسکرا کر سبب پوچھا تو آپ نے برحسب
 عرض کیا

”جو کھجوریں آپ کے دست مبارک سے عطا ہوئی ہوں، مجھے اچھا نہیں

معلوم ہوا کہ ان کی گٹھلیوں کو پھینک دوں۔“ (۱)

حضرت شیخ جمال خنداں ایک بچے کے منہ سے یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا
 ”تم اپنا، فقرا کا، اپنے خاندان کا نام روشن کر دو گے۔“ (۲)

چنانچہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے ابتدائی تعلیم شیخ جمال خنداں رو اور ادراج کے
 ایک اور بزرگ قاضی شیخ بہاء الدین سے حاصل کی۔ شیخ جمال ہدایہ، بزدوسی ہشراق الاوار
 مشکوات المعایز اور عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے ان سے حدیث
 کا درس بھی لیا تھا اور قاضی بہاء الدین نے آپ کو ہدایہ اور بزدوسی کا کچھ حصہ پڑھایا تھا
 اس کے متعلق مخدوم جہانیاں جہاں گشت فرماتے ہیں

”مولانا بہاء الدین قاضی اچھ دغاگو کے استاد تھے۔ میں ان کے

پاس پڑھتا تھا اور تواضع کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ تو سر

۱۔ بحوالہ ”خط پاک ادراج“ ص ۲۲۳۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے (الف) مخدوم

جہاں گشت، ص ۹۰۔ (ب) تذکرہ اولیائے پاک و ہند، ص ۴۸۷۔

۲۔ بحوالہ ”خط پاک ادراج“ ص ۲۲۳۔ مزید حوالے کے لئے

دیکھئے۔ (الف) مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۹۰۔ (ب) تذکرہ اولیائے

پاک و ہند، ص ۴۸۷۔

کو بلند کر کے سلام کر، نیچا کر کے سلام مت کر کیونکہ مکروہ ہے؟ ۱۱
 ابتدائی تعلیم مکمل کی تھی کہ قاضی بہار الدین وفات پا گئے اور آپ مزید تعلیم کے لئے
 ملتان تشریف لے آئے۔ ملتان میں آپ نے ایک سال قیام فرمایا۔ اس دوران میں
 آپ نے شاہ رکن عالم ملتان سے تعلیم حاصل کی جنہوں نے آپ کی مزید تربیت کیلئے
 مولانا موسیٰ نبیرہ، حضرت زکریا ملتان اور ان کے چچا زاد بھائی مولانا مجد الدین سے درس
 دلوایا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے الدر المنظوم میں اپنے ایک اور استاد نور الدین
 کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ نے ان سے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کر لی تو سلطان
 محمد تغلق نے ان کو شیخ الاسلام مقرر کر دیا۔ (۲)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے تحصیل علم کی خاطر کئی ممالک کا سفر اختیار کیا۔
 اس دوران میں کتنے ہی علماء سے انہوں نے فیض حاصل کیا اور مختلف نوعیت کے
 ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری کے مطابق آپ کے سفر کا
 آغاز شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہوا جو کہ محمد تغلق کا زمانہ تھا
 اور آپ کے مرشد شیخ رکن الدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ سن ۷۳۵ھ تھا۔ جبکہ

۱۔ بحوالہ " الدر المنظوم " ص ۳۶۰۔ جامع العلوم از مولانا علامہ الدین عصلی حسین، اردو ترجمہ الدر المنظوم

فی ترجمہ مفوظ المخدوم مطبع الفارسی دہلی (۱۳۰۹ھ) ص ۳۶۰۔

۲۔ بحوالہ " الدر المنظوم " ص ۲۲۵، ص ۲۵۵۔

سلطان فیروز شاہ تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام مقرر کیا اور چالیس خانقاہیں آپ کی تحویل
 میں دیں۔ اور سیوستان اور اس کے اردگرد کا علاقہ آپ کی تحویل میں دیا۔ اخبار الاخبار کے مطابق سیوستان
 اور اس کے اردگرد کا علاقہ آپ کی جاگیر قرار دیا گیا۔ وہاں آپ نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جس کا نام
 " خانقاہ محمدی " رکھا۔ پھر چند دنوں کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجاز چلے گئے۔ (بحوالہ " اخبار الاخبار ")
 ص ۲۰۸ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ (الف) مخدوم جہانیاں جہاں گشت ، ص ۱۱۱۔
 (ب) تحفت الکرام ، ص ۳۶۹۔ (ج) خطہ پاک اوج ، ص ۲۲۶۔ (د) تاریخ سندھ (جلد اول)
 از اعجاز الحق قدوسی ، ص ۲۰۳۔

سیاحت سے واپسی ۵۱، ۵۲ سے کچھ پہلے ہوئی۔ آپ نے کسی ممالک کا سفر کیا جس کی تفصیل قاضی جاوید اس طرح دیتے ہیں

”مذوم جہانیاں نے طویل سیاحت کی تھی۔ غالباً اس معاملے میں پنجاب کا کوئی دوسرا صوفی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ محتاط طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پنجاب سے نکل کر ہند کے بعض حصوں، سعودی عرب، یمن، لبنان، شام، ایران، خراسان، اور سوویت یونین کے مسلم علاقوں کی سیاحت کی تھی۔ دوران سفر انہوں نے بے شمار ولیوں، عالموں اور دانشوروں سے ملاقات کی۔ بہت سے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت سے

۱۔ بحوالہ ”مذوم جہانیاں جہاں گشت“ از محمد ایوب قادری، ص ۱۱۱۔ سیر و سیاحت کی وجہ اس طرح بتائی جاتی ہے کہ شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ایک رات آپ نے خواب میں شیخ رکن الدین ابوالفتح کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں کہ توج کو چلا جاوے غرق ہو جائے گا۔ صبح کو شیخ کے امام نے بھی کہا کہ شیخ کا حکم ہے جلد روانہ ہو جاؤ۔ تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے حضرت مذوم والد سے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گیا۔ (الدر المنظوم، ص ۶۰۹) — مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) خطہ پاک اوج، ص ۷۲، (ب) مذوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۱۱۲۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سفر کے دوران جدہ شریف پہنچے۔ دیکھا کہ لوگ کسی کا جنازہ اٹھائے جا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ حضرت بدر الدین مینی کا جنازہ ہے۔ پتہ چلا کہ وہ حج سے واپس آتے تھے بھر کے وقت قرآن شریف پڑھا اور اس کے فوراً بعد فوت ہو گئے۔ آپ نے (جہانیاں جہاں گشت) فرمایا دفن نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی مرے نہ ہوں۔ انہوں نے واپس جا کر جنازہ مسجد میں رکھ دیا۔ آپ نے لوگوں کو باہر نکال کر مسجد کا دروازہ بند کر دیا اور نماز و نوافل پڑھنے کے بعد قرآن خوانی شروع کر دی۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے

يَخْرُجُ اِلَيْهِ مِنَ الْمَيِّتِ وَيَخْرُجُ الْمَيِّتُ مِنَ الْحَيِّ

تو شیخ بدر الدین مینی میں حرکت پیدا ہوئی اور اٹھ بیٹھے (بحوالہ صدقیت الاسرار فی اخبار الابرار، (فارسی) ص ۱۹۰۔ مزید حوالے کے لئے دیکھئے ”تذکرہ اولیائے ہند و پاک“ ص ۲۸۹۔ ۲۹۰۔

لوگوں کو بہت کچھ سکھایا۔“
شیخ محمد اکرام کے مطابق

”آپ (مخدوم جہانیاں جہاں گشت) نے شمالی ہندوستان بہار و بنگال کے علاوہ عرب، مصر، شام، عراقین، بلخ و بخارا کی سیر کی اور چھ حج کئے۔ متعدد بزرگوں سے فیض پایا۔“ (۲)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے تقریباً دس بارہ برس سیاحت کی۔ اس دوران میں سات سال مکہ معظمہ میں رہے اور دو سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ سیر العارفین کے مصنف آپ کے سفر کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں

”حضرت سلطان المشائخ جلال الدین مخدوم جہانیاں نے تین سو سے زیادہ اہل کمال سے ملاقات کی اور ان سے فیض کلی حاصل کیا۔ دنیا کی ہر سمت میں سفر کیا اور اس حقیر (جمالی) نے بھی مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، بغداد اور بہت سے دوسرے مقامات پر ان (مخدوم جہانیاں) کے متبرک حجرے پائے اور وہاں نماز دو گانہ ادا کی ہے۔“ (۳)

سفر میں علوم ظاہری کی تربیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے سلوک کی منزلیں بھی طے کیں۔ آپ نے کئی علماء کرام سے خلافت حاصل کی۔ اخبار الاخبار کے مطابق آپ چودہ خانوادوں کے خلیفہ تھے (۴)۔ جبکہ مصنف ”گلزار ابرار“ سید شرف الدین مشہدی کے رسالے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

”مخدوم کو کچھ اد پر چار سو چالیس اصحاب سے خلافت ملی۔ منجملہ ان کے جس قدر بیان صحت کو پہنچا ہے اور شجرہ میں لکھا ہوا دیکھا ہے یادداشت

۱- بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۱۲۰

۲- بحوالہ ”آب کوثر“ ص ۲۷۸

۳- بحوالہ ”سیر العارفین“ ص ۲۲۶

۴- بحوالہ ”اخبار الاخبار“ ص ۳۰۸

میں لکھ لیا ہے؟ (۱)

مخدوم جہانیاں نے سب سے پہلے اپنے والد سید کبیر بخاری سے خلافت حاصل کی پھر چچا سید محمد بخاری سے اس کے بعد ملتان تشریف لے آئے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دادا اور والد کی طرح سہروردیہ سلسلے سے منسلک ہوئے

" مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے شیخ رکن الدین ابو الفتح بن شیخ

صدر الدین بن شیخ بہاء الدین کی خدمت میں تربیت حاصل کی اور انہیں

کے ہاتھ سے سہروردیہ پیروں کا خرقہ پہنا۔ (۲)

شیخ رکن الدین سے آپ کو اس درجہ عقیدت تھی کہ خواب میں ہی ان کے کہنے پر آپ نے شیخ الاسلام کا لقب اور سیوستان کی جاگیر چھوڑ چھاڑ کر حجاز کا رخ کیا۔ وہاں آپ نے مکہ میں شیخ عبداللہ یا فعی سے خلافت حاصل کی اور سات سال اُن کے ساتھ گزارے۔ پھر دو سال شیخ عبداللہ مطری کی صحبت میں گزارے اور وہاں سے خلافت حاصل کی۔ مکہ میں آپ نے شیخ عبداللہ یا فعی سے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے بارے میں سنا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے سفر سے واپسی پر ان سے چشتیہ سلسلے کا خرقہ حاصل کیا۔

سفینۃ الادلیا (فارسی) کے مطابق

" از مکہ معظمہ کہ باز با ہندوستان آمدند در دہلی با حضرت شیخ نصیر الدین

چراغ دہلی ملاقات نمودہ خرقہ متبرکہ چشت را از ایشان پوشیدہ اند۔ (۳)

۱- بحوالہ "گلزار ابرار" (اُردو ترجمہ) ص ۱۱۳۔

۲- بحوالہ "مرات الاسرار" (جلد دوم) ص ۴۱۱۔

۳- (۱) سفینۃ الادلیا (فارسی) ص ۱۱۴۔ (۲) سیر العارفین، ص ۲۳۶۔ میں لکھا ہے کہ

" ایک دن شیخ عبداللہ یا فعی نے بیت اللہ میں کہا کہ اگرچہ اس زمانے میں دہلی میں جو درویش

تھے الکا انتقال ہو گیا لیکن ان کا اثر اور ان کی برکتیں حضرت شیخ نصیر الدین میں ہیں اور وہ اس

زمانے میں اس شہر (دہلی) کے چراغ ہیں کہ مشائخ کے طریقوں (باقی بر صفحہ ثانی)

”سفینت الاولیاء“ (قلمی نسخہ) ص ۱۷۹، مرقومہ ۱۲۸۰ھ میں بھی یہی عبارت درج ہے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سیر و سیاحت کے تجربات حاصل کر کے واپس آئے تو ان تجربات سے لوگوں کو فیض یاب کرنے کے لئے اُدُج میں ایک درسگاہ مدرسہ جلالی کے نام سے قائم کی۔ اس مدرسے میں مختلف علوم اسلامی کی تدریس کی جاتی تھی۔ الدر المنظوم کے مطابق

”حضرت مخدوم کی مجلس مبارک میں علوم و معارف کے رموز و غوامض حل فرمائے جاتے تھے۔ درس و تدریس کا باقاعدہ انتظام تھا۔ دُور و نزدیک سے طلباء مدرسہ جلالی میں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ نامور عالم و واعظ مطالب قرآن و احادیث حل کرتے تھے، مریدین و معتقدین بالالزام تفسیر و حدیث اور کتب تصوف کا درس لیتے تھے۔ خاص مریدوں کے لئے ہجرت و زعموماً فخر کے بعد حضرت کا درس شروع ہوتا تھا۔ حضرت مخدوم کے یہاں قرآن حکیم، تفسیر مدارک، صحاح ستہ، مشارق الانوار، شرح کبیر، چہلم اسم، مشکوٰۃ المصابیح، رسالہ مکیہ، قصیدہ لامیہ، کتاب منفق، عقائد نسفی، شرح نودنہ نام، فقہ اکبر، عوارف المعارف اور ادیشخ شہاب الدین سہروردی وغیرہ کا باقاعدہ درس ہوتا تھا۔ حضرت مخدوم صرف و نحو اور لغت کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے تھے تاکہ عربی زبان کی تحصیل آسان ہو اور اس میں اچھی طرح جہارت و قدرت حاصل ہو جائے“ (۱)

(بقیہ گذشتہ صفحہ) کو اپنے وجود سے روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اسی وقت حضرت سید (جلال الدین) نے نیت کی کہ اگر سفر سے واپس ہو تو پہلے شہر دہلی میں آؤں گا اور حضرت شیخ نصیر الدین (چراغ دہلی) سے ملوں گا۔

۱۔ بحوالہ ”مخدوم جہانیاں جہاں گشت“ از محمد الوب قادری، ص ۱۹۱ تا ۱۹۳۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت درس و تدریس کے لئے زیادہ تر عربی و فارسی زبان اختیار کرتے تھے لیکن ضرورت اور موقع محل کے مطابق دیسی زبانیں استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے ملفوظات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملتانی، پنجابی، سندھی اور ہندی زبانوں میں نہ صرف گفتگو فرماتے تھے بلکہ تعلیم بھی دیتے تھے۔ الدر المنظوم کے مطابق ایک مرتبہ ایک سندھی بیعت کے لئے حاضر ہوا تو آپ نے اُسے سندھی میں تلقین فرمائی۔ اسی طرح ایک لڑکے کو ہندی (اُردو زبان) زبان میں اور ایک شخص کو ملتانی میں تلقین فرمائی۔^(۱) الدر المنظوم (اُردو ترجمہ) میں لکھا ہے کہ

”دہلی کے قیام کے زمانہ میں ایک موقع پر فیروز شاہ تغلق سے شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتوں، اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور خادموں کے لئے وظائف مقرر کرائے اور اسی موقع پر بادشاہ کے حضور میں ایک چھوٹے بندو بچہ کو بھی پیش کیا۔ سلطان نے کہا کہ یہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا حضرت مخدوم نے فرمایا کہ جس زمانہ میں یہ بچہ دعا گو کے پاس آیا تھا تو دعا کی گئی تھی کہ خدائے تعالیٰ اسے اسلام سے مشرف فرمائے حضرت مخدوم کی یہ تمام گفتگو سلطان فیروز شاہ تغلق سے ہندی (اُردو) میں ہوئی۔“^(۲)

جمعات شاہی (ملفوظات شاہ عالم فارسی ۱۰۲۵ھ / ۱۶۳۵ء) میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا ایک قول محفوظ چلا آتا ہے جو آپ نے اپنے چھوٹے بھائی راجو قتال کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ

”اساں خوبے تساں راجے؟“^(۳)

۱۔ بحوالہ ”الدر المنظوم“ فی ترجمہ ملفوظ المخدوم بعنوان جامع العلوم از سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت، مرتبہ مولانا علاء الدین دہلوی، اُردو ترجمہ از مولوی ذوالفقار احمد، ص ۲۱۶، جلد دوم، مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء)

۲۔ ایضاً — ص ۸۱۱ —

۳۔ بحوالہ مضمون ”اُردو زبان کا اصلی مولد۔ سندھ“ از پیر حسام الدین راشدی، مطبوعہ رسالہ

”اُردو“ ص ۱۴۔ اشاعت ۱۹۵۱ء (انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانی نے پروفیسر حسن عسکری (پٹنہ) کے ایک مضمون کے حوالے سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ہندی قول کے سلسلے میں ایک واقعہ درج کیا ہے کہ کسی شخص نے آپ سے گزارش کی کہ جو اورداد اعمال آپ ادا کرتے ہیں وہی وہ بھی ادا کرتا ہے لیکن اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس پر حضرت نے فرمایا

”کھانڈا ہے پھانڈا کہاں“

یعنی خندق موجود ہے۔ اس سے نکلنے کا ذریعہ کہاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سچے عرفان کی کمی ہے۔ مسعود حسن شہاب نے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے ایک قلمی رسالے ”مناقب برہان“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنی سیاحت گجرات کے دوران جب بٹوا پہنچے تو آپ نے اسی جگہ قیام فرمایا جہاں آج کل حضرت قطب العالم کا مزار ہے۔ آپ نے اس جگہ فرمایا

”ایٹھاں اساڈے ہاڈاں دی خوشبو ہے؟“

اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے ابتدائی دور میں اس قسم کے جملے اور فقرے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان کی ابتدائی نشوونما کے سلسلے میں دوسرے صوفیاء کے ساتھ جہانیاں جہاں گشت کا نام گرامی بھی بڑے تسلسل کے ساتھ آتا ہے۔

حضرت مخدوم نے اپنی سیاحت کے دوران کسی نادر کتب بھی جمع کی تھیں جن کو اپنے ساتھ اُدوچ لائے اور یہاں ایک شاندار کتب خانہ قائم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ عوارف المعارف کا وہ نسخہ بھی اس کتب خانے میں موجود تھا جو خود صاحب کتاب شیخ شہاب الدین سہروردی کے درس میں رہا تھا۔ شیخ قطب الدین دمشقی نے رسالہ مکیہ مکمل کیا تو اس کی ایک نقل مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو بھجوائی تھی۔ عبدالرحمن طناری کے پاس ایک نادر کتاب ”اسرار الدعوات“ تھی۔ اس کی ایک نقل بھی حضرت مخدوم نے حاصل کی۔ ایک فقہ و محدث نے سات جلدوں میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھی تھی

۱۔ بحوالہ ”اردو نثر کا آغاز و ارتقاء“ ص ۴۰ مطبوعہ مجلس تحقیقات اُردو، حیدرآباد دکن۔

۲۔ بحوالہ ”خط پاک ادوچ“ ص ۳۷۔

اس فاضل نے یہ ساتوں جلدیں حضرت مخدوم کو پیش کر دیں جو اس کتب خانے میں ہیں^(۱) حضرت جہانیاں جہاں گشت نے اگرچہ خود تو کوئی کتاب نہیں لکھی تاہم ان کے شاگردوں نے ان کے صوفیانہ تجربات، فقہی مسائل، حدیث، تفسیر، اخلاقیات اور رشد و ہدایت سے متعلق ارشادات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ ان ملفوظات کے مجموعوں میں جامع العلوم، سراج الہدایہ، مقررنامہ، خزانہ جلالی، جواہر جلالی، منظر جلالی، اربعین صوفیاء، مناقب مخدوم جہانیاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جامع العلوم کے مرتب ابو عبد اللہ علاء الدین علی بن سعد بن اشرف دہلوی ہیں جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے قیام دہلی کے دوران ان کے پاس مقیم رہے اور ۲۸ ربیع الآخر ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) سے ۱۷ محرم ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) تک ملفوظات جمع کرتے رہے۔ اس کتاب میں نہ صرف ہم عصر شخصیات اور واقعات کا ذکر موجود ہے بلکہ تصوف کی نہایت بلند پایہ کتابوں کے بکثرت حوالے بھی ملتے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "الدر المنظوم" فی ترجمہ ملفوظ المخدوم کے نام سے دو جلدوں میں ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں مطبع انصاری دہلی سے چھپا۔ "سراج الہدایہ" احمد برنی کی مرتب کردہ ہے۔ ملفوظات کا یہ مجموعہ نو ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں تصوف اور مذہب کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ مقررنامہ، حضرت جہانیاں جہاں گشت کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ بیالیس مکتوبات میں حضرت مخدوم نے تصوف کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ یہ مکتوبات تاج الدین بن معین سیاہ پوش کے بعض استفسارات کے جواب میں تحریر کئے گئے تھے۔ خزانہ جلالی حضرت جہانیاں کے مرید احمد المدعو بہ بہار بن حسن بن محمود بن سلیمان تلمنی نے مرتب کیا۔ یہ کتاب بھی رشد و ہدایت اور علم و معرفت کا انمول خزانہ ہے۔ جواہر جلالی کے مرتب فضل اللہ بن ضیاء العباسی تھے جو حضرت کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انہوں نے یہ کتاب ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں مرتب کی۔ منظر جلالی کے مرتب کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس کتاب میں توحید، طہارت، فضائل اسلام، اقامت وغیرہ

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (الف) جہانیاں جہاں گشت، از محمد ایوب قادری،

ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ (ب) پنجاب کے صوفی دانشور، ص ۱۲۲۔

کے بارے میں تشریحات درج ہیں۔ "اربعین صوفیاء" حضرت مخدوم کے درس میں رہتی تھی۔ "مناقب مخدوم جہانیاں" حضرت مخدوم کے ملفوظات کا نادر مجموعہ ہے جس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی لائبریری میں ہے۔ حضرت مخدوم کے ساتھ قرآن کریم کا ایک فارسی ترجمہ اور کئی سفرنامے بھی منسوب کئے جاتے ہیں^(۱)۔

موسیقی کے بارے میں حضرت جہانیاں جہاں گشت کا رویہ بین بین تھا۔ سماع کی اجازت مشروط انداز میں دیتے تھے۔ یعنی ایک دفعہ چند قوالوں نے اشعار پڑھے تو سنتے رہے۔ لیکن جب تالیاں بجانی چاہیں تو منع فرما دیا۔ الدر المنظوم کے مطابق مزامیر کا بجانا اور اس کا سننا گناہ ہے اور طبل کا بجانا بھی گناہ ہے۔ مگر لڑائی اور قافلہ میں اجازت ہے۔ اسی طرح دف کا بجانا بھی روا نہیں ہے۔ مگر نکاح کے وقت دف بجانا درست ہے۔ البتہ قضاۃ، ائمہ، اور صاحب اختیار حضرات کے حق میں یہ بھی منع ہے^(۲)۔
قاضی جاوید کے مطابق

"موسیقی کے بارے میں ان کا رویہ لچک آمیز تھا۔ وہ سر ملی آواز سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ لیکن آلات موسیقی کے استعمال کو ناجائز تصور کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ رویہ ان کی شخصیت میں چشبیہ اور سہروردیہ روایات کے امتزاج کا مرہون منت تھا؟^(۳)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں ۱۸۵۷ء تا ۱۳۸۴ء میں وفات پائی۔ لوح مزار پر یہ شعر درج ہے جس سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔
تاریخ گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ تاریخ بود ہفت صد ہشتاد پنج سال

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" از محمد ایوب قادری،

ص ۲۳۷ تا ۲۶۳ (ب) "خطہ پاک اربع" از مسعود حسن شہاب، ص ۳۳۹ تا ۳۴۳۔

۲۔ بحوالہ "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" ص ۱۶۸ - ۱۶۹۔

۳۔ بحوالہ "پنجاب کے صوفی دانشور" ص ۱۸۸۔

۴۔ آپ کی تاریخ پیدائش کی طرح تاریخ وفات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱۵۔ سید صدر الدین راجو قتال | سید جلال الدین سرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی سید صدر الدین راجو قتال کا شمار بھی اُدوج کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جن سے ایک عالم فیض یاب ہوا۔ آپ ۲۰ شعبان ۷۶۰ھ (۱۳۵۹ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور چند سالوں کے اندر ان تمام علوم کو حاصل کر لیا جو ایک صوفی بزرگ کے لئے ضروری تھے۔ سید صدر الدین راجو قتال نے اپنے والد سید احمد کبیر اور بڑے بھائی مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے خلافت پائی اور ان کی وفات کے بعد خلافت آپ کے حصے میں آئی۔ آپ نے اپنے بھائی مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی صحبت میں رہ کر بھی بہت کچھ سیکھا۔ راجو قتال علم و عمل اور شریعت و طریقت میں بے مثال تھے۔ آپ کے متعلق آپ کے بڑے بھائی

” مخدوم جہانیاں اکثر و بیشتر یوں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مخلوق کی خدمت میں مشغول رکھا ہے اور شیخ راجو کو اپنی ذات میں مصروف کر دیا ہے۔ چنانچہ سید صدر الدین پر ہمیشہ استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور لوگوں سے بالکل علیحدہ اور جدا رہتے تھے۔“ (۲)

۱۔ محمد ایوب قادری نے ”مخدوم جہانیاں جہاں گشت“ ص ۲۳۱ پر ایک قلمی نسخے ”مناقب الاولیاء“ ص ۱۳ کے حوالے سے یہ تاریخ پیدا نش بتائی ہے جبکہ مسعود حسن شہاب نے ”خطہ پاک ادوج“ ص ۲۳۸ پر ۲۶ شعبان ۷۳۰ھ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار، ص ۳۳۵ پر ۷۲۱ھ بتائی ہے ”شاہ رکن عالم ملتانی“ از نور احمد خاں فریدی، ص ۲۲۵ پر ۶۲۰ھ درج ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ تاریخ وفات ۸۲۷ھ درج ہے۔ ظاہر ہے حضرت کی عمر ۱۶ سال تو نہیں تھی۔

۲۔ بحوالہ ”اخبار الاخیار“ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (اُردو ترجمہ) ص ۳۳۵ — مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) خطہ پاک ادوج، ص ۳۳۸ (ب) مرات الاسرار (جلد دوم) ص ۵۳۲ (ج) صدیقت الاولیاء، ص ۷۸، نوکثور۔

سید صدرالدین کے نام کے ساتھ "قتال" لکھنے کی وجہ مختلف لوگ مختلف بتاتے ہیں۔ شیخ عبدالرحمن چشتی نے مولانا سید محمد ذوقی شاہ جو آپ کی اولاد میں سے ہیں، کے حوالے سے کہا ہے کہ

"آپ قتال اس لئے کہلاتے ہیں کہ مریدین سے نہایت سخت مجاہدہ

لیتے تھے" (۱)

جبکہ شیخ محمد اکرام کے مطابق

"انہوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے تھے۔ اس لئے انہیں قتال

یعنی قتالِ نفس کہتے ہیں" (۲)

مسعود حسن شہاب کے مطابق

"چونکہ طبیعت میں جلال کا عنصر غالب تھا۔ اس لئے قتال کے لقب سے

مشہور ہوئے" (۳)

قتال کہلوانے کی وجہ کچھ بھی ہو یہ تو آپ کے عمل سے ظاہر ہے کہ آپ ایسے بزرگ تھے جو بڑے رعب و جلال والے تھے۔ سید راہو قتال نے دین اسلام کی اشاعت کے لئے بہت کام کیا اور کئی لوگوں کو مسلمان کیا۔ اشاعت اسلام کا یہ کام صرف اوج اور ملتان تک محدود نہیں رہا بلکہ گجرات تک بھی پھیلا ہوا ہے۔ آپ نہ صرف ان لوگوں کو مسلمان کرتے بلکہ ان کی ایسی تربیت کرتے کہ وہ آپ کے مشن کو آگے لے جاتے تھے۔

۱۔ محمد ایوب قادری، مناقب الولاہیت کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ لفظ "راہن قتال" ہے قتال نہیں ہے۔ اور سریانی زبان کا لفظ ہے جس میں قتال کے معنی بزرگ اور راہن کے معنی ہیبت ناک ہے؛ (بحوالہ "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" ص ۲۳۲)

۲۔ بحوالہ "مرات الاسرار" (جلد دوم) از شیخ عبدالرحمن چشتی، مترجم کپتان واحد بخش سیال،

ص ۵۳۵، صوفی فاؤنڈیشن، لاہور۔

۳۔ بحوالہ "آب کوثر" ص ۲۸۲

۴۔ بحوالہ "خطہ پاک اوج" ص ۲۳۸۔

مولانا نور احمد خان فریدی کے مطابق

” حضرت کے دستِ حق پرست پر تین لاکھ چالیس ہزار تین سو اسی شخص

نے بیعت کی تھی۔“ (۱)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں

” آپ کا اصل کام اُچھ میں اشاعتِ اسلام اور گجرات وغیرہ کے صاحب

ہمت بزرگوں کی تربیت ہے۔ جنہیں آپ نے علومِ باطنی سے مالا مال کر کے

گجرات کے قدیمی دارالخلافہ میں اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجا؟ (۲)

محمد ایوب قادری نے آپ سے منسوب اوراد کا ایک مجموعہ ”مجموعہ تکبیرات راجو قتال“ کا

حوالہ دیا ہے جو نمبر ۸۸۴، رضالائبریری رام پور میں محفوظ ہے (۳)۔ اس کے علاوہ آپ

مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے شیخ کبیر الدین اسماعیل کو ”عوارف“ پڑھایا کرتے تھے

آپ کے چار فرزند تھے جن میں سے ایک ابو اسحاق نے بچپن ہی سے تبلیغِ اسلام کا کام

شروع کر دیا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کی بجائے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے سید

ناصر الدین محمود کو خلیفہ اور سجادہ نشین مقرر کیا جن کا مزار بھی اوچھ میں ہے۔

یوں تو بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی لیکن جن خاص لوگوں نے آپ کے

مشن کو آگے بڑھایا اور آپ کے نامور خلفاء ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ شیخ کبیر الدین

اسماعیل، برہان الدین قطب عالم گجراتی، مخدوم فضل الدین، حاجی سید عبدالوہاب، شیخ

علاء الدین، شاہ داؤد قریشی، شیخ اسماعیل قریشی، مخدوم جہاں شاہ اور شیخ سارنگ وغیرہ

آپ نے ۱۶ جمادی الآخر ۸۲۷ھ (۱۴۲۳ء) کو انتقال فرمایا اور اودھ شریف میں دفن

۱- بحوالہ ”شاہ رکن عالم ملتان“ ص ۴۲۸۔

۲- بحوالہ ”آب کوثر“ ص ۲۸۶۔

۳- بحوالہ ”مخدوم جہانیاں جہاں گشت“ از محمد ایوب قادری، ص ۲۳۶۔

۴- حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (الف) خط پاک اودھ، ص ۲۳۸ (ب) مرات الاسرار،

جلد دوم، ص ۵۳۵ (ج) آب کوثر، ص ۲۸۶ (د) مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص ۲۳۵۔

ہوتے جہاں آپ کا مقبرہ موجود ہے۔

۱۶۔ شیخ حسام الدین متقی ملتانی | شیخ حسام الدین ملتانی کا تعلق حضرت

شاہ عالم محمد بن برہان الدین قطب العالم گجراتی کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپ ۸۷۸ھ میں
ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ بڑے عالم، زاہد، پرہیزگار اور باعمل شخص تھے۔ مولانا
نور احمد خان فریدی کے مطابق۔

”آپ صحیح معنوں میں عالم ربانی زاہد اور متقی تھے۔“ (۱)

آپ کی پرہیزگاری اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ساری زندگی مشتبہ مال کو ہاتھ نہیں لگایا۔
حدیقتہ الاسرار فی اخبار الابرار میں لکھا ہے کہ

حضرت حسام الدین متقی ملتانی نے ساری زندگی حلال کی روزی کھائی۔ ان

کا قول تھا کہ جب تک خوراک حلال نہ ہو کسی کام کی نہیں؟ (۲)

آپ کی گزر بسر کا ذریعہ خراجی زمین تھی جس میں آپ کاشت کرتے اور خراج ادا کیا کرتے
لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے ان کا خراجی ہونا مشتبہ ہو گیا تو آپ نے اس زمین
کی پیداوار کو کھانا ترک کر دیا۔ اسی طرح جب بھی اپنے پیران طریقت کی زیارت کو جاتے
تو شاہ رکن عالم کے مزار کے سائے میں کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کے خیال
میں مزار کی تعمیر میں بیت المال کا روپیہ لگا ہوا تھا۔ (۳)

۱۔ ”اخبار الاخیار“ ص ۵۰، مترجمین مولانا سبحان محمود صاحب استاد الحدیث دارالعلوم

مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی۔

۲۔ بحوالہ ”شاہ رکن عالم ملتانی“ ص ۵۹۹۔

۳۔ اصل عبارت یوں ہے۔ ”میفرمودند ناقوت حلال نباشد ہیج بندگی بکار نیاید“ بحوالہ

حدیقتہ الاسرار فی اخبار الابرار، ص ۱۱۔ (اس کتاب کا ٹائٹیل صفحہ غائب ہے اس لئے مطبع اور ایڈیشن

کا پتہ نہیں لگ سکا۔ یہ کتاب جہازی سائز میں ہے اور جناب ڈاکٹر جہر عبدالحی کی ذاتی لائبریری

سے حاصل کی گئی ہے، (باقی بر صفحہ ثانی)

میر عبد القادر سرورسی نے حدیقت الاولیاء میں آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ
 "شیخ سفر میں جس گاؤں کے قریب سے گزرتے پہلے باہر ہی سے وہاں
 کے لوگوں کے طور طریق دریافت کر لیا کرتے۔ اگر وہ زیور شریعت سے آراستہ
 ہوتے تب اس گاؤں کے اندر داخل ہوتے۔ ورنہ پھر باہر ہی باہر چلے جایا
 کرتے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت اور طالبوں کو فیض پہنچانے میں صرف
 ہوا کرتا" (۱)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مطابق

"عالم وزاہد ومتقی تھے۔ فاتقواللہ ما استطعتم کے پایہ سے

فاتقواللہ حق تقاتہ کے مرتبہ میں پہنچے ہوئے تھے؟" (۲)

آپ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی پابندی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین
 فرماتے تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے شیخ بایزید بھی پرمہیزگاری اور تقویٰ میں ہمیشہ
 تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر روتے رہتے تھے۔
 شیخ حسام الدین متقی ملتانی کے تلامذہ میں شیخ علی متقی بہت مشہور ہیں۔ جنہوں
 نے ابتدائی تعلیم اور تقویٰ کی تربیت آپ سے حاصل کی۔ بعد ازاں ہندوستان چھوڑ کر

(بقیہ گذشتہ صفحہ) ۲۔ مولانا نور احمد خان فریدی نے اس کی تاویل یوں پیش کی ہے: "قطب الاقطاب
 شاہ رکن عالم قدس سرہ کا مقبرہ سلطان غیاث الدین تغلق نے تعمیر کرایا تھا۔ اس پر اس کا خالص حلال
 سرمایہ صرف ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شیخ کو ان عمارتوں کے بارے میں غلط اطلاع دی ہوگی
 اور چونکہ وہ ان امور میں بے حد احتیاط برتتے تھے اس لئے سائے سے بھی استفادہ نہ کیا۔"
 (بحوالہ "شاہ رکن عالم ملتانی" ص ۶۰۲)

۱۔ بحوالہ "تحفت الکریم" ص ۳۶۳۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے شاہ رکن عالم ص ۵۹۹-۶۰۰

۲۔ بحوالہ "انوار صوفیہ" یعنی اخبار الاخبار فی اسرار الابرار، مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی

مترجم محمد لطیف ملک شعاع ادب، لاہور، بار سوم، ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۴۱۵۔

مکہ معظمہ میں رہائش پذیر ہوئے اور دسویں صدی ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ شیخ علی متقی ہی سے آپ کی تعلیمات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ کیونکہ شیخ علی متقی کے فیض یافتگان میں ایسی ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کا شمار بڑے بڑے علماء اور محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کا مختصراً تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ان میں پہلی شخصیت تو مولانا محمد طاہر پٹنی کی ہے جو اپنے عہد کی عظیم علمی و ادبی شخصیت تھے۔ آپ نے لغت حدیث پر ایک مبسوط اور جامع کتاب "مجمع لاجار الانوار" کے نام سے لکھی جو فن لغت اور حدیث میں سند کا درجہ رکھتی ہے اور اسے صحاح ستہ کی ادبی شرح بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اسماء الرجال میں النخعی اور موضوع حدیثوں کے سلسلے میں "تذکرۃ الموضوعات" بھی لکھی ہیں۔ شیخ حسام الدین متقی کے خلفاء میں شیخ میلون کا نام بھی آتا ہے۔ جن کی خلافت مخدوم چمن، مخدوم برہان، مخدوم طیب سے ہوتی ہوئی شیخ عبدالکریم سہروردی تک پہنچی۔ شیخ عبدالکریم کے دو خلفاء بہت مشہور ہیں۔ ایک حبیب ملتانی جن سے ایک فرقہ حبیب شاہیہ مشہور ہوا۔ ان کا مزار شاہ شمس سہروردی کے مقبرہ کے قریب ہے۔ دوسرے خلیفہ مولانا محمد اسماعیل جو میاں وڈا کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے لاہور میں حفظ قرآن کے لئے ایک مدرسہ "درس میاں وڈا" کے نام سے کھولا جو آج تک قائم ہے۔ شیخ حسام الدین متقی ملتانی نے ۹۶۱ھ میں وفات پائی اور ضلع ملتان کے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن گیلے والہ میں ان کا مزار موجود ہے۔ مولانا نور احمد خان فریدی لکھتے ہیں

"اپنے عہد کا یہ ابوذر غفاری گیلے والا اور روانی کے درمیان ایک گمنام گوشے میں پڑا سوتا ہے۔ گرد و پیش کے لوگ آپ کا مقام تو بجائے خود رہا صحیح نام سے بھی واقف نہیں۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ پیرسما دین

۱۔ بحوالہ اخبار الاخبار، ص ۲۵، جیکہ تذکرہ اولیائے ہندوپاک، ص ۲۳، کی مطابق وفات ۹۶۰ھ میں ہوئی۔

۲۔ (۱) تحفۃ الکرام کے مطابق حسام الدین کی نسبت سے یہ علاقہ حسام پورہ کہلویا، ص ۳۶۳۔

(۲) حدیقت الاسرار فی اخبار الابرار، ص ۱۱۱۔

کا قبرستان ہے۔^(۱)

۱۷۔ دیگر صوفیاء :-

ان صوفیائے کرام اور اولیائے نظام کے علاوہ جن کا ذکر سابقہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے، پیر دربار شاہ، شیخ حسین کاہرہ، حضرت شاہ دانا شہید، حضرت سلطان ایوب قتال، حضرت شاہ علی محمد، ملتان کے ان بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اس سرزمین کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ اور لوگوں کو فیض و برکت سے شاد کام کیا۔ پیر دربار شاہ، جلال فیروز کی صوبیداری کے زمانے میں ملتان تشریف لائے اور حضرت بہاء الدین زکریا کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ آپ نے ۶۴۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار شیخ بہاء الدین زکریا اور شاہ رکن عالم کے مزاروں کے درمیان قلعہ کہنہ قائم پر واقع ہے۔ چونکہ دو عظیم بزرگوں کے مزاروں کے درمیان آپ کا مزار ہے اس لئے اس نسبت سے وصفی نام پیر دربار شاہ مشہور ہو گیا۔

بہاء الدین زکریا کے ہی فیض یافتہ اور ہم عصر ایک اور بزرگ شیخ حسین کاہرہ کا شمار بھی ملتان کے اولیاء میں ہوتا ہے۔ ان پر ہمیشہ بے خودی اور مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس حالت سے پہلے آپ گھاس کھود کر روزی کما یا کرتے تھے۔ آپ کا انتقال ملتان ہی میں ہوا۔ آپ کا مزار بوہڑ گیٹ کے اندر ہے۔

بہاء الدین زکریا ہی کے ایک اور مرید اور خادم حضرت شاہ دانا شہید بھی بڑے کشف و کرامات والے بزرگ تھے جن کا مزار اندرون دہلی گیٹ میں واقع ہے۔ آپ کے صوفیانہ مسلک پر حضرت بہاء الدین زکریا اور حضرت بابا فرید گنج شکر کی شخصیتوں کے اثرات تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور تھا کہ

”اندر غوث بہاء الحق باہر قطب فرید
جے توں بہت اُتا ولی منگ شاہ شہید“^(۲)

آپ کی پرورش بہاء الدین زکریا نے کی تھی۔ بہاء الدین زکریا کی وفات کے بعد آپ شیخ

۱۔ بحوالہ ”رکن الدین عالم ملتان“ ص ۶۳۔

۲۔ بحوالہ ”مرقح مولتان“ از سید اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۹۔

صدرالدین عارف کے معتمد خاص کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی کے دور میں آپ نے وفات پائی۔

مشہور صوفی بزرگ عیدالرشید حقانی کے پوتے حضرت سلطان ایوب قتال کا شمار بھی ملتان کے صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جو بڑے کشف و کرامات والے تھے۔ سلطان ایوب قتال کا مزار دنیا پور کے نزدیک ہے۔ آپ نے وہاں اپنے دادا کے حکم سے بکریاں چرا کر روزی کھاتے ہوئے ساری عمر بسر کی اور ۷۶۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار دنیا پور کے نزدیک جنگل میں واقع ہے اور ہر سال ۲۲ چیت کو آپ کے عرس میں شرکت کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں زائرین دور دور سے آتے ہیں۔

سلسلہ قادریہ کے بزرگ شاہ علی محمد بن حسین شاہ ۹۵۰ھ میں مشہد مقدس سے ملتان تشریف لائے اور حضرت مخدوم سید محمد غوث بندگی گیلانی اپچی کے ہاتھ پر بیعت کر کے مرشد کی اجازت سے دریائے چناب کے کنارے شیر شاہ کے مقام پر چلے گئے جہاں آپ مسلسل بارہ سال تک ریاضت و مجاہدے میں مصروف رہے اور آپ کی نسبت سے ہی یہ علاقہ ”چاہ چلہ والا“ کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے ملتان ہی میں وفات پائی اور دریائے چناب کے کنارے شیر شاہ کے مقام پر شہنشاہ اکبر نے آپ کا مزار تعمیر کروایا جو سیلاب آنے کے باعث منہدم ہو گیا۔ اسی وجہ سے آپ کا تابوت دوسری مرتبہ مبارک چاہ شریفوں والا نزد شیر شاہ میں دفن کیا گیا۔ آپ شیر شاہ کے لقب سے معروف ہوئے۔ آپ صاحب کرامات تھے۔ لاکھوں انسان آپ کے عقیدت کیش تھے۔ ان کی یاد میں ہر سال ان کے مزار پر میلہ لگتا ہے جسے شیر شاہ کا میلہ کہتے ہیں۔ آپ کے چھ بیٹے تھے جن میں سے صرف ایک بیٹے شاہ شیر محمد کے ہاں اولاد پیدا ہوئی۔ ملتان کے ایک اور صوفی بزرگ پیر جیون سلطان تھے جن کا مزار کہروڑ سے لودھراں کی جانب چھ میل پر ہے۔ آپ شاہ علی محمد کے خلیفہ تھے۔

دسویں صدی ہجری کے بزرگوں میں ایک اہم شخصیت حضرت حافظ شیخ محمد اسماعیل کا نام آتا ہے جو ۹۳۶ھ میں ملتان تشریف لائے۔ آپ نے بغداد کے مشہور معلم خواجہ کمال سے تعلیم حاصل کی جو کہ قرأت میں ماہر اور حافظ قرآن تھے اور اٹھارہ سال وہاں

رہ کر علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی۔ ملتان میں آپ نے حرم دروازے کے باہر ایک مسجد میں قرآنی درس دینے کے لئے مدرسہ کھولا۔ آپ کی کوششوں سے ہی کندہ ماغ طالب علم بھی چند دنوں میں قرآن پاک حفظ کر لیتے تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی لوگوں کو درس دینے کے لئے وقف کر دی تھی۔ فرحت ملتانی کے مطابق

”آپ نے اپنے خرچ پر غریب الدیار اور بے وطن طلباء کے لئے ایک عظیم درس گاہ بنوائی اور خود ہی درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے پھر ان پر دیسی اور بے وطن طلباء اور دیگر مسافروں کے لئے ایک بڑا لنگر خانہ قائم

کیا جس میں پانچ سو آدمی ایک وقت میں کھانا کھاتے تھے! (۱)

حافظ اسماعیل کا پیشہ طب تھا جو آپ کی روزی کا وسیلہ بھی تھا۔ حافظ صاحب نے اپنی ساری اولاد کے لئے حفظ قرآن اور طب کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔

حافظ اسماعیل کا شمار ان بلند پایہ صوفیاء میں ہوتا ہے جنہوں نے جو درس دیا اس کو عملی طور پر لوگوں کے سامنے نمونہ بن کر بھی پیش کیا۔ آپ کے ہاں امیر غریب کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ بادشاہ ہو یا غریب انسان دونوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے۔ خود رزق حلال کمایا اور دوسروں کو بھی تلقین کی اور اپنی اولاد کو بھی یہی سکھایا۔ آپ صاحب تصنیف بھی ہیں۔ آپ کی ایک بیاض قلب فارسی اور رسالہ مرات الحق تصوف کے موضوع پر ہے آپ کے خلفاء میں حضرت خواجہ امام بخش، حضرت خواجہ احمد یار کے نام ملتے ہیں۔

آپ نے ۱۰۱۱ھ میں ملتان میں وفات پائی اور ریلوے اسٹیشن کے جنوب کی طرف مسجد طوطیوں کے عقب میں آپ کا مزار موجود ہے۔

کچھ ایسے لوگوں کی ملتان میں آمد کا پتہ چلتا ہے جو اپنے صوفیانہ مرتبے اور روحانی فیوض سے زیادہ اپنے شعری، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اثرات کی بدولت مشہور ہوئے۔ ان میں حضرت امیر خسرو اور حسن دہلوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

۱- بحوالہ ”اولیائے ملتان“ ص ۱۵۷۔

۲- بحوالہ ”اولیائے ملتان“ از فرحت ملتانی، ص ۱۵۸۔

۱۸۔ حضرت امیر خسرو

حضرت امیر خسرو ایک عہد ساز شخصیت کے

حامل تھے۔ آپ کی صورت اور سیرت میں اہل تصوف کا طریقہ عیاں تھا۔ اور اگرچہ بظاہر بادشاہوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن حقیقت میں ان لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "تاریخ فیروز شاہی کے مطابق

وہ (امیر خسرو) مستقیم الحال صوفی بھی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گزرا۔ وہ مستعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے وہ شیخ نظام الدین کے خاص مریدوں میں تھے۔ صاحب سماع اور صاحب حال و وجد تھے۔ گانے اور راگ وغیرہ ایجاد کرنے (علم موسیقی گفتن و ساختن) کے فن میں کمال رکھتے تھے۔" (۲)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں

"سلسلہ چشتیہ میں عجیب صاحب کمال، وسیع مشرب، صاحب دل اور صاحب ذوق بزرگ گزرے ہیں۔ ہر ملت و مشرب کے لوگ ان کے ہاں حاضر ہوتے اور ان کے عرفان و زندہ دلی سے فیض پاتے تھے۔" (۳)

امیر خسرو کے آباؤ اجداد ترک النسل تھے اور لاجپن قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ منگولوں کا قتلہ اٹھا تو یہ تیرہویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے دریائے سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ پہلے شمال مغربی حصے میں قیام کیا پھر التمش کے عہد میں دہلی آگئے خسرو کے والد سیف الدین محمود التمش کے دربار سے وابستہ تھے۔ امیر خسرو مومن پور پٹیالی (ہندوستان) کے مقام پر ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اور تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ آٹھ برس کے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ اس کے بعد ان کی پرورش ان کے نانا عماد الملک کے زیر سایہ ہوئی۔ عماد الملک التمش کے عہد سے لے کر

۱۔ بحوالہ "سیرالاولیاء" ص ۲۹۹۔

۲۔ بحوالہ "تاریخ فیروز شاہی" ص ۵۲۲۔

۳۔ بحوالہ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" ص ۱۶۔

بلبن کے عہد تک دربار کے ساتھ وابستہ اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آپ طنطنے اور شان و شوکت کے حامل تھے۔ ان کا دسترخوان اور مجلس رتیمانہ اور شاہانہ تھیں۔ امیر خسرو نے بھی اسی شاہانہ ماحول میں پرورش پائی اور ان مجلسوں میں علماء، شعراء اور ماہرین موسیقی کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ انہیں صحبتوں کا اثر تھا کہ آپ نے بہت ہی کم عمری میں شعر کہنے شروع کر دیئے۔ آٹھ برس کی عمر میں والد کی وفات پر ایک مرثیہ کہا۔ امیر خسرو ہفت زبان تھے۔ فارسی، عربی، ترکی، ہندی، سنسکرت سے ان کی واقفیت ثابت ہے۔ انہوں نے طویل زندگی پائی اور آٹھ حکمرانوں کا عہد دیکھا^(۱)۔ علامہ شبلی نعمانی کے مطابق

”ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گونا گوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے۔“^(۲)

امیر خسرو مذہب، فقہ، نجوم، ہیئت، صرف و نحو اور ادب و شعر پر مہارت رکھتے تھے۔ امیر خسرو سب سے پہلے غیاث الدین بلبن کے بھتیجے اور امیر کشلو خاں چھجو کے دربار کے ساتھ وابستہ ہوئے اور دو سال ان کی ملازمت میں رہے۔ بعد میں بلبن کے بیٹے بغرا خاں کو بنگالے کی حکومت عطا ہوئی تو امیر خسرو دہلی چلے آئے اور بلبن کے دوسرے بیٹے ملک محمد قآن کے شعرائے خاص میں شامل ہوئے۔ جب سلطان محمد ملتان کے حاکم مقرر ہوئے تو امیر خسرو اور حسن دہلوی کو اپنے ساتھ ملتان لے آئے۔ یہاں پانچ برس تک ان کا قیام رہا۔^(۳) خسرو لکھتے ہیں

”پنج سال دیگر پنج آب ملتان را از بکور لطائف فانی

۱- ”تاریخ ادب اردو“ (جلد اول) ص ۲۴ کے مطابق گیارہ حکمرانوں کا زمانہ تھا۔

۲- بحوالہ ”شعرا لجم“ (جلد دوم) از شبلی نعمانی، ص ۱۱۸ مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد

بار اول ۱۹۶۲ء۔

۳- بحوالہ ”شعرا لجم“ (جلد دوم) ص ۲۰۱۔

اب دادم: ”

ہلاکو خاں کے پوتے ارغون خان نے جو ایران کا حکمران تھا اپنے ایک امیر تیمور خاں کو لشکر کے ساتھ ہندوستان بھیجا۔ وہ لاہور اور دیپال پور کو فتح کر کے ملتان پہنچا اور یہاں حملہ آور ہوا سلطان محمد خان شہید اس جنگ میں شہید ہو گئے اور چونکہ امیر خسرو اور حسن دہلوی اس معرکے میں شریک تھے۔ وہ تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور بلخ پہنچ گئے۔ دو سال بعد رہائی حاصل کر کے دہلی آئے۔ یہاں خان جہاں صوبہ دار اودھ کی ملازمت اختیار کر لی۔ دو سال ان کے پاس رہے۔ پھر جب جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو خواجہ حسن دہلوی کے ساتھ ساتھ امیر خسرو بھی اس کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ جب علاء الدین خلجی اپنے چچا کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا تو امیر خسرو نے ان کی ملازمت اختیار کر لی۔ پھر شہاب الدین قطب الدین مبارک اور غیاث الدین تغلق نے بھی ان کی قدر دانی کی۔ جب خواجہ نظام الدین اولیاء کا انتقال ہوا تو امیر خسرو تغلق کے پاس بنگال میں تھے۔ وفات کا سنتے ہی دہلی پہنچے اور خواجہ صاحب کی قبر کے مجاور بن گئے۔ اپنے مرشد کی وفات کے چھ ماہ بعد یعنی ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں انتقال فرمایا اور انہیں کی پانستی کی جانب دفن ہوئے۔

تاریخوں کے مطابق امیر خسرو نے ۹۹ کتابیں لکھیں۔ ۵ لاکھ کے قریب اشعار کہے اور ہندی زبان میں بے شمار کلام چھوڑا۔ تذکرہ مشائخ کرام کے مطابق ”امیر خسرو نے بانوے کتابیں سلک نظم میں منتظم کیں اور مشہور ہے کہ امیر خسرو نے اپنی بیس تصانیف میں لکھا ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم تر اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔“ (۳)

۱۔ بحوالہ ”بزمِ ملوکیہ“ ص ۳۰۳۔

۲۔ بحوالہ (الف) حیاتِ صوفیہ اُردو ترجمہ نغمات الانس، ص ۵۲، (ب) اقبال کے محبوب صوفیاء

ص ۲۹۸۔ (ج) تذکرہ اولیائے ہندو پاک، ص ۱۲۳۔ (د) شعرا لعم (جلد دوم) ص ۱۱۰۔

۳۔ تذکرہ مشائخ کرام از محمد قاسم فرشتہ، ص ۱۲۴۔ سفینتہ الاولیاء (فارسی) ص ۹۹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ ”تصانیف میر از نظم و نثر نو و دہنہ است و اشعار میر از پنج مشہور است از پنج لک کم و از چہار لک زیادہ است۔“

امیر خسرو کی مصدقہ تصانیف میں دیوان تحفۃ الصفر، دیوان وسط الخیات نہایت الکمال قرآن السعدین، مطلع الانوار، شیریں خسرو، آئینہ اسکندری، لیلیٰ مجنوں، ہشت بہشت سے پہر، افضل الفوائد، اعجاز خسروی، تاج الفتوح، تعلق نامہ، خزائن الفتوح، مناقب ہند، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ فن ریاضی اور فن موسیقی پر بھی انہوں نے کتابیں لکھیں۔ طوطی ہند امیر خسرو شاعری میں ایک نابغہ روزگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ شبلی نعمانی کے مطابق

” فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری، بے شبہ، قلیم سخن کے جم و کے ہیں۔ لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری، غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطے ہائے سخن یعنی تضمین مستزاد اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں؟“ (۱)

امیر خسرو کی فارسی شاعری سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف اس شاعری پر نگاہ ڈالی جائے جس میں انہوں نے ہندی زبان کا استعمال کیا تو ان کی حیثیت صف اول کے ان محسنین میں مسلم ہے کہ جنہوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج میں ابتدائی کاوشیں کیں۔ مولوی عبدالحق نے تذکرہ نکات الشعراء کے حوالے سے ایک قطعہ درج کیا ہے

زرگر پسے چو ماہ پارا
نقد دل من گرفت و بکست
کچھ گھڑیے سنوارے پکارا
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا
مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ

رینتہ اسی کا نام ہے جس میں فارسی ہندی دونوں ملی ہوئی ہیں اور یہیں سے اردو کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بیسیوں پہیلیاں انملیاں اور کہ مکر نیاں وغیرہ ان کے نام سے مشہور ہیں جن کی صحت کا اس

وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انہیں کی ہیں تو صد ہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ اور زبان میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے اور یہ بظاہر اس وقت کی زبان معلوم نہیں ہوتی
مثلاً

بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہ دیا اس ناؤں بوجھے نہیں تو چھوڑ دو گاؤں
دس ناری ایک ہی نہ بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم منہ میٹھا تا شیر گرم
لیکن ان کے فارسی کلام میں بہت سے ہندی لفظ بے تکلف استعمال ہوتے ہیں اور ان کی مثنوی تعلق نامہ "ہے ہے تیر مارا" کا جملہ اس وقت کی ہندی یا دہلوی زبان کی شان کو بناتا ہے۔" (۱۱)

فنون لطیفہ میں شاعری کے ساتھ ساتھ امیر خسرو کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کے بقول

"موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔" (۱۲)

موسیقی کی دنیا میں ان جیسا نادر کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے نہ صرف کئی ساز ایجاد کئے بلکہ بے شمار راگ ان کی بدولت دنیائے موسیقی میں متعارف ہوئے۔ تہذیب اور ثقافتی سطح پر بھی امیر خسرو کے کارنامے کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ انہوں نے صوفیانہ زندگی کی اس روش کو عام کیا جس نے انسان دوستی اور دنیاوی زندگی کے تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنے تخلیقی تجربات کا اظہار روحانی یا فکری سطح پر کرنے کی بجائے جمالیاتی اور جذباتی سطح پر کیا اور دوسری طرف انہوں نے

۱۔ بحوالہ "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیانے کلام کا کام" ص ۱۷-۱۸۔

۲۔ بحوالہ "شعرا العجم" جلد دوم، ص ۱۲۰۔

سید علی ہجویری اور بابا فرید گنج شکر کی طرح ہندو مسلم ثقافت کے ملاپ کے عمل کو تیز کیا۔
قاضی جاوید کے مطابق

”امیر خسرو ہندو مسلم تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر اس ثقافتی بیگانگی کو ختم کرنے کی کوشش کی جو برصغیر کے دو بڑے ثقافتی گروہوں کے درمیان چلی آرہی تھی۔“^(۱)

اس تہذیبی ملاپ کے لئے انہوں نے سب سے بڑا ذریعہ زبان کو بنایا۔ اردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں امیر خسرو کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ انہوں نے ایک مشترکہ زبان کی تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نہ صرف ہندی الفاظ و تراکیب کو بکثرت استعمال کیا بلکہ فارسی زبان کو بھی برصغیر کے مزاج اور صورت حال کے مطابق ڈھلنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی غزلیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ایک مصرع فارسی کا اور ایک مصرع ہندی کا ہے۔

ز حال مسکین مکن تغافل دو وائے نیناں بنائے بنیاں

کہ تاب بچراں نہ دارم اے جان نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

شہان بچراں دراز چوں زلف و روز و صلتش چو عمر کو تاہ

سکھی پیاکوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

لیکا یک از دل دد حشیم جادو بصد فریبم بہر تو کیسنے

کسے پڑمی ہے جاسناو سے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں زہر آں ماہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ او سے نہ بھیجے بتیاں

بخت روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

پسیت من کہ درائے رکھوں جو جاتے پاؤں پیاک کی کھتیاں^(۲)

امیر خسرو کے یہاں مقامی زبانوں کے الفاظ کے استعمال اور تصوف میں جو تجربات ملتے

۱۔ بحوالہ ”برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار“ ص ۵۳

۲۔ بحوالہ ”تاریخ ادب اردو“ (جلد اول)، از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۲۸۔

ہیں ان کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو کو ملتان میں پانچ سال قیام کرنے کا موقع ملا اس دوران میں انہوں نے ملتانی زبان کے الفاظ بھی سیکھے اور ان الفاظ کو اپنی شاعری میں برتنا۔ مولانا محمود شیرانی نے امیر خسرو کی ایک نظم درج کی ہے۔^(۱)

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار	آپے پارا تر گئے ہم تو رہے اردار
بھائی رے ملاحو ہم کوں پار اتار	ہاتھ کا دیوونگی مندر اگل کا دیوں ہار
دیکھ میں اپنے حال کوں روؤں زاروزار	بی گونتا بہت ہیں ہم ہیں او گنہار
باہل بھیجی میں دینج کوں تاندا کو پھول	ہو چھاونجیروہا جیاناں لدھا مول
چکوا چکوی ددچنے انکوں مارونہ کو	ادہ مارے بکرتار کے رین بھوڑی ہو
سج و چہتی دیکھ کے روؤں دن رین	پیا کرتی ہیں پہروں پل بھر سکھ نہ چین
سنبھ ناریں سو سکھ سیوس کنتاں کوں گل لا	میں دوکھیاری جنم کی دوکھی گئی بہار
تازی چھوٹا دس میں قصبے پڑی پکار	دروازے دیتے رہ گئے نکس گئے سوار
گوری سوتے پنگ پرکھ پر دارے کیس	چل خسرو گھر اپنے سانجھ پڑی چودیس

ڈاکٹر مہر عبدالحق کے مطابق

نشان زدہ الفاظ اور ترکیبیں اصل کے لحاظ سے تو ہندی ہیں لیکن اس لحاظ سے خالص ملتانی ہیں کہ یہ دوسری زبانوں میں ان معنوں میں یا ان ترکیبوں سے استعمال نہیں ہوتیں اگرچہ ملتانی زبان میں یہ عام ہیں۔ "دروازے دیتے رہ گئے" میں دروازہ دینا بمعنی دروازہ بند کرنا غالباً اردو کا نہ محاورہ ہے اور نہ کسی دوسری زبان کا "نہ لدھا مول" یعنی اصل بھی حاصل نہ ہو، خالص ملتانی زبان ہے۔ گل لاؤں بمعنی گلے ملنا یا گلے لگانا آج بھی ملتانی میں سنا جاسکتا ہے۔ نے یا بیا بمعنی "اور" اگرچہ پراکرت سے آیا ہے مگر جدید ہند آریائی زبانوں میں سوائے سندھی کے اور کسی زبان میں اس کی کوئی شکل موجود نہیں۔^(۲)

گویا امیر خسرو کے یہاں زبانیں مخلوط کرنے کے بے شمار تجربات ملتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ بحوالہ "بنجاب میں اردو" ص ۱۴۴

۲۔ بحوالہ "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" ص ۵۳۴، مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور، بار اول ۱۹۶۷ء

امیر خسرو کا شعر ہے۔

من کہ بر سر نئے نہا دم گل بار بر سر نہاد گفتا جل
یہ شعر غالباً اس موقع پر کہا جب منگول انہیں گرفتار کر کے بلخ لے جا رہے تھے۔ اب
اس شعر میں "جل" کا لفظ خالصتاً متانی زبان کا ہے۔ جس کا مطلب ہے "چل"۔ اسی
طرح خالق باری ان کی منظوم لغت ہے۔ جس میں عربی، فارسی، الفاظ کے معنی اور مترادفات
برج بھاشا، ہندی، سرائیکی اور پنجابی میں بیان کئے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

نیلا پیلا زرد کبود	تانا بانا بن ست و بود
قوت نیرو زور بل آن	سارق درد چور ہے جان
ترا بگنتم میں تجھ کہیا	کچا بھاندی توکت رہیا
بیا برادر آورے بھائی	بنشین مادر بیٹھے بھائی
خدر خسادہ ہندوی بول جو کہتے کال	آج امر و زبدان فردا تو بگونی کال
تمنا و ہم آرزو چاؤ کہیے	ید و دست ہاتھ و قدم پانوں کہیے
عاقبت انجام آخر کام ہے	ہم پیالہ نام ساغر جام ہے
کشتی و زورق تو بدان کا وہ ہے	زخم و جراحت تو بدان گھاؤ ہے
مولوی صاحب سرل پناہ	گدا بھکاری خسرو شاہ (۲)

غرض شاعری، موسیقی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی سطح پر امیر خسرو کے تخلیقی تجربات انہیں نہایت
اہم صوفیاء کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں جنہوں نے انسان دوستی کے رویے کو اپنایا اور
فنون لطیفہ کے علاوہ زندگی کے چلن کو بھی متاثر کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں

۱۔ بعض لوگوں نے اس کا امیر خسرو کی تصنیف ہونے پر شبہ کا اظہار کیا ہے لیکن جناب ڈاکٹر جمیل جالبی

کے مطابق یہ امیر خسرو کی لغت ہے۔ اس بحث کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "تاریخ ادب اردو"

جلد اول، ص ۲۹۔ تا ۳۳۔

۲۔ بحوالہ خالق باری بہ قلم حلی مطبوعہ مطبع مفید عام لاہور، بار اول فروری ۱۹۱۰ء ص ۱ تا ۲۷۔

"امیر خسرو — فارسی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ خود اہل زبان ان کا لوہا مانتے تھے۔ موسیقی کے ایسے استاد بے بدل کہ ان کی ایجادات و اختراعات آج تک علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اُردو زبان و ادب کے وہ شاعر اول جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے۔ امیر خسرو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گل نورس ہیں جو ابھرتی پھلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور میں آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔ امیر خسرو ہندو مسلم ثقافت کی وہ زندہ علامت ہیں کہ رہتی دنیا تک اس تہذیب کے اولین نمائندے کی حیثیت سے یادگار رہیں گے۔ ان کا اُردو کلام ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ امر کہ بعد میں بہت سا کلام ان کے نام سے منسوب ہو گیا، خود اس بات کا اشارہ ہے کہ امیر خسرو ہمارے طرز احاس کے ایسے نمائندے ہیں جو تہذیبوں کے خون میں شامل ہو کر خود کلچر بن جاتے ہیں" (۱)

۱۹۔ حسن دہلوی

شہزادہ سلطان محمد کے دربار میں امیر خسرو کے ساتھ ساتھ اس دور کے ایک اور بڑے شاعر اور بزرگ حسن دہلوی کا نام بھی آتا ہے۔ شہزادہ محمد جب امیر خسرو کو دہلی سے ملتان لاتے تو حسن بھی ساتھ تھے۔ سن ۶۵۳ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے لیکن پرورش دہلی میں پائی۔ حسن امیر خسرو کے ہم عصر بھی تھے اور پیر بھائی بھی۔ کیونکہ وہ بھی نظام الدین اولیاء سے بیعت تھے۔ عبدالرحمن جامی نے انہیں "سعدی ہندوستان" کہا ہے۔ مولانا جامی تاریخ ہند کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "عمدہ مکارم اخلاق اور لطافت و ظرافت مجالس اور عقل کی استقامت اور صوفیاء کے دستور و آداب اور قناعت کے لزوم اور پاکیزہ اعتقاد اور دنیاوی

۱۔ "تاریخ ادب اُردو" جلد اول، ص ۳۴۔

۲۔ بحوالہ "تاریخ ادب اُردو" از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۳۴۔

علاقے سے تہجد اور نفل میں ظاہری اسباب کے بغیر خوش رہنے اور اچھے گزراں کے ساتھ رہنے میں حسن جیسا دوسرا آدمی بہت ہی کم دیکھا ہے وہ ایسی شیریں مجلس والا بآداب اور مہذب تھا کہ جو راحت مجھے ان کے پاس بیٹھ کر ملتی تھی وہ کسی دوسرے کی مجلس میں نہ پاتا تھا۔ (۱)

حسن دہلوی اپنے وقت کے نہایت اہم اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مرآت الاسرار کے مطابق ”تمام شعرائے وقت میں سے فی البدیہہ کوئی آپ سے بہتر شعر نہیں کہتا تھا۔ شاہان دہلی آپ کے کلام کے عاشق تھے۔“ (۲)

آپ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ امیر خسرو کی طرح حسن نے بھی فارسی اور ہندی کو ملا کر شعر کہے ہیں۔ مثلاً

ہر لحظہ آید دردِ دلِ دیکھوں اسے طک جائے کر
گویم حکایت بھر خود با آن صنم جیو لائے کر
آن سیم تن گوید مراد کوئے ما آئی چہ را
ما ہی صفت تر پہوں جو ٹک نہ دیکھوں — جائے کر
تا کہ خورم خون جگر کا سین کہوں دکھ جائے کر
سوزم فادہ در تنم پیہ دے گئے سلگائے کر
گشتم ہوں جوگی در بدر یا بم اگر جائے خیر
پہر پہر رہیا بہوتوں نگر اجہوں ناملیا آئے کر
بسیار گفتم این سخن اے دل بکس رغبت مسکنے
ان کی تباہی ات کھن بہوتوں کہے سمجھائے کر
بس حیلہ کردم اے حسن بے جان شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر

۱۔ بحوالہ ”حیات صوفیہ اردو ترجمہ نغمات الانس“ ص ۵۲-۵۳، مترجم محمد ادریس انصاری۔

۲۔ بحوالہ ”مرآت الاسرار“ (جلد دوم) ص ۲۵۴۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ

”مکن ہے نقل در نقل کے سبب اس غزل کے بعض الفاظ وہ نہ رہے ہوں جو حسن نے لکھے تھے۔ لیکن لفظوں کے ادھر ادھر ہونے یا خفیف تبدیلی سے زبان کے مزاج اور اٹھان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ جو بات قابل توجہ ہے وہ نیا لہجہ ہے جو ”عربی ایرانی تہذیب“ کا عطیہ ہے جس نے مردہ لفظوں میں جان بھی ڈال دی ہے اور ایک ایسی جھنکار پیدا کر دی ہے جو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے جس نے زبان کو نئے سفر اور نئی منزلوں کا راستہ بنا دیا ہے؟“ (۱)

حسن دہلوی نظام الدین اولیاء کے کاتب بھی تھے۔ انہوں نے نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو ”فوائد القواد“ کے نام سے جمع کیا۔ اس کے علاوہ عربی میں ”قواعد النحو“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ آپ نے ۳۶ھ میں دیوگیر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (۲)

انگلے باب سے ہم دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء کا ذکر شروع کر رہے ہیں۔

۱۔ بحوالہ ”تاریخ ادب اُردو“ جلد اول، ص ۲۵۔

۲۔ بحوالہ ”تذکرہ اولیائے ہندوپاک“ از مرزا محمد اختر دہلوی، ص ۱۲۳، مطبوعہ سیٹھ آدم جی

عبداللہ پبلشر بمبئی واسے لاہور۔

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	کتاب	ناشر / ایڈیشن نمبر
۱-	آرنلڈ، ٹی، ڈبلیو، پروفیسر	دعوت اسلام (پریچنگ آف اسلام، محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب لاہور)	طبع اول ۱۹۷۲ء
	عنایت اللہ شیخ، ڈاکٹر (مترجم)		
۲-	آفتاب بیگ مرزا	تختہ الابرار	مطبع رنجوی، دہلی، ۱۳۲۳ء
۳-	اصغر علی چشتی	جواہر فریدی	دکتوریہ پریس لاہور ۱۳۰۱ھ
۴-	امام بخش مولوی	حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار، اس کتاب کا ٹائٹل صفحہ غائب ہے۔ اس لئے پریس کا پتہ نہیں چلتا۔	مطبع مفید عام لاہور، بار اول، فروری ۱۹۱۰ء
۵-	امیر خسرو	خالق باری بہ قلم جلی	
۶-	بدرالدین اسماعق، خواجہ	اسرار الاولیاء	اللہ والے کی قومی دکان، لاہور
۷-	ایضاً	اسرار الاولیاء (فارسی)	نوکلشور کانپور، چھٹا ایڈیشن ۱۹۱۷ء
۸-	بدر، کرم الہی	تاریخ ملتان	امتنراج پبلی کیشنز لاہور، بار اول ۱۹۷۸ء
۹-	برنی، ضیاء الدین	تاریخ فیروز شاہی	مرکزی اُردو بورڈ لاہور
	سید معین الحق، ڈاکٹر (مترجم)		
۱۰-	ٹپیل آر۔ سی	حکایات پنجاب (حصہ سوم)	مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۲ء
	میاں عبدالرشید (مترجم)		
۱۱-	جمالی حامد بن فضل اللہ	سیر العارفین	مرکزی اُردو بورڈ لاہور
	قادری، محمد ایوب (مترجم)		
۱۲-	جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اُردو (جلد اول)	مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۷۵ء
۱۳-	جھفر قاسمی، طاہر اسدی (مترجم)	بابا فرید الدین مسعود گنج شکر	"المعارف" لاہور

- ۱۴- جیشی رام مشتاق فرید کوٹی، ارشادات فریدی یعنی شلوک فریدی، اللہ والے کی قومی دکان، لاہور
بدری، صابری، قادری
۱۹۲۷ء
- ۱۵- حسن رضا گردیزی شاہ یوسف گردیز کاروان ادب ملتان، باراول ۱۹۸۳ء
- ۱۶- حکم چہند تواریخ ملتان
- ۱۷- خواجہ حسن دہلوی فوائد الفواد (فارسی) نوکشور ۱۳۰۲ھ
- ۱۸- خواجہ حسن دہلوی فوائد الفواد علامہ اکیڈمی، اوقاف پنجاب، لاہور
۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء
- ۱۹- خواجہ غریب نواز خواجہ غریب نواز امیر حسن علامہ سنہری (مترجم) محمد سرور، پروفیسر
شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع سوم ۱۹۷۸ء
- ۲۰- حضرت الہدایہ ابن شیخ تذکرہ خواجگان چشت، اُردو نفیس اکیڈمی کراچی
عبدالرحیم / دردانی، ترجمہ "سیرالاقطاب"
محمد معین الدین پروفیسر
- ۲۱- رفیعہ سلطانی، ڈاکٹر اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء، کریم سنز پبلشرز، کراچی ۱۹۷۸ء
(۱۹ ویں صدی کے اوائل تک)
- ۲۲- شارب، ظہور الحسن، ڈاکٹر معین الہند تاج پبلشرز، دہلی
- ۲۳- ایضاً ولی کے باتیس خواجہ ایضاً
- ۲۴- شبلی نعمانی، علامہ شعرا العجم (جلد دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
- ۲۵- شطاری، محمد غوثی، مانڈوی، گلزار ابرار (فارسی) اُردو ترجمہ اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور
فضل احمد جیوری (مترجم) "اذکار ابرار" سن اشاعت ۱۳۶۵ھ
- ۲۶- شمیم محمود زیدی، ڈاکٹر احوال و آثار، شیخ بہاء الدین انتشارات مرکز تحقیقات فارسی،
زکریا ملتان و خلاصۃ العارفین (فارسی) ایران و پاکستان
- ۲۷- شہاب مسعود حسن خطہ پاک ادب اُردو اکیڈمی بہاولپور، طبع اول ۱۹۶۷ء
- ۲۸- صباح الدین عبدالرحمن، بزم مملوکیہ "معارف" اعظم گڑھ ۱۳۷۲ھ
۱۹۵۲ء
- سید (مرتبہ)
- ۲۹- عبدالحی، سید مولانا نوشہروی نزہت الخواطر و بیجۃ السامع والنواظر، مقبول اکیڈمی، شاہ عالم مارکیٹ،

- ابو یحییٰ امام خاں (مترجم) لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء
- ۳۰۔ عبدالرحمن چشتی، مولوی تذکرہ اولیائے ہند لکھنؤ ۱۹۱۳ء
- ۳۱۔ عبدالرحمن شیخ، سیال، مرات الاسرار (جلد دوم) صوفی فاؤنڈیشن لاہور، سن اشاعت ۱۹۸۲ء
- ۳۲۔ عبدالرحمن، منشی آئینہ ملتان مکتبہ اشرف المعارف، ملتان۔
- ۳۳۔ عتیق فکری، علامہ نقش ملتان (جلد اول) فکری اکیڈمی بشرکت مجلس ثقافت
- ۳۴۔ علامہ الدین علی حسین، مولانا الدر المنظوم فی ترجمہ مفوظ المنحوم، ملفوظات حضرت جہانیاں جہاں گشت مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ
- ۳۵۔ غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور
- ۳۶۔ ایضاً خزینۃ الاصفیاء (جلد دوم) نو لکشور پریس، کان پور
- ۳۷۔ ایضاً حدیقۃ الاولیاء ایضاً
- ۳۸۔ فرحت ملتانی اولیائے ملتان مکتبہ تنویر ادب ملتان، بار سوم ۱۹۸۳ء
- ۳۹۔ فقیر محمد اشفاق حسن جمال یوسف مطبع الہی آگرہ ۱۳۲۶ھ
- ۴۰۔ فرشتہ محمد قاسم، تاریخ فرشتہ (جلد دوم) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
- خواجہ عبدالحی (مترجم)
- ۴۱۔ ایضاً تاریخ فرشتہ (جلد اول) ایضاً
- ۴۲۔ فرشتہ، محمد قاسم تذکرہ مشائخ کرام احسن برادرز لاہور ۱۹۶۵ء
- ۴۳۔ ایضاً ترجمہ تاریخ فرشتہ (اردو) جلد اول نو لکشور پریس لکھنور۔
- ۴۴۔ فریدی، نور احمد، مولانا تذکرہ شاہ رکن عالم ملتانی قصر الادب، جگودالا، ضلع ملتان
- ۴۵۔ ایضاً تذکرہ صدر الدین عارف (جلد اول) ایضاً
- ۴۶۔ ایضاً تذکرہ بہار الدین زکریا ملتانی محکمہ اوقاف پنجاب لاہور طبع اول ۱۹۸۰ء
- ۴۷۔ فیاض محمود سید (مرتبہ) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک ہند جلد ۱۳ پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ۴۸۔ قادری، داراشکوہ، شہزادہ سفینۃ الاولیاء (فارسی) نو لکشور

- ۴۹- قادری، داراشکوہ، شہزادہ سفینۃ الاولیاء
محمد علی لطفی (مترجم)
نفس اکیڈمی، کراچی، طبع ششم ۱۹۸۲ء
- ۵۰- قاری، محمد ایوب مخدوم جہانیاں جہاں گشت
ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی، بار اول
۱۹۶۳ء
- ۵۱- قاضی جاوید پنجاب کے صوتی دانشور
شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
- ۵۲- ایضاً برصغیر میں مسلم نکرہ کا ارتقاء
بک ٹریڈرز، ادارہ ثقافت پاکستان
لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء
- ۵۳- قانع ٹھٹھی، علی شیر میر تحفۃ الکرام
نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر (مترجم)
سندھی ادبی بورڈ کراچی ۱۹۵۹ء
- ۵۴- قدوسی، اعجاز الحق تاریخ سندھ (دو جلدیں)
مرکزی اُردو بورڈ لاہور
- ۵۵- قدوسی، اعجاز الحق اقبال کے محبوب صوفیاء
اقبال اکادمی، لاہور، طبع اول
جنوری ۱۹۷۶ء
- ۵۶- قلندر، حمید شاعر خیر المجالس (اُردو ترجمہ)
واحد بک ڈپو، جو ناما رکیٹ کراچی
مسطاب سراج المجالس
- ۵۷- کیفی جام پوری سرایکی شاعری
بزم ثقافت ملتان، طبع اول ۱۹۴۹ء
- ۵۸- گیلانی، اولاد علی سید مرقع مولتان
سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان نے
۱۹۳۸ء میں شائع کی۔
- ۵۹- محمد اکرام شیخ آب کوثر
ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،
ساتویں بار ۱۹۷۵ء
- ۶۰- محمد امین، پروفیسر اشارات فلسفہ
کاروان ادب ملتان ۱۹۷۸ء
- ۶۱- محدث دہلوی، عبدالحق شیخ انوار صوفیہ یعنی اخبار الاخبار
شعاع ادب لاہور، بار سوم،
ستمبر ۱۹۶۷ء
- ۶۲- محدث دہلوی، عبدالحق شیخ اخبار الاخبار
مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی

محمدناضل صاحب، مولانا (مترجمین)

۶۳- مسعود، وحید احمد سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود رضا پبلی کیشنز لاہور، سنہ اشاعت

۱۹۸۱ء

گنج شکر

۶۴- محمد اختر دہلوی، مرزا تذکرہ اولیائے ہندو پاک سیدھ آدم جی عبداللہ پبلشرز بمبئی والے

لاہور

محب ہند دہلی، طبع اول ۱۱۲۲ھ

۶۵- محمد بلاق، صاحبزادہ (سید) روضہ اقطاب

اشرف پریس لاہور، طبع چہام ۱۹۷۲ء

۶۶- محمود شیرانی، حافظ پنجاب میں اردو

وحید قریشی، ڈاکٹر (مترجم)

مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول

۶۷- محمود شیرانی، حافظ مقالات حافظ محمود شیرانی،

۱۹۶۶ء

جلد اول و دوم

معین الادب کراچی، طبع اول جون ۸، ۱۹۷۸ء

لمعات خواجہ

۶۸- معین الدین احمد

دکتوریہ پریس لاہور ۱۳۰۱ھ

جواہر فریدی

۶۹- معین الدین، مولانا

اردو کی ابتدائی نشوونما میں

۷۰- مولوی عبدالحق، ڈاکٹر

صوفیائے کرام کا کام

مقالات دینی و علمی (حصہ اول) مزدور پرنٹنگ پریس لاہور

۷۱- مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر

سرائیکی ادبی بورڈ ملتان،

سرائیکی زبان اور اس کی

۷۲- مہر عبدالحق، ڈاکٹر

سن اشاعت ۱۹۷۷ء

ہمسایہ علاقائی زبانیں

الکتاب گنج بخش روڈ لاہور،

۷۳- میر خورد، سید محمد بن مبارک سیر الاولیاء

سال اشاعت ۱۹۸۲ء

کرماتی بریاں غلام احمد (مترجم)

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

اولیائے ملتان

۷۴- ناظم، بشیر حسین

اللہ والے کی قومی دکان، لاہور

۷۵- نظام الدین اولیاء (خواجہ) راحت القلوب

ملک فضل الدین نقشبندی (مترجم)

احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود المعارف گنج بخش روڈ لاہور،

۷۶- نظامی، خلیق احمد

سن اشاعت ۱۹۸۳ء

مسعود گنج شکر

قاضی محمد حفیظ اللہ (مترجم)

- اردو ترجمہ "دی لائف اینڈ ٹائمر
آف شیخ فرید الدین گنج شکر"
- ۶۷- دقّاح شاہ معین الدین حشتی (فارسی) نوکشور پریس ۱۳۰۰ھ
- ۶۸- بزم صوفیہ معارف، اعظم گڑھ ۱۹۲۹ء
- ۶۹- معمولات مظہریہ و محبوب العارفین مطبع محمدی، لاہور ۱۳۰۱ھ

قلمی نسخے

- ۱- زکریا بہاء الدین (ملتان) دیوان فارسی
- ۲- ضیاء الدین بن حافظ خلاصۃ العارفین (فارسی) ملفوظات حضرت بہاء الدین زکریا مولوی عبداللہ قادری ملتان ۲۷ شعبان ۱۲۹۰ھ
- ۳- شرف الدین قریشی، شیخ منبع البرکات (مذکرہ حمانیہ) (فارسی) گنج الاسرار (ملفوظات بابا فرید گنج شکر) ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ
- ۴- فرید مسعود اجدوہنی گل محمد، حشتی مولوی گلزار فریدی (فارسی) ملفوظات بابا فرید گنج شکر
- ۵- محمد افضل قریشی خلاصۃ الاحباب (فارسی) المنتخب ملفوظ شریف (فارسی) اس کے دو نسخے حاصل ہوئے، ایک جناب اسد نظامی سے اور دوسرا ڈاکٹر طاہر تونسوی سے۔
- ۶- محمد مرید خواجہ تاج محمود حشتی پاکستانی
- ۷- قادری، داراشکوہ سفینۃ الاولیاء (فارسی) کاتب یار محمد مرید غلام حسن شہید، ۳۰ رمضان المبارک ۱۲۸۰ھ

رسائل

- ۱- دیوانہ، موہن سنگھ، ڈاکٹر بابا فرید الدین گنج شکر ابراہیم بنجاب یونیورسٹی میگزین، اور فرید ثانی فروری ۱۹۳۸ء

۲- راشدہی، حسام الدین، پیر اُردو زبان کا اصلی مولد، سندھ "اُردو" انجمن ترقی اُردو کراچی،

اپریل ۱۹۵۱ء

۳- عین الحق فرید کوٹی اسماعیلی بزرگوں کا عارفانہ کلام "ماہ نو" اکتوبر ۱۹۸۱ء

اخبارات

- ۱- عتیق فکری، علامہ
 برصغیر پر ملتان کے علمی اثرات "امروز" ملتان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء
- ۲- غضنفر مہدی
 ملتان کے قدیم علمی و ادبی محسن ایضاً
- ۳- محمد امین، پروفیسر
 تصوف اور ملتان ایضاً
- ۴- محمد اسلم چوہدری
 حضرت پیر مخدوم عبدالرشید حقانی روزنامہ "جنگ" لاہور، ۲۷ جولائی

۱۹۸۲ء

و اما در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

در مورد این که در این کتاب

باب سوم

ملتان کے صوفیاء

دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء کا احوال ،
اُن کی

علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کے حوالے سے

دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیائے کرام

(الف) پس منظر -

سابقہ باب میں جن صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وجہ سے سرزمین ملتان میں تصوف کی ایک مستقل اور پائیدار روایت قائم ہو گئی۔ ان صوفیاء کی بدولت ملتان کی تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کی جو اصلاح ہوئی اس کے واضح نتائج سامنے آئے۔ مختلف صوفیاء کی خالقا ہیں مرجح خلاق بن گئیں اور لوگوں نے اپنی مذہبی اور روحانی تشنگی کو دور کرنے کے لئے مختلف سلسلوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا شروع کیا۔ ملتان کے علاوہ تونسہ، اوج، سخی سرور، کوٹ مٹھن، پاک پٹن، عبدالحکیم اور خیر پور ٹامیوالی وغیرہ تصوف کے مرکز بن گئے۔

دسویں صدی ہجری کے بعد بھی تصوف اور مسلک تصوف کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا بلکہ حضرت حافظ جمال، حضرت خواجہ سلیمان تونسوی، حضرت خواجہ غلام فرید، حضرت خواجہ خدابخش اور غلام حسن شہید وغیرہ کی بدولت یہ سلسلہ نہ صرف قائم رہا بلکہ آگے بڑھتا رہا۔ دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء کی بدولت تعلیم و تعلم، رشد و ہدایت اور فلسفہ و فکر کے ساتھ ساتھ زبان و ادب اور علم و فضل کی بھی ترویج ہوئی۔ اس دور کے ملفوظات اگرچہ زیادہ تر فارسی ہی میں ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے تراجم ہو چکے ہیں اور بہت سے صوفیاء کا اردو کلام بھی دستیاب ہے۔

لیکن اگر ایک طرف تصوف نے تہذیبی اور علمی سطح پر اپنے دیرپا نقوش مرتسم کئے تو دوسری جانب عالمی سطح پر مسلمانوں کے مادی اور دنیاوی زوال کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور انیسویں صدی میں یہ زوال اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ پوری دنیا کے مسلمان بالعموم اور برصغیر کے مسلمان بالخصوص اس زوال کی زد میں آئے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور اقتصادی اقدار میں تبدیلیاں لایا۔ دنیا کے مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکیں تیز تر ہوئیں

اٹلی، فرانس اور جرمنی نے انقلاب دیکھے اور ان کے یہاں معاشرتی تہذیبی اور سیاسی سطح پر انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں لیکن اس کے برعکس ہندوستان کے مسلمان بتدریج اقتصادی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی طور پر زوال کی طرف بڑھتے گئے۔ سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی اور نئی نئی قوتیں ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ اس انحطاط کا سبب بادشاہوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پرستی اور پست ہمتی تھی اور جب مرکزی ڈھانچہ کمزور ہو جائے تو طرح طرح کی سازشیں، گمراہ بندیاں جنم لیتی ہیں۔ پھر ہر کوئی جوڑ توڑ کرنے لگتا ہے تو بیرونی طاقتیں آپس کے انتشار کا فائدہ اٹھا کر اپنا مفاد حاصل کرنے لگتی ہیں۔ کچھ یہی صورت حال ہندوستان میں بھی پیدا ہوئی۔ صوبوں کے گورنر، جاگیردار اور امراء خود مختار ہو گئے۔ یہ لوگ نہ صرف مرکز سے باغی ہوئے بلکہ اپنے اقتدار اور عیش پرستی کے نشے میں غریبوں پر ظلم بھی کرنے لگے جس سے عوام میں پریشانی پھیلی اور اقتصادی بد حالی میں اضافہ ہوا۔ ان کی دیکھا دیکھی سکھ مرہٹے، جاٹ اور روہیلے بھی سراٹھانے لگے۔ اور اپنے اپنے طور پر ہر ایک نے لوٹ پھادی سکھوں کی غارتگری خصوصاً تاریخ کا ایک تاریک دور ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں ان کی حکومت بہت پھیل گئی۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں ملتان پر بھی اس نے قبضہ کر لیا۔^(۱)

اندرونی سازشوں کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں نے برصغیر کی سیاسی اور اقتصادی بد حالی اور انتشار میں مزید اضافہ کیا۔ جس سے لوگوں میں خوف و ہراس، اضطراب اور یاسیت پیدا ہوئی ان حالات میں جبکہ ملکی، سیاسی، سماجی فضا اس قدر بگڑ چکی تھی، برطانوی سامراج کی یلغار کو رد کا نہ جاسکا۔ یوں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بد حالی کے ساتھ ساتھ غلامی کا طوق بھی ان کے گلے میں پڑ گیا۔ انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے غیر منقسم ہندوستان میں اٹھنے والی حریت پسند تحریکوں کو ناکام بنا دیا۔ انہیں زیادہ فائدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نا اتفاقی اور غداروں کی مفاد پرستی اور ضمیر فرودشی نے پہنچایا۔ انگریزوں کا نشانہ زیادہ تر مسلمان تھے کیونکہ وہ تقریباً پانچ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے۔ انگریزوں کو اب بھی

۱- بحوالہ "انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم" از ولیم ایل لینگر، ترجمہ اُردو غلام رسول مہر، ص ۲۳۸

خطرہ انہیں سے تھا۔ ادھر مسلمان ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد پھر سیاسی طور پر مجتمع نہ ہو سکے۔ ۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان پوری صدی مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی زوال کی صدی ہے۔ اکا دکا تحریکیں وجود میں آئیں لیکن ان کے کوئی خاطر خواہ اثرات مرتب نہ ہو سکے۔ بے عملی، انتشار اور طوائف الملوک نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جو بساط الٹی تو دوبارہ بچھائی نہ جاسکی۔ ادھر احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملوں نے اقتصادی بد حالی میں اضافہ کیا۔ غیر منقسم ہندوستان ہمیشہ غیر ملکی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ غیر ملکیوں نے کبھی تجارت کے نام پر اور کبھی طاقت کے بل بوتے پر اس ملک کا استحصال کیا۔ اقتصادی لوٹ مار کا سلسلہ پندرہویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں کی آمد سے شروع ہوا۔ پھر آئندہ صدیوں میں ولندیزی اور فرانسیسی لوٹتے رہے اور رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کر دی۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک کی اقتصادی بد حالی اخلاقی اقدار کو بھی پامال کر دیتی ہے۔ یہی کچھ ہندوستان میں بسنے والی اقوام کے ساتھ ہوا۔ لیکن اس کی زد میں مسلمان نسبتاً زیادہ آئے۔ کیونکہ انگریزوں کے اقتدار کے بعد شعوری سطح پر مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہر میدان میں آگے بڑھایا گیا اور مسلمانوں کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا گیا۔ غرض عبدالمجید سالک کے مطابق

”مرہٹوں کی بغاوت، سکھوں کی سرکشی، نادر شاہ کا حملہ، دہلی کا قتل عام، احمد شاہ

ابدالی کا معرکہ پانی پت، روہیلوں کا دور، ایرانی و تورانی امراء کی گش کش

بنگال و بہار میں انگریزوں کا تسلط اور پھر سارے ہندوستان پر چھبانا تاریخ

ہند کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ سلاطین و امراء کی نالائقی، علماء کی غفلت و

مداہنت، عمال حکومت کی نمک حرامی اور اخلاق باختگی نے پورے معاشرے

کو عقائد فاسدہ اور اعمال شنیعہ کے گرداب میں غرق کر دیا۔“ (۱)

مسلمانوں کی اس عمومی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی پستی و پسماندگی کا

تقاضیہ تھا کہ ایک بار پھر باعل اور با علم صوفیاء کا ایسا گروہ سامنے آئے جو مسلمانوں کو اس
 بھران سے باہر نکالے۔ کیونکہ دسویں صدی ہجری سے پہلے وہ نامور بزرگ اور صوفیاء جن کا
 ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اپنا فرض ادا کر کے دنیائے فانی سے کوچ کر چکے تھے اور اب
 ان کی وفات سے برصغیر کی اخلاقی اور روحانی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا تھا اس کو پورا کرنے
 کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اب اس باب سے جن بزرگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ وہ اس
 لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اپنے اپنے علاقے میں روحانی اور اخلاقی
 قدروں کی نشوونما میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بلکہ علی طور پر باطل قوتوں کے ساتھ نبرد آزما بھی
 رہے۔ چونکہ ہمارے پیش نظر اس وقت سرزمین ملتان کے صوفیاء کی خدمات اور کارنامے
 ہیں۔ اس لئے یہاں ملتان ہی سے متعلق چند اہم صوفیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے نہ صرف
 ملتان کی تہذیبی زندگی کو متاثر کیا، نہ صرف اپنی تعلیمات سے رشد و ہدایت کی شمع فروزاں رکھی
 بلکہ اپنے علم و ادب کے ذریعے ادبی و فنی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ ادب و شعر میں تصوف اور حقائق
 و معارف کی جو روایت زمانہ قدیم سے اردو زبان میں رائج تھی اس کو بھی آگے بڑھایا۔

صوفیائے کرام کا احوال (ب)

1- حضرت موسیٰ پاک شہید | گیارہویں صدی ہجری کے شروع ہوتے ہی سب سے پہلے جس بزرگ شخص نے دنیائے فانی سے منہ موڑ کر دارالبقاء کا رخ کیا وہ حضرت محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید ہیں جنہیں ان کے سن وفات ۱۰۱۰ھ کی بنا پر دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء میں شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کی ساری زندگی دسویں صدی ہجری کے وسط سے لے کر اختتام تک کے روز و شب میں گزری۔ جیسا کہ معلوم ہے ملتان برس ہا برس تک سلسلہ سہروردیہ کے زیر اثر رہا۔ اسی طرح اودج شریف کا علاقہ چشتیہ اور قادریہ سلسلوں کا محور اور مرکز بنا رہا۔ البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اودج کے تمام اولیاء اور صوفیاء کا تعلق خاص ملتان سے رہا۔ چنانچہ اودج شریف کی تمام نامور شخصیات نے یا تو تعلیم کے حصول کی خاطر ملتان میں قیام کیا یا ملتان کے اولیاء اور صوفیائے کرام سے رشد و ہدایت پا کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ان نامور بزرگوں میں جلال الدین سرخ بخاری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت وغیرہ شامل ہیں۔ بہر حال ملتان اور اودج کے صوفیاء میں ایک خاص قسم کا روحانی اور فکری تعلق رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تصوف کی تاریخ میں اودج ملتان ہی کا ایک حصہ رہا۔ اودج سے ملتان آنے والے نامور بزرگوں میں حضرت موسیٰ پاک شہید کا نام گرامی بڑا اہم اور فضیلت کا حامل ہے۔ آپ کا شجرہ نسب اور سلسلہ طریقت حضرت غوث الاعظم سید محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے نواسہ رسول حضرت سیدنا امام حسن سے جا ملتا ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہید کے ایک جد امجد حضرت شیخ محمد غوث گیلانی خراسان سے

منقل مکانی کر کے اوج تشریف لائے اور یہاں مستقل قیام فرمایا۔ آپ ولی کامل اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ منقول اور معقول کے جامع تھے۔ آپ کے حلقہ عقیدت میں ہند کا حکمران سکندر لودھی اور حاکم ملتان حسین لنگاہ بھی شامل تھے۔ ان کی وفات ۹۲۳ھ میں اوج شریف میں ہوئی۔ ان کے بعد ان کے فرزند مخدوم عبدالقادر ثانی سجادہ نشین بنے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مخدوم سید عبدالرزاق مسند نشین ہوئے۔ ان کا سن وفات ۹۲۲ھ ہے۔ سید عبدالرزاق کے فرزند مخدوم سید حامد المعروف سید حامد گنج بخش^(۱) سجادہ نشین ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ آپ کے مریدوں میں بہاولیوں بادشاہ ہند کے علاوہ حضرت سید داؤد بندگی کرمانی، حضرت شیر شاہ ملتان اور نواب میراں حاکم ملتان شامل تھے۔ ایسے برگزیدہ انسان کے گھر میں ایک برگزیدہ تر انسان حضرت موسیٰ پاک شہید کی صورت میں ۹۵۲ھ میں پیدا ہوا۔ آپ کا پورا نام حافظ محمد جمال الدین موسیٰ پاک تھا۔ فرحت ملتان کے مطابق

”ابو الفضل تاریخی مادہ ہے، سلطان المحققین، عمدۃ الواصلین، قطب العالم

جمال الاسلام القاب ہیں، ابوالحسن کنیت ہے؟ (۲)

کتاب ”بحر السرائر“ از سید سعد اللہ رضوی میں ان کے نام کے ساتھ یہ القاب درج ہیں۔

”سلطان المحققین، عمدۃ الکاملین، اسوۃ الواصلین، قطب العالم، شیخ المشائخ

والاولیاء، سلطان الشہداء وغوث الدنیا والدین، جمال الاسلام والمسلمین،

ابوالحسن شیخ موسیٰ شہید قدس سرہ؟ (۳)

۱۔ بحر السرائر از سید سعد اللہ رضوی، ص ۱۸۷، پر حامد گنج بخش کی بجائے حامد جہاں بخش اور حضرت

موسیٰ پاک شہید کے فرزند کا نام حامد گنج بخش لکھا ہے۔

۲۔ آپ کے سن ولادت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے سب تذکرہ نگار اس سن پر متفق ہیں۔

۳۔ اولیائے ملتان، ص ۸۱، مکتبہ تنویر ادب ملتان، بار سوم، ۱۹۸۴ء۔

۴۔ ”بحر السرائر“ از سید سعد اللہ رضوی فارسی (قلمی نسخہ) ص ۱۸۷، ۱۲۹۱ھ رمضان المبارک

کے چھینے میں خلیفہ محمد امین کاتب نے مکمل کی (۲۰۶، دوہرے صفحات پر مشتمل فوٹو سیٹ کا پی جناب

اسد نظامی کے ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہوئی۔)

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد علوم ظاہری کی تحصیل شروع کی۔ صرف و نحو، کافیہ اور جملہ علوم متداولہ نو عمری میں حاصل کر لیے۔ سلوک کے مدارج بھی والد محترم کی ہدایت میں طے کئے۔ حضرت شیخ حامد نے اپنے فرزند ارجمند کی تعلیم اور تربیت پر خاص توجہ دی۔ "بحر السرائر" میں خود موسیٰ پاک شہید کے حوالے سے لکھا ہے۔

— حضرت والد ماجد رامشغول خاطر بود بفقروہشت سالہ بودم کہ درسنہ

صغیر بخدمت نحمد ہمراہ کردند و از آل وقت در سفر و حضر از خود جدا نمی ساختند

— شب و روز در کفار رحمت و جوار عنایت ایشان تربیت می یافتم

و ہم در آل ایام طفولیت سخنان اس طائفہ و در جان ما ریختہ تربیت باطنی صمیمہ

شفقت ظاہری می خواستند؛ (۱)

اس تعلیم و تربیت کی بدولت حضرت موسیٰ پاک شہید شروع ہی سے ریاضت اور عبادت کے عادی ہو گئے۔ والد ماجد اپنے سامنے بیٹھا کرسات و طائف اور اوراد پڑھاتے۔ ذکر جہر اور اشتغال باطنی کراتے۔ اسمائے الہی اور ادعیہ مسنون کی تلقین کرتے اور تعلیم و تربیت رشد و ہدایت میں کوئی کسر نہ چھوڑتے (۲)۔ غلام سرور لاہوری کے مطابق

"جب باپ کے روبرو انہوں نے تکمیل ظاہری و باطنی پائی تو بخطاب،

جمال الدین ابوالحسن مخاطب ہوئے؛ (۳)

جب حضرت حامد گنج بخش نے آپ کی تربیت کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا تو اپنے بڑے بیٹے سید عبدالقادر کی بجائے آپ کو اپنا جانشین اور خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو اپنا خاص خرقہ مبارک، سجادہ اور انگوٹھی عطا فرمائی۔ حکم چند لکھتے ہیں

"تھوڑے عرصہ میں ہر ایک علم تفسیر و حدیث و فقہ و معانی وغیرہ میں ہوئے اور علم باطنی بھی حاصل کیا۔ والد بزرگوار حضرت سے بڑی محبت رکھتے تھے۔"

۱- "بحر السرائر" فارسی (قلمی) ص ۱۸۷ -

۲- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "بحر السرائر" قلمی، ص ۱۸۸ - ۱۸۹ -

۳- "مدیقتہ الاولیاء" ص ۴۱، تحقیق و تعلق محمد اقبال مجددی، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور۔

بلکہ اپنی حیات میں ہی انہوں نے ان حضرت کو جلے نشین اپنا فرمایا۔ باوجودیکہ
بڑے بھائی ان کا نظام الدین عبدالقادر موجود تھے۔^(۱)

عبداللہ محدث لکھتے ہیں کہ

”شیخ حامد درحالت حیات خود امر خلافت و سجادہ نشینی را بولد شریف

خود سپرد۔“^(۲)

بحر السرائر میں خود حضرت موسیٰ پاک شہید کے حوالے سے لکھا ہے

”..... بعد ازاں خرقہ خاص مبارک دجائے نماز و تسبیح خود و انگشتری کہ

در انامل کامل داشتند و اسناد فرامین اوقات لنگر متبرکہ حضرت غوث الثقلین

و وظائف کہ دہادشاہان متعین کردہ بودند ہمہ را بایں سر و سامان عنایت فرمود۔“^(۳)

موسیٰ پاک کی عمر ابھی چھبیس (۲۶) سال کی تھی کہ ۹۷۸ھ میں آپ کے والد وفات پا گئے

والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی سید نظام الدین عبدالقادر نے جانشینی کا جھگڑا کھڑا

کر دیا۔ یہ جھگڑا اس حد تک بڑھا کہ معاملہ دربار اکبری تک جا پہنچا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں

کو بیرم خاں اور خان خانان کے حکم کے تحت فتح پور سیکری طلب کیا گیا۔ وہاں بڑے بھائی

نے ثبوت کے طور پر اپنے والد کا قرآن مجید، مجموعہ اوراد اور چند تبرکات پیش کئے جبکہ موسیٰ

پاک شہید کے پاس خرقہ مبارک اور انگوٹھی تھی۔ آخر طے پایا کہ جھگڑے کا فیصلہ قرآن مجید

کی روشنی میں کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کھولا گیا تو سورہ القصص کی یہ آیت نکلی کہ

فخرج منها خالفاً يترقب قال رب نجني من القوم الظالمين۔

ترجمہ: پھر نکلا (موسیٰ) وہاں سے ڈرتا راہ دیکھتا، بولا اے رب! خلاص کر مجھ کو اس

قوم بے انصاف سے۔

چنانچہ اس آیت کے معانی کے مطابق فیصلہ موسیٰ پاک کے حق میں ہوا۔ اور ۲۲۔

۱۔ ”تواریخ ملتان“ ص ۸۱

۲۔ ”اخبار الاخیار“ ص ۲۰۶۔

۳۔ ”بحر السرائر“ فارسی (قلمی) ص ۱۹۰

ربیع الاول ۹۸۵ھ کے شاہی فیصلے کے مطابق آپ کو سجادہ نشین تسلیم کر لیا گیا۔ مولانا نور احمد خاں فریدی اس واقعے کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں

”اگرچہ حضرت موسیٰ پاک شہید کو والد بزرگوار اپنی زندگی میں ہی جانشین نامزد

فرما چکے تھے لیکن آپ کے بڑے بھائی سید عبدالقادر نے اس معاملہ میں نزاع

پیدا کیا اور دربار شاہی تک جا پہنچا۔ شہنشاہ اکبر نے ان بزرگوں کو فتح پور سگری

میں طلب کیا اور علماء قضاة اور رؤسائے دربار کو تحقیق و تفتیش پر مامور کیا۔

اراکین مجلس شوریٰ نے فیصلہ آپ کے حق میں لکھ کر دربار میں پیش کر دیا۔ چونکہ

اس واقعے سے دونوں بھائیوں میں شکر بنی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس

لئے بادشاہ نے مصلحتاً سید عبدالقادر کو اپنے پاس رکھا اور حضرت موسیٰ پاک

شہید کو لشکر کے ساتھ دکن بھیج دیا۔ کچھ عرصہ تک سید عبدالقادر فتح پور میں

رہے۔ مگر دربار شاہی کا رنگ ڈھنگ انہیں پسند نہ آیا اور بغیر اجازت لئے

اودھ کو روانہ ہوئے۔ دکن کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت موسیٰ پاک آگرہ آئے

تو بادشاہ نے پانصدی کا منصب عطا کر کے نہایت عزت و احترام کے ساتھ

رخصت کیا۔ آگرہ سے مرخص ہو کر آپ دہلی وارد ہوئے؟“ (۱)

عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ

”وردریں ایام شیخ موسیٰ بعد از زہد و عبادت و مشیخت چنداں سالہ ارادت

متعارف رسمی بہ بادشاہ آورد و شعت سپاہ گری یافتہ و تسلیم نوکری کردہ داخل

امرائے پانصدی شدہ؟“ (۲)

گویا حضرت موسیٰ پاک شہید صرف مذہبی اور روحانی رہنمائی تک محدود نہ رہے۔ بلکہ انہوں نے

عملی طور پر مہمات میں بھی حصہ لیا۔ اور یوں علم کے ساتھ عمل، دین کے ساتھ دنیا اور روحانی مدارج

۱۔ مضمون لجنوزان ”حافظ محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید از مولانا نور احمد فریدی، مطبوعہ امروز،

۳ جون ۱۹۸۳ء (موسیٰ پاک شہید کے عرس کے موقع پر خصوصی ایڈیشن شائع ہوا۔)

۲۔ منتخب التواریخ، جلد سوم از عبدالقادر بدایونی، ص ۹۲، مطبوعہ ایشیا بک سوسائٹی، کلکتہ۔

طے کرنے کے ساتھ ساتھ رزم گاہ حیات میں بھی سرخرو ہوئے۔ آگرہ میں آپ نے بہت عرصہ قیام فرمایا اور پھر وہاں سے دہلی تشریف لے گئے جہاں آپ دنیوی فرائض کے ساتھ ساتھ دین کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ شیخ محمد اکرام کے مطابق

” شیخ موسیٰ گیلانی ایک عرصے تک لشکر شاہی اور دارالسلطنت میں اسلام کا بول بولا کرتے رہے اور کئی شہر نشینوں کو اس بادیہ پیمانی کی بدولت روحانی تازگی اور استقامت نصیب ہوئی۔“ (۱)

دہلی میں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے جید عالم بھی شامل ہیں جنہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بشیر حسین ناظم لکھتے ہیں کہ ” آپ کی صحبت میں وقت کے بڑے بڑے علماء و فضلاء اور عرفا بیٹھا کرتے تھے اور آپ بڑے بڑے نکات اور ادق مسائل بڑے لطیف انداز میں حل فرمایا کرتے تھے۔ جن بزرگوں نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی ان میں سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔“ (۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی معروف تصنیف ” اخبار الاخیار“ میں مرشد سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

” اگر دیگرال کتب اند۔ او قطب الاقطاب است۔ واگر ایشان سلاطین، او سلطان السلاطین محی الدین کہ دین اسلام زندہ گردایند و ملت کفر بمیرایند؟“ (۳)

یہ حقیقت ہے کہ موسیٰ پاک گیلانی دین اسلام کی خاطر جس طرح کام کرتے رہے اس کا اظہار صرف عقیدت کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ آپ واقعی حق گو، بے باک اور نڈر انسان تھے۔ آگرہ اور دہلی میں ان کے قیام کا زمانہ وہی ہے جب اکبر ” دین الہی“ کو مروج کئے ہوئے تھا

۱۔ ” رود کوثر“ از شیخ محمد اکرام، ص ۳۵۰۔ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ساتویں بار ۱۹۷۹ء

۲۔ ” اولیائے حقان“، ص ۹۸، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۳۔ (۱) اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، از عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۶، در مطبع مجتبائے دہلی

۱۳۳۲ھ (۲) بحر السرائر (قلمی)، ص ۱۹۵۔

اگرچہ تاریخوں سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ حضرت موسیٰ پاک شہید نے عملی طور پر اس دین کے خلاف کوئی اقدام کیا یا اس کے خلاف کوئی فتویٰ دیا۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ اکبر کی موجودگی میں دیوان خانہ خاص و عام میں نماز کے وقت خود آذان دے کر باجماعت نماز پڑھاتے مگر کسی کو آپ کو ٹوکنے کی جرأت نہ ہوتی۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ

”در حضور بادشاہ در عین دیوان خانہ خاص و عام اگر وقت نماز می رسید خود آذان گفتہ نماز بحضور خلیفہ وقت بہ جماعت می گزارد۔ و بیچ کس چیزے نمی توانست گفت۔“ (۱)

موسیٰ پاک گیلانی نے کچھ عرصہ دہلی میں قیام فرمایا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا پھر وہاں سے اُدبج کی جانب روانہ ہو گئے۔ نور احمد فریدی کے مطابق

”شیخ (عبدالحق محدث دہلوی) کی دیکھا دیکھی دہلی شہر کی ہزاروں سعید روہیں بھی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئیں۔ چند یوم یہاں قیام کرنے کے بعد آپ اُدبج کو روانہ ہوئے اور والد ماجد کی آرام گاہ پر حاضر ہو کر مرقد اطہر کی خاک پاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا اور پھر ان کی مسند پر بیٹھ کر رشد و ہدایت کا دروازہ کھول دیا“

موسیٰ پاک کا دور بڑی افزائیزی اور بے چینی کا تھا۔ پورے ملک میں طوائف الملوک بھیلی ہوتی تھی۔ قزاقوں نے ہر طرف لوٹ مار اور راہزنی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس سے لوگ بڑے خوف اور انتشار کا شکار تھے۔ موضع منگے ہٹی میں آپ کے مریدوں کی ایک بستی پر ایک مرتبہ قزاقوں نے حملہ کیا۔ ”بحر السرائر“ میں لکھا ہے کہ

”..... قوم لنگا ہاں جمع شدہ در شب برائی غارت برآں دہ افتادند

آنحضرت بسبح شود شراز خادمی پر رسیدند اعرض کرد کہ لنگا ہاں دہ را غارت

می کند فرمودند ^{ایشان} صبح شد و زمان وصال آمد۔ حضرتش سوار بر فسیل شدند و خود را

بپند کس معدودہ میاں آل؟ رسانید — آں با مجرد دیدن سواری حضرتش

۱۔ منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۹۲۔

۲۔ مضمون بعنوان ”حافظ محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید“ مطبوعہ امرتسر، ۳ جون ۱۹۸۳ء۔

او بہ ہر میت نہادند و گریختند، دریں اثنا از دست سلطان نام لنگاہ تیرے بوجود کرامت آموز بجالی پہلو مہارکش رسیدہ بحق پیوست شد۔" (۱)

چنانچہ اسی تیر کی وجہ سے آپ نے شہادت پائی۔ آپ کی تاریخ وفات چہار شنبہ شعبان ۱۰۱۰ھ^(۲) ہے۔ پہلے آپ کو آپ کے والد کے پہلو میں اُدوج میں دفن کیا گیا۔ لیکن ۱۵ سال بعد آپ کے صاحبزادگان سیدیحیٰ اور سیدعیسیٰ نے ان کی نعش کو منگوہٹی منتقل کر دیا۔ پھر وہاں سے ان کے فرزند سید مخدوم حامد گنج نے جو ملتان میں رہتے تھے آپ کی نعش وہاں سے نکلوا کر ملتان میں پاک دروازے کے پاس دفن کرائی اور حضرت موسیٰ پاک شہید کی نسبت سے یہ علاقہ پاک دروازہ کہلوا یا۔

موسیٰ پاک شہید کے چار بیٹے تھے۔ سید حامد گنج بخش، سیدیحیٰ، سیدعیسیٰ اور سید جان محمد ان میں سے بڑے صاحبزادے سید حامد گنج بخش کو اپنی زندگی میں خلافت اور سجادگی سپرد کی اور اشتغال باطنی و ادضاع ظاہر بھی ان کو تفویض کئے۔ "بحر السرائر" کے مطابق "در حالت حیات خود امر خلافت و سجادگی بخلف اعظم خود بندگی شیخ الاسلام..... شیخ حامد گنج بخش سپرد جمیع لوازم و توابع ایس امر شریف را از اشتغال باطنی و ادضاع ظاہر بحضرت ایشان تفویض فرمودند۔" (۳)

۱۔ بحوالہ "بحر السرائر" قلمی، ص ۱۹۷۔

۲۔ بحوالہ (۱) تواریخ ملتان از حکم چند، ص ۸۱ (۲) اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۹۹، جبکہ مرتق مولتان از اولاد علی گیلانی، ص ۲۱۷، پر وفات کے وقت ان کی عمر ۵۸ سال بتائی گئی ہے۔ اس طرح کسن ولادت کے مطابق کسن وفات ۱۰۱۰ھ بنتا ہے۔ البتہ رود کوثر از شیخ محمد اکرام میں ص ۳۵۱، پر ۱۰۰۲ھ لکھی ہے۔ جبکہ فرحت متانی نے اولیائے ملتان، ص ۸۲، پر غلام سرور لاہوری نے حدیقۃ الاولیاء میں ص ۴۱، پر اور مسعود حسن شہاب نے "خط پاک اُدوج" میں ص ۳۱۸، پر کسن وفات ۱۰۰۱ھ لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ آپ کے تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وفات کے وقت عمر ۵۸ سال تھی اور کسن ولادت ۹۵۲ھ تھا اس کے مطابق آپ کا کسن وفات ۱۰۱۰ھ درست ہے۔

۳۔ "بحر السرائر" ص ۱۹۸۔

آپ کا اور سید بچپنی کا مزار بھی پاک دروازے کے پاس ہے۔ موسیٰ پاک شہید کے چوتھے بیٹے سید جان محمد دہلی چلے گئے تھے۔ ان کا مزار دہلی میں ہے۔ حضرت موسیٰ پاک شہید کی اولاد میں سے ان کے بڑے بیٹے اور خلیفہ سید حامد گنج بخش کے فرزند نواب سید موسیٰ پاک دین کو بھی پاکیزگی اور بزرگی کے لحاظ سے مرتبہ بلند حاصل ہوا۔ ان کا شمار بھی گیارہویں صدی ہجری کے بزرگوں میں ہوتا ہے۔ آپ کا اصل نام ابو الغیاث سید فتح علی تھا۔ اور والدہ محترمہ کا نام امۃ الرزاق فاطمہ — آپ قابل، ذہین دیر اور بہترین منتظم تھے۔ آپ کی قابلیت اور حسن تدبیر سے متاثر ہو کر شاہجہاں نے ۱۰۶۸ھ میں ملتان کی صوبیداری آپ کے سپرد کی تھی۔ بقول بشیر حسین ناظم "آپ علم و فضل کا مرقع تھے۔ ان کے عرفان و کمال کے پیش نظر شاہ ہند شاہجہاں نے کئی جاگیریں اور وظائف دے رکھے تھے۔ آپ کے پوتے حضرت سید عبدالرزاق کو بھی منصب نوابی عطا ہوا۔ لیکن انہوں نے قبول نہ فرمایا۔"

موسیٰ پاک دین نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی اور موسیٰ پاک شہید کے روضے ہی میں غزنی پہلو کی جانب دفن ہوئے۔

محمد بسطین رضا گیلانی از اولاد حضرت موسیٰ پاک شہید نے خود اپنے ہاتھ سے بحر السرائر (قلمی) کے ابتدائی صفحوں پر حضرت موسیٰ پاک شہید کے حالات زندگی اور کارناموں کے بارے میں مختصر طور پر لکھا ہے، اس مضمون میں درج ہے کہ

"شیخ الكل (حضرت موسیٰ پاک شہید مراد ہے) نے ملتان میں سادات حنیہ قادریہ کی ایک ایسی مسند ارشاد کی بنیاد رکھی جس نے ایک مستقل دینی، ملی اور ادبی انسٹیٹیوشن کی حیثیت اختیار کر لی۔

جس نے نہ صرف ایک ایسی مذہبی و روحانی درسگاہ کا کام کیا جہاں دینیات خصوصاً علم الحدیث کا اہتمام کیا گیا بلکہ اہل ملتان تو کجا ترکستان، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں سے آنے والوں کے لئے تہذیب، اخلاق اور تعمیر کردار کی تربیت گاہ کا بھی فریضہ سرانجام دیا اور اس انسٹیٹیوٹ

کے نامور فارغ التحصیل شاگردوں کے قول و عمل سے ہزاروں کم گشتگان کو
صراطِ مستقیم نصیب ہوا اور یہ سب اس ادارہ کے ناظم اعلیٰ حضرت شیخ اکل
موسیٰ پاک شہید گیلانی کی عظمت و کرامت کا اعجاز تھا۔^(۱)

لیکن کسی تاریخ یا سوانحی کتاب میں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ واقعی حضرت
موسیٰ پاک شہید ملتان میں قیام پذیر رہے اور انہوں نے کوئی مدرسہ قائم کیا یا تربیتی ادارہ
بنایا۔ اس لئے اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ
ملتان میں حضرت موسیٰ پاک شہید کا روحانی سلسلہ ان کی اولاد کی بدولت ابھی تک جاری ہے
حضرت موسیٰ پاک شہید کی ایک تصنیف "تیسیر الشاغلیں" کے نام سے موجود ہے میرے
پاس مطبع صدیقی فیروز پور کا چھپا ہوا نسخہ (۱۳۰۹ھ) موجود ہے۔ یہ کتاب تین ابواب پر
مشتمل ہے۔ ہر باب میں چھ فصلیں ہیں۔ ابواب کی تفصیل یوں ہے۔

- ۱۔ باب اول ، اس میں اذکار و ادعیہ صلوٰۃ وغیرہ کا بیان ہے۔
- ۲۔ باب دوم ، میں نماز ہائی سنن وغیر موقتہ کا ذکر ہے۔
- ۳۔ باب سوم ، آداب تلاوت قرآن و بیان روش اذکار جہر و شغل باطن
و ذکر خفی و ذکر مراقبہ کے بارے میں ہے۔

اس کتاب میں ان باتوں کا بیان ہے جو حضرت موسیٰ پاک شہید کے آباؤ اجداد سے
روایتاً چلی آتی تھیں۔ تیسیر الشاغلیں تصوف پر ایک قابل قدر کتاب ہے جسے سلسلہ قادریہ کے
نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔

تیسیر الشاغلیں — دراصل عبادات اور حصول روحانیت کے طریقوں پر مشتمل ہے
اس میں مختلف اوراد اور دعائیں درج کی گئی ہیں۔ ساری باتیں آب زر سے لکھنے کے لائق
ہیں۔ محبوب حقیقی کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی اطاعت کے نسخہ ہائے کیمیا درج ہیں
مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ذکر حق زبان پر ہونا چاہیے تاکہ تجھ پر لمحہ
بہ لمحہ تازہ بہ تازہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں، الفاظ یہ ہیں

۱۔ بحوالہ قلمی مضمون بحر السرائر (قلمی) کے ابتدائی صفحوں میں لکھا ہوا، از سبطین رضا گیلانی،

ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، دربار پیراں پیر صاحب ملتان۔

”باید کہ در آمد و رفت و برخواست و نشست و ہر طور کہ باشی ز بانٹ بند کر حق تر باشد
تارحمت ہائے تو تازہ بے اندازہ دم بدم بر تو نثار شود خصوصاً نیم شب و آخر
شب و وقت سحر پاسداری کہ این وقت محمود است“۔ (۱)

اسی طرح شب بیداری اور عبادت گزار کی کا ذکر ایک اور جگہ یوں کیا ہے
”نیم شب و آخر شب کہ بر خیزی بند کر کش آوزمی کہ این وقت محمود است
— باید کہ نیم شب و سحر گاہ با استغفار و دعا و بنالہ باشی کہ اثر سے عجیب

دارد“ (۲)

ایک اور جگہ درج ہے کہ

”عملے کہ بے موافقت دل بود ویرا نزد حق تعالیٰ جل و علا قدرے نیست و بشاغل

فائدہ نہ ہد“ (۳)

یعنی وہ عمل جو دل کی رغبت سے نہ کیا جائے خدا کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔ جب کسی کو عبادت
و ریاضت کا زعم ہو جائے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے
حضرت موسیٰ پاک شہید ایسے شخص کو نہج اسلام سے مردود قرار دیتے ہیں۔ ایسے شخص کے
بارے میں فرماتے ہیں

”..... پندارد کہ مقصد اعلیٰ ازیں کسب این ست کہ یقرب شیطان و فرود

او مغرور گردد و بدیگرے بنظر حقارت نگردد۔ نعوذ باللہ“۔ (۴)

آگے چل کر اسے توبہ استغفار کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقوال ادب کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے
ہیں کہ یہ تحسین اقوال اور تہذیب افعال کا نام ہے پھر افعال کی دو اقسام بتاتی ہیں۔ ایک کا تعلق ظاہر

۱۔ تیسیر الشاغلین، مصنفہ حضرت موسیٰ پاک شہید، ص ۳۔ حسب فرمائش منشی غلام محی الدین خاں

قادری مطبع فیروز پور۔ ۱۳۰۹ھ

۲۔ ایضاً ص ۳۸

۳۔ ایضاً ص ۲۶

۴۔ ایضاً ص ۵۵

کے ساتھ اور دوسرے کا باطن کے ساتھ اور دونوں کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے، فرماتے ہیں
 "لفظ ادب عبارت است از تحسین اقوال و تہذیب افعال و افعال دو قسم اندر
 افعال قلوب و آنرا انیات خوانند، و افعال قوالب و آنرا اعمال خوانند و اخلاق
 دنیات بیاطن تعلق دارد۔ و اقوال و افعال بظاہر نسبت دارد، پس مرد درست
 آنست کہ ظاہر و باطن و قول و فعل و نیت او بہ حسن اخلاق آراستہ بود۔ چہ خلقش
 مطابق قول وی بود و نیتش موافق عمل چنانکہ نماید باشد و چنانکہ باشد نماید؟" ۵
 حضرت موسیٰ پاک شہید نے حفظ آداب کو صحبت کا ثمر بھی قرار دیا اور تحم بھی فرمایا

"حفظ آداب ہم ثمرہ محبت است و ہم تحم محبت؟" (۲)

غرض یہ کتاب اس قسم کی خوب صورت باتوں سے پُر ہے۔ دلچسپ اور پُر لطف لیکن سنجیدہ
 اسلوب میں لکھی ہوئی یہ کتاب علم و اخلاق اور رشد و ہدایت کا انمول خزانہ ہے۔ ان باتوں پر
 عمل کر کے انسان دین و دنیا میں سرخرو ہو سکتا ہے۔

۱۔ تیسیر الشاہ علیین، مصنفہ حضرت موسیٰ پاک شہید، ص ۶۶ - ۶۷۔

۲۔ ایضاً ————— ص ۶۷۔

حافظ محمد جمال ملتانى

مناقب المحبوبين میں لکھا ہے کہ
 ”جب حضرت قبلہ عالم (خواجہ نور محمد مہاروسی) دہلی گئے ہوئے تھے اور
 ایک دن حضرت مولانا صاحب (مولانا فخر الدین دہلوی) کی مجلس میں حافظ صاحب

۱۔ اٹھارہویں صدی ہجری میں پنجاب میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو پھیلانے میں سب سے اہم
 کردار خواجہ نور محمد مہاروسی نے ادا کیا۔ آپ کے خلفاء کی تعداد اتنی زیادہ تھی اور ان سب کا اثر اتنا
 ہمہ گیر تھا کہ یہ سلسلہ دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔

شاہ نور محمد ۱۲۱۴ رمضان المبارک ۱۱۲۲ھ کو قوم کھرن میں چوٹالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ابھی چھوٹے
 تھے کہ آپ کے والد نے چوٹالہ چھوڑ کر مہار میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ پانچ سال کی عمر میں حافظ مسعود
 صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد موضع بڈیراں، موضع بیلانہ، ڈیرہ غازی خاں، لاہور
 اور دہلی میں تحصیل علم کیا۔ انہی دنوں آپ کی ملاقات شاہ فخر الدین دہلوی سے ہوئی جن سے آپ نے
 قطبی کا درس لینا شروع کیا۔ ۱۶۶۵ھ میں قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر آپ نے شاہ
 فخر الدین سے بیعت کی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ مرشد کے ساتھ مہار اور پھر پاک پٹن رہے۔ پھر
 شاہ فخر جہاں نے آپ کو مہار شریف میں مستقل رہائش کا حکم دیا۔

مہار شریف میں آپ نے خانقاہ قائم کی اور تلیقن و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کی مغل میں
 دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے اور فیض پاتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں کے
 تربیت ان کے مزاج کے مطابق کرتے تھے۔ تکملہ سیرالادبیار میں لکھا ہے کہ ”مریدوں کی تعلیم
 و تربیت کا طریقہ عجیب و غریب تھا۔ جس طرح حکیم مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ درجہ حرارت اور
 بروقت مرض کو سمجھتا ہے اور اس کے ازالے کے لئے گرم یا سرد مزاج کی مناسبت سے دوا تجویز
 کرتا ہے اس طرح ذات مبارک ہر شخص کو اس کے مناسب حال اشغال کی تلیقن فرماتے۔
 (تکملہ سیرالادبیار (اردو ترجمہ) از مولوی گل محمد احمد پوری، ص ۱۲۵۔)

آپ کے خلفاء اور مریدین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ تقریباً سارے پنجاب میں پھیلے
 ہوئے ہیں۔ ”مناقب المحبوبین“ (فارسی، قلمی، ص ۴۴، پر لکھا ہے، (باقی بر صفحہ ثانی)

(حافظ محمد جہاں متانی) کے ساتھ موجود تھے، تو یہ بات چلی کہ ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا کی عظمت کے سامنے کسی ولی کا تصرف نہیں چلتا۔ حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ "اے میاں نور محمد! اب تک ملتان کی ولایت حضرت بہاء الدین زکریا کے سپرد تھی۔ مگر اب ملتان ہمارے سپرد ہو گیا ہے۔ لازم ہے کہ اپنے مریدوں سے ایک مرید اس جگہ بھیجیں اور کہیں کہ عین خالقاہ بہاء الدین زکریا ملتان میں خلق کو بیعت کریں۔ جب حضرت قبلہ عالم (خواجہ نور محمد ہماروسی) دہلی سے ہمارے شریف واپس آئے تو حافظ جمال الدین کو خلافت دے کر ملتان کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے مولوی خدا بخش متانی کو جوان کے نامور خلفا میں سے تھے۔ عین حضرت بہاء الدین زکریا کی خالقاہ میں مرید کیا۔" (۱)

(بقیہ گذشتہ صفحہ) "حضرت قبلہ عالم راجہ خلیفہ مجازین دیگر مریدان کامل و صاحب نسبت ہم بسیار بودند" اپنے ۳ ذی الحج ۱۲۰۵ھ میں وفات پائی۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

حیف داویلا جہاں بے نور گشت (۱۲۰۵ھ)

آپ کا مزار تاج سرور میں ہے۔ آپ کے خلفاء میں حافظ محمد جمال، شاہ سلیمان تونسوی، شیخ نور محمد نارو والہ، میاں غلام حسین بھٹی، مولوی نور محمد بہاؤ پوری، قاری عزیز اللہ، قاری صبغت اللہ، نواب لطف اللہ خاں، مخدوم نوبہار اوچی، شیخ جمال حشمتی فیروز پوری، مولوی تاج محمد ساکن گڑھی حافظ عظمت میرن شاہ قابل ذکر ہیں۔ خواجہ خدا بخش ٹامیوالی بھی اپنے مرشد حافظ محمد جمال کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض حاصل کرتے رہے۔ نور محمد ہماروسی کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) مناقب المحبوبین (فارسی) قلمی (۲) تکلمہ سیر اللادیا (فارسی) از مولوی گل محمد احمد پوری، ص ۱۲۱ تا ۱۳۰، مطبوعہ در مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ (۳) مشائخ چشت، ص ۵۴ تا ۵۶ (۴) گلشن ابرار (فارسی قلمی) (۵) خلاصۃ الفوائد فارسی قلمی از قاضی محمد عمر حکیم (خواجہ نور محمد ہماروسی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جناب اسد نظامی سے حاصل ہوا۔)

۱۔ بحوالہ (۱) مناقب المحبوبین، از حاجی نجم الدین سلیمانی، مترجم پروفیسر افتخار احمد حشمتی، ص ۱۳۱-۱۳۲، مطبوعہ اسلامک بک

ناؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۹ء (۲) گلشن ابرار فارسی (قلمی) ص ۳۹۹، پر یہ واقعہ درج ہے۔

گو یا ملتان پر صدیوں سے قائم سہروردی سلسلے کے ساتھ ساتھ پہلی بار حافظ محمد جمال کی بدولت ملتان میں چشتیہ سلسلے کی مقبولیت بھی شروع ہوئی۔ یوں حافظ محمد جمال ملتان بارہویں صدی ہجری میں ملتان میں سلسلہ چشتیہ کے باقاعدہ پہلے اہم بزرگ قرار پاتے ہیں۔ انہوں نے ملتان میں رہ کر اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور نہ صرف اپنی علمی اور روحانی قابلیت سے دوسروں کو فیض یاب کیا بلکہ احیائے اسلام کے لئے عملی طور پر بھی جہاد کیا اور ساری زندگی سکھوں کے خلاف صف آراء رہے۔ آپ کے والد کا نام محمد یوسف ولد حافظ عبدالرشید تھا۔ اعوان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے دادا اعوان کاری سے ہجرت کر کے ملتان شہر میں قلعہ کے مشرقی حصے میں آکر سکونت پذیر ہوئے جہاں آج کل حافظ محمد جمال کا روضہ ہے۔ جن دنوں آپ کے والد ملتان ہجرت کر کے آئے اس وقت یہاں پر سلطنت دہلی کی طرف سے میاں ابوالقاسم اور ابوالہاشم حاکم تھے۔ آپ کے والد ان کے معتمد وزیر تھے۔ چونکہ یہ دونوں حضرات بے اولاد تھے اس لئے انہوں نے محمد یوسف کو اپنی جائیداد کا وارث بنایا^(۱)۔ آپ کے والد کا ذریعہ آمدنی تجارت تھا۔ منشی غلام حسن شہید کے مطابق

”قبلہ گاہ آل حضرت معاش خود بہ تجارت بسرے برد“ (۲)

۱۔ آپ کے خاندان کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے۔ جو تھوڑی بہت باتیں ملتی ہیں ان کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) گلزارِ جمالیہ اُردو ترجمہ ”انوارِ جمالیہ“ از عبدالعزیز پرباروی مترجم فقیر محمد برخوردار، ص ۵۔ مطبع ادا اللہ اگروہ، ۱۳۲۵ھ۔ اصل کتاب عربی میں ہے مترجم نے فارسی اور اُردو میں ترجمہ کر کے اصل عربی عبارت کے ساتھ اسے شائع کر دیا ہے۔ (۲) ”گلشن ابرار“ (فارسی قلمی) از مولانا امام بخش، اُردو ترجمہ بعنوان ”حقیقت الاخیار“ مترجم صالح محمد تونسوی، مطبوعہ صدیقیہ پریس۔ (۳) نورِ جمال (سرائیکی) از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۵۔

۲۔ ”انوارِ جمالیہ“ فارسی (قلمی) از منشی غلام حسن شہید لقمہ اللہ بخش مرید غلام حسن شہید، (۱۲۴۵ھ میں لکھی گئی) ملکیہ جناب فیض الحسن سجادہ نشین خانقاہ حضرت شہید (جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی دساتل سے دستیاب ہوئی۔

محمد یوسف نے ساری عمر ملتان میں گزاری۔ یہیں ان کے گھر ۱۱۶۰ھ میں حافظ محمد جمال پیدا ہوئے
حافظ محمد جمال بچپن سے ہی لائق اور ذہین تھے۔ آپ نے چھوٹی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا
اور درسی علوم کتاب دائرۃ الاصول تک مکمل پڑھ لی تھی۔ پھر معقولات و منقولات کی تعلیم لینی
شروع کی۔ ”انوار جمالیہ“ کے مطابق

”چوں ذات جامع الصفات آنحضرت از دولت حفظ کلام مجید بہرہ یاب
سعادت گشت بر کسب علوم معقول و منقول کمر جہد محکم بست“ (۲)

آپ کی ذہانت اور قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے ایک ہم مدرس مولوی محمد حسین
نے آپ کو علامۃ العصر^(۳) کہا۔ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں کہ

”نہایت ہی دقیق اور مشکل مسائل میں از روئے فکر آپ احسن الناس تھے
جب ہمیں کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ پیش ہوتا گو وہ کسی علم کا ہو ہم آپ کی طرف
رجوع کرتے آپ اس کے حل اشکال میں ایسی واضح اور اچھی تقریر فرماتے
کہ جس سے بہتر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور ہے۔ آپ تحصیل علم کے وقت یعنی
طالب علمی میں علم و ذکاوت میں تمام طلباء سے افضل و اکمل سمجھے جاتے۔
ادراک علوم میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ تمام مدارس میں مستثنیٰ خیال کئے جاتے

۱۔ ”نور جمال“ از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۱۷، مطبوعہ سرایتی ادبی بورڈ ملتان ۱۹۷۲ء۔ حافظ
محمد جمال کی سنہ پیدائش کے متعلق اختلاف ہے۔ ”ظہور جمال“ مرتبہ مخدوم زادہ محمد سلیم جمالی، ص ۱۳۔
مطبوعہ جمال لائبریری ملتان میں ۱۱۶۲ھ درج ہے۔ جبکہ عمر کمال خاں نے اپنی کتاب ”نواب مظفر خان
شہید اور اس کا عہد“ ص ۲۸۱، مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان میں سنہ پیدائش ۱۱۲۵ھ لکھا ہے جو کہ
قرین قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ کا سن وفات ۱۲۲۶ھ کے مطابق، جس پر آپ کے تمام
تذکرہ نگار متفق ہیں۔ آپ کی عمر ۱۰۱ سال بنتی ہے۔ حافظ صاحب کی اتنی طویل عمر کا ذکر کہیں نہیں ملتا
۲۔ ”انوار جمالیہ“ قلمی فارسی، ص ۶۔

۳۔ ۷، گلشن ابرار (ترجمہ) ص ۱۶۲۔ (۲) مشائخ چشت، از

خلیق نظامی، ص ۶۰۰۔

مناظرہ و مباحثہ کا یہ حال تھا کہ جو معارضہ میں آتا آخر خاموشی و ندامت حاصل

کرتا۔ کتاب دائرۃ الاصحاب تک علم حاصل کیا تھا۔^(۱)

حافظ محمد جمال نے خواجہ نور محمد بہاروی سے بیعت کی تھی۔ اس بیعت کا سلسلہ حسن بصری

تک پہنچتا ہے۔ "انوارِ جمالیہ" فارسی (قلمی) از منشی غلام حسن شہید میں جو سلسلہ درج ہے

وہ اس طرح ہے۔

حسن بصری

خواجہ ابوالفضل عبدالواحد ابن زید رضی

سلطان ابراہیم ادہم

خواجہ سدیدین حدیفۃ المرعشی رضی

خواجہ امین الدین ابی ہبیرۃ البصری رضی

خواجہ عمشاد علو دینوری رضی

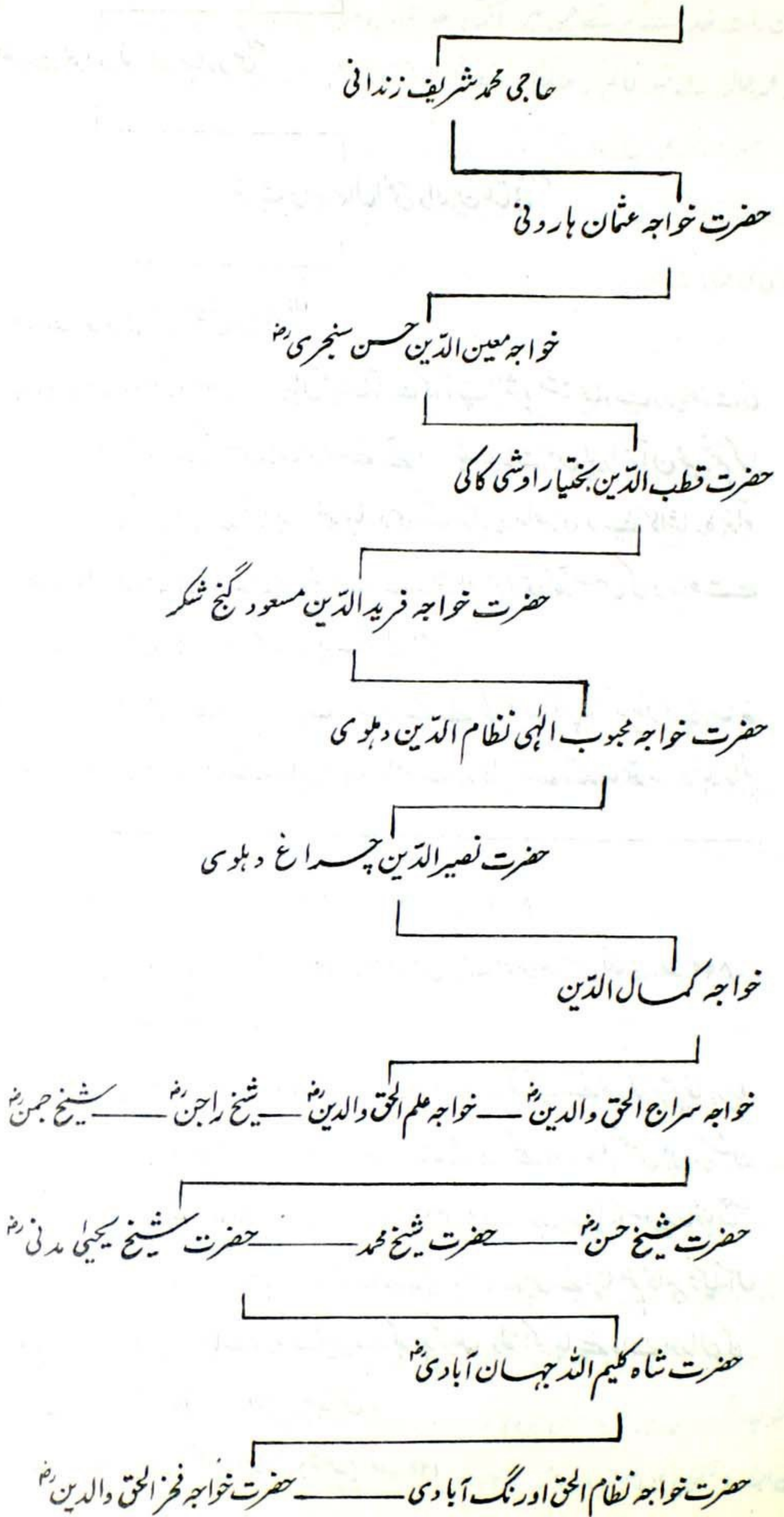
خواجہ ابواسحاق شامی چشتی

خواجہ قطب الحق والدین حضرت خواجہ عبدالصمد

خواجہ ناصر الحق والدین ابی محمد بن ابی احمد الجشتی رضی

خواجہ ابویوسف چشتی رضی - مودود چشتی رضی

۱۔ "گلزارِ جمالیہ" اردو ترجمہ "انوارِ جمالیہ" مترجم قاضی محمد بر خوردار، ص ۸۷۷۔



حضرت خواجہ نور محمد ہبارویؒ

حضرت خواجہ جمال الحق والدین ملتانیؒ

حضرت مولوی خدا بخش ملتانیؒ

آپ کی بیعت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اکثر و بیشتر عبادت و ریاضت کی خاطر شاہ رکن عالم کے مزار کے پاس رات گزارتے تھے اور ایک رات میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے۔ ایک رات آپ کو خواب میں خواجہ نور محمد ہباروی کے مزار پر حاضری دینے کا اشارہ ہوا تو آپ ہمارے شریف خواجہ نور محمد کی خدمت میں تشریف لے گئے اور مولوی محمد حسین کی وساطت سے ان سے ملاقات کی اور ان کے دست حق پر بیعت کر لی۔^(۲)

خواجہ نور محمد ہباروی نے مزید تربیت دینے کے لئے کچھ عرصہ آپ کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھا۔ سفر حضر میں بھی ساتھ لے جاتے۔ جہاں آپ ریاضت اور مجاہدے کے ساتھ ساتھ قیلہ عالم

۱- "انوارِ جالیہ" فارسی (قلمی) از منشی غلام حسن شہید، ص ۳، ۴۔

۲- (۱) مناقب المحبوبین (ترجمہ) ص ۱۳۱- (۲) مشائخ چشت از علامہ خلیق نظامی، ص ۵۹۹۔

(۳) گلشن ابرار (ترجمہ) ص ۱۶۱، ۱۶۲۔

حافظ محمد جمال جب خواجہ نور محمد ہباروی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے خود کو کم علم ظاہر کیا لیکن آپ کے ہم مدرس مولوی محمد حسین نے بتایا کہ آپ بہت پڑھے لکھے اور عالم شخص ہیں۔ یہ سن کر خواجہ نور محمد ہباروی نے پوچھا کہ حافظ صاحب! آپ نے اپنا علم ہم سے کیوں چھپایا۔ اس پر حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں نے سنا تھا کہ آپ فقراء و علماء سے نفرت کرتے ہیں اس لئے میں نے اپنا علم ظاہر کیا۔ اس پر خواجہ نور محمد ہباروی نے فرمایا کہ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ ہم تو علماء و فقراء کو چاہنے والے اور ان کی قدر کرنے والے ہیں۔ ("نور جمال" از ڈاکٹر مہر عبدالحق)

حوالے کے لئے دیکھئے "گلشن ابرار" (ترجمہ) ص ۱۶۲

کی دن رات خدمت کرتے جن میں آفتابہ بھرنا اور وضو کرنا بھی شامل ہے۔^(۱) ساتھ ہی ساتھ حافظ محمد جمال نے قبلہ عالم کی خانقاہ کے لنگر کا انتظام بھی سنبھال لیا تھا۔

حضرت نور محمد ہماروسی وقتاً فوقتاً ان کی قابلیت و اہلیت کا امتحان لیتے رہتے تھے۔ حافظ جمال اللہ ان کی خدمت اور فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ یہاں تک کہ حضرت نور محمد ہماروسی کی عنایات ان پر بڑھتی گئیں۔ گلشن ابرار (قلمی) میں لکھا ہے

”..... چون آنحضرت جمال اللہ بخدمت حضرت قبلہ عالم در سفر و حضر بجان میگو

شید آل حضرت قبلہ بنا برا عطاء نعمت باطنی — امتحان قابلیت

واہلیت این معنی نمود ہر گاہ بفضلہ تعالیٰ در ولایت تمام و کامل عیارے دید با

عطاء نعمت سرفراز فرمود“ (۲)

کچھ عرصہ اسی طرح آپ قبلہ نور محمد ہماروسی کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد انہوں نے آپ کو رشد و ہدایت کی خاطر ملتان واپس جانے کا حکم دیا۔ ملتان جا کر آپ نے بہار الدین زکریا کی خانقاہ میں بیٹھ کر سب سے پہلے مولوی خدابخش کو مرید کیا۔ مجاہدے اور ریاضت کی بدولت روحانیت کو ترقی دی، خلقت جوق در جوق ان کی خدمت میں آنے لگی۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے علماء ان کے آستانے پر حاضری دینے لگے۔ گلشن ابرار فارسی (قلمی) میں لکھا ہے،

”بمجاہدات شاقہ و ریاضیات حاقتہ قالب عنصری رامیفر سود و لطافت روحانی سے

افزود تا آنکہ کار بجائے رسید کہ عالمی بدامن فیض میامن آنجناب اعتصام گزید

و خلقتی در سایہ رحمتش بیار امید..... علمائے کبار کہ غلفہ کو کس علو درجت

ایشال بہ سامعے زمین و زمان رسیدہ بود در حضرتش کسب علوم ظاہر و باطن

۱۔ ”مناقب المجدوبین“ (ترجمہ) میں لکھا ہے کہ..... ”مدت تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں لوٹا

اٹھانے اور وضو کرنے کی خدمت انجام دیتے رہے۔“ (ص ۱۳۱)

۲۔ بحوالہ ”گلشن ابرار“، ص ۲۲۹۔ خواجہ نور محمد ہماروسی نے حافظ جمال کے صبر اور جوصلے کا امتحان

کئی جگہ لیا۔ لیکن آپ ہر آزمائش میں پورے اترے۔ صبر اور جوصلے کے امتحان کے کئی واقعات

گلشن ابرار (قلمی) میں صفحہ ۲۲۸ تا ۲۳۳ میں درج ہے۔

نمودند: (۱)

ملتان میں آپ نے ایک دینی مدرسہ قائم کر کے خود ہی وہاں قرآن مجید، حدیث، فقہ اور تفسیر کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس مدرسے کا شمار ملتان کے اچھے مدرسوں میں ہوتا ہے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے بھی کچھ عرصہ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"بندہ دو سال تک ملتان میں کسب علم کرتا رہا ہے اور آپ کے فیض صحبت سے مستفیض ہوا ہے" (۲)

آپ لوگوں کو قرآن پاک کی آیات اور احادیث مبارک کے متعلق تفصیل سے بتایا کرتے تھے آپ علم و ذکاوت میں برتر تھے۔ دقیق اور مشکل مسائل کو بیان کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کی محفلوں میں علم و فلسفے کے باریک سے باریک مسائل پر بحث ہوتی اور آپ بڑی تفصیل وضاحت اور روانی کے ساتھ آسان لفظوں میں ان کے جواب دیتے۔ بحث و مباحثے اور مناظرے میں بھی آپ کسی سے کم نہ تھے۔ مسئلہ وحدت الوجود خاص طور پر آپ کا موضوع تھا۔ "انوار جمالیہ" میں لکھا ہے کہ

"حافظ ممدوح مسئلہ وحدت الوجود میں اجل العلماء تھے۔ آپ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ عبدالرحمن جامی قدس سرہما کی کتابوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔ نیز نفحات الانس، مثنوی شریف، لوائح جامی، اشعۃ اللمعات، الفقرات اور فصوص الحکم طیب خاطر تھیں۔ فصوص الحکم کا فص محمدی تو خصوصی طور پر پسند تھا یہاں تک کہ فص محمدی کو اگر کوئی آپ کے سامنے پڑھتا تو آپ وجد میں آکر کھومتے اور دونوں لبوں کو ازراہ تلمذ چومتے۔ جب اپنے کسی مرید کو مذکورہ بالا کتب میں سے کسی ایک کتاب سے مسئلہ وحدت الوجود کا درس دیتے تو ایسے مسائل بیان فرماتے کہ عقول و افکار حیران و ششدر رہ جاتے۔ مجھے اپنی عمر

۱- "گلشن بہار" فارسی قلمی، ص ۲۳۲ -

۲- بحوالہ "تکملمہ سیرالاولیاء" از خواجہ گل محمد احمد پوری مترجم مسعود حسن شہاب، ص ۱۵۳

مکتبہ الہام، بہاولپور۔

کی قسم کہ آپ علم کا بحرِ فخر تھے۔ اور ایک ادنیٰ سے لفظ سے بھی علوم و معانی کی کئی اقسام استنباط فرماتے؟^(۱)

مناقبِ المجویبین کے مطابق

”حافظ صاحب اپنے زمانہ میں سمد وحدت الوجود میں بزرگ ترین عالم تھے حضرت مولانا جامی اور محی الدین ابن عربی کی تصانیف کو دوست رکھتے تھے“^(۲) وحدت الوجود پر مشتمل تصانیف کا درس دیتے وقت آپ جس طرح گفتگو فرماتے اس سے آپ کے تبحر علمی کا اظہار ہوتا۔ آپ کے طریقِ درس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ تفصیل، وضاحت اور تمثیل کے ذریعے مشکل چیزیں سمجھایا کرتے تھے^(۳) حافظ جمال کے قائم کردہ مدرسے میں آپ کے مرید بھی شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے جس سے آپ کے مدرسے کی شہرت میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ دُور دور سے بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کے در پر حاضری دینے لگے۔ آپ کی قابلیت کا شہرہ اس درجہ بلند تھا۔

”کہ ملک کے بڑے بڑے عالم اور فاضل بھی جن کی شہرت کا غلفہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ کے ظاہری اور باطنی علوم کے درس حاصل کرنے میں زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے صوفی اور متقی آکر چشمہ فیض سے سیراب ہوتے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق ظرف پر کرتے تھے“^(۴) ”گلشنِ ابرار“ ہی میں آگے چل کر لکھا ہے

”ہر مذہب و ملت کے برگزیدہ انسان آپ کے آستانِ فیض نشان کی طرف

۱- ”انوارِ جمالیہ“ از شیخ عبدالعزیز پرہاروی مترجم محمد اعظم سعیدی، ص ۲۷، ۲۸، سرائیکی اُردو رائٹرز گلڈ آف پاکستان، کراچی۔

۲- بحوالہ ”مناقبِ المجویبین“ ص ۱۳۲۔

۳- ”انوارِ جمالیہ“ از عبدالعزیز پرہاروی، ص ۹۔

۴- ”گلشنِ ابرار“ (ترجمہ) از خواجہ امام بخش، ص ۱۶۷ (گلشنِ ابرار فارسی (قلمی) ص ۲۰۱)۔

رجوع فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کی مجلس علماء، صلحاء، امراء کے لئے آفتاب
 جہاں تاب کی طرح یکساں نور افروز تھی۔ فقر اور تصوف کے علاوہ ان کی مجلس
 میں شعر و سخن فصاحت اور بلاغت کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔^(۱)
 حافظ محمد جمال نہ صرف درس دیتے تھے بلکہ آپ نے اپنے مریدوں کو جہاد کے لئے عملی تربیت
 بھی دی۔ کیفی جام پوری لکھتے ہیں

”کہ آپ کی درس گاہ میں علم و فن کی تدریس کے ساتھ ساتھ فن سپاہ گری
 بھی دی جاتی تھی۔ آپ علمی و نظری طور پر اس کے قائل تھے کہ

عصانہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

چنانچہ اس درس گاہ سے ہزاروں نمازیان اسلام جذبہ جہاد سے

سرشار ہو کر جگہ جگہ پھیل گئے۔^(۲)

آپ خود بھی فن تیر اندازی میں ماہر تھے اور یہی فن آپ نے اپنے مریدوں کو بھی سکھایا
 اگرچہ سلسلہ چشت کے مشائخ کے ہاں عملی جہاد کی تلقین یا ترغیب نہیں دی جاتی تھی۔ کیونکہ ان
 لوگوں کا مقصد صرف عوام کی ذہنی و اخلاقی تربیت کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ معاشرے کو
 سنوارا جائے۔ اس مقصد کے لئے عملی جہاد اور لوگوں کے کردار کو سنوارنا ان کے پیش نظر تھا
 خود خواجہ سلیمان جو کہ آپ کے مرشد نور محمد مہاروی کے خلیفہ تھے۔ اس بات کے قائل تھے
 کہ ہمیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ حاکم کون ہے یا جو حکومت ہم سے چھین گئی ہے
 اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی جائے بلکہ وہ اپنے مریدوں کو حکومت اور سرکاری معاملات
 سے لاتعلقی اختیار کرنے کا درس دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم پر کافر حکمران مسلط کئے
 گئے ہیں تو یہ ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں کیونکہ ہم اسلامی شعائر سے دور ہو چکے ہیں۔ اس
 لئے ہمیں چاہیے کہ انہیں برا بھلا کہنے کی بجائے سب سے پہلے اپنے کردار، اعمال اور
 اخلاق کی اصلاح کریں^(۳)۔ جبکہ ان کے برعکس حافظ محمد جمال لوگوں کا اخلاق سنوارنے،

۱۔ گلشن ابرار (ترجمہ) از خواجہ امام بخش، ص ۱۶۸، گلشن ابرار فارسی (قلمی) ص ۴۰۲

۲۔ بحوالہ ”سرائیکی شاعری“ از کیفی جام پوری، ص ۲۵۵ - ۲۵۶

۳۔ اس سلسلے میں تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”نافع السالکین“ ص ۳۲ تا ۴۰۔

انہیں درس دینے کے ساتھ ساتھ فن تیر اندازی بھی سکھاتے تھے تاکہ وقت پڑنے پر وہ اپنے علاقے کی حفاظت کر سکیں۔ ارض ملتان کے مطابق

”آپ کے ہاں تیغ و قلم ایک سائے میں تربیت پاتے تھے۔ علم و فراست کے باوجود شمشیر و سپر سے بیگانہ نہ تھے۔ تیر اندازی میں ماہر تھے۔ نہ صرف وقتِ ضرورت کام آتے بلکہ اس کی تعلیم بھی دیتے۔“ (۱)

حافظ محمد جمال کے زمانے میں پنجاب سکھوں کے زیر تسلط تھا۔ پورے ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور پنجاب سکھوں کے ہاتھوں میں تھا۔ انگریز مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے درپردہ سکھوں کی امداد کر رہے تھے۔ ملتان میں اس وقت نواب مظفر خاں کی حکومت تھی۔ نجیت سنگھ نے طاقت حاصل کر کے غارت گری، لوٹ مار کے ذریعے پورے پنجاب میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ملتان جیسا زرخیز علاقہ بھی اس کی نظر میں تھا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ ملتان پر حملہ کیا۔ کبھی تو وہ لوٹ مار کر کے واپس چلا جاتا اور کبھی بھاری تاوان لے کر ٹل جاتا تھا (۲)۔ حافظ جمال کے زمانے میں مسلمان سکھوں کے ہاتھوں مصائب کا شکار تھے۔ بار بار کی لوٹ مار، قتل و غارت گری سے وہ لوگ کافی پریشان تھے۔ ایسے موقع پر حافظ جمال نے صرف درس و تدریس پر اکتفا نہ کیا بلکہ انہیں عملی جہاد کے لئے بھی تیار کیا۔ آپ انہیں فن تیر اندازی کی تربیت بھی دیتے تھے بلکہ بوقت ضرورت خود بھی تیر کمان لے کر میدان جنگ میں اتر آتے۔ مناقب المحبوبین میں ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے جب آپ خود بھی میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ ایک موقع پر جب آپ کو سکھوں کے حملے کی اطلاع ملی تو آپ تیر کمان لے کر میدان میں آگئے۔ لکھا ہے کہ

۱۔ بحوالہ ”ارض ملتان“ از شیخ اکرام الحق، ص ۲۳۹، مطبوعہ الاکرام، ملتان۔

۲۔ ملتان پر نجیت سنگھ کے حملوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) ”تاریخ پنجاب“ از سید محمد لطیف

ص ۱۰۷ تا ۱۲۰، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، طبع اول، ۱۹۸۲ء (۲) ”تاریخ پنجاب“ از کنہیا لعل ص ۱۵۹

تا ۲۵۸، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور (۳) ”نواب مظفر خاں شہید اور اس کا عہد“ از عمر کمال خاں،

ص ۱۳۶ تا ۲۳۳، مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان۔

پشت پناہی کے لئے بلا بھیجا تھا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ

”کفار ظفریاب شدہ اند“

تو آپ نے فوراً کہا

”دروغ ست“

پھر فرمایا

”تحقیق گردانند کہ آیا حضرت حافظ جمال درحین حیات ہستند یا نے ،

عرض نمود کہ درحیات مستند ، خود بدولت فرمود تا آنکہ آنجناب درحین حیات

مے باشند ہرگز قلعہ ملتان مسخر کفار نخواہد شد القصد بعد ساعتی دیگر عرضہ اش

در رسید کہ ملتان تسخیر کفار نگر دید کہ اہل اسلام ظفریاب شدند و کفار رو

بفرار نہار“ (۱)

گویا حافظ صاحب کی موجودگی مسلمانوں کے لئے باعث نصرت و ظفریابی تھی۔ البتہ حافظ صاحب

کی وفات کے بعد ملتان سکھوں کے قبضے میں آگیا (۲)۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی شجاعت

اور بہادری ہی تھی جس سے لوگ حوصلہ نہیں ہارتے تھے اور اسی دلیری کا درس آپ

لوگوں کو بھی دیتے تھے۔ خلیق نظامی کے مطابق

”ان کی شجاعت، ہمت اور استقلال نے مسلمانوں کے مضمحل اعضاء میں نئی

روح پھونک دی تھی۔ سکھوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ انہوں

نے انتہائی مردانگی اور عالی بہمتی سے کیا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے

تو خود میدان جنگ میں اتر آئے۔“ (۳)

۱- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”گلشن ابرار“ فارسی (قلمی) ص ۲۵۹ تا ۲۶۱۔

۲- خاتم سلیمانی، ص ۹۹ پر لکھا ہے کہ ”نواب مظفر والی ملتان کے عہد نوابی میں ہی ہمارا جبرنجیت

سنگھ نے کئی مرتبہ ملتان پر حملہ کیا مگر چونکہ حافظ جمال الدین صاحب قلعہ میں موجود تھے۔ اس واسطے ان

کی برکت سے سکھوں کا قبضہ نہ ہو سکا۔ مگر ان کی وفات کے بعد بہت جلد سکھوں نے ملتان تسخیر کیا۔

۳- ”تاریخ مشائخ پشت“ از علامہ خلیق نظامی، ص ۶۰۳۔

حافظ صاحب صرف بہترین عالم، استاد اور مجاہد ہی نہ تھے بلکہ بحیثیت انسان بھی آپ دلجوئی کرنے والے ایسے شخص تھے کہ جن کا اخلاق دوسروں کے لئے مثال تھا۔ "مناقب فخریہ" میں لکھا ہے کہ

"..... حافظ محمد جمال ملتانی علیٰ ہذا القیاس کمال باطن و تہذیب اخلاق

و بکمال آراستہ" (۱)

اچھے اخلاق و عادات کے ساتھ ساتھ ایک صوفی بزرگ کے لئے جو چیز اہم ہے وہ اس کی گفتگو کا انداز ہے۔ حافظ جمال حسن و اخلاق کے ساتھ ساتھ شیریں گفتار بھی تھے اور عالمانہ سطح پر گفتگو کرتے اور ہر شخص کے مزاج کے مطابق اس سے بات کرتے اور کبھی کبھی حاضرین کی خوشی کی خاطر ظرافت اور خوش طبعی کا انداز بھی اختیار کر لیتے تھے لیکن اس میں بھی حق کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ عبدالعزیز پر ہاروی لکھتے ہیں کہ

"آپ شیریں گفتار تھے۔ آپ مختصر اور ایسی نافع کلام کرتے جو حکمت اور معرفت

کے چشموں پر مشتمل ہوتی۔ آپ مخاطب کے مزاج و مذاق کے موافق کلام فرماتے" (۲)

آپ اپنی گفتار اور عمل میں شریعت کا خاص خیال رکھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے ایک مرتبہ اپنے خلیفہ زاہد شاہ سے پوچھا کہ تم کہیں شادی کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے عرض کی، جی ہاں۔ مگر ایک تو وہ لوگ سادات سے نہیں ہیں اور دوسرے ہماری برادری کے کچھ سربر آوردہ لوگ مخالفت کر رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا

"کہ ہر دو غلط است زیرا کہ نکاح سادات یا غیر سادات در شرع جائز است

تو گفتہ جا ہلاں را چہ اعتبار می کنی؟" (۳)

حافظ صاحب اکثر لوگوں کو تصوف و سلوک کی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ آپ کے چند اشارات

۱۔ "مناقب فخریہ" فارسی (دقلمی) بہ حالات حضرت خواجہ فخر الدین دہلوی، ص ۴۶۔ (جناب اسد

نظامی کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی۔)

۲۔ بحوالہ "گلزار جالیہ" مترجم قاضی محمد بن خوردار ملتانی، ص ۱۹۔

۳۔ بحوالہ "مناقب المجدوبین" (فارسی) ص ۱۲۷۔

یہ ہیں۔

فرمایا کہ درویشی کیا ہے؟ اس سے نہ کسی کے کف پا کو درد ہو اور نہ پشت پا کو گرد لگے۔ پھر یہ کہ درویشی عجز و خاکساری میں استواری کا اور تحلیل و مٹ جانے میں کمال حاصل کرنے کا نام ہے۔ ان کے مطابق اصول سلوک چار چیزوں سے عبارت ہے۔ قلتِ طعام، قلتِ منام، قلتِ کلام، قلتِ صحبت مع الانام۔

اسی طرح فرمایا عرفان حق کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ کرنا اور باطن کو رجحاناتِ ذمہ سے پاک کرنا، خواہشاتِ نفس کو ریاضت یا خاموشی کے ذریعے کم کرنا۔

اسی طرح ارشاد ہے کہ طبیب کا ایمان ضعیف ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مریض کی شفا اپنے نفس کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس سے مفتر ہوتا ہے۔ اگر اس وہم سے سلامت رہے تو پھر مشکور ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں بہت اچھا شغل، نذا و صدا کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی امر وجود میں ظہور پذیر ہو فرمایا کہ حدیث صحیح مرفوع میں آیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت بایں اخلاص و نورانیت کرے کہ گویا تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکے کہ تو اسے دیکھے تو یہ اعتقاد تو ہو کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔^(۱) حافظ جمال کے بہت سے ملفوظات ملتے ہیں جن میں سے یہ مجموعے زیادہ مشہور ہیں "انوارِ جمالیہ" کے نام سے حافظ جمال کے بارے میں دو کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک آپ کے خلیفہ منشی غلام حسن شہید نے آپ کی حیات اور ملفوظات پر فارسی میں تحریر کی۔ یہ قلمی ہے جو آپ کے سجادہ نشین جناب فیض الحسن کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ اور ۱۲۲۵ھ میں غلام حسن شہید نے اپنے مرید اللہ بخش کاتب سے اسے لکھوایا تھا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ آپ کے ارشادات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (۱) مکملہ سیرالاولیاء از خواجہ گل محمد احمد پوری،

ص ۱۵۵-۱۵۶۔ (۲) انوارِ جمالیہ از عبدالعزیز پرباروی اردو ترجمہ "گلزارِ جمالیہ" ص ۲۵، تا ۳۰۔ (۳)

ارضِ مغان از شیخ محمد اکرام، ص ۲۲۰۔

مقدمہ در نعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و ذکر اسمائے متبرکہ خواجگان سلسلہ علیہ چشتیہ رضوان اللہ
علیہم اجمعین و بیان بعضی القاب مخصوصہ ایشان

باب اول ————— مشتملہ مناقب خدام حضرت خواجہ محبوب اللہ کی خلیفہ اعظم حضرت
خواجہ جمال الحق والدین است رضی اللہ تعالیٰ عنہما و خاتمہ کتاب متضمن است بر ذکر اولاد و
اجداد حضرت قبۃ عالم رضی اللہ عنہ، و ذکر خلفاء باصفاء ایشان و بر اکثرے از اسرار توحید و فوائد
سلوک و اشعار و عبارات نشرو دیگر فوائد کہ ارباب سلوک را بکار آید و اصحاب ارادت راقوت
باطن افزاید۔

حافظ محمد جمال کی حیات پر عبدالعزیز پرہاروی نے بھی "انوار جمالیہ" کے نام سے ایک
کتاب عربی میں لکھی — اس کتاب کے دو ترجمے ملتے ہیں۔ ایک فقیر محمد بر خوردار
نے "گلزار جمالیہ" کے نام سے اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کی ترتیب یوں رکھی ہے
کہ ہر صفحے پر تین کالم بنائے ہیں۔ پہلے کالم میں اردو ترجمہ دیا ہے۔ دوسرے میں فارسی ترجمہ
درج کیا ہے۔ اور تیسرے کالم میں "انوار جمالیہ" کا اصل متن (عربی) دیا ہے۔ یہ کتاب
مطبع ابو العلاء آگرہ سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوئی۔ اسی طرح علامہ محمد اعظم سعیدی نے
انوار جمالیہ (عربی) کو سرانیکی اور اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "انوار جمالیہ"
ہے۔ اس میں پہلے سرانیکی ترجمہ دیا گیا ہے، پھر اردو اور پھر دو کالم بنا کر ایک میں اردو
ترجمہ اور دوسرے میں عربی متن دیا ہے۔ یہ کتابچہ سرانیکی رائٹرز گلڈ کراچی نے پہلی بار ستمبر
۱۹۸۳ء میں شائع کیا — ان کے علاوہ آپ کے ملفوظات کے یہ دو مجموعے ہیں۔

(۱) فضائل رضیہ از مولوی عبدالعزیز پرہاروی۔

(۲) "اسرار الکمالیہ" — یہ مخدوم سید زاہد شاہ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف

ہے۔ مخدوم زاہد شاہ حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ یہ کتاب حضرت جمال اللہ

۱۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب جناب عبدالعزیز پرہاروی نے حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی کی وفات کے تین روز بعد

لکھنا شروع کر دی تھی۔

(۲) ۱۰۱ کے صفحے دیکھئے "گلزار جمالیہ" ص ۱۔

ملتان کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جو ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے دو باب ہیں۔
باب اول میں سب سے پہلے وضو اور طہارت کے بارے میں ہدایات درج ہیں۔ پھر حضرت
جمال اللہ ملتان کے اقوال و احوال کا بیان ہے۔ یہ سب کچھ ص ۱ سے ص ۲۰ تک ہے۔
باب دوم میں توحید کی تشریح کی گئی ہے جو ص ۲۰ سے شروع ہو کر ص ۲۶ تک
جاتی ہے۔ یہ نایاب مخطوطہ پیر محمد اجمل چشتی ساکن چشتیاں کی ملکیت ہے جس کی فولڈسٹیٹ
کاپی جناب اسد نظامی سے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔

حافظ محمد جمال کے شعری سرمائے میں سے ایک نظم "سی حرفی" (سرائیکی) دستیاب
ہے۔ جس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ دوسرا نسخہ جناب
ڈاکٹر مہر عبدالحق کے پاس تھا۔ اوراق بہت بوسیدہ تھے۔ محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ لہذا اس
کا فولڈسٹیٹ نسخہ تیار کر لیا گیا۔ اس کو کسی زمانے میں آگرہ کے ایک چھاپہ خانے سے شائع
کیا گیا تھا۔ لیکن غلط کتابت اور ناقص طباعت کی وجہ سے ناقابل فہم ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ سید عبدالحق
(بہاولپور) کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے^(۱)۔

مزار کے دروازے پر لکھے ہوئے عربی و فارسی کے یہ اشعار ان کے اپنے ہیں۔

(۱) حافظ بہ کنج میکدہ دارد قرار گاہ

کالطیر فی الطریقہ واللیث فی الملاء

(۲) ابن جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دست

روزے نیش بہ بنیم و تسلیم دے کنم^(۲)

کیفی جام پوری نے بھی یہ تین اشعار آپ سے منسوب کئے ہیں۔

ماں نہ کر سہاگ داتے بہ نہ بانہہ در گھیر

چوڑے والی کسی جنٹی بانہوں بٹیا لے ڈھیر

اتھاں پانہ کیتا اسی اتھاں منگن سیر

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے "نور جمال" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۲۲

۲۔ "نور جمال" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۲۱ - ۲۲ -

آؤن نہ ڈلیسن پکیڑے کتن نہ ڈلیسن پھیر

بھنیں بھنیں میں پتریاں جاداں میرے پنے نہیں مزوری

ناخدا دے پار پچاؤ میں ونجنے ڈھوک ضروری (۱)

حافظ محمد جمال کو محفل سماع بھی بہت پسند تھی اور اکثر شوقیہ سماعت فرماتے تھے۔ گلشن

ابرار کے مطابق

”آپ کو سماع سے بہت رغبت تھی اور شوقیہ سنا کرتے تھے۔ مولانا جامی کی

غزلیں زیادہ مرغوب تھیں۔“ (۲)

حافظ محمد جمال کا انتقال تپ صفاوی کی وجہ سے ۵ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء کو ہوا۔

آپ کے مریدوں میں ایک میاں عبداللہ بزدار بھی تھے جب اسے حضرت کے وصال کی خبر ملی

تو بے حد افسردہ ہوا اور فوراً حضرت سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس قدر

رویا کہ بات بھی نہ کر سکا۔ حضرت سلیمان نے اسے تسلی دی اور فرمایا

”اسی عبداللہ چندیں گر یہ ممکن کہ دین مردان خدا ہرگز نمیرند“ (۳)

(اے عبداللہ اس قدر نہ رو کیونکہ ایسے مردان خدا ہرگز نہیں مرتے۔)

آپ کے خلیفہ منشی غلام حسن شہید نے تاریخ وصال ان الفاظ میں لکھی ہے۔

ان المتقین فی جنات

۱۲۲۶ھ

آپ کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں آپ نے وفات پائی۔

آپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ لیکن کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ آپ کی پہلی شادی

۱۔ بحوالہ سرائیکی شاعری از کیفی جام پوری، ص ۲۵۷۔

۲۔ بحوالہ ”گلشن ابرار“ (اردو ترجمہ)، ص ۱۸۳۔

۳۔ آپ کی تاریخ وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آپ کے تمام سوانح نگار اسی تاریخ وصال پر متفق ہیں

۴۔ بحوالہ ”المنتخب محفوظ شریف حضرت سلیمان تونسوی مرتبہ یار محمد (فارسی قلمی) ص ۲۶۱ - ۲۶۲۔

موضع لانگ کے بزرگ میاں محمد موسیٰ المعروف میاں پہلوان صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی لیکن ان سے اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ آپ کے خلیفہ مولوی محمد خدا بخش نے آپ کی دوسری شادی کردائی جن سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں لیکن کچھ عرصے کے بعد دوسری بیوی اور اس کی اولاد فوت ہو گئے۔ آپ نے اپنے برادر نسبتی مخدوم میاں مہر علی کو اپنا بیٹا اور جانشین مقرر فرمایا۔ وہی آپ کے پہلے سجادہ نشین بنے اور مولانا خدا بخش صاحب آپ کی راہنمائی کرتے تھے۔

حضرت حافظ محمد جمال کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ گلشن ابرار فارسی (قلمی) میں پانچ خلفاء کا ذکر ہے، لکھا ہے

” خلیفہ اول مولانا حضرت محمد خدا بخش ملتانی ثم خیر پوری نور اللہ مرقدہ کہ خلیفہ مطلق و سجادہ نشین برحق آسجناب است خلیفہ دوم مولوی عبدالرزاق کہ در حین حیات آنحضرت منظر جمال اللہ از دار الفنا رفت اقامت پدار البقا کشید خلیفہ سوم مولوی حامد خلیفہ چہارم سید زاہد شاہ خلیفہ پنجم سید بلند شاہ ۱۱

کچھ ایسے خلفاء ہیں جنہیں بیعت تو حضرت نور محمد مہارومی سے تھی۔ لیکن خرقہ خلافت اور اجازت حضرت حافظ جمال سے حاصل ہوئی۔ اسی طرح بعض وہ ہیں کہ جنہیں بیعت تو حضرت حافظ جمال سے تھی لیکن اجازت حضرت نواب خدا بخش سے حاصل ہوئی۔ چنانچہ گلشن ابرار فارسی (قلمی) کے مطابق

” خلفائے دیگر آنحضرت بسیار اند مگر بعضی کسانند کہ بیعت بخدمت حضرت قبلہ عالم (حضرت نور محمد مہارومی) میداشتند و خرقہ خلافت و اجازت از آسجناب یافته بودند و بعضی کسانند کہ شرف بیعت آسجناب مشرف گشتند

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے گلشن ابرار فارسی (قلمی) ص ۲۶۸ تا ۲۷۱، مصنف مولانا امام بخش (التوفی ۱۳۰۰ھ) اس کتاب کا اصل نسخہ حضرت حافظ کریم بخش مہارومی ساکن مہار شریف از مضافات چشتیاں موجود ہے۔ اس کی فوٹو سٹیٹ کا پنی جناب اسد نظامی سے حاصل ہوئی۔

واجازت از حضرت محبوب اللہ مولانا محمد خدا بخش وصول کردہ اند: (۱)

ایسے لوگوں میں مولوی عبید اللہ ملتانی، منشی غلام حسن شہید، قاضی محمد عیسیٰ خان پوری نزد شجاع آباد، صاحبزادہ غلام فرید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حافظ محمد جمال کا مقبرہ بیرون دولت دروازہ عام خاص باغ کے مشرق کی طرف ہے وہاں قلعہ نما فصیل کے اندر ۲۷ فٹ مربع کا مقبرہ ہے جو تقریباً سو سو سال پہلے کا بنا ہوا ہے لیکن وقتاً فوقتاً اس کی مرمت اور اس میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا فرش ہے اور شمالی و جنوبی دروازے بھی سنگ مرمر کے ہیں۔ چھتوں پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف مجلس خانہ ہے جس کی چھت منقش ہے۔ مقبرے کی تعمیر کے بارے میں ایک روایت شیخ محمد اکرام نے درج کی ہے

”کہ تعمیر کے وقت ایک کونے کی ڈاٹ صحیح نہیں آتی تھی، معمار اس کی بجائے لکڑی کے مضبوط ٹکڑے پر جس کو معماری اصطلاح میں ”چھتن“ کہا جاتا ہے دیوار اٹھانا چاہتے تھے۔ آپ کے مرید اور خلیفہ اول خواجہ خدا بخش خیر پوری کو جو مقبرہ بنوا رہے تھے، خبر ہوئی تو باوجود ضعف پیری کے خود آئے اور کہا بابا میرے پیر کے مکان کو عیب نہ لگاؤ، مشکل سے ڈاٹ پر چڑھ بیٹھے اور کہا،
 از زمین خشک رویا ند گیاہ آسماں را بے ستوں دارد نگاہ
 ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو خشک زمین سے سبزہ اگانے کی قدرت ہے اور آسمان کو بغیر ستون کے سنبھالے ہوئے ہے۔

پھر اپنے ہاتھ سے مہرابی اینٹ لگائی جو صحیح بیٹھ گئی اور ڈاٹ مکمل ہو گئی۔“ (۲)

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے گلشن ابرار فارسی (قلمی) ص ۲۶۸ تا ۲۷۱، مصنف مولانا امام بخش (المتوفی ۱۳۰۰ھ) اس کتاب کا اصل نسخہ حضرت حافظ کریم بخش مہاروی، ساکن مہار شریف، از مضافات چشتیاں موجود ہے۔ اس کی فوٹو سٹیٹ کا پی جناب اسد نظامی سے حاصل ہوئی۔

۲۔ بحوالہ ”ارض ملتان“ ص ۱۲۲۔

حافظ محمد جمال — بحیثیت شاعر | اگرچہ حافظ محمد جمال ملتان کے

تمام ملفوظات فارسی زبان میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بلند مرتبہ خلیفہ اور شاگرد حضرت غلام حسن شہید نے بھی، جو سرایتیکی اور اردو زبان کے شاعر تھے۔ ان کی تعلیمات اور صفات کے بیان کے لئے "انوار جمالیہ" فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کی مادری زبان سرایتیکی تھی اور وہ اردو زبان سے بھی پوری طرح واقف تھے چنانچہ ان کے ادبی اور شعری سرمائے میں جہاں عربی اور فارسی کے کچھ اشعار شامل ہیں وہاں سرایتیکی زبان میں بھی ہوتی "سی حرفی" بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت حافظ جمال کا فارسی، عربی اور سرایتیکی کلام ایک قلمی دیوان کی صورت میں موجود تھا اور یہ حضرت مولانا عبدالرشید طاہر کی نسیم کی تحویل میں تھا۔ لیکن ان کی اچانک وفات کے بعد ان کے لواحقین نے جہاں ان کے سرمایہ کتب کو ضائع کر دیا۔ وہاں یہ دیوان بھی باقی نہ رہا۔ — قیاس کہتا ہے کہ اس قلمی دیوان میں اردو کی کچھ چیزیں بھی یقیناً شامل ہوں گی کیونکہ "سی حرفی" میں اردو الفاظ و تراکیب کا بکثرت اور بے دریغ استعمال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ حضرت حافظ جمال اردو زبان کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ یوں بھی انہوں نے حضرت فخر الدین دہلوی اور نور محمد ہاروی کی مخلص اور صحبتیں دیکھی تھیں اس لئے وہ اردو زبان و ادب سے نا بلد کیسے رہ سکتے تھے۔ تاہم اردو زبان کی ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہو سکی جس سے ان کی اردو شعر گوئی یا زبان دانی کا ثبوت مل سکتا۔

حضرت حافظ جمال کی سرایتیکی "سی حرفی" کو جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق نے "نور جمال" کے عنوان سے ایک کتابچے میں درج کیا ہے۔ یہ نظم ۲۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں چار مصرعے ہیں اور ہر بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ ہر بند کے چوتھے مصرعے میں حافظ صاحب اپنا تخلص "جمال" باندھتے ہیں۔ اس نظم میں جو بحر استعمال کی گئی ہے وہ سرایتیکی زبان کے ڈوہڑے کی مشہور بحر متدارک ہے جو فعلن فعلن کے ساتھ بار تکرار سے

وجود میں آتی ہے" — اس نظم کی ایک فنی خوبی یہ بھی ہے کہ انتیس (۲۹) بندوں میں پہلا حرف حروف ابجد کے بالترتیب استعمال سے بنتا ہے۔ مثلاً الف سے "اٹھی" ب سے بنھ (باندھ) ت سے تلخائی، ج سے "جوان" ح سے حلیمی، خ سے خوبی، د سے دنمائی، ط سے طبع علیٰ الہذا علیٰ قیاس — لندن یونیورسٹی کے پروفیسر کرسٹوفر شیکل نے اس کتاب (نور جمال) کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اسے بزم ثقافت ملتان نے شائع کیا ہے۔

اس نظم سی حرفی کا موضوع تصوف کے حوالے سے متین کیا جاسکتا ہے۔ یعنی مرکزی موضوع زندگی کی بے ثباتی، فنا اور عارضی پن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فانی اور عارضی دنیا سے کوچ ایک اہل حقیقت ہے۔ یہ دنیا ایک میدان عمل ہے جس میں ہر انسان کو ایک مخصوص امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگلی دنیا کے لئے زاد راہ کا حصول اعمال صالح کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نظم میں جہاں زندگی کی بے ثباتی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے وہاں نیک اعمال کی تلقین بھی بڑی شد و مد کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس نظم کا مخاطب مرد نہیں عورت ہے اور وہ بھی بیٹی جو ماں باپ کے گھر میں پرورش پاتی ہے لیکن بالآخر اپنے کسراں چلی جاتی ہے۔ بیٹی کی تربیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال سے نہ صرف اپنے ماں باپ کے نیک نام کی لاج رکھ سکتی ہے۔ بلکہ کسراں والوں کے دل بھی موہ سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عاقبت بھی سنوار سکتی ہے۔ اس لئے اس نظم میں حضرت حافظ جمال کا مخاطب بیٹی کے ساتھ ہے جس کو صبح سویرے اٹھ کر چرخا کاتنے کی تلقین کی گئی ہے۔ پہلا بند اسی طرح شروع ہوتا ہے۔

الف اٹھی دھیانت جاگ سویلے توں سنڑدھی سیانڑیں

گھن چرکھا، پاکنڑ کھوڑی، لمبی رات دھانڑیں

ایہو ویلا ہتھ تیدے ناں آسی دھی بلیانڑیں

اٹھ جمال سہاگنڑ سو ہے، جو شوہ دے من بھانڑیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے سیانی اور عقل مند بیٹی! اب اٹھ جا چرخا لے کر بیٹھ، آرام

کی لمبی رات گزر چکی، عمل اور حرکت کا وقت آن پہنچا، مزید وقت ضائع نہ کر کہ وقت کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر عاقبت نیک اور انجام بھلا چاہتی ہے تو اپنے خداوند حقیقی کو راضی کر (اور ظاہر ہے کہ وہ نیک عمل سے راضی ہوتا ہے۔)

در اصل حافظ جمال نے تصوف کے معاملات کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ چرخا اور اس کے لوازم کو فرائض کی ادائیگی، محنت، حرکت اور نیک اعمال کے حصول کا اشارہ، میکے گھر کو مادی دنیا کی، سسرال کو عاقبت اور زندگی کے بعد موت کی، شوہ (شوہر) کو خداوند حقیقی کی علامت بنایا ہے اور یوں اس نظم کے ذریعے کردار کی تعمیر کا فرض ادا کیا ہے۔ ہر بند میں خوش اخلاقی، نیک سیرتی، دیانت داری، حلیمی، نرم مزاجی، سلیقہ شعاری، اور روحانی ترقی کی تلقین کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تصوف کی عملی تعلیمات کا ناگزیر حصہ ہے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ پہلے بند میں بیدار ہونے اور کام میں جت جانے کی تلقین ہے۔ اس کے بعد ہر بند میں کوئی نہ کوئی نصیحت کی گئی ہے۔ مثلاً دوسرے بند میں کاہلی اور سستی کو چھوڑنے اور سوت کاتنے (فرائض کی ادائیگی) کا مشورہ ہے۔ تیسرے بند میں بد مزاجی ترک کرنے اور عجز و انکاری اختیار کرنے کی نصیحت ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند میں اعمال نیک کی تعریف کی گئی ہے۔ چھٹے بند میں حلیمی، نرم مزاجی اور خوش خلقی کی صفات کو سراہا گیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں بند میں فخر و غرور اور مکر و فریب سے اجتناب کی تلقین ہے۔ نوویں اور دسویں بند میں بے پروائی چھوڑ کر اعمال نیک کے ذریعے عاقبت سنوارنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ گیارہویں اور بارہویں بند میں مال و دولت کے لالچ کو ترک کرنے کا مشورہ ہے۔ سکندر کی تلمیح کے حوالے سے زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔

زر، زر دولت، مال خزانہ کر کر کائی سما لے

لا تھی رہی اکھٹی اتھاں کہیں نہ نیتی نالے

کن گیا سلطان سکندر جس ملک زمیں پر تلے

ڈیکھ جمال احوال تمھاں داموت مٹی دنج گالے

یعنی لوگ سونے چاندی کے خزانے زر و دولت تو جمع کرتے ہیں لیکن یہ سب کے سب یہیں رہ جاتے ہیں اور کوئی بھی انہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ سکندر جیسے سلطان نے

ساری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھے۔ دنیا جہاں کے ملکوں کو اس نے زیر و زبر کر دیا لیکن ذرا ان لوگوں کا انجام دیکھو کہ اب سب مٹی میں گل سڑ چکے ہیں۔

تیر ہویں اور چود ہویں بند میں اللہ کی محبت اور عشق کا درس دیا ہے۔ پندر ہویں بند میں بری صحبت سے بچنے اور سو لہوئیں بند میں سلیقہ شعاری اور سکھڑا پا اختیار کرنے کی تلقین ہے ستر ہویں بند میں موت کے برحق ہونے کا اعلان ہے تو اٹھار ہویں اور انیسویں بند میں کیسویں کے ساتھ خداوند کریم سے محبت کرنے کی نصیحت ہے۔ بیسویں بند میں حُسن اور جوانی کے عارضی اور گزراں ہونے کا اور اگلے تین بندوں میں زندگی کی بے ثباتی اور فنا کا ذکر ہے۔ چوبیسویں، پچیسویں اور چھبیسویں بند میں شوق اور جذبے سے کام کرنے کی تلقین ہے، ستائیسویں اور اٹھائیسویں بند میں حُسن اور جوانی کی گریز پائی اور بڑھاپے کی آمد کا اعلان ہے اور آخری بند میں الوداعی دعا کی گئی ہے۔

ی، یاری رب ڈیوی دھیا گھر ور ہونویں سکھی
طالع بخت سوتے ہو دنیں رات نہ دیکھیں ڈکھی
شہ دے نال محبت دل دی شالا پوری ڈھکے
نت جمال دعا کرے، ناں ننگی رہیں نہ بکھتے

یعنی اے بیٹی! آخر میں میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ گھر میں سکھی رہو تمہارا مقدر چلے۔ تمہیں دکھوں بھری رات سے واسطہ نہ پڑے۔ خدا کرے خاندان حقیقی کے ساتھ تمہاری محبت ہر آزمائش پر پوری اترے اور اللہ تمہیں دنیا اور آخرت میں تنگی ترشی اور بھوک ننگ سے محفوظ رکھے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق سی عرفی کے موضوع کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں

"ایں نظم دا حاصل اے ہے جو عجز تے انکساری نال وقت گزاریا ونجے
غزور تے فخر کون نیڑے نہ آنونڈ ڈوتیجے، تے جوں دس لگے نیکی دے کم
کر کے خوش اخلاقی ورت کے تے دنیا اچ صحیح عمل کر کے آپڑاں آگہاں دے
سفر دا زاد راہ بنڑیا ونجے" (۱)

اس نظم کا حاصل یہ ہے کہ عجز اور انحراسی کے ساتھ وقت گزار دیا جائے۔ غرور اور فخر کے قریب نہ پھٹکا جائے۔ جتنا بس چلے نیکی کے کام کر کے خوش اخلاقی سے کام لے کے اور دنیا میں صحیح عمل کر کے عاقبت کے سفر کے لئے زاد راہ بنایا جائے۔

حافظ محمد جمال کا اسلوب نہایت سادہ، رواں دواں اور دلنشیں ہے۔ موضوع کے ساتھ میل کھاتے الفاظ، با محاورہ زبان اور علامتوں کا استعمال اس نظم کے عام خصائص ہیں جہاں ایک طرف سرائیکی ڈکشن کی مٹھاس پائی جاتی ہے تو دوسری طرف عام فہم اور مانوس اردو الفاظ و تراکیب کے ذخیرے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں ایسے چند الفاظ کے فہرست دی جاتی ہے جو اردو اور سرائیکی میں مشترک طور پر مستعمل ہیں۔ ان سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سرائیکی اور اردو میں کتنی مشابہت، مناسبت اور اشتراک پایا جاتا ہے۔

لمبی رات، جمال، نکما، پرانی، بد کردار، نیکیاں بدیاں، جملہ، پرانے، دکیل، کرن، لفاظ، خوبی، خلق، کیسر (زعفران)، عمل، دغا، احوال، نیت، ذکر و فکر، ابر، شرم، مکلاوا (آخری الوداع)، کچاوا، دعوا (دعویٰ)، قبیلہ، زر و دولت، مال خزینہ، سلطان، ملک، زمین، سوداگر، وپار (تجارت)، لعل، صد ہزار، پسا رنا، شرم، سہیلیاں، رل مل، ناز بھری البیلیاں، حویلیاں، ستر (سوت)، جگ (دنیا)، مجلس، فائدہ، ازل، ظلم، خویش قبیلہ، سنگ سہیلی، محل حویلی، فضل، بیلی (دوست)، نفس، غریبی، حرص، معذوری، دُوری، محبت، پاک کمانی، صورت، حُسن جوانی، راج، داغ، غفلت، عیب، ادھار، وقت، تھوک، وداع، نشانی، ہوش، پلک، طالع بخت، ننگی،

ایک سوسولہ (۱۱۶) مصرعوں پر مشتمل مختصر سی نظم میں اردو الفاظ کا یہ ذخیرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت حافظ جمال اردو زبان سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے اور اگر ان کا دیوان دستیاب ہو جاتا تو یقیناً اس میں اردو کلام بھی شامل ہوتا۔ تاہم سرزمین ملتان میں اردو شعروادب کی ترویج کے سلسلے میں حافظ محمد جمال کا حصہ قابل ذکر بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔

خواجہ خدا بخش

حضرت خواجہ خدا بخش بارہویں صدی ہجری کی ایک اہم

روحانی اور عوامی شخصیت ہیں۔ جنہیں حافظ محمد جمال ملتانی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ حافظ محمد جمال نے انہیں خانقاہ بہاء الحق زکریا کے سامنے بیٹھ کر سلسلہ چشتیہ کے حق میں بیعت لینے کا حکم دیا اور مرشد کے حکم سے انہوں نے ملتان میں سلسلہ چشتیہ کی تجدید کا حق ادا کیا۔ اور یوں حافظ محمد جمال ملتانی اور خواجہ خدا بخش کی بدولت ملتان میں سلسلہ سہروردیہ کے ساتھ ساتھ سلسلہ چشتیہ کا اثر و رسوخ بھی قائم ہوا۔ خواجہ خدا بخش حافظ جمال ملتانی کے نہایت نامور خلفاء میں سے ایک تھے۔ بلکہ گلشن ابرار کے مطابق

” خلیفہ اول ذات ملکی صفات، سراج الواصلین، فخر العاشقین، سند العارفین،

محبوب اللہ سیدنا مولانا حضرت محمد خدا بخش ملتانی ثم خیر پوری نور اللہ مرقدہ
کہ خلیفہ مطلق و سجادہ نشین برحق آنجناب (حضرت خواجہ حافظ جمال اللہ) ست (۱۰)
اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے۔

”چوں در او آخیر عمر حضرت محب اللہ محمد جمال کہ مزاج شریف عارضہ مرض الموت

لاحق شد بہر یک غلام خاص و عوام خود باواز بلند بطریق و عظم فرمود کہ ماکلید.....

ہر دو جہاں بجزرت مولوی صاحب (خواجہ خدا بخش) تفریض کراں ام۔“ (۱۲)

خواجہ خدا بخش کے آباؤ اجداد محمد بن قاسم کے عہد میں عرب سے ہجرت کر کے سندھ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور کچھ عرصہ وہاں قیام کرنے کے بعد ملتان میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اپنی بہادری اور علمی قابلیت کی بنا پر اس خاندان کے لوگوں کا دخل حکومت کے معاملات میں ہر زمانے میں کسی نہ کسی طور رہا۔ یہ لوگ کبھی تو کسی فتنے کو ختم کرنے کے لئے حکومت کا ساتھ دیتے تو کبھی اپنی قابلیت کی بنا پر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز رہتے۔ مسعود حسن شہاب ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

۱۔ گلشن ابرار فارسی (قلمی) از خواجہ امام بخش، ص ۲۶۸

۲۔ ایضاً ص ۴۱۰

”یہ خاندان عالی قدر اپنی شجاعت و فطانت اور دوراندیشی کی وجہ سے ہر دور حکومت میں ممتاز و مہتمم رہا ہے۔ شیرشاہ سوری نے اس خاندان کے بعض افراد کو جلیل القدر عہدے دے رکھے تھے۔ جب سلطان ناصر الدین قباچہ نے قطب الدین ایبک سے سرکشی کی اور ملتان و سندھ پر اپنا تسلط قائم کیا تو اس خاندان نے اس کے خلاف احتجاج کیا جس کی پاداش میں قباچہ نے اس خاندان کی تمام جائیداد ضبط کر لی اور مجبوراً اس خاندان کو ترک سکونت کر کے ضلع ہزارہ میں پناہ یعنی پڑی۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں یہ خاندان ضلع ہزارہ سے تلمبہ آ گیا۔ جہانگیر نے تلمبہ کا قلعہ اسی خاندان کے ایک بزرگ قاضی علاء الدین کے سپرد کیا اور انہیں دس ہزاری کا منصب دیا۔ یہ منصب شاہ عالم ثانی کے عہد تک اس خاندان میں رہا۔ مولوی عنایت اللہ اس سلسلے کے آخری منصب دار تھے جو ۱۱۹۱ھ میں اس سے دستکش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔“ (۱)

اس خاندان میں خواجہ خدابخش ۱۱۵۰ھ میں مولانا قاضی جان محمد کے ہاں پیدا ہوئے (۲) آپ قریشی النسل (۳) تھے۔ آپ کے والد مولانا جان محمد نیک، پرمیزگار اور باعمل تھے۔ ابتدائی تعلیم

۱- اولیائے بہاولپور از مسعود حسن شہاب، ص ۱۶۸، مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور، بار دوم۔

۲- ایضاً ص ۱۶۹۔

جبکہ عمر کمال خاں نے اپنی کتاب ”نواب مظفر خان شہید اور اس کا عہد“ ص ۲۸۲، مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان اور محمد ایاز قیصر نے ”خیر البلاد“ ص ۱۲، مطبوعہ قصر الادب، خیرپور ٹامیوالی (بہاولپور) میں آپ کا سن ولادت ۱۱۶۸ھ لکھا ہے۔

۳- آپ کے سن ولادت کی طرح نسل کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اولیائے بہاولپور ص ۱۶۸ میں احوال و آثار (قلمی) کے حوالے سے بتایا ہے کہ آپ قریشی نسل سے تھے۔ آپ کی والدہ کا تعلق قوم مٹنہاس سے تھا جو تلمبہ کی رہنے والی تھیں۔ اس لئے آپ کا مادری سلسلہ قوم مٹنہاس سے ملتا ہے لیکن والد کی طرف سے آپ قریشی نسب سے تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) ”ذکر کرام“ از

مولوی حفیظ الرحمن، ص ۴، مطبوعہ دہلی، رجب المرجب ۱۳۵۲ھ (باقی بر صفحہ ثانی)

آپ نے انہی سے حاصل کی حضرت غلام حسن شہید اپنی کتاب انوار جالیہ فارسی (تلمی) کے بارے میں حضرت خواجہ خدا بخش ملتانی ثم خیر پوری ملقب بہ محبوب اللہ کی منقبت میں لکھتے ہیں

”پدر بزرگوار آنحضرت از علمائے کبار و اقیائے روزگار بود چوں این اختر سعادت
 کا شانہ صولتیش را بہ ضیائے وجود مسعود نورانی ساخت توجہ بترہیت او مصروف
 داشت و عمرے ہمت والا برابر این کار بر گاشت تا آنکہ بمقتضائے علوفت و
 صفائی طینت از کسب فضائل بہرہ وافی برداشت و از معقول و منقول و فروغ
 و اصول آنچنان کمالے بہم رسانید کہ از فحول علمائے دہر سر آوردہ در فضلائے
 عصر محبوب گردیدند وہ بہ اقتضائے والا ہمتی اغلب بتدریس علوم متداولہ و
 تعلیم فنون متعارفہ از تفسیر و حدیث و فقہ و عقائد و علم ہیئت و صرف و نحو و منطق،
 و معانی و بدیع و بیان و غیرہ ذالک من العلوم المتعارفہ متوجہ گردیدہ و اذ فیض
 بخشی و فیض رسانی داد و بوصف جامعیت کمالات انسانی برالسنہ اخاصی و ادنی
 اشتہار یافت۔“ (۱)

والد گرامی سے حصول تعلیم کے بعد آپ دہلی کے مدرسہ رحیمیہ میں مزید علم کے حصول کی خاطر تشریف لے گئے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ دہلی میں رہ کر آپ نے بہت سے مشائخ سے صحبت حاصل کی اور فیض اٹھایا۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر علم حاصل کیا۔ پھر آپ واپس تلمذ تشریف لے آئے اور والد کی حیات تک وہیں رہے۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے ملتان کے محلے کہہار پورہ میں رہائش اختیار کر لی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ملتان میں آپ جس مسجد میں درس دیتے تھے وہ آج تک قائم ہے اور درس والی مسجد کے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) اس کتاب کا پہلا صفحہ غائب ہے اس لئے مطبع کا نام پتہ نہیں چلتا۔ صرف دہلی کا نام
 رہ گیا ہے۔ (۲) گلشن ابرار (اُردو ترجمہ) حدیقۃ الاخیار، از خواجہ امام بخش مترجم صالح محمد تونسوی، ص ۲۹،
 مطبع صدیقیہ، (۳) خیر البلاد از انیسویس قیصر، ص ۱۱۔

۱۔ بحوالہ ”انوار جالیہ“ فارسی (تلمی) از منشی غلام حسن شہید، ص ۸، ۷۔

نام سے مشہور ہے جو دولت دروازے کے اندر واقع ہے۔ مولوی عبدالغفور انصاری (متوفی ۱۳۱۴ھ) کی ایک منظوم قلمی کتاب ”در تعریف خواجہ خدا بخش خیر پور ٹا میوالی“ (سرائیکی) مجھے اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں ملتان میں خواجہ خدا بخش کے تدریسی مشاغل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں انہوں نے اپنی ایک مسجد بنائی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم آنے لگے اور یوں ان کا فیض ہدایت عام ہوا اور تمام شہر والوں نے اپنے اپنے نصیب کے مطابق فیضان حاصل کیا۔ اشعار یوں ہیں

جو ہک مسجد اونہاں اپنی بنائی	پڑھن کیتے بہوں مخلوق آئی
اوس درج درس شروع کیتونے	ہزاراں طالباں کوں رنگ لیونے
جسے طالب اونہاں توں سبق گھدا	چو وہ کونین عجب اس فیض لدھا
کوڑے ہالے بہرہ ازل کولوں	پیتا اس نے پیالہ فضل کولوں
تمام شہر فیض انہاں ونڈایا	حسب قسمت نصیبیا اونہاں پایا (۲)

لیکن ڈاکٹر مہر عبدالحق کا کہنا ہے کہ مولوی خدا بخش صاحب

”حافظ جمال اللہ کے قائم کردہ مدرسہ عالیہ کے اول مدرس اور مہتمم و منصرم تھے آپ نے ملتان میں ساہا سال رشد و ہدایت کے سلسلے کو نہایت کامیابی سے چلایا پھر جب ملکی حالات خراب اور بد امنی انتہا کو پہنچ گئی تو حافظ صاحب نے انہیں نقل مکانی کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ بہادر پور کے بے آب و گیاہ ریگزاروں کی طرف شمع ہدایت و تبلیغ لے کر چل پڑے اور خیر پور ٹا میوالی میں متمکن ہو گئے جہاں انہوں نے مدرسہ قائم کر لیا۔“ (۳)

۱- سرد لبرال، ص ۵۔ پر لکھا ہے کہ ”چنداں تدریس علم کر دکہ عالم را از علم خود بہر داد“ (سرد لبرال از مولانا عبید اللہ ملتان، ص ۵۔ مطبوعہ فیض عام پریس لاہور، ماہ صفر ۱۳۲۳ھ)۔

۲- ”در تعریف خواجہ خدا بخش“ (قلمی سرائیکی منظوم) از مولوی عبدالغفور انصاری المتخلص عبداللہ ص ۶، مرقومہ ۱۳۰۵ھ (۵۰ صفحے پر مشتمل کتابچہ ہے)۔

۳- ملتان کے اسلامی دور حکومت کے انحطاط کی چار عظیم شخصیتیں، ص ۶، مطبوعہ امروہ ملتان نمبر ۱۹۷۸ء

اپنے طریق تدریس کی بنیاد پر بہت جلد آپ کی شہرت دُور دراز تک پھیل گئی۔ سید عبدالحی ندوی آپ کے درس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

”ایشیخ العالم خدابخش اچشتی الملتانی احد من كبار المشائخ می عصره دلانشار

”ملتان“ وقرار العلم علی من بہا من الغلام ثم تصدرت تدریس ودرسن

بمدینۃ العلم ”ملتان“ اربعین سنہ“ (۱)

گلشن ابرار کے مطابق

”مولانا صاحب اپنے بزرگوں کی ہدایت کے مطابق علوم ظاہری کی تدریس

میں مشغول ہوئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، علم ہیئت، صرف و نحو، منطق

و معانی، بدیع و بیان وغیرہ جملہ علوم متعارفہ کی تعلیم دیتے تھے اور لوگوں کے

فیض رسانی میں مشغول رہے اور آپ کے علمی کمالات کے چرچے خاص و عام

میں پھیل گئے۔ عتفوان شباب سے لے کر آخر بڑھا پلے تک لوگوں کو فائدہ

پہنچانے اور لوگوں کے فیض دینے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ہمیشہ رضائے الہی کے طالب رہے۔ ان لوگوں کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ

کر رہی۔ جنہوں نے آپ کے مدرسہ سے فارغ ہو کر دستار فضیلت باندھی۔

عام طالب علموں کا تو شمار نہیں۔ آپ جو دو کرم اور فیض اتم کے ایک سمندر

بے کنار تھے جن کے جن کے علوم کے سیلاب سے ہزاروں پیاسوں نے اپنی

طلب اور شوق کی پیاس بجھائی۔ ان کے دل کا ایک ایک قطرہ درنایاب اور ان

کے سینے سے ایک ایک علم بحرِ قلزم تھا۔“ (۲)

ڈاکٹر مہر عبدالحق کے مطابق

”آپ علم ریاضی میں ہمارت تامر رکھتے تھے۔ علوم دینیہ و باطنیہ کے بہت بڑے

فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔“ (۳)

۱۔ نزہت الخواطر جلد ششم از سید عبدالحی ندوی، ص ۳۶۸، مطبوعہ دارالمعارف، حیدرآباد دکن۔

۲۔ گلشن ابرار (اُردو ترجمہ) از خواجہ امام بخش، ص ۲۸۴۔

۳۔ ”ملتان کے اسلامی دور حکومت کے انحطاط کی چار عظیم شخصیتیں“ ص ۶، مطبوعہ امروز۔

وہ علوم جن کا شمار آج سائنسی علوم میں ہوتا ہے۔ خواجہ خدا بخش ان میں ہمارت رکھتے تھے۔ دین اور دنیا کا یہ ملاپ بہت کم صوفیاء میں دکھائی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے خواجہ خدا بخش کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ وہ ہر خاص و عام کو حساب، رسالہ ہائے اسطرلاب کرہ، حکمت اور اقلیدس وغیرہ کی تعلیم دیتے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ علوم متروک ہو گئے تھے اور لوگ ان علوم کے حصول میں سستی سے کام لیتے تھے اور چونکہ حضرت خواجہ خدا بخش کو یہ علوم بڑی دشواری سے حاصل ہوئے تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ دوسرے ان سے حاصل کریں۔ اکثر فرماتے

۷ بیکار مہاش کچھ کیا کر خون دل عاشقاں پیا کر ۱۱

اس بات کی تصدیق مولانا عبید اللہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو سرد لبرال ص ۹ پر موجود ہے۔ اس کا ترجمہ کیپٹن واحد بخش سیال کے الفاظ میں لکھتی ہوں کہ

"حضرت اقدس نے علوم اسلامیہ کے علاوہ مجھے فنون (دنیاوی علوم) کی

بھی تعلیم دی۔ مثلاً ریاضی، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، طب، علم زچگی، اقلیدس

وغیرہ۔" (۲)

دنوی دروس و تدریس کے دوران آپ روحانیت کی طرف مائل ہوئے تو مرشد کی تلاش بھی ہوئی۔ چنانچہ کئی جگہوں کا سفر کیا۔ بہت سے بزرگوں سے ملاقات بھی ہوئی اور آخر حافظ جمال کی شکل میں مرشد نظر آیا تو حضرت بہاء الدین زکریا کے مزار کے سامنے بیٹھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور سلوک کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ "قصر عارفان" میں لکھا ہے کہ

"در ملتان مولوی خدا بخش از مریدان ایشان (حضرت حافظ جمال) مے باشند" (۳)

۱- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "گلشن ابرار" فارسی (قلمی) ص ۲۳۹، دوسرا مصرعہ یوں مشہور

ہے کہ "کچھ نہیں تو کپڑے پھاڑ کر سیا کر" لیکن خواجہ صاحب کے تصرف سے شعر میں زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

۲- سرد لبرال (اردو ترجمہ) ص ۵۲، مطبوعہ صوفی فاؤنڈیشن بہاولپور، اشاعت اول، محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

۳- "قصر عارفان" (فارسی) جلد دوم، ص ۱۲، مؤلف مفتی علی الدین خلیف مفتی خیر الدین لاہور،

مطبوعہ پنجابی اکیڈمی لاہور۔

حافظ محمد جمال کے ساتھ آپ کئی مرتبہ ان کے مرشد خواجہ نور محمد مہاروی کی خدمت میں مہار شریف تشریف لے گئے۔ وہ آپ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اکثر حافظ جمال سے فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے ایک شیر کو جال میں پھنسا یا ہے۔ اس کے علاوہ بارہا اپنی زبان سے خواجہ خدا بخش کے اوصاف، فطری صلاحیت اور قابلیت کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا نوار جمالیہ میں لکھا ہے کہ

"باوجود کمالات فنون ظاہر شوق تحصیل علوم باطن نیز دامن کش خاطر مبارک بود

باقضائے ہدایت ازلی بشرف بیعت جناب مخدومی قدس اللہ سرہ العزیز (حضرت

حافظ جمال) مشرف گشتند و قربے بلند و قبولے ارجمند یافتند بلکہ در جناب قبلہ

عالم رضی اللہ عنہ (خواجہ نور محمد مہاروی) نیز مرغوب و مقبول شدند چنانکہ نقل است

کہ در آیامے کہ جناب مخدومی بہ قصد زیارت حضرت قبلہ عالم رضی اللہ عنہ کہ در ان

زبان پیرایہ حیات صوری در برداشتند ہمراہ بردند۔ در اولین صحبت مورد فیض

و منظر قبول آنجناب گردیدند چنانچہ حضرت قبلہ عالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بر زبان

مبارک خود ایثاں را مستثنائی سلسلہ عالیہ فرمودند و نیز بہ حضرت جناب مخدومی

مبارک دادند کہ شیر عظیم بہ چنگال تو در آمدہ و بارہا ذکر مکارم اوصاف ایثاں بر

زبان کرامت ترجمان حضرت قبلہ عالم رفتند و بہ کرامت مرآت قابلیت جبلی و

استعداد فطری ایثاں مرغوب جناب قبلہ عالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ افتاد" (۱)

خواجہ خدا بخش نے خواجہ نور محمد مہاروی سے بھی بہت فیض حاصل کیا۔ حافظ جمال فرماتے تھے کہ،

"خواجہ خدا بخش کو میرے ساتھ تو فقط بیعت کا تعلق ہے ان کو جو بلند مرتبے حاصل

ہوتے ہیں۔ خود قبلہ عالم سے ملے ہیں۔" (۲)

تحفۃ الابرار میں لکھا ہے کہ

"آپ کامل ترین خلیفہ حضرت حافظ محمد جمال ملتانی تھے۔ آپ عالم قیصر اور رموز تصوف

۱- "انوار جمالیہ" فارسی (قلمی) از منشی غلام حسن شہید، ص ۸-۹۔

۲- "اولیائے بہاؤ پور" از مسعود حسن شہاب، ص ۱۷۳۔

کے اعلیٰ درجے کے ماہر تھے۔^(۱)

آپ کو اگرچہ حافظ محمد جمال سے بیعت کرنے کی اجازت مل چکی تھی لیکن آپ کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ آپ مرشد کے ہوتے ہوئے براہ راست لوگوں کو بیعت کرنا درست خیال نہیں کرتے تھے۔

خواجہ خدا بخش نور محمد مہاروی کے خلیفہ خواجہ سلیمان تونسوی کے ہم عصر تھے اور اکثر عرس وغیرہ کے موقع پر اکٹھے ہوتے تھے۔ جیسا کہ "منتخب ملفوظ شریف" میں لکھا ہے کہ

"..... مؤلف مناقب شریفہ در این جامی آرد کہ یکے مرتبہ حضرت فخر الاولیاء قدس سرہ (حضرت سلیمان تونسوی) بر عرس حضرت قبلہ عالم بر خالقہ تبرکہ ادشاں تشریف فرما بودند کہ کسی عالم چند سوال از مسائل بخدمت آن فخر الاولیاء قدس سرہ عرض نموده جواب با صواب یافته بود و در آن مجلس حضرت مولوی صاحب مولوی خدا بخش خیر لوری کہ خلیفہ اعظم حضرت حافظ صاحب حافظ محمد جمال ملتانی بود موجود بودند۔"^(۲)

خواجہ خدا بخش، خواجہ سلیمان تونسوی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سلیمان نے ایک سفارشی چھٹی ان کے نام لکھی جس میں خواجہ خدا بخش کے ایک مرید سے کام تھا۔ خواجہ صاحب اس خط کے ملتے ہی بذات خود اپنے مرید کے مکان پر پہنچے وہ حیران رہ گیا کہ حضور نے خود کیوں زحمت کی لیکن خواجہ صاحب حضرت سلیمان کی خوشنودی چاہتے تھے اس لئے اس کو بلانے کی بجائے خود جانا مناسب سمجھا۔^(۳)

خواجہ خدا بخش بہت عرصہ ملتان میں رہ کر درس و تدریس کا کام سرانجام دیتے رہے۔ ملتان پر جب سکھوں نے رنجیت سنگھ کی سرکردگی میں بار بار حملے کئے تو دوسرے

۱- "تحفۃ الابرار" جدول ثانی، ص ۱۵۲، مطبوعہ مطبع رضوی، دہلی۔

۲- منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) مرتبہ حضرت خواجہ یل محمد بن تاج محمود حشقی، پاکپن، ص ۵۵۔

یہ قلمی نسخہ جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوا۔

۳- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے، کتاب مناقب سلیمانی، فارسی (قلمی) ص ۵۲-۵۵، کتاب خدا بخش ذوقی۔

علماء کے ساتھ ساتھ آپ نے بھی یہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب تک ملتان میں رہے حافظ محمد جمال اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ جنگ میں حصہ لیتے رہے۔ گویا بقول مولوی حفیظ الرحمن

”آپ علم و عمل کے دونوں زیوروں سے بہترین طریق پر آراستہ تھے۔“
 سکھوں نے جب قلعہ ملتان کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو آپ بھی حافظ جمال کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ جیسا کہ حافظ جمال کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب سکھ قلعہ کا محاصرہ کرنے کے باوجود فتح نہ کر سکے اور ہزیمت کھا کر پسا ہو گئے تو منجھین کے حوالے سے یہ بات مشہور ہو گئی کہ ملتان میں ایک قطب ہے اور جب تک وہ موجود ہے اس کی زندگی میں قلعہ تسخیر نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ یہ بات حضرت حافظ جمال کے بارے میں کہی گئی تھی لیکن انہوں نے خواجہ خدا بخش کو قطب قرار دیا۔ حضرت غلام حسن شہید لکھتے ہیں

”بزبان کرامت بیان رفت کہ بے شک ذات حضرت مولوی صاحب (خولجہ خدا بخش) قطب زمانہ است پس رتبہ قطبیت ایشان بدلیل ناطق و برہان صادق باثبات رسیدہ۔“^(۱)

گلشن ابرار فارسی (قلمی) میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”در ایام کہ قلعہ دارالامان ملتان محصور کفار مقہور گشت در اں ایام خدام کرام جناب حضرت حافظ صاحب محمد جمال نور اللہ مرقدہ نیز در اں قلعہ محصور بودند انحصار بعد رفتی ہنگامہ محاصرہ بر السنہ عوام شہرت یافت کہ بعضی منجمان لشکر کفار گفتہ اندوہم بعضی مجازیب خبر دادہ کہ در ملتان قطبے است از اقطاب اللہ کہ ملتان در ظل حمایت او مامون ست تا عین حیات او تسخیر قلعہ دشوار ست چنانچہ ایں سخن بگوش پر ہوش آبخواب حضرت حافظ صاحب قدس سبرہ در رسید اگرچہ بالیقین اشارت قطب بہ نفس نفیس آبخواب بود لیکن بر زبان

۱- ”ذکر کرام“ از مولوی حفیظ الرحمن، ص ۲۷۔

۲- ”انوار جالیہ“ فارسی (قلمی)، از منشی غلام حسن شہید، ص ۹۔

کرامت بیان چنان رفت کہ بیشک ذات حضرت مولوی صاحب (خواجہ
خدا بخش) قطب زمانہ ست پس رتبہ قطبیت آنحضرت بدلیل ناطق و برہان
صادق بہ اثبات رسیدہ ۱۱

جب آپ نے ملتان چھوڑا تو پہلے موضع دنیا پور المعروف راوے والا میں کچھ عرصہ قیام فرمایا
گلشن ابرار کے مطابق

"جناب حافظ صاحب (حافظ جمال) نے حافظ غلام حسن بھٹی کو ایک خط لکھا
کہ جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ پر واضح ہو کہ جناب مولانا صاحب ملتان سے
چلے گئے اور کوثر و سبیل کی طرح وہاں کے لوگوں کو سیراب کر رہے ہیں۔ آپ
پر واجب ہے کہ جو کچھ ہو سکے ان کی نذر گزاریں۔ ان کو اپنے مکان پر لے آئیں
اور اپنے تئیں بھی ان کے چشمہ رحمت سے سیراب ہوں۔ نیز اس موقع
کو غنیمت سمجھیں۔ جب یہ نامہ نامی آپ کی خدمت میں پہنچا تو تمیلاً جو کچھ بھی
گھر میں موجود تھا از قسم زیورات و پارچات وغیرہ جناب مولانا صاحب کی
خدمت میں لے گئے، نذر کر دی۔ آپ بہت ہی التجا اور آرزو کے ساتھ ان
کو اپنے ڈیرہ چیلادوہن میں لے گئے اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوئے" (۲)

یہاں سے آپ بہاولپور کی طرف گئے تو وہاں کے والی ریاست محمد صادق خاں نے آپ کو
خیرپور میں بٹھرایا۔ آپ کے خادموں کا روزینہ مقرر کیا اور لنگر کا تمام خرچ اپنے ذمے لے لیا
اس کے بعد آپ تمام عمر خیرپور میں ہی رہے۔ وہاں آپ نے ایک مؤذن مسجد، ایک
محموظ کنواں، ہمان سرائے، فقرا کے حجرے اور دیگر لوگوں کے لئے عمارتیں تعمیر کرائیں۔ (۳)
خواجہ خدا بخش نے خیرپور میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے
ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مسعود حسن شہاب کے مطابق

۱- گلشن ابرار، فارسی (قلمی)، ص ۲۰۹ - ۲۱۰ -

۲- گلشن ابرار (اُردو ترجمہ) ص ۲۹۳ (گلشن ابرار فارسی (قلمی) میں ص ۲۱۶، پر یہ واقعہ درج ہے)

۳- ۱۷۱۷ء کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) گلشن ابرار، ص ۲۹۵ (۲) خیرالبلاد، ص ۳۱ -

آپ کی تمام عمر درس و تدریس میں صرف ہوئی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، علم ہیئت، صرف نحو اور منطق و معانی آپ کے درس کے خاص موضوعات تھے۔ آخری عمر میں تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری کیا۔ اس دور کی ایک مشہور کتاب توفیقیہ آپ کی یادگار ہے۔ اس میں شریعت کے احکام، طریقت کے آداب، حقیقت اور معرفت کے اسرار بیان کرنے کے علاوہ وحدت الوجود کے مسئلے کو بھی بڑے عالمانہ اور عارفانہ انداز میں حل فرمایا ہے۔ (۱)

مولوی امام بخش لکھتے ہیں کہ

”ضعف بدنی کے باعث جب آپ میں درس و تدریس کی طاقت نہ رہی تو ورد و وظائف سے جو وقت بچ رہتا اپنی مشہور تصنیف توفیقیہ کے لکھنے میں مصروف رہتے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کہ شریعت کے احکام، طریقت کے آداب، حقیقت اور معرفت کے اسرار بیان کئے ہیں۔ اس رسالہ میں توحید کے ایسے دقیق مسئلے بیان کئے گئے ہیں کہ راز داران معرفت نے کم لکھے ہوں گے جو بھی صاحب مذاق آپ کے پاس آتا اسے اس کے مسودہ دکھاتے اور فرماتے کہ ان کی تصحیح کر دو۔ بعض کو تو درمقصد ہاتھ لگ جاتا اور بعض کا انکار اہل اللہ کے کمالات پر ٹوٹ جاتا اور بعض بیچارے گمراہی اور ضلالت میں رہ کر محروم رہ جاتے۔“ (۲)

خواجہ خدا بخش تمام عمر درس دیتے رہے۔ پہلے ملتان میں اور پھر خیرپور میں۔ اس موقع پر آپ نے ہر طرح کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ آپ علم کا دریا تھے۔ ہر موضوع پر بے تکان بولتے اور حدیث و فقہ کے حوالے دے کر بات کرتے تھے۔ لوگوں نے کسی مسئلے کے متعلق آپ کی رائے پوچھی، آپ باقاعدہ حوالے دے کر بات کرتے اور آپ کی یہ بات فتوے کی صورت اختیار کر جاتی۔ چنانچہ آپ نکاح، طلاق، قبروں پر اذان دینے جیسے مسئلوں پر بھی فتوے جاری کر چکے تھے۔ آپ کی باتیں شیریں اور انداز شگفتہ ہوتا جو سننے والے کے دل پر اثر کرتا

۱۔ ”اولیائے بہادری پور“ از مسعود حسن شہاب، ص ۱۷۵

۲۔ ”گلشن ابرار“ (اردو ترجمہ) ص ۲۸۳ - ۲۸۵

موقع بہ موقع اشعار بھی پڑھتے تھے۔ مسعود حسن شہاب لکھتے ہیں کہ
 ”آپ کی مجلس میں ہمیشہ اسرار و معارف کا بیان ہوتا تھا اور باتوں باتوں میں
 آپ ایسے نکتے حل فرمادیتے تھے جن کے لئے ضخیم کتابوں کی ضرورت ہوتی
 ہے۔ اکثر بر محل اشعار سے خشک موضوع کو بھی شگفتہ بنا دیتے تھے۔ صبح دم
 یہ اشعار زبان مبارک پر ہوتے تھے۔“

سحر بر خیزند ذکر بے ریاکن
 اگر گوئی کہ من درویش عالم
 بدال درگاہ خود را آشنا کن
 نظر بر خاندان مصطفیٰ کن
 اگر گوئی کہ بر من ظلم رفت است
 نظر بر گشتگان کر بلا کنسے

چشتیہ سلسلے کے صوفیاء کی سماع سے دلچسپی بے مثال ہے۔ جنوں کی حد تک سماع میں
 دلچسپی رکھتے تھے۔ خواجہ خدا بخش کو بھی سماع سے دلچسپی تھی اور سماع کی محفل میں سب
 سے پہلے ان پر ذوق طاری ہوتا تھا۔ بہر حال موقع ہوتا تو کسُن لیتے لیکن فرمائش کر کے
 کسی کو گانے بجانے کی تکلیف نہیں دیتے۔ ”انوار جالیہ“ کے مطابق
 ”باوجود استیلائے ذوق و تعطش سماع گاہے کسے را تکلیف قولے و طنے
 و سخنے نفر مودند؟“^(۱)

”سر دلبران“ میں لکھا ہے کہ قوالی کی خواہش خود نہیں کرتے تھے۔ ہاں اگر کوئی شخص اشعار یا
 قوالی سنوانے کا آرزو مند ہوتا تو کسُن لیتے۔^(۲) اسی طرح آپ سماع کی سرمدی آواز یا نئے
 کے حاجت مند نہ تھے۔ کیونکہ سماع کے بغیر بھی الحان اور سر آپ کے ذوق لطیف کا حصہ
 تھے۔ چنانچہ آپ دوستوں کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر سماع سنتے تھے اور بس۔ کسی نے
 انہیں کبھی سکر یا وجد کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ ”سر دلبران“ میں لکھا ہے کہ

۱- ”ادلیائے بہادرپور“ ص ۱۷۷-۱۷۸۔

۲- ”انوار جالیہ“ فارسی (قلمی) از منشی غلام حسن شہید، ص ۹۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں

”گلشن ابرار“ فارسی خطی، ص ۲۱۱ تا ۲۱۲۔

۳- ”سر دلبران“ (فارسی) از حضرت عبید اللہ ملتانی، ص ۲۹، فیض عام پریس لاہور، ماہ صفر ۱۳۲۲ھ

” آنحضرت را با سماع الحانائات حاجت بنود چه بے سماع الحانائات حاجت بنود
 چه بے سماع الحانائات در ذوق می بود و اگر می شنود برائے موافقت یاراں و خوشی
 دوست داراں می شنود، از دیدن سکر و وجد او خلق در دیند رسوم و عادات
 محجّب بود“ (۱)

آپ کے حلیہ مبارک کے بارے میں حافظ غلام حسین بھٹی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے حضرت
 غوث بہاء الدین زکریا کی زیارت نہ کی ہو تو وہ حضرت مولانا محبوب اللہ کو دیکھ لے کہ دونوں
 شیخین کے درمیان صوری اور معنوی طور پر بال برابر کا بھی فرق نہیں ہے (۲)

خواجہ خدا بخش خیر پور میں تقریباً ۱۹، ۲۰ برس تک درس و تدریس کی خدمات سر انجام
 دیتے رہے۔ البتہ آخری عمر میں ضعف کی وجہ سے تمام شغل ترک ہو گئے اور زبان پر صرف لا الہ
 الا اللہ کا ورد جاری رہا۔ آخر عمر ماہ صفر ۱۲۵۰ھ میں آپ نے وفات پائی اور خیر پور میں
 ہی آپ کا مزار بنا جو آج تک مزاج خلّاق ہے۔ مولوی عبدالغفور انصاری لکھتے ہیں

ڈھاڑے عرس عجب مخلوق آندی وچ اس دربار عالی نہ سماندی
 بزرگاں سازیاں دے عرس تہذیبی مثل عرس اونہاں ہرگز نہ سیندی
 سماع ہوندا عجب مجلس وچالے دل آندا جذبے وچ از حد خیالے (۳)
 ترجمہ: یعنی عرس کے دن اتنے لوگ جمع ہوتے ہیں کہ اس دربار عالی مرتبت میں سما بھی

۱- ”سر دلبراں“ (فارسی) از حضرت عبید اللہ ملّانی، مد ۴، فیض عالم پریس لاہور، ماہ صفر ۱۳۲۴ھ
 ۲- اصل عبارت یوں ہے ”اگر کسے زیارت حضرت غوث بہاء الدین زکریا نہ کرے یا نہ کرے وہ باشد زیارت حضرت
 محبوب اللہ (خواجہ خدا بخش) مشرف شود کہ فی ما بین ہر دو شیخین صورتاً و معنی بقدرتار موفرق نیست“
 (گلشن ابرار فارسی، قلمی، ص ۲۱۴-۲۱۸)

۳- (۱) گلشن ابرار (اُردو ترجمہ) ص ۳۳۲ (۲) اولیائے بہاد پور، ص ۱۷۹۔ لیکن عمر کمال خاں
 نے اپنی کتاب ”نواب مظفر خان شہید اور اس کا عہد“ ص ۲۸۳، اور مولوی عبدالغفور انصاری نے اپنی کتاب
 ”در تعریف خواجہ خدا بخش“ میں ص ۴۶ پر آپ کا سن وفات ۱۲۵۱ھ لکھا ہے۔
 ۴- بحوالہ ”در تعریف خواجہ خدا بخش“ قلمی منظوم سرائیکی، ص ۷۔

نہیں سکتے۔ یوں تو تمام بزرگوں کے عرس تہذیب کی علامت ہیں لیکن ان جیسا عرس کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اس مجلس میں ایسا سماع ہوتا ہے کہ دل جذبات سے مملو ہو جاتا ہے، خواجہ خدا بخش کے ہاں صرف ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جو بچپن میں ہی فوت ہو گیا۔ آپ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ آپ کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے چند مشہور یہ ہیں قاضی محمد عبید اللہ ملتانی، منشی غلام حسن شہید، مولوی عظیم بخش احمد پوری، مولوی محمد موسیٰ ملتانی، مولوی خدا بخش ملتانی، قاضی محمد عیسیٰ خان پوری، مولوی محمد حسین پنوار، مومن شاہ احمد پوری، مولوی نور اللہ خیر پوری، مخدوم حامد شاہ گیلانی اور مولوی نور محمدی بھنڈی والہ۔

آپ کی تصانیف توفیقیہ، توحید یہ اور ذوقیہ آپ کے خیالات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں سے توفیقیہ بہت عرصہ پہلے چھپی تھی جو اب نایاب ہے۔ البتہ اس کے قلمی نسخے کئی لوگوں کے پاس ہیں۔ آپ کی دوسری تصنیف ذوقیہ نایاب ہے۔ آپ کی ان کتابوں میں سے حقیقت و معرفت کے اسرار، شریعت کے احکام، طریقت کے آداب اور توحید سے متعلق آپ کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ ان تینوں کتابوں کے قلمی نسخے جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ حضرت خواجہ خدا بخش جب گفتگو فرماتے تھے تو اس میں علمیت کے علاوہ ادبیت کا رنگ بھی ہوتا تھا۔ اشاروں اور کنایوں میں بات کرنے سے نہ صرف بات میں حُسن پیدا ہو جاتا تھا بلکہ اس میں گہرائی بھی آجاتی تھی۔ مثلاً ایک بار فرمایا

”نخواہد ایں چمن از سر دلالہ خالی ماند یکے ہے رود و دیگر ہمیں آید مراد از سر و مرشد ست کہ از دست و مراد از لالہ عاشق است کہ بداغ ہجران مستلاست یعنی جہان از طالبان و مطلوبان خالی نباشد؟“^(۱)

ایک اور موقع پر فرمایا

”عاشقان ہر چند مشاق جمال دلبرند، دلبران بر عاشقان عاشق تراند؟“^(۲)

۱۔ ”گلشن ابرار“ فارسی (قلمی) ص ۲۲۱ - ۲۲۲ -

۲۔ ایضاً ص ۲۲۳ -

حضرت خواجہ خدابخش جب کوئی تلقین کرتے یا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت فرماتے تو اس کے لئے براہ راست قرآن و حدیث کے حوالے سے بات کرنے کی بجائے قصوں، شعروں یا حکایتوں کے ذریعے بالواسطہ طور پر اظہار فرماتے تاکہ کم عقل اور جاہل لوگوں تک بات کو باحسن طریق پہنچایا جاسکے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو مولانا روم نے اختیار کیا تھا۔ گویا وہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ

خو شتر آں باشد کہ سرد لبرال گفتہ آید در حدیث دیگران

ان کے ملفوظات پر مبنی ایک کتاب کا نام بھی "سرد لبرال" ہے جسے ان کے خلیفہ اول مولانا عبید اللہ ملتانی نے مرتب کیا۔ حضرت عبید اللہ ملتانی کے مطابق آپ بڑے دردمند انسان تھے۔ دوسروں کے دکھ میں دکھ محسوس کرتے اور دوسروں کو راحت میں دیکھ کر راحت پاتے گویا سارا عالم آپ کے اجزاتھے۔ لکھا ہے

"..... بتضرر دیگرے متضرر میشد و نفع میشد گویا ہمہ عالم اجزائے اوست"^(۱)

یہ نظریہ حیات و وحدت الوجود کی بنیاد اور روح ہے۔ آپ خلق عظیم کے حامل تھے اس کے باوجود کہ کوئی شخص آپ سے بے ادبی برتتا یا غصہ دکھاتا آپ دوستوں سے بڑھ کر اس پر شفقت اور کرم فرماتے۔ آپ ہمیشہ یہ تلقین کرتے۔

"اگر مردی احسن الامن اُسا"

یعنی اگر تو مرد ہے تو اس کے ساتھ نیکی کر جس نے تیرے ساتھ برائی کی۔^(۲)

آپ کے مرید آپ سے ملنے کے لئے آتے تو آپ تعظیماً کھڑے ہو جاتے اس سے راہ کی ساری کلفتیں بھول جاتیں۔ مولوی عبید اللہ ملتانی لکھتے ہیں کہ وہ جب کبھی زیارت کے لئے حاضر خدمت

۱- سرد لبرال از مولانا عبید اللہ ملتانی، ص ۴، فیض عام پریس لاہور، ماہ صفر ۱۳۲۲ھ

د جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق سے دستیاب ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ کیپٹن واحد بخش سیال نے کیا ہے

جسے صوفی فاؤنڈیشن بہاولپور نے حرم الحرام ۱۴۰۰ھ میں پہلی بار شائع کیا۔ (یہ کتاب مجھے اسد نظامی

سے ملی۔)

۲- سرد لبرال از عبید اللہ ملتانی، ص ۱۷۔

ہوتے تو آپ مرجا مرجا فرما کر یہ شعر پڑھتے

آمدی و آمدنت بس خوش است دیدن روتے تو عجب دلکش است

ان کے اخلاق، انکساری، شفقت اور محبت کے کتنے واقعات مولانا عبید اللہ ملتانی نے "سر دلبران" میں قلم بند کئے ہیں۔^(۱)

حضرت خواجہ خدا بخش اپنی گفتگو میں موقع محل کے مطابق فارسی اشعار پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی خود بھی فارسی شعر کہتے تھے۔ اسی طرح اُردو اور سرائیکی اشعار بھی استعمال کرتے تھے اور ان میں تصرف بھی فرماتے تھے۔ مثلاً

بیکار مباحش کچھ کیا کر خون دل عاشقاں پیا کر^(۲)

اسی طرح ایک موقع پر فرمایا

وقت سحر وقت مناجات ہے خیز در راں دم کہ بہ برکات ہے
نفس مبادا کہ گوید سترا خسب چہ خیزی کہ ابھی رات ہے^(۳)

ایک دفعہ بطریق استعارہ فرمایا

در کوئے دوست گرچہ عطا بھیر بھاڑ ہے تو بھی گھڑ گھڑ کے آبنجا گھساڑ چشم^(۴)

پھر فرمایا

عطا از مفلسی دو لوگ رہتے سمجھتے بوجھتے پہچانتے رہ^(۵)
اسی طرح ایک موقع پر یہ پہیلی کہی

۱- سر دلبران، از عبید اللہ ملتانی، ص ۶

۲- ملاحظہ فرمائیے، - ایضاً - ص ۶، ۸ تا ۱۰

۳- ایضاً - ص ۹

۴- ایضاً - ص ۱۱

۵- ایضاً - ص ۱۳، کیپٹن واحد بخش سیال نے اس شعر کو یوں لکھا ہے

در کوئے دوست عطا کی ہے بھیر بھاڑ + تو بھی گھڑ گھڑ کے آبنجا گھساڑ (سر دلبران (اُردو ترجمہ) ص ۶۶-)

۶- "سر دلبران" (فارسی) از عبید اللہ ملتانی، ص ۱۳-

س ڈوں دی لگی لچھ ترے بجا گھنہی چوتھی داناں ٹکے لگے بادشاہ دے سدودی سراں

(ایں معما چراغ است کہ مرکب از چهار چیز است آتش دروغن و پنبہ و ظرف) (۱)

ایک مرتبہ کسب حلال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا

س لکڑیاں چن لے آؤ ہم کی صفت اور سچ کہا یہ مجرب چوب چینی ہے من کے درد کو^(۲)

غزور، خود بینی اور خود پستی کو ختم کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا

س ما جنیندی پترنے و مھوہ وئی سنج و سبائی ہر کو پتر سو جو دست پیٹی^(۳)

وحدت اور کثرت کے مسئلے پر فرمایا

س چل بلا چلئے سنارتے او تھاں گھنے گھر بجن لاکھ صورت آپو آنٹی تو ہکو رو یا آکھ^(۴)

ان اشعار میں ایک طرف تو اخلاق کی تعلیم ہے دوسری طرف اردو اور سرائیکی اشعار اور اقوال کا بے دریغ استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ اپنی گفتگو میں خواص کے لئے عربی و فارسی اشعار اور عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے اردو اور سرائیکی اشعار و اقوال سے کام لیتے تھے۔ نزاکت طبع اور لطافت ذوق کی یہ حالت تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ابو سعید ابو الخیر سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے جنازے کے موقع پر کون سی آیت پڑھی جائے تو انہوں نے کہا کہ قرآن پڑھنا تو بڑی بات ہے یہ شعر پڑھا جائے

س چیت چنیں خوب تر در ہمہ آفاق کار دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

پھر فرمایا کہ میرے جنازے پر یہ شعر پڑھا جائے

س مفلسانیم آمدہ در کوسے تو شینا لہ از جمال روئے تو (۵)

آپ حضرت بہاء الدین نقشبند بخاریؒ سے بھی نسبت رکھتے تھے۔

۱، ۲، ۳ - "سرد لبرال" فارسی، ص ۱۴ -

۴ - ایضاً ص ۱۵

۵ - ایضاً ص ۱۵

حضرت محمد سلیمان تونسوی

ہندوستان میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کے

جن بزرگوں نے ارشاد و تلقین کی بیش بہا خدمات انجام دیں ان میں صوبہ ملتان میں خواجہ سلیمان تونسوی کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کا تعلق پٹھانوں کے قبیلہ جعفر خوانی سے تھا۔ اس قبیلے کو رمدانی (رحیم۔ دانی) بھی کہتے تھے۔ کیونکہ یہ رمدانی قبیلہ کی شاخ تھا۔ جعفر خوانی قبیلہ کے مورث اعلیٰ جعفر خوان تھے جو ابتداء میں مرآتہ (کوہستانی شیرانی) کے مقام پر رہتے تھے۔ کوہستان سلیمان کی دو بلند چوٹیوں "تخت سلیمان" اور "فورٹ مزو" کا درمیانی علاقہ "گرگوجی" کے شمال مشرق میں درگ کا وسیع و شاداب علاقہ تھا۔ جعفر خان نے وہاں کے ہندو حکمران گہنہ کو شکست دے کر وہاں قبضہ کر لیا۔ جعفر خاں کی تیسری نسل سے رحیم داد خاں نے، جو کنبے کا سربراہ تھا۔ بعد ازاں گرگوجی پر بھی قبضہ کر لیا۔ رحیم داد خاں کی مناسبت سے اس قبیلے کا نام رمدانی پڑ گیا۔ اسی رحیم داد خاں کی نسل سے آگے جا کر ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء میں کوہستان "گرگوجی" کے مقام پر خواجہ شاہ سلیمان تونسوی پیدا

۱- (۱) خاتم سلیمانی از مولوی اللہ بخش خان بلوچ، ص ۱۵، مطبوعہ اسٹیٹ پریس لاہور ۱۳۲۵ھ -

(۲) مناقب المہدیین از نجم الدین سلیمانی، ترجمہ و تلخیص پروفیسر انقار احمد چشتی، ص ۱۳، مطبوعہ اسلامک بک

فائونڈیشن لاہور، ۱۹۷۶ء

۲- "سیرت سلیمان" از مولوی صالح محمد، ص ۹-۱۰، مطبوعہ لاہور ۱۸۳۵ء

۳- "حیات سلیمان تونسوی" حصہ اول، از مولوی صالح محمد، ص ۷، مطبوعہ چشتیہ کتاب گھر، لاہور ۱۹۵۶ء

خواجہ سلیمان تونسوی کی صحیح تاریخ ولادت کہیں نہیں ملتی۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ نے ۸۴ سال کی عمر

میں ۱۲۶۷ھ / ۱۸۸۱ء میں وفات پائی تھی۔ چنانچہ اس تاریخ وفات کے مطابق آپ کا سن پیدائش

۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء بنتا ہے۔ (بجراہ مناقب المہدیین، ص ۱۹۹) جبکہ خاتم سلیمانی (حاشیہ) ص ۱۵

سیرت سلیمان، ص ۱۵، تاریخ مشائخ چشت، ص ۶۱۱، پنجاب کے صوفی دانشور، ص ۲۴۰، اور حدیقہ الاولیاء

ص ۱۱، تذکرہ اکابر اہل سنت، مرتب محمد عبدالحکیم شرف قادری، ص ۴۷۰، مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور میں

آپ کا سن ولادت ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء اور مقدمہ توفیق، ص ۵، کے مطابق ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۲ء درج

ہے جو کہ تاریخ وفات کے مطابق درست نہیں ہے۔

ہوئے۔ آپ اپنی جلے پیدائش کے متعلق لکھتے ہیں کہ
 "خانہ خود کہ در کوہ است واسم آل گر گوجی ست کہ مسافت آل از تونسہ
 سی کردہ می شود"

آپ کے والد کا نام زکریا بن عبدالوہاب بن عمر خاں اور والدہ کا نام زلیخا تھا۔ آپ کا خاندانی نام
 "محمد سلیمان" تھا۔ بعد میں آپ حضرت "خواجہ محمد سلیمان تونسوی" کے نام سے مشہور ہوئے^(۱)
 حضرت سلیمان تونسوی کی ابتدائی تعلیم آپ کی والدہ محترمہ کی زیر نگرانی ہوئی کیونکہ والد بچپن میں
 وفات پا گئے تھے۔ چار سال کی عمر میں والدہ نے حفظ قرآن کے واسطے حافظ ملا۔ یوسف نامی جعفر
 خوانی کے پاس بھیجا۔ سلیمان تونسوی نے وہاں رہ کر پندرہ سپارے حفظ کئے۔ بعد میں ایک
 اور بزرگ حاجی صاحب سے کلام اللہ ختم کیا اور انہیں سے دو کتابیں فرائض و کریما پڑھیں^(۲)
 اور اس کے بعد حاجی صاحب نے آپ کو مزید علم حاصل کرنے کے لئے تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی
 خاں) جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ استاد کے حکم سے کوہ درگ سے تونسہ تشریف لے گئے
 وہاں تونسہ کے بازار میں واقع سفید مسجد المعروف "بگی مسجد" میں میاں حسن علی صاحب سے
 فارسی کی چند کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ جن میں پند نامہ عطار اور گلستان و بوستان سعدی شامل
 ہیں^(۳)۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ تونسہ سے پانچ کوس کے فاصلے پر واقع موضع لانگھ
 میں میاں ولی محمد کے پاس گئے۔ میاں ولی محمد سے آپ نے فارسی درسیات کی تعلیم حاصل کی
 پھر عربی تعلیم حاصل کرنے کی جستجو ہوئی تو کوٹ مٹھن تشریف لے گئے جہاں قاضی محمد عاقل نے
 علوم عربیہ اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم قائم کیا تھا۔ ان دنوں اس مدرسے کے صدر
 مدرس قاضی احمد علی تھے۔ خواجہ سلیمان تونسوی نے کوٹ مٹھن میں رہ کر اس مدرسے سے درسی

۱۔ بحوالہ "نافع السالکین" (فارسی) مؤلفہ فقیر امام الدین، ص ۱۰، مطبع مرتضوی دہلی، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء

(جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی۔)

۲۔ بحوالہ "مناقب المہجوبین" اردو ترجمہ، ص ۱۳۴۔

۳۔ بحوالہ "مناقب سلیمانی" (فارسی) قلمی نسخہ، ص ۳، کاتب خدا بخش ذوقی (جناب اسد نظامی

چک نمبر ۱۱/۱۰، آر جہانیاں کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کیا گیا۔)

۴۔ ۱، مناقب المہجوبین (ترجمہ) ص ۱۲۱، خاتم سلیمانی، ص ۲۶-۲۷، حیات سلیمان تونسوی و صحبہ اول، ص ۹۔

کتا میں پڑھیں جن میں منطق کی کتاب قطبی بھی شامل تھی۔ علامہ خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ
 ” درمبادی حال درکوٹ مسٹن بہ مدرسہ قاضی محمد عاقل صاحب بہ تحصیل علم
 کتب درسیہ توجہ می فرمودند “^(۱)

اسی دوران میں جبکہ آپ وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ نور محمد مہاروی اوج
 کے مقام پر تشریف لائے تو کوٹ مسٹن سے قاضی محمد عاقل اور ان کے فرزند قاضی احمد علی مد سے
 کے طالب علموں اور عالموں کو ساتھ لے کر خواجہ نور محمد مہاروی صاحب کی ملاقات کے لئے
 تشریف لے گئے۔ خواجہ سلیمان تونسوی بھی ہمراہ تھے۔ دراصل وہ ” خواجہ مہاروی سے مسئلہ
 سماع پر بحث کرنا چاہتے تھے تاکہ اسے غیر اسلامی ثابت کیا جائے۔ لیکن خواجہ کے حضور
 پہنچے تو کایا ہی پلٹ گئی۔ گڑ گڑانے لگے اور مرید ہونے کی درخواست کی^(۲) جسے خواجہ مہاروی
 صاحب نے قبول فرمایا اور بیعت لینے کے بعد سلیمان تونسوی سے کہا کہ

” اسی میان! بہر جا کہ علم بخوانی برو بخوان

اے میان! جس جگہ علم پڑھ رہے ہو وہیں جا کر مزید علم حاصل کر دو!^(۳)
 گویا حضرت قبلہ عالم نور محمد مہاروی نے اس شہباز کو اپنے دام میں شکار کر لیا^(۴)۔ اس وقت
 سلیمان تونسوی کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ خواجہ مہاروی کے حکم سے سلیمان تونسوی کوٹ
 مسٹن تشریف لائے۔ لیکن مرشد کے عشق نے بے چین کر دیا اور آپ دوبارہ مہار تشریف لے
 گئے جہاں خواجہ نور محمد کا قیام تھا۔ مگر خواجہ مہاروی نے آپ کو واپس بھجوا دیا کہ مزید علم حاصل
 کریں۔ چنانچہ آپ دوبارہ کوٹ مسٹن تشریف لے آئے اور مزید علم حاصل کرنے کے
 بعد نور محمد مہاروی کے مرشد خواجہ فخر الدین دہلوی کی زیارت کے لئے جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ

۱- ” مشائخ چشت “ ص ۶۱۳

۲- ” پنجاب کے صوفی دانشور “ از قاضی جاوید، ص ۲۴۱، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع اول ۱۹۷۹ء

۳- بحوالہ ” خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور ان کے خلفاء “ تحقیق و تصنیف ڈاکٹر محمد حسین ملہی، ص ۱۲

مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور، سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء

۴- بحوالہ کتاب ” مناقب سلیمانی “ (فارسی) تلمی نسخہ، ص ۴۲۔ کاتب خدا بخش ذوقی۔

۱۷۸۲ء میں دہلی روانہ ہوئے^(۱)۔ اوج، بیکانیر اور اجمیر کے راستے سے دہلی پہنچے۔ لیکن آپ کے دہلی پہنچنے سے دو روز قبل خواجہ فخر الدین غازی پٹنہ کے تھے۔ چالیس دن تک ان کے مزار پر متمکف رہنے کے بعد آپ نے خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی، حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، شیخ کمال الدین، امیر خسرو اور شاہ کلیم الدہلوی کے مزارات پر بھی اعتکاف کیا۔ پھر بیکانیر و بھینر سے فرخ نگر اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے رمضان ۱۱۹۹ھ میں مہار شریف پٹنہ^(۲)۔ مہار شریف میں آپ کا قیام حافظ خدا بخش مہار کی مسجد میں تھا۔ آپ یہاں سے اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہوں نے چشتیہ روایات کے مطابق درویشی کے درجے تک پہنچانے کے لئے آپ کو ریاضت و مجاہدے اور ذکر و فکر کی تلقین کی۔ حاجی نجم الدین سلیمانی کے مطابق

”آپ رات دن ذکر، پاس انفاس اور وقوف قلبی میں مصروف رہتے تھے۔ رات کو ذکر جہر بلند آواز سے کرتے۔ آپ کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا۔ صرف کچھری کے وقت زیارت اور سبق کے لئے حضرت قبلہ عالم کی خدمت میں جاتے آپ نے سلوک کی باتیں مثلاً آداب الطالبین، فقرات، لوائح، عشرہ کاملہ، فصوص الحکم وغیرہ اپنے پیرو مرشد سے پڑھیں۔ حضرت قبلہ عالم نے آپ پر خاص توجہ فرمائی۔ چنانچہ کبھی کبھی حضرت قبلہ عالم خود بہ نفس نفیس خدا بخش مہار کی مسجد میں آپ کو ملنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔“^(۳)

یہاں صرف باطنی و روحانی ریاضت پر ہی زور نہیں دیا گیا بلکہ خواجہ نور محمد مہاروسی نے اپنے لنگر کے منتظم غلام رسول کو حکم دیا کہ محمد سلیمان کو کھانا کم دیا جائے اور سردیوں کا بستر بھی معمولی ہو۔ تاکہ

۱۔ ”مناقب المحبوبین“ (ترجمہ) ص ۱۲۲ کے مطابق — ”قبلہ عالم اپنے وطن مہار شریف کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت غوث زماں کو فرمایا کہ آپ یہاں سے دہلی جائیں اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کی ملاقات و زیارت کے بعد میرے پاس مہار شریف آئیں۔“

۲۔ بحوالہ ”خواجہ محمد سلیمان تو نسوی اور ان کے خلفاء“ از ڈاکٹر محمد حسین للہمی، ص ۱۲۸۔

۳۔ بحوالہ ”مناقب المحبوبین“ (ترجمہ)، ص ۱۲۸۔

خواب غفلت کا شکار ہو کر اصل مقصد سے غافل نہ ہو جائیں۔ خواجہ بہاروی نے محمد سلیمان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی خیال رکھا۔ آپ دوسرے مریدوں کی نسبت ان پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر ان کی خبر گیری کے لئے تشریف لے آتے۔ ایک مرتبہ خواجہ بہاروی تشریف لائے تو خواجہ سلیمان "دیوان حافظ" میں سے کچھ اشعار خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ مرشد کے سوال پر کہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ عرض کیا "اشعار دیوان حافظ" انہوں نے فرمایا کہ "ہمیں بھی سناؤ" اس پر خواجہ سلیمان نے یہ شعر پڑھا

کمال صنعت مشاطہ شاید کہ رومی زشت رازیا نساید

یہ سن کر خواجہ بہاروی خوش ہوئے اور خود بھی یہ شعر پڑھا

گو کہ پیر شدی ذوق عاشقیات نماند شراب کہنہ ماستی دگر دارد (۱)

تقریباً چھ سال تک آپ نور محمد بہاروی کی صحبت میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اور روحانی کمالات حاصل کئے۔ خاتم سلیمانی کے مطابق

"خواجہ صاحب نے آداب الطالبین، فقرات، لوائح، عشرہ کاملہ، فصوص الحکم

وغیرہ سلوک و تصوف کی کتابیں سب اپنے پیر سے ہی پڑھیں۔" (۲)

ان چھ سالوں میں صرف تین مرتبہ آپ اپنی والدہ کو ملنے گڑ گوجی گئے لیکن مرشد کے عشق میں بے قرار ہو کر فوراً واپس چلے آئے۔ ان کی والدہ اپنے بیٹے کی جدائی میں بہت پریشان رہا کرتی تھیں۔ منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) کے مطابق ان کی والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ،

۱- بحوالہ "خاتم سلیمانی" از مولوی اللہ بخش خاں بلوچ، ص ۱۲۸۔

۲- بحوالہ "منتخب ملفوظ شریف" فارسی (قلمی) مرتبہ خواجہ یار محمد بن تاج محمود حشمتی پاکستانی، ص ۴۲

(ملکیہ اسد نظامی، جہانیاں) اس کتاب کی ایک نقل لیکن جو کسی دوسرے کاتب احمد الدین کی لکھی ہوئی جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ قلمی نسخہ (فارسی) ۱۲ محرم ۱۳۱۶ھ کو مکمل ہوا۔ اسی طرح ایک نسخہ قلمی جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کے پاس بھی ہے۔ اس کا کاتب میاں غلام محمد ہے۔

(یہ تینوں نسخے مجھے دستیاب رہے۔)

۳- بحوالہ "خاتم سلیمانی" ص ۲۲۔

پسر و فرزند مرا کسی فقیر مہاراں والا چناں سحر کردہ کہ نزد او مضبوط شدہ

می ماند

بلکہ ایک بار انہوں نے ایک شخص کے ذریعے حضرت نور محمد مہاروی کو پیغام بھیجوا یا کہ
 ” اسی میاں فقیر! ایک پسر من فلاں نام بود کہ از مدتی جدا شدہ با نظر ست
 و سابق ازیں مرا خبرش نبود حاتی معلوم شد کہ نزد شماست و من از فراق او
 گداز می شوم بنام خدا عزوجل پسر مرا از خود رخصت دادہ بایں طرف بفریند“
 حضرت نور محمد مہاروی نے حضرت سلیمان تونسوی کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ

” حافظ! حق والدہ بسیار است برو ملاقات کردہ بیاتید“

اس پر حضرت سلیمان تونسوی دو چار روز خاموش رہے۔ آخر ایک دن حضرت مہاروی نے
 پھر طلب کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ

” اے حافظ برائے رفتن بوطن خود دل نمی خواہد؟“

حضرت سلیمان تونسوی نے دست بستہ یہ شعر پڑھا

ز آسودگی منزل الطاف تو جاناں غربت زدگان را نشود میل وطن ہا۔^(۱)

آخری مرتبہ جب آپ اپنی والدہ کو ملنے تشریف لے گئے تو اس وقت خواجہ نور محمد مہاروی
 مرض الموت میں مبتلا تھے۔ تمام علاج معالجے بیکار ہو چکے تھے۔ اس موقع پر آپ بار بار
 خواجہ سلیمان کو روہیلے کے نام سے یاد کرتے رہے۔ آپ کے صاحبزادے نور القصد اور حافظ جمال
 ملتان نے اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ جا کر آپ کو لے آتے ہیں لیکن خواجہ مہاروی نے منع فرمادیا
 آخر یکم ذی الحجہ کو خواجہ سلیمان خود ہی بے قرار ہو کر تشریف لے آئے۔ خواجہ نور محمد نے آپ کو
 اپنے پاس بلایا اور یکم ذی الحجہ سے دو ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کی نماز عصر تک سامنے بٹھائے
 رکھا۔ اس کے بعد فرمایا

” اسی فلاں اگرچہ برائی جدائی تو دل نمی خواہد لیکن بحسب آئین پیران کلاں چوں

خواجہ معین الدین از خواجہ عثمان و خواجہ قطب الدین از خواجہ معین الدین و خواجہ

۱۔ بحوالہ ”منتخب مفوظ شریف“ فارسی (قلمی) ص ۲۱۔

فرید الدین از خواجہ قطب الدین و خواجہ نظام الدین از خواجہ فرید الدین تا آخر یعنی قبلہ عالم (خواجہ نور محمد) از مولانا صاحب (خواجہ فخر الدین) رضوان اللہ تعالیٰ علیہم پیشتر از وصال رخصت شدند، ازیں قرار مانیز شمارا از خود رخصت نماید و اگرچہ تو نواختہ و تلقین یافتہ آہی ہستی مگر آہنچہ از ما بفرمان آہی و معاملہ رسول اللہ و اصحاب و پیران خواجگان چشتیہ و قادریہ و سہروردیہ و نقشبندیہ و شطاریہ وغیرہ تمامی سلسلہ تو ہم رسیدہ، انشاء اللہ تعالیٰ شما بحصول آل مقبول الحق و منظور الرسول گشتید و خواہید ماندہ (۱)

(ترجمہ: اے سلیمان! اگرچہ تمہاری جدائی کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن بزرگان سلسلہ کے مطابق کہ جیسے خواجہ معین الدین، خواجہ عثمان ہارونی سے اور خواجہ قطب الدین خواجہ معین الدین سے اور خواجہ فرید الدین خواجہ قطب الدین سے اور خواجہ نظام الدین خواجہ فرید الدین سے اور آخر تک یعنی خواجہ نور محمد خواجہ فخر الدین سے ان کے وصال سے پہلے رخصت ہوئے۔ اس طریقہ سے ہم (اپنی وفات سے پہلے) تم کو رخصت کرتے ہیں اور اگرچہ تم حق تعالیٰ کے تلقین یافتہ اور برگزیدہ ہو لیکن ہماری طرف سے جو فرمان الہی اور معاملہ رسول اللہ و اصحاب رسول اللہ کے مطابق تمام سلسلوں کے بزرگوں یعنی خواجگان چشتیہ و قادریہ و سہروردیہ و نقشبندیہ و شطاریہ کا فیض تم کو پہنچا ہے۔ انشاء اللہ اس کے حصول کے بعد تم خدا اور رسول کے منظور نظر ہو گئے ہو اور ہمیشہ منظور نظر خدا و رسول رہو گے۔)

اس طرح انہوں نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد چند نصیحتیں ارشاد فرمائیں۔ اور تونسہ شریف میں قیام کی ہدایت فرمائی۔ خلافت کے وقت خواجہ سلیمان کی عمر تقریباً اکیس بائیس سال کی تھی۔ تین ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو خواجہ نور محمد ہاروسی نے وفات پائی۔ خواجہ سلیمان ۹ ماہ تک مرشد کے مزار پر محکف رہے (۲)۔ پھر آپ اپنے وطن گڑگوجی چلے آئے۔ یہاں سے اکثر

۱۔ بحوالہ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور ان کے خلفاء از محمد حسین لہمی، ص ۱۳۳، ۱۳۵۔

۲۔ حوالے کے لئے دیکھئے "گلشن ابرار" دو ترجمہ حدیقۃ الاسرار، از خواجہ امام بخش، مترجم صالح محمد

ص ۲۲۵، مطبوعہ صدیقیہ پریس ملتان۔

جہاں شریف جاتے رہے۔ اسی دوران میں آپ نے والدہ کے اصرار پر اپنے خاندان میں عمرخان جعفر خانی کی بیٹی سے شادی کی۔“

۱۲۱۲ھ میں آپ ضلع ڈیرہ غازی خان کے علاقہ تونسہ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ جہاں آپ نے آخری دم تک زندگی گزار سی۔ آپ کی نسبت سے یہ علاقہ ”تونسہ شریف“ کہلایا آپ جب تونسہ منتقل ہوئے تو یہاں کی آبادی بمشکل سو گھروں پر مشتمل تھی۔ ابتداء میں سرکنڈوں کی جھونپڑی بنا کر وہیں رہنے اور عبادت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس علاقے کی صورت حال بدلنے لگی۔ آپ کے آنے کے بعد طالبان علم دور دور سے یہاں آکر آباد ہونے لگے تو آپ کی رہائش کے اردگرد والی زمین بھی آباد ہونے لگی اور اس میں نئی نئی عمارتوں کا اضافہ ہونے لگا۔ نجم الدین سلیمانی نے لکھا ہے کہ

”آپ کی والدہ محترمہ، ہمیشہ محترمہ اور زوجہ محترمہ تونسہ شریف آگئے تو آپ نے سب سے پہلے اپنے دولت خانہ کے لئے ایک کمرہ، ایک دالان اور چاروں طرف بڑی دیوار کا احاطہ تعمیر کرایا اور ساتھ ہی اپنے لئے ایک حجرہ عبادت فقراء کی مجلس کے لئے ایک دالان اور باجماعت نماز کے لئے بغیر چھت کی مسجد تعمیر کرائی۔ بعد ازاں ایک بنگلہ حضرت صاحبزادہ گل محمد کی شادی کے وقت تیار کیا۔ پھر مدت بعد ایک اصطلیل ہمانوں کے گھوڑوں کے لئے تیار کرایا۔ جس میں ایک دو گھوڑے لنگر کے بھی تھے۔ کچھ عرصہ بعد خلیفہ محمد باراں نے تین حجرے اور ایک دالان لنگر خانے کے لئے تعمیر کرائے۔ مزید کچھ عرصہ بعد بر خور دار چاکی نے سادہ مٹی سے چھت والی مسجد تعمیر کرائی۔ پھر بہت مدت کے بعد نواب بہاول خاں نے اس کچی مسجد کی جگہ پختہ مسجد تعمیر کرائی شروع کی۔“ (۲)

یہ تبدیلی تو صرف اس جگہ کی تھی جہاں آپ کا قیام تھا۔ اس جگہ نے خانقاہ کی صورت اختیار کر لی

۱۔ بحوالہ ”خاتم سلیمانی“ ص ۶۴۔

۲۔ بحوالہ ”ذکر حبیب“ از محمد الدین، ص ۲۸۲، مطبوعہ لاہور ۱۳۴۲ھ

۳۔ بحوالہ ”مناقب الجوبین“ (ترجمہ) ص ۱۵۸۔ مزید حوالے کے لئے ”خاتم سلیمانی“ ص ۶۵۔ ۶۶

تھی۔ جب تونسہ شریف کی آبادی بڑھی جوق درجوق مریدین اور طالبان علم نے آنا شروع کیا تو خواجہ سلیمان تونسوی نے مشائخ چشت کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اس مقصد کے لئے آپ اپنی خانقاہ کے ساتھ دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس دور میں مسلمان خصوصاً سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر پسماندہ زندگی گزار رہے تھے۔ اور ایسے موقع پر ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے دینی مدارس قائم کئے جائیں جہاں اسلامی روح اور اسلامی ثقافت کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کے مزید زوال کو روکنے کے لئے اسلامی علوم کا احیاء کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ہندوستان کے کئی شہروں میں ایسی درس گاہیں قائم ہو چکی تھیں۔ تونسہ شریف میں یہ خدمت خواجہ سلیمان تونسوی نے انجام دی۔ ڈاکٹر محمد حسین للہمی کی مطابق

”خواجہ محمد سلیمان تونسوی نے تونسہ شریف میں ایک بڑی درس گاہ قائم کی جس میں سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے علم دین حاصل کر کے جگہ جگہ تبلیغ و اشاعت اسلام کی۔ تونسہ کا غیر معروف اور علم و معرفت سے محروم علاقہ علم و عرفان کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ اس نور علم و معرفت کی کریمیں سابق مغربی پاکستان سے باہر کے دور دراز علاقوں میں پھیل گئیں۔“ (۱)

سلیمان تونسوی نے تونسہ میں کئی مدارس قائم کئے جن کے سرپرست وہ خود تھے۔ ان مدرسوں کیلئے آپ نے ایسے علماء اور اساتذہ رکھے جو طالبان علم کی پیاس بجھاتے تھے۔ مجموعی طور پر ان مدرسوں میں پچاس استاد تھے جو مختلف علوم کی تدریس پر مامور تھے۔ ان مدارس میں مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی چیزیں کپڑے اور کتاہیں بھی مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ مناقب سلیمانی میں لکھا ہے کہ

”چندین از علماء نامدار و از فضلاء ذوی الاقدار کہ مستفیض از حاشیہ نشینان بساط فیض مناظاند، ارشاد فیض رشاد حضرت خواجہ بہ تعلیم علوم شریفہ و فنون لطیفہ است پس صد ہا طالب علم بہ خاص تونسہ شریف زبردامن عاطفت حضرت آمدہ و از حواجج خود فارغ البال بودہ تحصیل مطالب ارجمند و کتاب مآرب دلپذیری نمایند زیرا کہ کتب تحصیل از آنحضرت خواجہ عطا شدہ اند و برائی طالب علمان روغن تلخ بہت

۱۔ بحوالہ خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور ان کے حلقاء، از ڈاکٹر محمد حسین للہمی، ص ۹۹۰۔

مطالعہ کتب مقرر است " (۱)

خواجہ سلیمان تونسوی کے مدرسے کے اردگردان علماء کے مکانات تھے جو مدرسے میں درس دیا کرتے تھے اور یہ مکان ان کے نام سے موسوم تھے۔ ان مکانوں کی حیثیت بھی ایک لحاظ سے چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تھی جو کہ سلیمان تونسوی کے مدرسے سے وابستہ تھے۔ یہ اس مدرسے کے الگ الگ حلقے کہلاتے تھے جہاں مختلف علوم کا درس دیا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں کچھ تفصیل مسٹر ایچ۔ ایف۔ فارلس، ڈسٹرکٹ جج ملتان نے اپنے ایک مقدمے کے فیصلے میں دی ہے جو کہ خواجہ حامد اور خواجہ محمود کے درمیان تھا۔ مسٹر ایچ۔ ایف۔ فارلس نے اپنے ایک فیصلے میں خواجہ سلیمان تونسوی کے مدرسوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

" انہوں نے (یعنی خواجہ محمد سلیمان) اغراض مذہبی کے لئے مدارس جاری کئے اور وہ لوگ جو زیارت کے لئے اور مرید بننے کے لئے آتے تھے ان کو مذہبی تعلیم دیتے تھے اور ان کے لئے سہولتیں ہیا کرتے تھے۔ یہ تمام کارروائی زیر نگرانی شاہ محمد سلیمان صاحب ہوتی تھی۔ امداد کنندگان ان کے خلفاء تھے..... بڑے بڑے خلفاء کے نام سے اب تک وہ مکانات جو مسجد کے اردگرد ہیں موسوم ہیں۔ گواصلی مکانات سب شہید ہو چکے ہیں۔ احمدیہ بیان کرتا ہے کہ خواجہ اللہ بخش صاحب کے مکانات بنانے سے پہلے یہ زمین خالی تھی اور وہاں فقروں کی جھگلیاں (جھونپڑیاں) تھیں۔ مکھڑی بنگلہ، محمد علی شاہ کا بنگلہ اور نیز اور بہت سے ناموں سے مکانات نامزد ہیں۔ مثلاً مدرسہ مولوی محمد عمر، مولوی احمد صاحب کا بنگلہ، مدرسہ مولوی الہی بخش۔ یہ تمام صاحب خواجہ سلیمان صاحب کے خلفاء تھے..... پھر ملاحظہ ہو بیان نور محمد کا وہ یہ کہتا ہے کہ میرا دادا یہاں آیا اور پندرہ سال خواجہ محمد سلیمان صاحب اور پندرہ سال خواجہ اللہ بخش صاحب کی خدمت کرتا رہا۔ اس کو مولوی شیخ احمد کہتے تھے۔ اس کا ایک مدرسہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ خواجہ محمد سلیمان صاحب

۱۔ بحوالہ "منائب سلیمانی" (فارسی) از غلام محمد خاں بریال، ص ۲۴ مطبوعہ در مطبع احمدی دہلی، سنہ اشاعت ۱۲۸۸ھ

کے زمانہ میں پچاس استاد تھے۔ ان کے مکانات تھے: خواجہ صاحب
کے لنگر سے ان کو کھانا ملتا تھا۔^(۱)

خواجہ سلیمان کے ایک خلیفہ خواجہ شمس الدین سیالوی جنہوں نے اس مدرسے میں آپ
سے تصوف کا درس لیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ

" بیست و سہ فضلائی کامل در تونہ شریف تدریس می کردند و بیست زیادہ
سبق نزد ہر ایک خواندہ مشید و دیگر علمائے نامدار از طرف مشرق و مغرب و
جنوب و شمال بیشتر می آمدند انگاہ فرمود کتب توحید مثل لوائح و لمعات در غل
داشتہ بکھنور حضرت حاضر شد می چون نظر مبارک بر من افتادی باشارہ دست
مبارک تر خود خواندہ سبق تعلیم نمودے و اکثر اوقات در باب خواندن سبق سعی
بلیع فرمودے " (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

"..... بعد ازاں چند کتب توحید مثل لوائح مولوی جامی و لمعات فخر الدین عراقی
و شرح لمعات مولوی جامی و سوان السبیل و کسکول و مرقعہ شریف من تصنیفات
خواجہ کلیم اللہ جہاں آباد سے در قریہ سو تونہ شریف بخدمت حضرت خواجہ
تونسوی رضی اللہ عنہ خواندم ؟ (۳)

خواجہ سلیمان تونسوی کے قائم کردہ مدارس میں صرف تعلیم ہی نہیں دی جاتی بلکہ تربیت
کا بھی خاص انتظام تھا۔ کیونکہ خواجہ صاحب تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور ہدایت کو بھی
مزدوری سمجھتے تھے۔ ملفوظ شریف فارسی قلمی میں علم کے بارے میں ان کا یہ فرمان درج ہے

۱- بحوالہ، ترجمہ فیصلہ مقدمہ دیوانی منصفہ ایچ۔ ایف۔ فارلس ڈسٹرکٹ جج ملتان، ص ۱۱-۱۲

مقدمہ نمبر ۱۰۹، ۱۹۱۱ء (خواجہ حامد و محمود) مطبوعہ یومین پرنٹنگ ورکس لدھیانہ ۱۹۱۳ء۔

۲- مرآة العاشقین (فارسی) از شمس الحق سیالوی، ص ۲۸، مطبوعہ مصطفائی لاہور ۱۳۰۲ھ

۱۸۸۵ء۔ اس کتاب کا ترجمہ صاحبزادہ غلام نظام الدین نے کیا ہے جو اسلامک بک فاؤنڈیشن سے

۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس عبارت کا ترجمہ ص ۶۹ پر ہے۔

۳- مرآة العاشقین (فارسی)، ص ۲۶، اُردو ترجمے میں یہ ص ۶۷ پر ہے۔

....." علم نیز بہ ہدایت نیکو چیز ست و اگر ہدایت ہمراہ نباشد خود علم سبب

و وبال نمود " (۱)

پھر آگے لکھا ہے کہ علم کی مثال ایک تلوار کی ہے جس کے ہاتھ میں یہ تلوار ہو اور اس کا دل جگہ پر ہو اور دشمن سے بد دل نہ ہو وہ دشمن کا سر کاٹ لے گا۔ لیکن اگر دل ہاتھ میں نہ رہے اور بزدلی غالب آجائے پھر اس کا دشمن اسی کی تلوار سے اس کا سر کاٹ لے گا۔ گویا علم کا تعلق تربیت اور دل سے ہے (۲) — مولانا روم کا شعر ہے

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

آپ اپنے مریدوں اور طلبہ کو بار بار علم حاصل کرنے کی ہدایت فرماتے اور اس سلسلے میں تساہل نہ کرنے کی تہنید کرتے۔ ملفوظ شریف کے مطابق

....." روز و شب بندگان را از حضور انور این تاکید صادر می شود کہ در خواندن

علم و در مطالعہ آں پیچ تساہل نسا زید"۔ (۳)

یہی وجہ ہے کہ یہاں آنے والے طلبہ کی تہذیبی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی ہر طرح سے تربیت کی جاتی تاکہ یہ لوگ اپنے عمل اور اخلاق سے دوسروں کو متاثر کریں۔ کیونکہ انہی مدارس کے تربیت یافتہ لوگ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر مسلمانوں کے علم و اخلاق کی تربیت کرتے جس طرح بہاء الدین زکریا کے مدرسے میں طالب علموں کی ذہنی، اخلاقی اور تعلیمی تربیت پر زور دیا جاتا تھا بالکل اسی طرح سلیمان تونسوی کے مدارس میں بھی ان باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس کے لئے سب سے پہلے ان علماء اور اساتذہ کا کردار ان کے سامنے مثالی نمونہ ہوتا جو ان کو تربیت دیتے تھے۔ ان مدارس میں طالب علموں کی تعلیم

۱- بحوالہ (۱) منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) مرتبہ یار محمد بن تاج محمد چشتی، ص ۱۱۸۔

(۲) یہی عبارت ڈاکٹر طاہر تونسوی دالے نسخے میں ص ۳۶۲ پر درج ہے۔

۲- (۱) — ایضاً — ص ۱۱۸ — (۲) — ایضاً — ص ۳۶۳ —

۳- بحوالہ (۱) منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) مرتبہ یار محمد بن تاج محمد چشتی، ص ۱۱۹ (۲) اس کتاب کے

ڈاکٹر طاہر تونسوی دالے فارسی قلمی نسخے میں بھی یہی عبارت ص ۳۶۶ پر درج ہے۔

و تربیت کے لئے وہ تمام علوم سکھائے جاتے جن کی ضرورت انہیں دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی موقع پر پیش آسکتی تھی۔ ان علوم کے نصاب زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر وضع کئے جاتے تھے۔ اسی لئے آپ کی خانقاہ اور مدارس برصغیر پاک و ہند کے صوفیاء کی خانقاہوں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں ظاہری و باطنی ہر طرح کی تربیت کا خیال رکھا جاتا۔ اس عملی تعلیم میں پیشہ ورانہ

تربیت بھی شامل تھی۔ مثلاً لکڑی کا کام سکھایا جاتا تھا جس میں رحل اور کنگھیاں بنانا شامل تھا۔ سرمہ ڈالنے کی سلاخیاں بنانے کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔ پارچہ بافی اور طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس علمی اور عملی تربیت کی خاطر دور دور سے لوگ یہاں فیض حاصل کرنے کے لئے آتے۔ فیض اللہ خان قصوری خواجہ سلیمان کے مدرسوں کی عظمت اور علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

”جب حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسہ میں مقیم ہوئے۔ تب تونسہ ”تونسہ شریف“ کہلانے لگا اور آبادی اس جگہ رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہوئی۔ دور دراز سے لوگ ہجوم در ہجوم حاضر بحضور خواجہ شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہونے لگے۔ پنجاب، ہندوستان، بلوچستان، کشمیر، قندھار، عرب، فارس، افغانستان جمیع اطراف سے لوگوں کا درد ہونے لگا۔“ عربی، فارسی، حدیث، تفسیر، فقہ، سائنس قدیم، فلسفہ اور ہندسہ وغیرہ کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جانے لگی۔ مشہور و معروف علماء دور دراز سے آکر اس جگہ مقیم ہوتے اور بڑی بھاری درس گاہ تونسہ میں قائم ہو گئی۔ ہر دو تعلیم ظاہری و باطنی دی جاتی تھی۔ حضرت خواجہ شاہ سلیمان صاحب نہایت سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر فرمایا کرتے تھے اور ان کے

۱۔ تذکرہ اکابر اہل سنت، ص ۲، ۳ میں لکھا ہے کہ ”آپ کے روحانی فیض سے نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ کابل، ایران، لنکا، عدن اور ترکستان کے عوام و خواص مستفید ہوئے۔“ اسی طرح مرآة العاشقین ص ۱۱۳ کے مطابق ”بلخ، بخارا، ایران، ہرات، ہند، سندھ اور حرمین شریفین کے لوگ اپنی استعداد کے مطابق ان سے مستفیض ہوئے۔“

۸۰۰ روپے ذی وقار میں امیر و فقیر ہر دو کے ساتھ یکساں سلوک برتا جاتا تھا۔ آپ شریعت کے عامل اور احکام محمدی کے پابند تھے۔^(۱)

خواجہ سلیمان تونسوی خود بھی طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کو تمام علوم پر کامل دسترس حاصل تھی۔ اس کی وجہ وسعت مطالعہ تھی۔ خلیق نظامی کے مطابق ،
 " شاہ محمد سلیمان صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی ، قرآن ، حدیث اور فقہ پر ان کو پورا عبور تھا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی نقل کرتے ہیں۔ تصوف کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا۔ عوارف المعارف اور فتوحات مکیہ نوک زباں پر تھیں اور شیخ سہروردی اور امام اکبر کے بنیادی خیالات پر کافی غور و فکر کیا تھا۔ حدیث و فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مسئلہ آپ سے دریافت کیا جاتا تو برجستہ اسناد نقل کر دیتے۔"^(۲)

عوارف المعارف اور فتوحات مکیہ کے علاوہ بھی کئی کتابیں آپ کے درس میں شامل رہیں نجم الدین سلیمانی نے ان کتابوں کے نام بتائے ہیں۔ ان کے مطابق
 " مختلف درویش اور طلبہ درج ذیل کتب میں سے کوئی کتاب آپ سے پڑھتے ، آداب الطالبین ، فقرات ، لوائح ، عشرہ کاملہ ، فصوص الحکم ، نقد فصوص ، احیاء العلوم ، فوائد الفواد ، سوا السبیل ، تسنیم ، فتوحات مکیہ اور نفحات الانس ؛^(۳)

خواجہ سلیمان تونسوی کے مدارس میں زائرین ، طالبین ، علماء اور طلباء کی بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی جن کی رہائش و طعام کا بندوبست آپ نے کر رکھا تھا۔ اگرچہ آپ کی باقاعدہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ان کو حاصل ہوتا آپ اسے فوراً خرچ

۱۔ بحوالہ "مقدمہ تونسہ شریف" از فیض اللہ خاں قصوری، ص ۶۔ مطبوعہ لاہور، ۱۹۲۷ء

۲۔ بحوالہ "مشائخ چشت" از خلیق احمد نظامی، ص ۶۲۳۔

۳۔ بحوالہ "مناقب المجوبین" (ترجمہ) ص ۱۶۰۔

کر دیتے۔ المنتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) کے مطابق ایک دفعہ ایک شخص حافظ نور احمد افغان نے حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں بارہ ہزار روپے پیش کئے۔ بعد از مغرب کا وقت تھا۔ فرمایا یہ روپے فی الحال فلاں شخص کے پاس رکھے رہیں۔ کل اس رقم کو فقرا اور علماء میں تقسیم کرنے کی تدبیر کی جائے گی۔ چنانچہ دوسرے روز نماز اشراق اور وظائف وغیرہ سے فارغ ہو کر قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھے اور سب رقم علماء، ملازمین اور ملاؤں میں بانٹ دی اور خود اپنے لنگر کے لئے بھی کچھ نہ رکھا۔ بعد میں فرمایا کہ اس بلا کے بوجھ سے ساری رات نہ تو سو سکے اور نہ آرام و قرار حاصل کر سکے۔ آپ جس جگہ بھی رہے آپ کا یہی طریقہ رہا۔ آپ نے لنگر خانے کے مختلف حصے بنا رکھے تھے اور وہاں ہر کام کے لئے الگ سے آدمی مقرر تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا کام سرانجام دیتا۔ نجم الدین سلیمانی آپ کے لنگر خانے کے متعلق لکھتے ہیں کہ

”جب تولد شریف میں مستقل رہائش اختیار کی اور ولایت سلیمانی کا شہرہ اطراف عالم میں پھیلا اور طالبان حق افغانستان، ہندوستان، عرب، عجم، روم اور شام سے فوج در فوج آنے شروع ہوئے تو آپ نے یہاں لنگر کے نظام کی از سر نو باقاعدہ تشکیل فرمائی۔ پیارا نام کا ہندو بقال تھا۔ اسے اپنے لنگر کا مودی مقرر کیا۔ فقرا کے امور کے لئے اجراء پروانہ کا کام میاں علی محمد ہوتانی کے سپرد فرمایا اور مستوفی حساب میاں برخوردار چاکی کو وکیل سرکار اور تدبیر صلاح کار نور خاں گورمانی کو مقرر کیا۔ ان کے فوت ہو جانے کے بعد میاں گل محمد فقیہ دامان کو مشیر با تدبیر مقرر کیا۔ منشی گری کا عہدہ صدیق محمد کاسبی کو عطا فرمایا۔ نیز حجام ترکھان، لوہار، موچی، ماشکی، خاکش، کلال، دھوبی اور کوٹانہ مستقل طور پر لنگر کے روزینہ خوار یا ملازم تھے۔ انہیں ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بیماروں کے علاج کے لئے طبیب بھی مقرر تھے۔ لانگری کے عہدہ پر پہلے محمود کا تقرر فرمایا۔ ان کے بعد قبول کو لانگری مقرر کیا اور پھر خدا بخش لانگری مقرر ہوئے؟“ (۲)

۱۔ المنتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) ص ۲۰۳ (ملکیہ ڈاکٹر طاہر تونسوی)

۲۔ بحوالہ مناقب الجوبین (ترجمہ) ص ۱۵۹، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: خاتم سلیمانی ص ۶۶۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مدرسے میں رہنے والے تمام علماء، طلباء اور خانقاہ پر آنے والے زائرین کو کھانا لنگر سے ملتا تھا۔ بعض اوقات کھانے والوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچ جاتی تھی اور اکثر ایک مہاجن کی دکان سے ادھار لینا پڑتا اور یہ قرض کبھی کبھی کئی ہزار تک پہنچ جاتا۔ — لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے لنگر کا خرچ کسی نہ کسی صورت نکلتا رہتا تھا ایک دفعہ بعض لوگوں نے حضرت سے مودی آیا، مل اور اس کے بھائیوں کی شکایت کی کہ وہ حضرت سے سینکڑوں ہزاروں روپے لیتے ہیں اور پرانی گندم، جوار اور باجرہ وغیرہ لنگر کے لئے دے دیتے ہیں۔ حضرت قبلہ نے ہندی میں فرمایا

دودھ کا دودھ پانی کا پانی کچرے یج کے بچھو تانے
یعنی اگر کوئی کسی کے ساتھ دغا اور فریب کرتا ہے تو اپنی عاقبت کو نقصان پہنچاتا ہے۔
مشائخِ پشت میں لکھا ہے کہ

" لنگر کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر درویش کو تین پاؤ پختہ روٹی ملا کرتی تھی۔ چھ مہینے کے بعد کپڑے اور جوتیاں ملتی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک سیر تیل اور کچھ گھی ملا کرتا تھا۔ ان مدرسین کے لئے جو رات دن درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے ان کو اس کے علاوہ بھی کچھ مراعات ہوتی تھیں۔ ان کا کام چونکہ دماغی محنت کا تھا اس لئے ان کو ایک سیر پختہ روزینہ، سیر بھر گھی ماہانہ اور ایک سیر تیل ملا کرتا تھا۔ لباس ان کو بھی چھ مہینے میں ہی ملتا تھا لیکن ایک سفید لنگی اور گو سفند بھی عطا ہوتا تھا۔" (۲)

غرض خواجہ سلیمان تونسوی کی درس گاہ میں تعلیم کے ساتھ تربیت اور تربیت کے ساتھ زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا جاتا تھا۔ اس طرح ان لوگوں کی پوری توجہ صرف درس و تدریس کے ساتھ وابستہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی محنت کی وجہ سے یہاں سے ایسے ایسے عالم

۱۔ " مناقب سلیمانی " فارسی (تلمی) ص ۳۲۔

۲۔ بحوالہ نافع السالکین (فارسی) مؤلف فقیر الدین بن میاں تاج محمد، ص ۱۲۹ مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء

۳۔ بحوالہ (۱) مشائخِ پشت از خلیق احمد نظامی، ص ۲۲۶۔ (۲) خاتم سلیمانی، ص ۶۷۔

اور طلباء علم حاصل کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں گئے جنہوں نے اس درسگاہ کا نام روشن کیا اس باب کے پہلے حصے میں ہم ہندوستان میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں کہ مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے زوال کو روکنے کے لئے چھوٹی چھوٹی کئی اصلاحی تحریکیں ابھرتی اور دم توڑتی رہیں مختلف مصلحین نے مختلف طریقے سے حالات کو سنبھالنے اور مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ ایسے ہی حالات میں صوفیائے کرام نے بھی اپنا مثبت رول ادا کیا۔ شاہ سلیمان تونسوی سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع کے زمانے کے مصلحین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں مغلیہ سلطنت زوال کی زد میں تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلبہ اور تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔ پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ ان حالات میں آپ نے مسلمانوں کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ آپ سلسلہ مشائخ چشت سے وابستہ تھے۔ جنہوں نے جہاد اور تیغ و سنان کی بجائے مسلمانوں میں اسلامی روح اور اسلامی ثقافت کو از سر نو بیدار کرنے کا کام شروع کیا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں حصول آزادی کی خاطر کئی ایسی تحریکیں شروع کی گئی تھیں کہ جنہوں نے تلوار اور جہاد کا ذریعہ اپنایا لیکن وہ اتنی کامیاب نہ ہوئیں۔ ۱۸۳۱ء کے زمانے میں رائے بریلی (اودھ) میں سید احمد شہید نے مسلمانوں کی آزادی اور عظمت رفتہ کے احیاء کے لئے جہاد کیا اور بالآخر شہید ہوئے۔ لیکن یہ تحریک کسی واضح کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔

اس دور میں مسلمانوں میں تیزی سے بڑھتے ہوئے تنزل کو روکنے کے لئے کئی ایسی شخصیات بھی سامنے آئی ہیں جنہوں نے کتاب و سنت کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی اور اس سلسلے میں خود بھی کتابیں لکھیں۔ شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے اسرار علوم دین، اصلاح معاشرت، تنظیم، معیشت و سیاحت وغیرہ کے موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) بھی ایک مصلح کے روپ میں سامنے آئے۔ پھر خود خواجہ غفر الدین دہلوی (متوفی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۲ء) جو کہ

مشائخِ چشت میں سے تھے اس فکری جہاد میں شریک ہوئے۔ انہوں نے فکری سطح پر لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کیونکہ مشائخِ چشت کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کی دینی، اخلاقی، روحانی، معاشرتی اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک ان کے زوال کو روکا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت انہوں نے مدارس بھی قائم کئے۔ ڈاکٹر محمد حسین للہی کے مطابق

”نئے حالات میں علماء و مشائخ کی دونوں شاخوں (سلسلہ چشتیہ نظامیہ، سلسلہ چشتیہ صابریہ) نے اقدام کی بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کی۔ انہوں نے اس کی فکر کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیبِ اسلامی کے جتنے بچے کچھے آثارِ باقی رہ گئے ہیں ان کو محفوظ کیا جائے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لئے قلعہ بندیاں کر لی جائیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا دونوں شاخوں کے بزرگوں نے پاک و ہند میں ایک طرف جگہ جگہ دینی مدارس قائم کئے جن میں ہزاروں مسلمانوں نے اسلامی علوم کی تحصیل کی اور مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کا احترام اور استقامت پیدا کی۔“

سلیمان تونسوی جانتے تھے کہ مسلمانوں کی نپستی اور زوال کا سبب مذہب اور اسلامی شعائر سے بیگانگی ہے۔ ”نافع السالکین“ کے مطابق

”دریں زمان چوں مسلماناں متابعت نبی صاحب صلی اللہ علیہ وسلم گذاشته اند حق سبحانہ تعالیٰ کفار را بریں مسلط کرده است۔“

چنانچہ شاہ سلیمان تونسوی نے انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح اور ان میں صحیح اسلامی شعائر پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے تونسہ کے علاقہ کو منتخب کیا۔ جہاں آپ نے سیاسی ہنگاموں

۱۔ بحوالہ ”خواجہ سلیمان تونسوی اور ان کے خلفاء“ ص ۲۸۵ - ۲۸۶۔

۲۔ بحوالہ ”نافع السالکین“ ص ۵۔

سے کنارہ کش ہو کر صرف درس و تدریس اور دین اسلام کی تبلیغ اور طلباء کی عملی تربیت کی طرف توجہ دی۔

خواجہ سلیمان تونسوی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے مصائب خود ان کے پیدا کردہ ہیں اور اس کا بڑا سبب مذہب اور اسلامی شعائر سے بیگانگی ہے۔ اسی سبب سے ان سے حکومت چھین گئی ہے اور ان پر کافر مسلط ہو گئے ہیں۔ مناقب سلیمانی میں داؤد بخش کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے کہ وہ مولوی خدا بخش صاحب خلیفہ حضرت حافظ جمال ملتانی کے پاس تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس وقت بچہ تھا۔ ایک مرتبہ مولوی خدا بخش صاحب حضرت سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا حضرت اگرچہ حضرت مرشدی حافظ صاحب (حافظ جمال ملتانی مراد ہے) کا سایہ اب ہمارے سروں سے اٹھ گیا ہے لیکن آپ کا تبرک سایہ تو ہم خاکساروں پر باقی ہے۔ پھر آخر کیوں ہمارے شہر ملتان پر بے دین سکھوں کی حکومت ہے۔ آپ نے فرمایا

”مولوی تم ملتان کی بات کرتے ہو، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں

اور پشاور، سنگھڑ وغیرہ پر بھی رنجیت سنگھ کا قبضہ ہے۔ اگر اللہ کی مرضی اور

حکم یہی ہے تو پھر اس کے سامنے کیا چارہ ہے؟“

گویا جب کسی ملک کے لوگ بد اعمال اور اپنے دین سے بیگانہ ہو جائیں تو قدرت کی طرف سے ان کو سزا دینے کے لئے ان پر ظالم حکمران مسلط کیا جاتا ہے۔ یہی اللہ کی مرضی اور یہی اس کا حکم ہے۔ چنانچہ وہ یہ شعر پڑھتے تھے

چو خواہد کہ ویراں کند عالمی ہند ملک در پنجمہ ظالمی

بقوسے کہ نیکی پسند و خدائے دہد خسروے عادل و نیک رائے

آپ کا خیال تھا کہ چونکہ ہم خود بد اعمال ہیں اور غیر مسلم، ظالم حکمران ہمارے اپنے کردار کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہم پر مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم اس کو برا بھلا کہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم پہلے اپنے کردار کی خیر لیں اور اپنے

۱۔ بحوالہ ”مناقب سلیمانی“ فارسی، مؤلفہ غلام محمد خان، ص ۲۹۔ ۴۰، مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۸ھ۔

اعمال کو درست کریں۔ نافع السالکین میں لکھا ہے کہ

”سالک را باید کہ اعمال صالح کند و از نواہی محترز بوده باشد زیرا کہ بر بلاد مصیبت کہ بر مرد ماں منزل شود از جهت صدور اعمال ناشائستہ باشد۔ چنانچہ در حدیث شریف واقع است اعمالکم عما لکم، یعنی کردار ہائے شما حاکمان شما اند۔ اگر اعمال شما نیک باشد پس حاکم شما اہل اسلام و عادل باشد، و اگر بالعکس باشند پس حاکم شما نیز کافر و جابر باشند۔“^(۱)

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مریدوں کو حکومت اور سرکاری معاملات سے لاطعلق اختیار کرنے کا درس بھی دیتے تھے۔ کیونکہ قاضی جاوید کے مطابق

”غیر ملکی حکمرانوں سے انہیں شدید نفرت تھی۔ ان کے بارے میں شاہ (شاہ سلیمان) کا رویہ حب الوطنی اور قوم پرستی کے سچے جذبوں پر مبنی تھا۔ وہ اپنے مریدوں اور دوستوں کو نوآبادیاتی نظام کا کل پرزہ بننے سے منع کرتے تھے۔“^(۲)

چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے صحیح دینی خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ سرکاری معاملات میں پڑ کر تو فرشتہ بھی شیطان ہو جاتا ہے جبکہ مرید کا کام صرف لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ ان کی اخلاقی و روحانی تربیت کرنا ہے۔ نافع السالکین میں ایک جگہ مریدوں کو سرکاری ملازمت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

”نوکری و ملازمت نمودن بہ اہل دنیا بد است، و داخل شدن در کاہلہ اہل دنیا ازاں بدتر است چنانچہ کسیکہ حاکم شود از جانب اہل دنیا بر مخلوقات چوں بر مخلوقات حکم کند۔ پاس خاطر اہل دنیا نماید در عایت امر اللہ، و رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم را فراموش کردہ بر خلق اللہ ظلم و تعدی کند و مال خلق اللہ را بہ ظلم و جبر بگیرد۔“^(۳)

۱۔ بحوالہ ”نافع السالکین“، ص ۳۵۔

۲۔ بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ از قاضی جاوید، ص ۲۲۶ - ۲۲۷۔

۳۔ بحوالہ ”نافع السالکین“، ص ۷۳۔

خواجہ صاحب کی علمی خدمات کا ذکر تو ان کے مدارس کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ ان کی دینی خدمات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ کے زمانے میں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے عیسائی مشنریاں بڑے زور شور سے عیسائیت کی تبلیغ کر رہی تھیں۔ پادری اس مقصد کیلئے مختلف حربے استعمال کرتے تھے۔ کسی کو وہ ملازمت کا لالچ دیتے تھے اور کہیں وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اثر پیدا کرتے۔ پھر انہوں نے انگریزی تعلیم دینے کے لئے سکول کھول رکھے تھے۔ جہاں ہندوستان کے لوگ جدید علوم سے روشناس ہونے اور اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہاں بھی عیسائی پادری طالب علموں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتے۔ سلیمان تونسوی ان باتوں سے آزرده ہوتے۔ کوشش کرتے کہ مسلمان مغربی اثرات سے دور رہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ

”بہ گرسنگی مردن بہ کہ در صحبت بد مذہبان تعیم یافتن کہ در چنین صحبت

زوال ایمان باشد“ (۱)

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خواجہ سلیمان تونسوی تنگ نظر یا کٹھ ملا قسم کے عالم تھے بلکہ وہ نہایت وسیع المشرب، وسیع الخیال اور وسیع النظر بزرگ تھے۔ جن کے تعلقات غیر مسلموں سے بھی تھے۔ آپ کے دوستوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ قاضی جاوید کے مطابق

”بر صغیر کے دو بڑے مذہبی گروہوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان

خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کو وہ اپنے روحانی سلسلے کا اہم اصول قرار

دیتے تھے“ (۲)

چنانچہ خواجہ سلیمان ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہب کے معاملے میں اس قدر سخت ہوں کہ ان کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے نفرت کریں بلکہ آپ کا خیال تھا کہ اپنے مذہب، تمدن، معاشرت اور شریعت اپنی شناخت کو قائم رکھتے

۱۔ بحوالہ ”نافع السالکین“ ص ۱۳۔

۲۔ بحوالہ ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۲۲۶۔

ہوئے ہم غیر مسلموں سے بھی ملیں۔ ان سے اچھا برتاؤ کریں۔ صلح و محبت رکھیں۔ آپ یہ شعر بہت پڑھا کرتے تھے

حافظ گر وصل خواہی صلح کن با خاص دعام

باسماں اللہ اللہ بابر ہمیں رام رام

خواجہ سلیمان تونسوی نے مسلمانوں کے علمی، دینی، معاشرتی، تمدنی ہر طرح کے زوال کو روکنے کے لئے اقدامات کئے۔ معاشرتی سطح پر وہ دیکھتے تھے کہ ان کے افکار و اعمال، عادات و اطوار، اخلاق سب زوال پذیر تھے اور اس کا واحد حل انہیں دین اسلام پر عمل پیرا ہونے میں نظر آتا تھا۔ کیونکہ خواجہ سلیمان اچھی طرح جانتے تھے کہ دین اسلام ایک فطری مذہب ہے جس میں ہمارے تمام مسائل اور دکھوں کا حل موجود ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی صحیح روح کو پالیں۔ اس میں اپنے عقائد، مقاصد اور ضروریات کے لئے خود سے کوئی مطلب نہ نکالیں بلکہ اس کی اصل روح تک پہنچیں اور جب کوئی مسلم معاشرہ اس سے بھٹکتا ہے تو وہ زوال کی طرف جاتا ہے۔ سلیمان تونسوی کا بھی یہی خیال تھا کہ قرآن و سنت سے ہی صحیح راہنمائی لی جاسکتی ہے۔ دینی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کی معاشرتی خدمات بھی کچھ کم نہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ حکومت کے حصول کی بجائے معاشرے کو سنوارنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک معاشرہ نہیں سنورے گا تب تک حکومت حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور لوگوں کے سنورنے سے حکومت خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

سہروردی سلسلے کے برعکس مشائخ چشت کا اصول تھا کہ وہ سلاطین اور امراء کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ سلیمان تونسوی بھی اسی اصول پر قائم تھے کیونکہ آپ کے نزدیک یہ حکمران طبقے کے لوگ "سفید چشم" اور "بے وفا" ہوتے ہیں۔ آپ نہ صرف خود ان کی صحبت سے دور رہتے بلکہ مریدوں کو بھی بچنے کی تلقین فرماتے۔ لیکن آپ امراء اور مقتدر طبقے کی راہنمائی سے بھی غافل نہیں تھے۔ اور ان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے نہیں جھکتے تھے آپ کے حلقہ مریدین میں کئی امراء اور حکماء کے نام شامل ہیں جو آپ کے عقیدت مند تھے کئی ریاستوں کے سربراہان کا ذکر بھی ملتا ہے جنہوں نے آپ سے ملاقات کی اور آپ کے پاس قیام کیا۔ ان میں نواب بہاول خان اول، نواب بہاول خان ثالث، شاہ شجاع، امیر

دوست محمد خاں، نور احمد خاں کو انی وغیرہ سے آپ کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔“ نواب بہاول خاں ثالث کی دستار بندی کے لئے آپ احمد پور تشریف لے گئے تھے۔ یہ لوگ نذرانے کے طور پر جو کچھ خواجہ صاحب کی خدمت میں بھجواتے وہ آپ فوراً ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیتے۔ ان لوگوں سے تعلقات اس لئے رکھتے تھے کہ جب کوئی مظلوم ان میں سے کسی کے ظلم کا شکار ہوتا یا کبھی کوئی غیر شرعی کام ہوتا یا لوگوں کو کوئی مسائل درپیش ہوتے تو آپ ان سے ملاقات کرتے۔ کبھی کبھی آپ خود بھی کسی مسئلے کے حل کے لئے بہ نفس نفیس چل کر جاتے۔ سنگھڑ کے حاکم لعل خاں نے جب ایک بلوچ لڑکی سے زبردستی نکاح کر لیا تو لوگ آپ کے پاس فریاد لے کر آئے۔ آپ نے اسے تنبیہ کے لئے لکھ کر بھیجا کہ

”تو بر مسلمانا ظلم مکن و از خدا برترس“

لعل خاں نے گستاخانہ جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ

”فلک بہ دست درویش است ہر کہر خواہ بدید“

چنانچہ سنگھڑ پر افغانستان کے پٹھانوں نے قبضہ کر لیا اور لعل خاں بارہ سال تک ان کی قید میں رہا اور حکومت اسد خاں کے پاس آئی۔“

امراء و سلاطین کے علاوہ سلیمان تونسوی نے صوفیاء و علماء کی تربیت پر بھی زور دیا کیونکہ معاشرے میں ان حضرات کی خاص اہمیت تھی۔ اگر یہ لوگ اعلیٰ انسانی اقدار، اچھے اخلاق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باکرم دار ہوں تو لوگوں کی بھی صحیح اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کا لوگوں پر خاص اثر ہوتا ہے۔ آپ کے زمانے میں کچھ ایسے نام نہاد مذہبی رہنما پیدا ہو گئے تھے جو لوگوں کی عقیدت کا غلط فائدہ اٹھاتے۔ وہ لوگوں کو قبر پرستی، تعویذ گندوں، توہمات و کرامات کے چکروں میں پھنسا کر کاہلی، بے عملی اور ضعیف الاعتقادی سکھا رہے تھے۔ جس سے معاشرہ سنورنے کی بجائے جمود کا شکار تھا۔ دراصل اس قسم کے علمائے سورا اپنی کم علمی اور کج فہمی کے باعث تصوف اور اس کی اصطلاحات کا غلط مفہوم لیتے تھے جس سے معاشرے

۱- (۱) مناقب المحبوبین (ترجمہ) ص ۱۸۸ تا ۱۹۰، (۲) خاتم سلیمانی، ص ۹۷۔

۲- مناقب المحبوبین (ترجمہ) ص ۱۸۳ تا ۱۹۱۔

کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ لوگ عام زندگی اور اس کے مسائل سے نظریں چڑا کر خالق ہوں میں پناہ لینے لگے۔

انہی حالات کے پیش نظر آپ نے علماء کی تربیت و اصلاح پر زور دیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اگر عالم باعمل ہوگا، اس میں اطاعتِ حق اور دین کا صحیح جذبہ ہوگا تو اس کا لوگوں پر اچھا اثر پڑے گا۔ آپ کے مدرسے میں جو طالب علم زیادہ قابل ہوتا اسے مزید حصول علم کی خاطر تو نسے سے باہر بھیجا جاتا۔ سیرت سلیمان میں لکھا ہے کہ

”آپ (خواجہ سلیمان تونسوی) کی سرپرستی میں جو سب سے زیادہ مشہور

اور جو بات سب سے زیادہ ممتاز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے جتنے

عالم پیدا کئے وہ عملی زندگی کا اعلیٰ نمونہ اور روحانیت کا مجسمہ تھے؟“ (۱)

آپ علماء کے لئے فقہ و تفسیر کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ،

”علم، فقہ و تفسیر ضروریہ است کہ دانستن فرض و واجب و سنت و مستحب

و مکروہ موقوف بر علم فقہ است و باقی ہمہ علوم سررودی است“ (۲)

اور کہتے ہیں کہ عالم زاہد خشک نہ ہو بلکہ عشقِ حقیقی کی نعمتوں سے فیض یاب ہو کر روحانی منزلیں

طے کریں۔ اور یہ عشق کیا ہے؟ اس کے متعلق منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) میں لکھا ہے

”استقامت عشق شریعت است و استقامت شریعت خود عشق است

ہر گاہ کہ شریعت استقامت یا بد عشق برود عود کند“ (۳)

آپ نے معاشرے کی اصلاح کے لئے صرف علماء کی اصلاح پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ عام لوگوں

کی تربیت کو بھی ضروری سمجھا۔ کیونکہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے فرد کی تربیت ضروری تھی۔

چنانچہ مدارس کے علاوہ آپ محفل میں بھی لوگوں کو درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے خیال میں

لوگ اس لئے راستے سے بھٹک گئے ہیں کہ وہ سنت رسولؐ کی پیروی نہیں کر رہے اور یہ

۱۔ بحوالہ ”سیرت سلیمان“ از مولوی صالح محمد، ص ۱۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۵ء

۲۔ بحوالہ ”نافع السالکین“ ص ۱۳۵۔

۳۔ بحوالہ ”ملفوظ شریف فارسی“ (قلمی)، ص ۲۵۔

آپ کے نزدیک

"متابعت عبادت از دو چیز است آنچه خدا و رسول خدا او امر کرده اند بیاید کرد

و از آنچه منع فرموده اند نہ بیاید کرد" (۱)

اور اس کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین رکھیں اور اپنی حاجت اس سے طلب کریں۔ "نافع السالکین" کے مطابق

"سالک را باید کہ سوائی جناب حق عزوجل تکیہ گاہ خود نہ بند و نیندیشد"۔ (۲)

اس زوال اور انحطاط کے دور میں لوگوں میں ہر طرح کی اخلاقی و سماجی برائیاں پیدا ہو چکی تھیں ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کا سدباب کیا جائے۔ خواجہ سلیمان نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگوں میں ان برائیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ کے ملفوظات میں جا بجا ایسی نصیحتیں ملتی ہیں جن میں مریدوں اور مجلس میں آنے والے لوگوں کو نیکی کی تلقین اور برائی سے بچنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ان میں شریعت کی پابندی، برمی صحبت سے اجتناب، غیبت اور عیب جوئی سے پرہیز، غرور و تکبر سے بچنے، حرام خوری، رشوت، ذخیرہ اندوزی سے دور رہنے کی تلقین، والدین کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آنے، بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے پیار، نیک سیرتی اور دوسروں کے ساتھ باہم پیار و محبت کے ساتھ رہنے کا درس دیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بدعت عام ہے کہ ہم بغیر سوچے سمجھے دوسروں پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیتے ہیں۔ ان فتوؤں کی زد سے بڑے علماء، فقہاء، صلحاء اور اکابرین بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ حضرت سلیمان تونسوی نے اس بدعت کے خلاف آواز بلند کی۔ منتخب ملفوظ شریف کے مطابق کسی مسلمان کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں بلکہ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ (۳)

چشتیہ سلسلے کی روایت کے مطابق حضرت خواجہ سلیمان تونسوی علیہ الرحمۃ موسیقی (سماع)

۱- بحوالہ "نافع السالکین" ص ۹۷ -

۲ - ایضاً - ص ۱۲۳

۳- اصل الفاظ یہ ہیں "مسلمان را کافر نستند و اطلاق کفر بر مسلمان کردن جائز نیست۔ اگر شخص کسی مسلمان

را کافر اعتقاد کند، اعتقاد کندہ خود کافر شود" (بحوالہ منتخب ملفوظ شریف فارسی (قلمی) ص ۷۸ -

میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ سماع کی محفلوں میں ان پر کئی بار وجد طاری ہوا۔ گھنٹوں بے ہوشی اور بے خودی کی کیفیت میں رہتے۔ مختلف کتابوں میں سماع کی ایسی بہت سی محفلوں کا ذکر ہے جن میں حضرت سلیمان تونسوی نے شرکت فرمائی اور ان پر رقت طاری ہوئی۔ حاجی پور شہر میں حضرت خواجہ نور محمد ناروالہ کے عرس کے موقع پر جب قوالوں نے ہندی اشعار گا کر سنائے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور آپ بھرنے لگے۔ اسی طرح ایک بار خلیفہ ناروالہ کے عرس سے واپس تشریف لارہے تھے کہ راستے میں احمد نامی قوال جو ان کی سواری میں تھا فقط کا یہ شعر گنگنا نے لگا

نیست بر لوح دلم جزالف قامت دوست

چہ کنم حرف دگر یاد نداد استادم

حضرت سلیمان گھوڑے کی زین پر تھے۔ شعر سنتے ہی وجد طاری ہو گیا اور آنکھوں سے خون رواں ہو گیا۔^{۱۲} نافع السالکین میں کئی ایسے واقعات درج ہیں کہ حضرت سلیمان تونسوی سماع اور قوالی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ اکثر اوقات مختلف قوال انہیں کانیاں اور سرود سناتے۔ نافع السالکین، ص ۱۰۸ میں درج ہے کہ

”وقت قیلولہ میاں احمد قوال در جوگ ایں کافی شروع کرد

کریں سیالیں دو پھیروے

رنجھٹیاوے

سب تاگئی ماہی دی ڈکھ ڈھیروے

جو کچھ کیتا اینہاں اکھیاں دے

رنجھٹیاوے

کریں سیالیں دو پھیروے

رنجھٹیاوے“

پھر آگے چل کر لکھا ہے،

” روزے در مجلس حضرت قبلہ صاحب قدس سرہ پیر بخش قوال کہ صاحب
درد سوز بود ایں کافی شروع کرد دو ہڑہ
کریں سیالیں دو پھیروے

رُنجھٹیاوے

خواجہ سلیمان تونسوی کے شاعر یا نثر نگار ہونے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن مجھے جناب
عبید فائق کی ذاتی لائبریری میں ”تحفہ فقیر“ (مسئمے بہ ہدیہ فقیر) کتاب ملی ہے جسے
فقیر اللہ نامی شخص نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب اُردو نعتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں دوسرے
لوگوں کے علاوہ انہوں نے خواجہ سلیمان تونسوی کی فارسی نعت دی ہے جس کے ساتھ ہی
عربی ترجمہ بھی دیا ہوا ہے۔ لیکن اس نعت کا خواجہ صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے ذکر
نہیں کیا۔ یہ کتاب خواجہ صاحب کی وفات کے تقریباً اڑتیس (۳۸) سال بعد ۱۸۸۸ء میں
شائع ہوئی ہے۔ نعت یہ ہے

از کلام فیض نظام شاہ سلیمان صاحب تونسوی

عینای تطلبانک اجلس علیہما	ای سرورِ دو عالم یک جلوہ وہ بما
حتی تراک عینا کا آتشمس فی الضحیٰ	از درج برج یثرب بر ما بکن طلوع
جبریل باملا نک بیکی علی السما	بخرام بر فلک کہ بدر در فراق تو
یشفی لنا لقانک فی وجہک الشفا	دردِ مرا وصالِ تو در مانست اے طبیب
یهدی لنا الیہ وما ینطق الہوی	لنطق بہر بیان تو وحی خداست بس
بالجملہ انت مقصد کومین احمدا	شدا از طفیل ذات تو ایجاد کائنات
بامظر العجائب اجلس قلوبنا	سید تولی کہ ماہ فلک از تو شد دو نیم
از فی کمال حسنک لم یندر منتہما	یوسف بدین جمال ز حسنت نمونہ
فار الخلیل بار ۴۰ منک سیدا	از تو بوج و آدم شد حل مشکلات

شاہی و فخر یافت سلیمان ز نورِ تو

سبحان من اعزک یا مظهر العطاء

۱۔ بحوالہ تحفہ فقیر (مسئمے بہ ہدیہ فقیر) از فقیر اللہ ص ۴۱، مطبع محمدی لاہور، طبع شدہ۔ (باقی بر صفحہ ثانی)

اس نعت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ حضرت سلیمان تونسوی فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ آپ کا سرائیکی، اُردو کلام موجود نہیں ہے۔ تاہم ملفوظات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ شعر و شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اپنی گفتگو کے دوران حافظ، سعدی، اور دیگر فارسی شعراء کے اشعار پڑھتے تھے۔ آپ نے اپنے خیالات و افکار ہمیشہ عام فہم اور سیدھے سادے انداز میں پیش کئے۔ آپ کے ملفوظات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سامنے کی زندگی کی مثالوں سے یا ہندی اور فارسی اقوال و ابیات کے حوالے سے بات سمجھاتے تھے۔ سرائیکی، پنجابی، اُردو اور ہندی زبان کے بہت سے اقوال نافع السالکین میں ملتے ہیں۔ مثلاً

مجھ مڑ گئی، جل سک گئے، پلکھی رہے کرلا
گھسی پڑی پریت کی، چن چن کا گر کھا (ص ۱۹)

جیسی پریت چکور، نہ چاندے منے (۲)
اپنی توڑ نبھائی، اس کی اوہ جانے (ص ۱۹)

کھا رابا رہے کم جوگ دا، سکھیا راں دا اتھے کم فی
نہیں چگ کے ڈڈتے ہتھ پھیرن، مڑلی مار کے لوک ہنساوندے فی
تسیں بکیاں مار دیاں کھا بیٹھے، اتھے کزنگ (۳) کے ٹکڑے کھاوے فی
تن چھوڑ کے اُرسی نال دیکھن، اتھے تھی تے روڈ گھساوے فی (ص ۱۹)

(بقیہ گذشتہ صفحہ) اس کتاب میں فقیر اللہ کی اُردو نعتیں شائع ہوئی ہیں۔ آخر میں کچھ دوسرے لوگوں کی بھی نعتیں ہیں۔ مثلاً حافظ محسن مرحوم کی اُردو نعت، حضرت شاہ سلیمان کی فارسی نعت، حضرت مولانا عبدالرحمن جامی کی فارسی نعت مولانا مولوی غلام رسول مرحوم کی پنجابی نعت بھی شامل ہیں۔

نعت: ۱- ذبح کی ہوئی، حلال کی ہوئی۔ ۲- مانے۔ ۳- جسم۔ ۴- تیل یا آبن سے جسم کی مالش کرنا۔

آپے چاڑیو بسیل تیں آپے لسن کھڑ
 کوہجی کھلی تیریاں ، میری اوگن دیکھ نہ بھیج
 سے ہیننی سے دہلی ، یار یاراں دے ہڈ
 منہ تو پلوں دور کر ، گلاں کرے رنج

(۲۲ ص)

ترجمہ : (جب خود ہی (محبت کی) بیل چڑھائی تو خود ہی خبر لے گا۔ میں چاہے بد صورت
 ہوں یا بے وقوف ، بہر حال میں تیری ہوں ، میری برائیاں دیکھ کر بھاگ نہیں ، چاہے
 میں کتنی کمزور یا دہلی پتلی ہوں لیکن دوست دوست کا قالب ہوتے ہیں۔ آج اپنے رخ
 سے نقاب ہٹا کر جی بھر کر باتیں کریں۔)

(۲۴ ص) سبھے کم چھوڑ کے ڈھونڈ محمد اہینوال کوں

(۹۴ ص) سسی جئے نہ چڑھی جے جئے چڑھی مول نہ مڑے

جھتھے حاکم آدے ہسدا

(۹۴ ص) دسا نہ کرے تلے دا

(۹۶ ص) موڑ نہ سگیاں موڑ لکھیا لوح قلم دا

(۱۰۹ ص) ہا بسیل قابیل آدم کے جائے آدم کس کا جایا

(۱۱۰ ص) ہینٹوں تو ہیں ، اتوں تو ہیں ، ظاہر تو ہیں باطن تو ہیں

(۱۱۶ ص) بے کسی کے نہ کھسی^(۴)

عشق ہو رہے ہیرے تیرے آئے

تاکے میاں رانجھے کنے پڑوائے^(۵)

(۱ ص) صاحب کوئے پر ناولنے آئے

نفت: ۱-الادب پنجابی میں بھانڈے ۲-ہرگز ۳-بھروسہ ۴-چھیننا ۵-پھاڑنا، چھید کرنا ۶-بیاہنے آئے۔

سرمرزے دامار یا ہے

پڑ ہے یارو کہ کچھ پیٹ ہے

کون ان بن بند بندھا دے، وہ پڑ ہے (۱۲۴ ص)

کوئی مرے کوئی جیوے، ہترہ جھول پتا سے پیوے (۱۲۵ ص)

جسے چوڑاں مٹھا سا، ہتھیرا تا دے چور مٹھے (۱۲۸ ص)

ان کی تشریح خود نافع السالکین میں اس طرح کی گئی ہے کہ
"اگر نیک کار کردہ باشد برائے خود کردہ واگر کسے کار بد کند برائے خود
کردہ باشد؟" (۴)

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی

کچری بیج کی بکھوستانی (۱۲۹ ص)

"یعنی اگر کسے بہ دیگر دی خابازی کند عاقبت اور ازیاں رسید؟" (۵)

گائیں بلائیں تے مال جنجال، فرزند تے ذال بھی مہینی دبال

جو کوئی رہے انہاں تول دور، ہوسی او خوشحالے ضرور (۱۳۲ ص)

ایہو عشق کپتا، جیندے نال اسادامٹھا (۱۳۵ ص)

ترجمہ: (عشق ہے تو مصیبت لیکن اب ہمارا واسطہ اس سے پڑ گیا ہے۔)

تارے وی صحبت تے بوڑے وی صحبت (۱۳۴ ص)

ترجمہ: (صحبت ہی تیراتی ہے اور صحبت ہی ڈبوتی ہے۔)

خواجہ سلیمان کے ملفوظات ان کے کئی مریدوں نے جمع کئے ہیں جن میں کچھ مطبوعہ

لغت: ۱- درد، تکلیف۔ ۲- بہت زیادہ، ڈھیر۔ ۳- گھول کے۔ ۴- بحوالہ نافع السالکین ص ۱۲۸

۵- بحوالہ "نافع السالکین" ص ۱۲۹ - ۶- بیوی۔

ہیں اور کچھ قلمی صورت میں ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

- ۱۔ راحت العاشقین مرتب مولوی محمد۔
- ۲۔ رسالہ در مسائل فقہ مرتب مولوی عبدالغفار۔
- ۳۔ ملفوظات خواجہ محمد سلیمان مرتب مولوی غلام حیدر۔
- ۴۔ مناقب شریف مرتب حافظ احمد یار پاکپٹنی۔
- ۵۔ منتخب المناقب مرتب یار محمد ذوقی۔
- ۶۔ نافع السالکین مرتب مولانا امام الدینؒ۔

ان قلمی ملفوظات کے علاوہ میری نظر سے جو قلمی نسخے گزرے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے

- ۱۔ منتخب ملفوظ شریف حضرت خواجہ سلیمان تونسوی فارسی (قلمی) مؤلف حافظ احمد یار مرتبہ و منتخبہ از یار محمد بن تاج محمد چشتی، پاک پتن شریف، کاتب خدا بخش ذوقی (یہ نسخہ جناب اسد نظامی چک نمبر ۱۱۴/۱۰، آر، جہانیاں سے حاصل ہوا۔)

(یہ کتاب "انتخاب مناقب سلیمانیہ" کے عنوان سے حمید یہ اسٹیم پریس لاہور سے ۱۲ صفر ۱۳۲۵ھ کو طبع ہوئی۔ یہ کتاب مجھے جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی سے حاصل ہوئی۔ جیسا کہ اس کے آخری صفحے پر تصریح کی گئی ہے کہ یہ کتاب دراصل حافظ احمد یار متوطن پاک پتن کی تالیف ہے۔ مناقب سلیمانیہ سے انتخاب کی گئی ہے اور اس کے مرتب مولوی یار محمد بن تاج محمد بن محافظ احمد یار کے بھائی تھے۔)

۲۔ کتاب مناقب سلیمانی فارسی مرقوم است مرتبہ حضرت میاں درزی تونسوی۔

(یہ کتاب منتخب ملفوظ شریف کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے۔)

۳۔ "المنتخب" ملفوظ فارسی۔ مرتبہ یار محمد بن تاج محمد پاک پتن، یہ نسخہ منتخب ملفوظ

شریف (نمبر ۱) ہی کا دوسرا قلمی نسخہ ہے۔ لیکن دونوں کے کاتب الگ الگ ہیں۔ اس

نسخے کی کتابت ۱۲ محرم ۱۳۱۶ھ کو مکمل ہوئی۔ اور اس کا کاتب احمد الدین ہے۔ اس

کتاب کے ۴۷۱ صفحات ہیں۔ ۲۶ x ۱۷ سینٹی میٹر کی تقطیع پر ہے۔

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے "حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور ان کے خلفاء از محمد حسین للہی، ص ۱۳۸ / ۱۳۹۔

۴۔ انوار سلیمانیہ (فارسی) مرتبہ یار محمد ابن تاج محمد۔ یہ نسخہ بھی (۱) اور (۳) کا تیسرا قلمی نسخہ ہے۔ اس کا کاتب میاں غلام محمد ولد حافظ محمد بختیار ہے۔ یہ نسخہ مجھے جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق سے دستیاب ہوا۔ ۱۶ × ۲۵، سینٹی میٹر کی تقطیع پر ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی تمام عمر رشد و ہدایت میں گزار سی۔ آپ نے تقریباً ۶۸ سال تو نسہ میں رہ کر عوام کی خدمت کی۔ آپ کے مریدوں اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مشائخ چشت میں ان کی تعداد ستر لکھی ہے۔ حدیقۃ الاولیاء کے مطابق

”تمام عمر حضرت نے ہدایت و ارشاد میں گزار سی۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ حضرت کے مرید اور سینکڑوں کفار و فجار نے توبہ کی۔“ (۳)

ساری عمر لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد آخر ۸۴ سال کی عمر میں ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔ حدیقۃ الاولیاء کے مطابق

”وفات حضرت نویں ماہ صفر روز پنج شنبہ سنہ ایک ہزار دوسو سر سٹھ (۱۲۶۶ھ) میں واقع ہوئی۔“ (۴)

مناقب سلیمانی (فارسی) میں لکھا ہے کہ

”..... وصال مبارک حضرت خواجہ کہ بتاریخ ۶ صفر ۱۲۶۶ھ

بوقوع آمدہ“ (۵)

گلشن ابرار کے مطابق

۱۔ بحوالہ ”نافع السالکین“ فارسی، ص ۱۵۵۔

۲۔ بحوالہ ”مشائخ چشت“ ص ۶۶۴۔

۳۔ بحوالہ ”حدیقۃ الاولیاء“ از غلام سرور لاہوری، ص ۵۴۔

۴۔ ایضاً _____، خاتم سلیمانی، ص ۱۴۸ کے

مطابق ”وفات بہ شب جمعرات ہفتم ماہ صفر ۱۲۶۶ھ میں ہوئی۔“ آپ کے سنہ وفات کے بارے میں تمام

تذکرہ نگاران متفق ہیں صرف قاضی جاوید کی کتاب ”پنجاب کے صوفی دانشور“ ص ۲۳۳ کے مطابق انکا وصال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔

۵۔ بحوالہ ”مناقب سلیمانی“ مؤلفہ غلام محمد خان، ص ۸۵۔

"بتاریخ ہفتم ماہ صفر المنظر بہ صبح جمیس در سن یک ہزار و دودصد و ششت و

ہفت از ہجرت طائر روح پر فتوح آنجناب از قفس عنصری پرواز نموده" (۱)

آپ کی وفات پر کئی شعرا نے قطعات کہے۔ حدیقت الاولیاء میں یہ قطعہ درج ہے۔

۷ شہ چو از دنیا بفرود کس بریں شاہ والا شان سلیمان اہل فیض

بر تاریخش بسرور گفت دل ای بگو سلطان سلیمان اہل فیض (۲)

مولوی حسین علی فتح پوری نے یہ قطعہ لکھا ہے کہ

۷ سلیمان زمان رحلت چو فرمود یکا یک در جہاں ظلمت بے فرود

۸ پس سال و صالحش ہا لف غیب بگفت " او آفتاب چشتیاں بود" (۳)

مولوی محمد حسین نے تاریخ وصال یوں بیان کی

۷ خواجہ ما آں امام العارفین شہ سلیمان رحمۃ اللعلین

ہفتم ماہ صفر صبح خمیس جاں بجاناں داداں نفس نفیس (۴)

خواجہ سلیمان تونسوی کے تین فرزند تھے۔ خواجہ گل محمد، خواجہ درویش محمد اور خواجہ

عبداللہ۔ ان میں سے خواجہ گل محمد جو بڑے صاحبزادے تھے وہ آپ کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

خواجہ سلیمان تونسوی کو ان کے عبادت خانے میں دفن کیا گیا۔ بعد میں نواب بہاول

خان ثالث نے جو آپ کے مرید تھے آپ کی قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

خاتم سلیمانی کے مطابق

"پہلے معمولی سا مقبرہ تھا۔ نواب صاحب بہاولپور نے قریباً ۷۰ ہزار روپیہ

خرچ کر کے ایک سنگ مرمر کا عالیشان روضہ تعمیر کرایا ہے اور حضرت

ثانی خواجہ اللہ بخش صاحب کے وقت میں اس روضہ کے اندر نہایت

۱۔ بحوالہ گلشن ابرار فارسی (قلمی) از مولانا امام بخش، ص ۲۵۲ - ۲۵۳۔

۲۔ بحوالہ "حدیقت الاولیاء" ص ۵۴۔

۳۔ (۱) خاتم سلیمانی، ص ۱۴۹ (۲) مناقب المحبوبین (ترجمہ) ص ۱۹۹

۴۔ بحوالہ "گلشن ابرار" (قلمی) ص ۲۵۳۔

عمدہ قیمتی فرکش سنگ مرمر (ابلق) سے بنایا گیا ہے اور مزار مبارک
 کے اوپر روضہ شریف کے اندر ایک چھوٹی سی بارہ دری بنائی گئی ہے جو
 سنگ مرمر کی ہے اور قیمتی پتھروں، شیشوں وغیرہ سے مزین ہے
 اور اوپر سونے کا کام کیا ہوا ہے۔ (۱)

۱۔ بحوالہ خاتم سلیمانی ، ص ۱۴۹ -

حضرت منشی غلام حسن شہید

مدینۃ الاولیاء، ملتان میں تیرہویں صدی ہجری کے نہایت اہم اور سربر آوردہ صوفیاء میں ایک نام منشی غلام حسن شہید کا ہے جو حافظ محمد جمال ملتان اور خواجہ خدابخش کے نامور خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت بطور ایک صوفی صافی، ایک عاشق صادق اور ایک شاعر کے مسلم اور معتبر ہے۔ آپ کا وجود مسعود سرزمین ملتان کے لئے باعث برکت اور وجہ حفظ و امان تھا۔ جب تک آپ زندہ رہے انگریز ملتان پر قبضہ نہ جاسکے۔ بلکہ ملتان پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں نے حضرت غلام حسن کو شہید کیا۔ آپ ایک ماہر خطاط اور خوشنویس تھے۔ کئی منظوم اور نثری کتابوں کے مصنف تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ سرائیکی ان کی مادری زبان تھی۔ چنانچہ ان سب زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرزمین ملتان سے تعلق رکھنے والے قدیم ترین صوفی شاعروں میں غلام حسن شہید کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اردو میں باقاعدہ شاعری کی۔ ان سے پہلے کے صوفی شاعروں کے یہاں ہندی، فارسی اور اردو کے مخلوط نمونے تو مل جاتے ہیں۔ یعنی اردو کا ایک آدھ مصرعہ، ایک آدھ شعر یا ایک آدھ قول۔ لیکن اردو شاعری پر باقاعدہ طور پر طبع آزمائی نہیں ملتی۔ غلام حسن شہید سرزمین ملتان کے وہ پہلے صوفی شاعر ہیں جن کے یہاں خالصتاً اردو کا کلام ملتا ہے۔ پھر انہوں نے مسائل تصوف کو نہایت عام فہم اور دلکش انداز میں پیش کیا اور تمثیلوں کے ذریعے افکار کی وضاحت کی۔ ان کا عالمانہ لیکن عام فہم اسلوب بڑا دلنشین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محض ایک صوفی کی حیثیت سے نہیں، ایک عالم، ایک شاعر، ایک ادیب، ایک خوشنویس، ایک شارح اور ایک معلم اخلاق کے طور پر زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔

غلام حسن شہید ۱۲۰۲ھ / ۱۸۲۷ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش اس شعر سے نکلتی ہے

سال تولیدش ز خاصیت ملائک آمدست
ہم نظارہ ماہ قلیدے خلافت سعیدش^(۱)

آپ کے والد کا نام منشی جان محمد اور دادا کا نام منشی عاقل محمد تھا۔ جن کا تعلق ذات ملہا س قوم راجپوت سے تھا۔ منشی غلام حسن شہید چھوٹے سے تھے تو حافظ محمد جمال آپ کو اپنے ساتھ لے گئے اور آپ نے ان کے مکتب میں تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا^(۲) اور حافظ محمد جمال ہی سے بیعت کی۔ منشی غلام حسن وحدت الوجودی فلسفے کے قائل تھے۔ اور اس سلسلے میں منصور صلاح کے فلسفے سے متاثر تھے۔ اس کا اظہار ان کی صوفیانہ شاعری میں بھی ہوا ہے۔ آپ ماہر خوشنویس تھے۔ اسی بناء پر لوگ آپ سے تبرکات کتابیں لکھوانے آتے تھے۔ آپ کے والد ملتان کے سکھ گورنر دیوان سادون مل کے منشی تھے۔ آپ کے متعلق بھی یہ روایت مشہور ہے کہ آپ

”دیوان سادون مل اور اس کے لڑکے دیوان مولراج کے میر منشی تھے۔“^(۳)

۱- (۱) ”ملتان میں اردو شاعری“ از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۵۲- (۲) منتخبات از دیوان حضرت حسن (قلمی) ص ۶۹- (اس کی فوٹو سٹیٹ میرے پاس ہے۔) البتہ ”ادیبئے ملتان“ از فرحت ملتان ص ۱۳۳ اور ”ارض ملتان“ از شیخ محمد اکرام، ص ۲۲۲ میں آپ کا سن پیدائش ۱۳۰۲ھ لکھا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ حافظ محمد جمال کے خلیفہ تھے اور ان سے تعلیم حاصل کی تھی جن کا سن وفات ۱۲۲۶ھ ہے۔ اس لئے ۱۲۰۲ھ آپ کا صحیح سن ولادت ہے۔

۲- مضمون بعنوان ”حضرت منشی غلام حسن شہید رحمۃ اللہ علیہ“ از محمد اقبال عاصی، مطبوعہ امرود

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء

۳- محمد اقبال عاصی اپنے مضمون ”حضرت منشی غلام حسن شہید“ میں حافظ محمد جمال سے آپ کے حصول تعلیم کے بارے میں یہ روایت درج کرتے ہیں کہ ”بچپن میں حضرت (غلام حسن شہید) کو تعلیم کی طرف رغبت کم تھی۔ استاد ہمیشہ زبرد تواریخ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن اسی حالت (باقی بر صفحہ ثانی)

اولاد علی گیلانی کے مطابق

"چونکہ آپ کو خوشنویسی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور دورِ دراز سے لوگ تبرکاً
آپ سے کتابیں لکھوانے کی خاطر آتے تھے۔ اس لئے منشی صاحب، آپ کا
لقب ہو گیا۔" (۱)

جبکہ عمر کمال خاں لکھتے ہیں کہ

"آپ نواب مظفر خاں کے منشی خانہ میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ملازم تھے
اسی ملازمت اور اس پیشہ کی وجہ سے منشی کہلاتے تھے۔" (۲)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کو یہ خطاب آپ کے علم و فضل کی وجہ سے عطا ہوا۔ بہر حال آپ
کے باپ دادا کے نام کے ساتھ بھی منشی کا لقب شامل تھا

غلام حسن شہید نے نواب مظفر خان شہید کا زمانہ پایا ہے جو کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کا
آخر اور انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہے۔ یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے انتشار اور بد امنی کا دور
ہے۔ اس سے پہلے بھی حافظ محمد جمال کے ضمن میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں برصغیر
پر انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ملتان میں نواب مظفر خان شہید حکومت کرتے تھے۔ جبکہ پنجاب
میں ہمارا بھ رنجیت سنگھ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مختلف علاقوں میں قبضے کی خاطر مسلسل
فوجی کارروائیاں کر رہا تھا۔ چنانچہ ملتان کا زرخیز خطہ بھی اس کی نظر میں تھا۔ آخر کار ۱۸۱۸ء
میں اس نے نواب مظفر خان کی شہادت کے بعد ملتان پر اپنی عملداری قائم کر کے دیوان

(بقیہ گذشتہ صفحہ) توزیح میں استاد کے سامنے رو رہے تھے کہ حضرت خواجہ حافظ محمد جمال کا گزر ہوا۔
بچے کی حالت دیکھ کر حضرت حافظ صاحب نے فرمایا کہ میاں جی یہ بچہ آپ سے نہیں پڑھتا تو اس
کو میرے حوالے کر دیں۔ میں اس کی تعلیم و تربیت کروں گا۔ چنانچہ آپ اس وقت سے حافظ صاحب
علیہ الرحمۃ سے وابستہ ہو گئے۔

۴۔ "ارض ملتان" از شیخ محمد اکرام، ص ۲۴۲۔

۱۔ "ادیبان ملتان" از اولاد علی گیلانی، ص ۲۶۲، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، بلاول، جنوری ۱۹۶۴ء

۲۔ "نواب مظفر خاں شہید اور اس کا عہد" از عمر کمال خاں، ص ۲۹۷۔

سادن مل کو ملتان کا گورنر بنایا پھر اس کے بعد اس کے بیٹے دیوان مولراج نے یہاں کے گورنری سنبھالی۔ ملتان پر سکھوں کو انگریزوں نے آسانی سے حکومت نہ کرنے دی اور انہوں نے ملتان فتح کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس عہد میں منشی غلام حسن زندہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے انگریز ملتان پر قبضہ نہ جاسکے۔ آخر ایک انگریز سپاہی نے ۲۹، محرم ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۵ء میں آپ کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ برس کی تھی آپ کے بارے میں حافظ محمد جمال اور خواجہ خدابخش مامیوالی کی طرح سکھوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کا ذکر تو کہیں نہیں ملتا البتہ انگریز سپاہی کی گولی سے شہادت کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔ حکم چند لکھتے ہیں کہ

• باطنی حاکم ملتان کا جو فقیروں سے ہوتا رہا وہ مریدان حضرت سے ہوتا ہے۔ ہر وقت تغیر و تبدل سلطنت کی جب وہ باطنی حاکم وصال کرتا تھا تب دوسرا حاکم فحیاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب سرکار انگریز نے ملتان فتح کیا جب تک منشی غلام حسن صاحب نے وصال نہیں پایا۔ ملتان فتح نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک گورہ فوج سرکاری نے منشی غلام کو گولی سے مار دیا۔ اسی روز ملتان فتح ہو گیا۔ (۲)

اس سلسلے میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ

• ملتان کے ظاہری حکام کا تغیر و تبدل اس وقت عمل میں نہیں آیا کرتا تھا جب تک باطنی حاکم جو حضرت جمال اللہ کے مریدان خاص میں سے ہوتا تھا، وصال نہ کر جاتا۔ انگریزی افواج نے جب شہر پر حملہ کیا تو فحیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی کسی طریقہ سے پتہ چلا یا گیا کہ شہر فتح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ کسی نے بتایا کہ جیب

۱- (۱) "ملتان میں اردو شاعری" از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۵۲- (۲) منتخبات از دیوان حسن، ص ۶۹ (تلمی)، سن ولادت کی طرح فرحت ملتان اور شیخ محمد اکرام نے آپ کا سن وفات بھی ۱۳۶۵ھ بتایا ہے۔ جبکہ حکم چند نے "تواریخ ملتان" ص ۸۸ میں آپ کا سن وفات ۱۲۲۶ھ اور عمر کمال خاں نے "نواب مظفر خاں شہید اور اس کا عہد" میں ص ۲۹ پر ۱۸۴۸ھ بتایا ہے جو درست نہیں ہے۔

۲- "تواریخ ملتان" از حکم چند، ص ۸۸، مزید حوالے کیلئے دیکھئے "ادیلئے ملتان" از اولاد علی گیلانی، ص ۲۶۳-

تک حضرت غلام حسن زندہ ہیں تب تک ظاہری حکومت کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک انگریز نے منشی صاحب کو اپنی بندوق کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔" (۱)

ان کا وہ لباس جس پر گولی لگی تھی حضرت غلام حسن شہید کے سجادہ نشینوں کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ مخدوم غلام حسین خلیفہ ہوئے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ غلام حسن شہید بڑے عالم، فاضل، دانشور، ادیب اور شاعر تھے اور انہیں اردو، سرائیکی، فارسی اور عربی زبان پر یکساں مہارت حاصل تھی۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ "عربی اور فارسی پر عالمانہ عبور تھا۔ آپ نے فارسی، عربی اور ملتان زبانوں میں دو دین چھوڑے ہیں۔" (۲)

شاعری میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فارسی، سرائیکی اور اردو میں یکساں مہارت اور پختگی کے ساتھ شاعری کرتے تھے۔ حضرت غلام حسن شہید کا کلام خود ان کی زندگی میں اتنا معروف اور مقبول ہوا کہ مختلف محفلوں میں قوال ان کی کافیاں اور غزلیں گایا کرتے تھے۔ چنانچہ نافع السالکین (ملفوظات حضرت سلیمان تونسوی مرتبہ امام الدین) ص ۱۱۲ پر ایک گھڑولی درج ہے جو حضرت غلام حسن شہید کی ہے۔ اور ظہور جمال (نذرانہ عقیدت) میں بھی موجود ہے۔ اسے میاں احمد قوال نے گایا۔ "نافع السالکین میں لکھا ہے

"روزے در حضور قبلہ من ابراہیم خان سرود کرد

..... پے پیسل پینگھاں پیال

سیال رل مل جھوٹن گیاں

جھوٹے ہیر سیال نی اج پی گھر آیا (۳)

آپ کی بہت سی تصانیف ملتی ہیں جو نثر اور شاعری کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان میں زیریہ تر

۱- "ادلیائے ملتان" از بشیر حسین ناظم، ص ۱۱۳

۲- "ارض ملتان" ص ۲۴۲

۳- "نافع السالکین" ص ۱۱۲۔

فارسی زبان میں ہیں۔ ان کتابوں میں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ قلمی صورت میں ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تفصیل اس طرح ہے

- ۱ — دیوان حسن (فارسی) مطبوعہ (اس کے قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ میرے پاس موجود ہے)
- ۲ — انشائے گلزار معانی در انشائے عبارت صافی (یہ کتاب ضائع ہو گئی، سکھا شاہی فسادات میں)
- ۳ — رسالہ موج دریا (فارسی) [در باب کشف حقائق دحل دقائق مسئلہ توحید
- ۴ — بحر المواج (عربی) (یہ دونوں نایاب ہیں۔)
- ۵ — حنیہ در بیان مصطلحات صوفیہ (یہ بھی نایاب ہے)
- ۶ — کلمات الانصاف (عربی) (اس کی نقل موجود ہے)
- ۷ — نور الہدایت (مثنوی فارسی) [یہ ۱۸۸۵ء میں نرسنگھ پریس ملتان سے شائع ہوئی
- ۸ — رسالہ نور الہدیٰ (فارسی) (ان دونوں قلمی نسخوں کی فوٹو سٹیٹ میرے پاس ہے)
- (یہ دونوں کتابیں اپنے بڑے صاحبزادے مخدوم غلام لیلین کے لئے لکھیں۔)
- ۹ — رفیق الفقراء (یہ نایاب ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے رکن الدین کیلئے لکھی تھی)
- ۱۰ — انوار جالیہ (فارسی) (حافظ محمد جمال کی سوانح عمری ہے جو کہ مطبوعہ ہے۔ لیکن میرے پاس قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ بھی ہے۔)
- ۱۱ — دیوان متفرقات (اُردو، سرائیکی، ہندی اور پنجابی زبان میں مختلف شعری اصناف)
- ۶۹ صفحات قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ میرے پاس موجود ہے۔
- ۱۲ — تذکرہ حضرت محبوب ذوالمنن — چار اوراق پر مشتمل تذکرہ از یار محمد خلیفہ خالقاہ حضرت غلام حسن شہید، یہ اُردو میں لکھا ہوا ہے، تاریخ یکم شعبان ۱۳۱۰ھ ہے۔ (قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ میرے پاس موجود ہے۔)
- ۱۳ — شمائل حنیہ، از نظام الدین رنگریزی (فارسی) قلمی — اس رسالے کے اقتباسات کی نقل میرے پاس موجود ہے۔

ذیل میں غلام حسن شہید کی کچھ اہم دستیاب تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے

- ۱ — نور الہدیٰ (فارسی) — یہ رسالہ حضرت غلام حسن شہید نے اپنے فرزند غلام یسین کے لئے لکھا۔ جیسا کہ رسالے کے شروع میں تصریح موجود ہے۔

"اس رسالہ ایست موجز مسعی بہ نور الہدیٰ برائے فرزند ارجمند سعادت آئین
 غلام یسین منظر اسم الہادی است صورت تحریر یافت و از خلوتکدہ ضمیر بر فراز
 عرصہ تقریر شناخت - مشتمل است بر نصائح سودمند کہ سعادت مندان
 ازل نآن در خورد رجا کہ اہل ارادت ازاں بہرہ وافی برتند - اللہ تعالیٰ این
 درویش نیاز کیش و جمیع مسلمین حق اندیش را توفیق علم و عمل کرامت کناد و
 از علم و عمل بمقصود رساناد و بہ و کمال کر مرہ -"

اس کے بعد الگ الگ ٹکڑوں میں عبارتیں درج ہیں۔ ہر عبارت کے آغاز میں "اے جان بابا!
 کے عزان سے مخاطب کیا گیا ہے اور ہر ٹکڑے میں ایک نصیحت درج کی گئی ہے۔ سب سے
 پہلی نصیحت تحصیل علم کے بارے میں ہے جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، کتب تواریخ و تذکرہ وغیرہ
 پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ حصول مقصد کے لئے تحریر و ترغیب پیدا ہو۔ آداب و معاملات
 اور معاش و معاد نیاں کے بارے میں اطلاع حاصل ہو اور سلوک کی راہ کے لئے دستور العمل
 میسر آئے۔ دوسری عبارت میں صدق و اخلاص اور ارادت و عقیدت کی صفات پیدا کرنے کی
 نصیحت ہے۔ اور جناب رسالت مآب کی متابعت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تکمیل ذات
 کے لئے علوم ظاہری ہی کافی نہیں علوم باطنی بھی ضروری ہیں۔ تیسری نصیحت حفظ توحید کے
 سلسلے میں ہے لیکن اس کے لئے عقل سلیم اور طبع مستقیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس
 سے اگلے ٹکڑے میں وحدت و کثرت کی تشریح دریا اور موجوں کے حوالے سے کی ہے۔ جس
 طرح امواج کی کثرت دریا کی یکتائی کے منافی نہیں ہے اسی طرح مظاہر کی فرادانی اور کثرت
 بھی وحدت ذات مقدس کے منافی نہیں ہے۔ جس طرح دریا موج و جباب، کف و بخار،
 ابر و باران اور برف و ژالہ میں ظاہر ہوتا ہے اسی طرح وجود مطلق ممکنات کی مختلف صورتوں میں
 ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح دریا کو موج یا موج کو دریا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح حق کو عبد
 اور عبد کو حق بھی نہیں کہتے۔ حالانکہ موج کا وجود دریا سے اور وجود خلق حق تعالیٰ سے ہے
 تاہم دریا اپنی ذات میں موج کا محتاج نہیں جبکہ موج کا وجود دریا کا مرہون منت ہے

اسی طرح حق اپنی ذات میں خلق کا محتاج نہیں جبکہ خلق اپنے وجود کے لئے حق کی محتاج ہے۔ جس طرح موج کی نسبت دریا سے قبل از ظہور بھی ہوتی ہے اور بعد از ظہور بھی قائم رہتی ہے۔ اسی طرح خلق کی نسبت حق سے قبل از ظہور بھی تھی اور بعد از ظہور بھی ہے۔ غلام حسن شہید نہایت عالمانہ لیکن عام فہم انداز میں مختلف مثالوں اور حوالوں سے اپنی بات کی وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن تمام مسائل کی تفہیم کے لئے سب سے پہلا مرحلہ معرفت نفس کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

” ترا باید کہ اولاً معرفت نفس پیدا کنی کہ کہہ دیکستی کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه “

وحدت اور کثرت کے مسئلے کی تشریح کے بعد سلوک کی راہ پر چلنے کے لئے مختلف تقاضوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر طریقت کی وضاحت کی ہے۔ اللہ کے دوست کی نشانی یہ بتائی ہے کہ اس کی سخاوت دریا کی سخاوت، اس کی شفقت آفتاب کی شفقت اور اس کی تواضع زمین کی تواضع کی مانند ہے۔ طہارت کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک ظاہری طہارت اور دوسری طہارت باطنی، لیکن دونوں ضروری ہیں۔ پھر ارکان اسلام کی تشریح الگ الگ کی ہے۔ آخری صفوں میں خدا دوستی، ہمان نوازی، خدمت خلق، صلہ رحمی، یتیموں اور مسکینوں کی مدد، بیماروں کی عیادت، نماز جنازہ میں حاضری، باہمی ضیافت، خاطر، تواضع، فروتنی و مرآت، ایثار و تعظیم، غسل، مسواک، طہارت، کسب حلال، گمراہوں کی اصلاح، بزرگوں کی عزت، اہل موعیال کے نان نفقہ کا خیال، مزاروں پر حاضری اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کی نہ صرف تلقین کی ہے بلکہ دنیاوی زندگی میں ان کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔

اختتام میں حضرت مولوی خدابخش ملتانی کو اس آخری دور کا شیخ المشائخ، حجت الاسلام والمسلمین، سند الموحدین، سلطان العاشقین، شمس العارفین، طریق المجاہدہ، غزلیق المشاہدہ، غوث الانام، قطب الاسلام، جامی شریعت، ہادی طریقت، کشاف اسرار حقیقت، بحار معرفت، صوفی صاف مشرب، وجود مستغرق، وجود بکر شہود و قدوۃ علمائے کرام۔ مظہر نام جمال اللہ

الملقب بہ محبوب اللہ تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کا تربیت یافتہ اور ان کے خوان نعمت کا خوشہ چین قرار دیا ہے۔

اس رسالے کا کاتب اللہ بخش ہے جس نے ۲۴ ماہ صفر ۱۳۳۰ھ کو اس کی کتابت مکمل کی۔ رسالہ کے کُل اوراق گیارہ اور صفحات ۲۳ ہیں۔ اسلوب سادہ، ادبی اور دلکش ہے۔ مختلف مسائل تصوف کی تشریح نہایت عام فہم انداز میں کی گئی ہے اور تخیلوں کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔ زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن اُردو خواندہ لوگ اس کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

منشی غلام حسن شہید بختیت شاعر

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ منشی غلام حسن شہید صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ گو، قادر الکلام اور خوش رنگ شاعر بھی تھے۔ ان کا فارسی، سرائیکی اور اُردو کلام دستیاب ہے۔ ہم سب سے پہلے ان کے فارسی کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس میں ایک توشنوی نور ہدایت ہے۔ اور دوسرا دیوان حسن۔ ہم یہاں دونوں کا جائزہ الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

منشی غلام حسن شہید کی منظوم تصنیف "نور ہدایت" ایک شنوی ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کے قلمی نسخے کی فولٹو سٹیٹ کاپی میرے پاس موجود ہے جو مجھے میرے مقالے کے نگران اور رہنما جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ کتاب میاں بلال بخش مجاور خالقاہ حضرت غلام حسن شہید کے فرزند یار محمد نے اپنے ہاتھ سے لکھی اور جیسا کہ اس کتاب کے ص ۸۵ پر درج ہے کہ یہ ۲۹ محرم ۱۳۰۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ سہادہ نشین خالقاہ حضرت شہید، فیض الحسن صاحب کی ملکیت ہے۔ جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق نے یکم ستمبر ۱۹۷۳ء کو لفظ بلفظ نقل کی، انہیں سے مجھے حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

شنوی کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے جس میں نہایت دلکش اور شاعرانہ انداز میں سوز عشق، جرات پروانہ، آتش نور اور شراب دنواز کے ساتھ ساتھ ایک ایسے دل کی طلب کی ہے جو مخزن ستر ولایت، مطلع نور ہدایت، غواص بحر راز اور محرم خلوت خاص ہو۔ ایک ایسا دل جو

بچوں طفلاں شیر رحمت خوردہ عشق

دلے در نسل دہ پروردہ عشق

دے از وادی امین رسیدہ چوموسیٰ شعلہ آتش خریدہ

دوسرا عنوان "حمد" کا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کا حق ادا کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ حضورؐ کی نعت پر مشتمل ہے۔ حضورؐ سے کس آرزو کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

بیادِ حلقہ زنداں گذر کن فرد را رخصت از بیرون در کن

گرد کن خرقہ زہد ریا را بگرداں دور جام کبریا را

گویا غلامِ حسن شہید کے نزدیک رندی، زہد ریا سے بہتر ہے اور عشقِ دمستی کی دنیا میں عقل و خرد کا گزر نہیں۔ اس کے بعد معراج کا ذکر ہے۔ پانچواں عنوان "در مدح پیر دستگیر روشن

ضمیر..... حضرت محمد جمال اللہ" ہے جس کے تحت اپنے مرشد اور پیر حضرت جمال اللہ متانی کی تعریف کی ہے۔ کچھ اشعار یوں ہیں

زہے پیرے بہت دستگیرے ز نور معرفت روشن ضمیر نے

بظاہر ہادی راہ طریقت بعباطن واقف سر حقیقت

قضا ہر لحظہ جو یائے رضائش اجابت چشم بر راہ دعائش

رخش آیتہ دار نور مطلق دلش گوہر نثار حکمت حق

جماش را کمال دل ستانی کماش را جمال جوادانی

زہے حسن و زہے محبوبی او جہانے مبتلائے خوبی او

ثنوی کے چھٹے عنوان کے تحت "ایجاد آدم" کا مضمون باندھا گیا ہے۔ پھر نزولِ سلطانِ عشق

ہوا۔۔۔۔۔ وہ عشق جو سریرِ آرائے اقلیم تقدس اور شہ فرماں دہ آفاق و انفس ہے۔ اس

کے ظہور میں آتے ہی فرہاد نے پہاڑ کھو ڈالا۔ زینب کا ادب سے اس کے آگے جھک گئی۔

بلبل نے اس کی ثنا خوانی شروع کی۔ قمری شرطِ تعظیم بجالائی۔ پروانہ آہ جگر سوز کے ساتھ

شمع کا طواف کرنے لگا۔ شیریں نے اپنے شکر خند سے اس کے بندوں کو شربتِ قند پلایا۔

سرد آزاد اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ اور شمشاد نے اس کے سامنے زمین کو بوسہ دیا

ایک طرف خیلِ خوباں جلوہ فرما ہوا تو دوسری طرف عاشقان ہنگامہ آرا جمع ہو گئے۔ ایک

طرف ساتی نے شراب سے جام بھرا اور دوسری طرف ہوش جاتا رہا۔ نالہ و فریاد اور آہ

وزاری کا بازار گرم ہوا۔ ایک طرف ایک بوسے کے لئے پیغام پہنچا تو دوسری طرف ہونٹوں

سے دشنام کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف وصل کی خواہش کا اظہار ہوا تو دوسری طرف اجابت نے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ خرد اور جنوں کی جنگ چھڑ گئی۔ خرد نے دانش کے سینکڑوں دفتر کھول لئے تو جنوں نے اس کا ایک ایک ورق برباد کرنا شروع کیا۔ خرد نے چارہ سازی شروع کی تو جنوں نے گریبان چاک کر دیا۔

۲ مٹھویں بند میں اپنی جوانی سے پیری تک کا احوال اور اس شنوی کا سبب تصنیف بیان کیا ہے کہ عہد طفلی سے عشق نسوں ساز کا شکار رہے۔ کبھی سوزے مے نے اور کبھی سوزے نغمے نے خرابی کی صورت پیدا کی۔ کبھی تالہ و فریاد سے واسطہ رہا اور کبھی گریہ ہائے پیہم سے، کبھی دل سے صبر و قرار چھن گیا اور کبھی دل کا افسردہ آنکھوں کے ذریعے بہ گیا۔ کبھی شوق نے دامن کھینچا تو کبھی وحشت کے ہاتھوں گریبان چاک ہوا۔ القصد سوائے عشق و جنوں کے کوئی کام نہ تھا کہ اچانک ایک حسین چہرے نے بجلی گرائی۔ اس کا چہرہ غیرت ماہ تھا کہ سوج کی آنکھ نے خواب میں بھی ایسا چہرہ نہ دیکھا ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

ز عشق آں جمال دل نوازم حقیقت جلوہ گردش در مجازم
 رہ اندر عالم تجرید بر دم مے از خم خانہ توحید خوردم
 حجاب از روئے ہستی برگزتم حساب زندگی از سر گرفتیم (ص ۲۴)
 اس نے افسردہ دلوں کو نئی گرم جوشی بخشی، مردوں کو حیات تازہ دی، اس نے ایک ایسا نغمہ سرمدی عطا کیا جس نے بے نواؤں کو نوا، گمراہوں کو راہ، بیماروں کو شفا، اور دردمندوں کو دوا دی۔

نویں بند میں شیخ منصور علاج کے حوالے سے حدیث عشق بیان کی ہے۔ سوال حصہ سرورد قمری اور شمع پر دانہ کی تمثیل سے عشق میں صبر و قرار، برداشت اور حوصلہ مندی کی تلقین پر مشتمل ہے گیارہویں بند میں لیلیٰ مجنوں کی حکایت بیان کی ہے۔ دونوں کے سوال و جواب بڑے دلچسپ ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

چنیں آشفته و در ہم چرائی بہ زلفت گفت دارم آشنائی
 بگفتنا چون نیائی جانب بچد بگفتنا بسکہ رہ گم کردم از وجد
 بگفتنا از چہ کردی پیرین چاک بگفت از دستبرد عشق بے باک

بگفتنا چوں خمیدست پشت زیں ساں بگفت لے جان من از بار ہجرال
 بگفتنا از چہ اسی زیں گو نہ بیسار بگفت از چشم شریخ چوں تو دلدار (ص ۱۳۱)

بارہویں بند میں ایک نوجوان کی محبت کا حال بیان کیا ہے۔ پھر تیرہویں اور چودھویں بند میں حکایت مجنوں بمطابق مضمون سابق منظوم کی ہے۔ پندرہویں بند میں شیخ جنید، سولہویں بند میں زلیخا، سترہویں حصے میں ابراہیم بن شکاس، اٹھارہویں میں ایک زاہد، انیسویں میں مجنوں اور چوبیسویں میں فرہاد کی حکایت کے حوالے سے عشق و جنوں کے مختلف مراحل اور تصوف کے متنوع مسائل کی وضاحت کی ہے۔ پچیسواں بند پھر مجنوں کی حکایت پر مشتمل ہے۔ چھبیسویں بند میں "شاہ شجاع کرمانی کہ باختیار دولت جاودانی ترک سلطنت فانی کردہ بود" کے عنوان سے حکایت بیان کی ہے۔ اگلے سات بندوں میں مجنوں ہی کے حوالے سے دانائی و نادانی، مستی و ہشیاری، طالب و مطلوب، عشق و ہوس، جانفشانی و ناتوانی وغیرہ کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ چونتیسویں حصے میں زن عیار کی حکایت بیان کی ہے۔ اگلے تین بندوں میں پھر حکایت مجنوں کے بند کھولے ہیں۔ اٹھتیسویں بند میں حضرت خواجہ غریب نواز کی حکایت کے حوالے سے سلوک کی راہ میں ترک دنیا و عقبی کا مضمون باندھا ہے۔ اگلے دو بند پھر مجنوں کے ذکر کے حامل ہیں۔ مجنوں کا انجام حیات جاودانی ہے۔ اس لئے کہ اس کا عشق صادق تھا۔ یوں تو ہر کمال کو زوال ہے لیکن کمال عشق کو زوال نہیں ہوتا۔ غلام حسن شہید فرماتے ہیں

زوالے می پذیرد ہر کمالے کمال عشق را نبود زوالے
 مگر ایس عشق آب زندگانی است کہ تاثیرش حیات جاودانی است
 چہ باک از عاشق از غم جاں سپارد کہ عشقش زندہ جاوید دارد
 شہید عشق الحق زندہ جاں است کہ مرگ اد حیات جاوداں است (ص ۱۳۲)

آخری بند میں اس مجموعہ اسرار کی قبولیت کی دعا کی ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ سحر آفریں گرامی نامہ ہے جو نیا آئین اپنے اندر رکھتا ہے اور تحفہ ملتان ہے۔

گرامی نامہ سحر آفریں است نو آئین تحفہ ملتان زمین است (ص ۱۳۳)

انہیں یہ پسندار بھی ہے کہ

نہال صد معنی اندر ہر عبارت بہر معنی نہفتہ صد اشارت

سوادش دادہ از عنبر سرشتے نشاں از زلف حوران بہشتے
سطورکش نقشہ از زلف سنبل حروفش حلقہ از نار کا کل

اس مثنوی کے اشعار کی کل تعداد ۱۲۶۰ ہے۔ ان اشعار میں تصوف اور عشق کے مسائل حکایات اور تمثیلوں کے حوالے سے زیر بحث لائے گئے ہیں۔ پوری مثنوی کا اسلوب بے حد سادہ لیکن شاعرانہ ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کے ذریعے مختلف موضوعات کی وضاحت بڑے دلنشین انداز میں کی گئی ہے۔ پوری نظم رواں دواں، مربوط اور دلکش آہنگ کی حامل ہے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حضرت غلام حسن شہید شاعرانہ صلاحیتوں سے پوری طرح متصف تھے اور مختلف زبانوں میں شعر کہنے کی انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔

دیوان حسن (فارسی) — یہ دیوان مطبوعہ ہے۔ لیکن میرے پاس دیوان حسن (فارسی) کے قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ کاپی بھی ہے جو مجھے جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئی ہے۔ ۱۶۲ صفحات کا یہ دیوان فقیر یار محمد خلف میاں بلال بخش مجاور خانقاہ حضرت غلام حسن شہید کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے آخر میں اس کی تاریخ تحریر ۲۳ شعبان المعظم ۱۳۰۳ھ بروز جمعہ درج ہے گویا یہ دیوان مثنوی نور ہدایت سے ایک سال پہلے تحریر کیا جا چکا تھا۔ اس دیوان کا آغاز اسی نعت سے ہوا ہے جو مثنوی نور ہدایت میں بھی شامل ہے۔ لیکن مثنوی نور ہدایت اور "دیوان حسن" میں درج شدہ ایک ہی نعت کے بعض شعروں میں تبدیلی کی گئی ہے، یہاں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ دیوان حسن میں یہ شعریں درج ہیں۔

جہاںش مخزن اسرار معنی جہینش مطلع نور تجلی

مثنوی نور ہدایت میں اس شعر میں تبدیلی کر دی گئی ہے اور اس کی صورت یوں ہو گئی

کمالش مخزن اسرار معنی جہاںش مطلع الوار معنی

اسی طرح

بہستی کرد چوں چشمش اشارت بغزہ ملک دل را کرد غارت (دیوان حسن)
دو چشم مست او بایک اشارت متاع کشور دل کرد غارت (مثنوی نور ہدایت)
سزدگر آدم خاکی سرشتے دہر بردانہ خالش بہشتے (دیوان حسن)

بخالش چونکہ آدم دیدہ بکشا د
چو ہر کف ساغر صہبارواں کرد
چو دست خود راں راگو ہر فشاں کرد
جمالش را کہ مہ شرمندہ اوست
زہے ہرے کہ مہ شرمندہ اوست
حیات جان بسر ہم چوں نباشش
دوائے جان دلب ہم چوں نباشش

بدام عشق اوزیں دانہ افاد (ثنوی نور ہدایت)
کلیم اللہ دید بیضا نہاں کرد (دیوان حسن)
کلیم اللہ دید بیضا نہاں کرد (ثنوی نور ہدایت)
ہزاروں ہم چو یوسف بندہ اوست (دیوان حسن)
ہزاروں ہم چو یوسف بندہ اوست (ثنوی نور ہدایت)
خضر لب تشنہ آب حیاتش (دیوان حسن)
خضر لب تشنہ آب حیاتش (ثنوی نور ہدایت)

بعض مصرعوں میں یکسانی اور بعض میں تبدیلی محض پہلے بند میں ہے۔ اس بند کے بعد باقی اشعار بالکل مختلف ہیں۔ نعت کے بعد ص ۱۱ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔

حسن کے یہاں زیادہ تر حقیقت اور معرفت کے شعر ملتے ہیں۔ بظاہر ان کا مفہوم مجازی معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا سا غور کریں تو اس کی دوسری سطح ظاہر ہونے لگتی ہے۔ گویا حسن کے یہاں مجاز اور حقیقت کا امتزاج اور میل ہے۔ اس میں ایک سطح مجازی مفہوم کی ہوتی ہے اور دوسری تہ حقیقت کی۔ حسن کے یہاں معاشرتی موضوعات یا سیاسی مضامین نہیں۔ نہ مرد و جہ نظام پر تنقید یا تبصرہ ہے۔ سامنے کی زندگی کے حوالے بھی بہت کم ہیں۔ یہ شاعری تو سیدھے سادے عشق و محبت کے مسائل، صوفیانہ حقائق، عارفانہ مضامین اور مجاز کے پرے میں حقیقت کے بیان پر مبنی ہے۔ حسن کی شاعری کا نقطہ ماسکہ NUCLEAS عشق کا توانا جذبہ ہے جو کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا محور ہے۔ سارا نظام اسی کے گرد گھوم رہا ہے۔ حسن عشق کے حوالے سے عاشق اور اس کی واردات کا اور معشوق کے حوالے سے اس کے سائے متعلقات کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ چنانچہ دیوان حسن کا بیشتر حصہ ان تینوں موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ حمد و ثنا، نعتیہ غزلیات اور اہل بیت کی تعریف میں لکھے گئے اشعار کا محرک بھی یہی جذبہ عشق ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ حسن کی شاعری کا مرکز جذبہ عشق ہے جو سارے جذبوں کا ستارہ اور صدر نشین ہے۔ اس جذبے کا راس جس نے پی لیا وہ کیف سرمدی کا مالک بن گیا۔ جو خواب حقیقت کے مست الست ہوتے ہیں ان کی زندگی بعنوان دیگر ہوتی ہے۔ وہ بظاہر ہنسے ہوئے

من ز خود بر خود تجلی می کنم
 این جہاں آئینہ روتی من است
 خولش را بر خولش شیدا می کنم
 صورت خود را تمنا شامی کنم
 آں قدر کنز خولش پنہاں می شوم
 راز خود را آشکارا می کنم
 می شوم در پردہ پنہاں لے عجب
 ہر قدر بے پردہ خود را می کنم
 این ظہور و این بطوں و سر من است
 سر خود بر خود ہویدا می کنم
 خود منم عین تمنا چوں حسن
 پس چرا خود را تمنا می کنم (ص ۱۰۶)

عشق کا آغاز جلنا اور اس کا انجام موت ہے۔ لیکن یہ موت وصالِ جاناں کی تمہید ہے
 اس کی ابتداء بھی عجیب ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی عجیب ہوتی ہے۔ عشق میں قدم رکھنا
 آسان بھی نہیں۔ یہ راہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز دھار ہوتی ہے۔ لیکن چلنے والے
 اس راہ پر چلتے ہیں اور جان ہتھیلی پر رکھ کر چلتے ہیں اور پار بھی اترتے ہیں۔
 دراصل یہ جذبہ کوئی نیا جذبہ نہیں ہے۔ یہ جذبہ انسان کو ازل سے ودیعت ہوا تھا۔
 شراب کہنے کی طرح عشق کہنے کی تاثیر بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ماعا شقیم و در ازل از عشق زادہ ایم
 ما مشکلات عشق نہ آساں شمردہ ایم
 روئے تو دیدہ ایم و دل از دست دادہ ایم
 سردادہ ایم تا بہ ریش پانہادہ ایم (ص ۱۰۷)

آغاز عشق سوختن انجام مردن است
 لیکن عشق کا امرت ہر بولہوس کے لئے نہیں ہوتا۔ دار و رسن کی آزمائش سے گزرنے والے
 ہی حیات جاوداں کے مالک بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نہ تو ہر شخص زند بلا نوش ہو سکتا
 ہے اور نہ روز روز وہ منصور پیدا ہوتا ہے جو تختہ دار پر کھڑے ہو کر بھی انا الحق کا نعرہ بلند
 کرتا ہے۔ حسن اس حقیقت کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں کہ جلادت لب شیریں۔۔۔ کے
 ذائقے سے وہی شاد کام اور بہرہ مند ہو سکتا ہے جو فرہاد کی طرح کوہ بے ستوں کا
 سینہ چیر کر جوئے شیر بہاتا ہے نہ کہ وہ خسرواں بے نصیب کہ جو پانے کے لئے
 نہ تو جستجو کرتے ہیں اور نہ ہی اس جذبے سے آشنا ہوتے ہیں۔

جلادت لب شیریں بہ پرس از فرہاد
 کہ خسرواں جہاں کم چشیدہ انداں را (ص ۱۰۸)

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اہل دل اور اہل ذوق ہی غموں کے خریدار ہو سکتے ہیں کہ غم خریدنا نفع کا سودا نہیں۔ لیکن اس کو ہر یکتا کی قدر و قیمت ایک جوہری ہی جان سکتا ہے۔ جنوں سے سودا کرنے والے شکست سے دوچار ضرور ہوتے ہیں لیکن اس شکست پر ہزاروں بے روح فتوحات قربان کی جا سکتی ہیں۔ حسن نے تباہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے "غم" کے وجود پر اظہار حیرت کیا ہے کہ آخر اس کو پیدا کرنے کا سبب کیا تھا۔ لیکن انہیں یہ عرفان حاصل ہے کہ "غم" کے خریدار اہل محبت ہوتے ہیں جو اس متاع عزیز کے حصول کے لئے سب کچھ لٹا دیتے ہیں

۴ غم کہ اہل محبت خریدہ انداں را ندانم از چہ سبب آفریدہ انداں را۔ (ص ۱۱)
دور جدید کے ایک شاعر نے غم کی اہمیت کو غالباً غلام حسن شہید ایسے صوفی سے سمجھا ہوگا۔ وہ کہتا ہے

۵ ہ۔ دل گیا رونق حیات گئی غم گیا ساری کائنات گئی
لیکن جب اہل دل اور اہل ذوق کو ظلمت شب میں منزل کا نشان نہیں ملتا تو وہ عکس عذرا پر محبوب کے ستاروں کی روشنی سے نشان راہ پاتا ہے اور جب سالک کو سلوک کی راہ میں مقام حیرت سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب تجلیات کا سلسلہ معطل ہو کر اس کی پریشانی اور مایوسی کا سبب بنتا ہے تو وہ محبوب حقیقی کے حسن مطلق کی جوت دل میں جگا کر استقامت پاتا اور اپنی منزل مراد کی طرف رداں رداں رہتا ہے۔ عاشق شب رو بھی ظلمت شب میں محبوب کے گل عذراؤں کے ستارے چمکا کر راہ پاتے ہیں۔

در حلقہ ہائے طرہ ز عکس عذرا تو در ظلمت شب است نمایاں ستارہ ہا (ص ۱۲)
عشق کا محرک محبوب کا وجود ہے جو حقیقی اور ابدی ہے اور اسی کا پر تو محبوب مجازی میں بھی جلوہ فگن ہوتا ہے۔ اسی لئے محبوب کے سراپا کی تعریف اردو اور فارسی شاعری میں عام ہے چنانچہ اس مضمون میں حسن اور جدت کا وصف ابھارنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ اکثر صورتوں میں تکرار اور یکسانیت کا نقص خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ حسن کے یہاں محبوب کے لئے شیریں دھن، گل بدن، سیمیں ذقن، گل پیرہن، سنبل دیا سمن، جان حسن — جیسی ترکیبیں نہ صرف بلحاظ قوافی ایک مترنم کیفیت پیدا کر دیتی ہیں بلکہ پوری غزل میں ایک مخصوص صوتی نظام کی

ہوتے ہیں لیکن زندگی کا حسن انہی کی بدولت قائم ہوتا ہے۔ وہی امکانات کے مجتہس اور
 حرک ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر خاک کی پستیوں میں گرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا
 مقام بلند عرش کی رفعتوں سے بھی ماورا اور بالا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنا دل "یار" کی
 زلفوں کے خم و بیچ میں اسیر کر کے باقی ساری دنیا سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی نگاہ میں
 عام دکھائی دینے والے یہ "رندے پرست" "مے عرفان" کے بلانوش اور عرش
 نشین ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ تہستم ہستیم	ماست زیادہ استیم
ہر چند کہ ہم چو خاک ہستیم	از عرش بلند تر ہستیم
از بند زمانہ باز ہستیم	دل در خم زلف یار ہستیم
بگذار کہ رندے پرستیم (۹۲-۹۳)	اسے محسب از حسن چہ خواہی

اور ان کی اس بند نشینی، رفت و عظمت کا باعث وہ عشق ہے جس نے حیات کو پر معنی بنایا۔
 زندگی کا سارا حسن، سارے ہنگامے عشق کی بدولت ہیں۔ اسی لئے حسن فرماتے ہیں کہ ہم
 نے عبادت اور اطاعت کا منصب فرشتوں کے ذمے لگا دیا اور اپنے آپ کو عشق کے لئے
 وقف کر دیا۔ کیونکہ عشق کا گد اگر کوئین کا شہنشاہ ہوتا ہے۔ جو عشق کے کام میں لگ گیا اس
 کے لئے باقی سارے کاروبار بیکار ہو گئے۔ اقلیم عشق میں عقل کا گزر نہیں ہوتا۔ جو عشق کا راز دار
 بن جاتا ہے اس کے سامنے سارے اسرار حق کھل جاتے ہیں۔ عشق کی لذیذ اور خوشگوار
 شراب دیوانہ و مست کر دیتی ہے۔

ماز دل و جان فدائی عشقیم	فر بان سر و فائے عشقیم
طاعت بفرشتگان سپردیم	ما سرزده از برائی عشقیم
شاہنشہ کشور دو کونیم	زیں روئی کہ ماگدائے عشقیم
از ہر ہمہ کار و بار بیکار	مشغول بکار و یار عشقیم
بگذار سخن ز عقل بگداز	از ما کہ سخن گزار عشقیم
دیوانہ و رند مست سرشار	از بادہ خوشگوار عشقیم
اسرار حقائق از حسن پرس	زیں روئی کہ راز دار عشقیم (۹۲-۹۳)

حضرت غلام حسن شہید عشق و جنوں کے سرود سے سرشار ہو چکے تھے اور انہوں نے جامِ محبت
مخمل یاراں میں گھمایا اور سب کو صلاح دی کہ کوئی تو ”حریفے مردانگن عشق“ ثابت ہو
خود کو تو انہوں نے عشق کے ساتھ باندھ ہی لیا تھا۔

۵ کافر عشقم ز خود وارستہ ام بر کمر ز نار زلفش بستہ ام (ص ۱۱)
جب عاشق اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں فنا کر دیتا ہے یا صوفی فنا فی اللہ کی منزل پر
پہنچ جاتا ہے تو پھر دوئی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ کثرت و وحدت میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر
ہر صورت زیبا اس کی صورت بن جاتی ہے۔ اشیاء کے ظاہر اور باطن میں وہ سرایت کر جاتا
ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں اس کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ خورشید کی تجلی میں بھی
وہی ہوتا ہے۔

چوں نگری صورت و معنی منم	معنی ہر صورت زیبا منم
وحدت موصوف و مسمی منم	کثرت اسماء و صفات از منست
باطن این جملہ اشیاء منم	ظاہر من این ہمہ اشیاء بود
کردہ چو خورشید تجلی منم (ص ۱۲)	در ہمہ ذرات ظہور منست

عشق کے پر لگ جائیں تو پھر لامکان تک رسائی معمولی بات ہے۔ زمان و مکان کی گرفت
سے آزادی مل جاتی ہے۔ پھر عین غیاب میں حضوری اور عین حضوری میں غیاب کی قدرت
حاصل ہو جاتی ہے۔ عشق کی بدولت وہ جمال معنی حاصل ہوتا ہے کہ زمین و آسمان پر نور
ہو جاتے ہیں۔

ما طائر اوج لامکانیم	وارستہ ز بند آشیانیم
برتر ز مکان و در مکانیم	بیرون ز جہاں در جہانیم
در عین بطون خود عیانیم	در عین ظہور خود نہانیم
ہم چو حسن از جمال معنی	ما نور زمین و آسمانیم (ص ۱۲-۱۵)

یہ عشق بوالہوسی کا نہیں، حقیقت اور صداقت کا عشق ہے۔ اس عشق میں من و تو کا
فرق مٹ جاتا ہے۔ پھر سارا جہاں آئینہ بن جاتا ہے۔ جس میں ایک ہی چہرہ منعکس دکھائی
دیتا ہے۔

نضا بھار کر چمن گل کے تلازمات کے ساتھ سراپا نگاری کے فن کو حسن اور جاذبیت کا رنگ عطا کر دیتی ہیں۔ ایک ہی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ حرف ندا کے ساتھ ان حسین ترکیبوں کا استعمال غزل میں ایک کیف سا پیدا کر دیتا ہے۔

شیریں دھنا ، طوطی شکر شکننا شمشاد قدا ، سمن برا ، گل بدنا
 جادو نگہا ، پر می نژادا ، صنما زریں گلہا ، دلبر کسمیں ذقنا
 از قامت و زلف عارض چو فریب خجالت وہ سرد سنبل و یاسمنا
 چوں غنچہ بہ عرض لب کشایم کنوں رشک چنا ، نگار گل پیر ہمن
 یک شب چہ شوی اگر درانی بہ برم چوں جان بہ ہزار لطف جان حنا (۲۲)

آخر ایسے شعر کیوں نہ ہوں جب تخلیقی محرک اتنا شدید ہو کیونکہ محبوب کا سراپا دلبر بانی کے اتنے انداز رکھتا ہے کہ انسان تو انسان قدسی بھی اس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہے۔

چنیں کہ زلف و خط و خال دلربا است ترا شکار مرغ دل قدسیاں رواست ترا (۱۲)

احساس حسن کی وجہ سے محبوب اپنے انداز دلربائی آزما تا بھی ہے اور غرور حسن اسے رحم اور لطف و کرم کا آشنا بھی نہیں ہونے دیتا۔ اسی لئے تو عاشق پکار اٹھتا ہے

چہ سخت سنگ دل لے صنم! معاذ اللہ نہ بیم خلق نہ اندیشہ خداست ترا (۱۳)

محبوب کی رفتار اور وہ بھی قدر عنا کے ساتھ عاشق پر قیامت ڈھادیتی ہے۔ حسن نے اس خرام ناز کی قیامتوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے اور اسے تخلیقی سطح پر محسوس بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کی چال شاعر کے لئے ایک تخلیقی تجربہ بن گئی۔

گا ہی ز خرام قدر عنا صد محشر ناز کردہ برپا (۱۴)

خرام کا یہ تلازمہ کئی اور تلازمات کا محرک بنا۔ محبوب کی چال کے ساتھ ساتھ اس کے رخ زیبا کا خیال چمکا۔ سخن دل نواز ادلب شکر خا کا خندہ یاد آیا۔ پھر کرشمہ جادو انگیز اور غمزہ محبوب بھرا اور یوں خوب صورت شعر تخلیق ہوتے گئے۔

گہ در خم طرہ دل آویز گہ نور جمال رودنی زیبا
 گہ در سخن از دہن نمک ریخت گہ خندہ زوازل شکر خا

۱۔ دہن کے ساتھ ہمیشہ شیریں کا ذکر آیا ہے۔ یعنی شیریں دہن وغیرہ — (باقی بر صفحہ ثانی)

گہ شد بجز شمعہ جادو انگیزند کہ داد ز غمزہ دل بہ لینما (ص ۱۳)
 محبوب کے تلامذے سے کتنے پہلو حسن کے یہاں سامنے آجاتے ہیں۔ کبھی صنم کے چہرے سے
 نقاب ہٹ جائے تو کلیسا بھی کعبہ کا سامر تہہ حاصل کر لیتا ہے اور کبھی اس بات پر حیرت کا
 اظہار کرتے ہیں کہ وہ محبوب جو پردے میں ہے اور پھر بھی اس کے حسن پر شور قیامت برپا
 ہے۔ اگر وہ نقاب الٹ دے تو کیا کیا قیامتیں برپا نہ ہو جائیں گی۔ کبھی اس ساغر بادہ کی خاطر
 جو ساقی ازل کا عطا کردہ ہے۔ خرقة زہد گروہی رکھ دیا جاتا ہے اور کبھی عشق کی پردہ داری کے
 باوصف محبوب کی بدگمانی کا یقین پختہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی حسن محبوب کا چرچا ہے
 جو کتابوں کے حسن سے کہیں حسین تر ہے۔

اگر تو اے صنم از رخ نقاب برداری
 حنت بہ پردہ شور قیامت فگندہ است
 بہ پردہ حسن تو صد شور در جہاں انگخت
 خرقة زہد نہ سادم بگرد
 عشق ہر خچہ نہاں داشتہ از یاروے
 امی منتخب ترین ہمہ انتخاب
 عشق محبوب کے حوالے سے عاشق پر ظلم و ستم کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ لامتناہی ہے
 عشق کی کلفتوں کے ہاتھوں عاشق کا خانہ ہی خراب نہیں ہوتا اشک پیہم کی روانی کتنی بربادیاں
 بھی لاتی ہے۔ چنانچہ گریہ شوق کی تباہ کاریاں دیکھنے کہ دل خستہ و خراب کو بہا کر لے جاتا ہے
 بالکل اسی طرح جیسے سیل رداں جناب کو خانہ بدوش کر دیتا ہے۔ ایسا خوب صورت مضمون
 بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس مضمون میں جدت بھی ہے اور حسن و انفرادیت بھی۔ بالکل
 نیا خیال ہے اور نہایت دلکش انداز میں بانڈھا گیا ہے۔ شعر دیکھئے
 گریہ شوق می برد قالب خستہ را رجا خانہ بدوش می کند سیل رداں جناب (ص ۱۴)

(بقیہ گذشتہ صفحہ) لیکن غلام حسن شہید کی جودت طبع نے دہن سے نمک ٹپکا یا ہے کہ شیرینی کے ذائقے میں
 جلد بیزاری ہے جبکہ نمک کے ذائقے میں پائیداری ہے۔

عاشق، محبوب اور محبت کے ساتھ مے و نغمہ کا ذکر لازمی ہے۔ شراب و نغمہ اہل عیش کے لئے
تحریک کا باعث بھی ہے اور آرام و سکون کا موجب بھی۔ لیکن اہل صفا — نغمہ سردی اور
مے عرفان سے "نور صفا" اور "سہرِ خدا" حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ حسن زاہد خشک کو
یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مے کدے میں جا کر بادۂ معرفت سے اپنے باطن کو پاکیزہ کریں۔
اور اس بوریاریائی کو جو منافقت کی بُو دے رہا ہے اس شراب سے دھو ڈالیں۔

ساقی زبادہ نور صفا میدہد مرا . مطرب خبر ز سہرِ خدا می دہد مرا
زاہد برو برے کدہ و زبادہ پاک کن . این بوریاکہ بوئی ریامیدہد مرا (ص ۳۰)

یوں تو دیوان حسن کے بیشتر اشعار حقیقت اور معرفت کے مضامین کے حامل ہیں۔ لیکن بہت
سی غزلیں ایسی ہیں جو خالصتاً نعتیہ ہیں اور حضور سے حسن کی عقیدت اور محبت کا ثبوت ہیں
اسی طرح "دیوان حسن" میں اہل بیت اور واقعہ کربلا کے بارے میں بھی اشعار کا اچھا خاصا خزانہ
موجود ہے۔ حضرت حسین کی شہادت پر یہ اشعار اپنی مثال آپ ہیں۔

در ماتم حسین کہ ارض و سما گریست . ماہی بآب مرغ باوج ہوا گریست
تہنا ز امت از غم آل عبا گریست . ہم مرتضیٰ فغان زدو ہم مصطفیٰ گریست
میدان خاک تیرہ شد و آسمان سیاہ . آل دود و آہ ابر شد و جا بجا گریست
اندیشہ کن کہ شور قیامت شود بپا . بنت رسول چونکہ بروز جزا گریست (ص ۳۹)

حسن کو اپنے مرشد (حافظ جمال اللہ) سے جو عقیدت اور محبت تھی اس کا اظہار انہوں نے نہ
صرف سراییکی شاعری میں کیا جس کا ذکر بعد میں آئے گا بلکہ فارسی غزلوں کے اشعار میں بھی کیا
ہے۔ دیوان حسن، ص ۸۰ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے

ناگہاں بر من تجلی کرد عشق . شور محشر تازہ بر پا کرد عشق

اسی غزل کا مقطع حضرت جمال اللہ کے بارے میں ہے۔

جز جمال اللہ ندیم اے حسن . تاکہ چشم باطنم واکر عشق (ص ۸۱)

اس کے فوراً بعد والی غزل میں جو ابھی بحر میں ہے اور جس کا مطلع پہلی غزل کے مطلع سے ملتا
جتا ہے۔ یعنی

جلوہ از ناگہاں چوں کرد عشق . صد دل و صد دیدہ پر خوں کرد عشق (ص ۸۱)

مقطع دیکھئے

چوں مجنوں صد عاشق شوریدہ را
بر جمال اللہ مفتوں کر د عشق

حسن کی شاعری پاکیزہ مضامین تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس میں فن کی پاکیزگی اور حسن بھی موجود ہے۔ شاعرانہ حسن مضمون کی عظمت اور بلندی کے ساتھ ساتھ لفظوں کے بر محل استعمال تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کے موزوں اور مناسب برتاؤ، صنائع لفظی کے حسن کا مرہون منت بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر شاعری کا تعلق لفظوں کے فن کارانہ استعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ حسن کے یہاں فنی لطافتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نغمگی، تکرار لفظی، صوتی حسن، مترنم بحروں، رداں دداں، دلکش اور خوب صورت قوافی اور قریب الماخذ تشبیہ و استعارات کا استعمال غلام حسن شہید کے کلام میں عام ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ساری فنی خوبیاں اس میں نظر آجائیں گی۔

قطرہ قطرہ از سر اشکم شدہ دریا دریا
داغ داغ ہمہ گل گل شدہ صحرا صحرا

دی و امروز بہ امید وصال بگذشت
بعد ازین نیست مرا طاقت فردا فردا

دل جدا، عقل جدا، ہوش جداے ظالم
گشتہ آوارہ بگویت ہمہ تنہا تنہا

دل چرا شہرہ بازار ملامت نشود
کردہ بے سود بہ عشق این سر سودا سودا

جز تو بر حاشیہ دل نہ کشم نقش دگر
من دوا بستگی غیر تو حاشا حاشا (ص ۲۷)

اسی طرح غزل کے یہ اشعار دیکھئے

ترک خوشخوار من این است این است
آنکہ اور ہزن دین است این است

آنکہ چوں مرد مک اندر چشم
روز و شب پر دہ نشیں است این است

آنکہ چوں زلف خود از روی عقاب
بہ حسن چیں بہ چین است این است (ص ۲۶-۲۷)

صنعت تضاد کی مثال دیکھئے

ما مشکلات عشق نہ آساں شمرده ایم
سردادہ ایم تا بہ رہش پانہاہ ایم (ص ۱۸)

یا ظاہر من این ہمہ اشیا بود
باطن این جملہ اشیا منم

کثرت اسما و صفات از منت
وحدت موصوف و مسمی منم (ص ۱۲)

لف و نشر کی مثال ملاحظہ فرمائیے

از قامت و زلف و عوارض چو فریب
یا ای لب و چشم و دہانت شکر و بادام قند
نخط مشکیں و رخ زیبا و زلفِ دل کشت
یا رخس از روضہ رضوان بہاری
حسن را زلف او عمر دراز است
تشبہ کی مثال دیکھتے

قد رعنائی آل سرو دل آرا
قیامت بود قامت نام کر دند (۵۷)
ایک شعر میں دیدہ کو حجاب کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو نادر ہے۔ آنکھ کے ساتھ رونے کا
تصور یا دریا کا تلامذہ عام ہے۔ لیکن آنکھ کو حجاب کہہ کر دریا کو اس میں اسیر کرنے کا
خیال بالکل نیا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

حسن زدیدہ گریاں خویش حیرانم
کہ در حجاب نہاں کردہ اندر دریا را (۲۳)
بلاشبہ کیفیت چشم کو شراب کی تاثیر کے ساتھ مشابہت دینا کوئی نئی بات نہیں لیکن اس عام
مضمون کو حسن نے جس خوب صورت انداز میں باندھا ہے وہ ان کی جدت فکر اور جودت طبع
کا بین ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں

کیفتے کہ درنگہ چشم ساقی است
ہرگز نیافت بادہ فروش از شراب ہا (۲۶)
اس گفتگو کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت غلام حسن شہید فارسی زبان پر کامل
دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے مخصوص مضامین کو فارسی شعر میں اہل زبان کی سی بہارت
اور پنچگی کے ساتھ ادا کیا۔

منتخبات دیوان حضرت منشی غلام حسن شہید

مجھے منشی غلام حسن شہید کا ایک ایسا قلمی دیوان جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی معرفت
دستیاب ہوا ہے جس میں متفرقات شامل ہیں۔ یعنی اس میں اردو، پنجابی، سرایتی
اور ہندی زبان کے شعری نمونے موجود ہیں۔ ان میں خالصتاً سرایتی کی چیزیں بھی ہیں اور

خالصتاً اُردو کی بھی۔ لیکن سرایتی، پنجابی، ہندی اور اُردو کے مخلوط نمونے جا بجا موجود ہیں مثلاً پہلی ہی غزل جو اس دیوان میں درج ہے اس مخلوط زبان کا نمونہ ہے جس میں پنجابی، سرایتی، ہندی اور اُردو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن اُردو کا رنگ غالب ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

حضرت عشق دا کرو نظار ہر ہر شان میں روپ تمہارا
سارے جگت کا روپ سنوارا ہم بیٹے وہ باپ ہمارا
جس کو کہتے ہیں ذات الہی وہ انسان تمام کہا ہی
میں اس بات پہ دیوں گواہی احمد ہو کر کیا پسارا
احمد ہو معراج سدھایا جب سرائیل براق لیا یا
آپ کو دیکھا آپ کو پایا آپ سے آپ حجاب اتارا
کدی گدا کدی شاہ کہا وے کدی امیر سپاہ کہا وے
کدی جمال اللہ کہا وے گانمن کا وہ میت پیارا

اسی طرح کی کئی مثالیں ہیں جو شاعری کے جائزے کے دوران درج کی جائیں گی۔ اس دیوان متفرقات میں جو چیزیں شامل ہیں ان کا ایک اجمالی جائزہ درج کیا جاتا ہے تاکہ ایک نظر میں مندرجات کی تفصیل سامنے آجائے۔

اشاریہ — (منتخبات از دیوان غلام حسن شہید)

- ۱- ص ۲۔ ہر ہر شان میں روپ تمہارا (اُردو غزل لیکن مخلوط وٹکشن) ص ۴۔ اشعار، (وحدت الوجودی نظریہ)
- ۲- ص ۴۔ کیا کیا کرتے ہیں رنج ادا (سرایتی، ہندی الفاظ و لب و لہجہ، غزل اُردو، ایک مصرعہ غائب ہے۔)
- ۳- ص ۵۔ ہر ہر طرف بہار وہ عجب تماشا (گیت تریح بند ہنیت میں۔ اُردو سرایتی امتزاج۔ اسے ترتیب سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی نقل غلط انداز میں تیار کی گئی ہے مصرعوں کو گڈ ٹڈ کر دیا گیا ہے۔)

- ۲- ص ۶ پر " ایضاً " غلط لکھا گیا ہے۔ یہ سرایتیکی غزل ہے جس میں ہندی، پنجابی اور اُردو ڈکشن کا امتزاج ہے۔ پانچ اشعار ہیں۔ وحدت الوجود کا فلسفہ، ہندی روایت کا اثر
- ۵- ص ۷، " جوگی " نظم سرایتیکی، اشعار آٹھ
- ۶- ص ۸، " جوگی " نظم سرایتیکی۔ اشعار گیارہ
- ۷- ص ۹، نعت اُردو، سعدی شیرازی کی نعت کا تتبع، اُردو نعت گوئی میں نیا تجربہ سرایتیکی مصرعہ، صفحہ افعال سب سوز دھیں لگن، حسنت جمیع خصالہ۔ ایک مصرعہ اُردو اور دوسرا نکرہ سعدی کی نعت کا ہے۔ یا اس کا اُردو ترجمہ ہے (اشعار گیارہ)
- ۸- ص ۱۱، غزل، اے صنم کیسے مصوّر نے بنایا ہے تجھے (اُردو) پانچ اشعار، تغزل کا رنگ عشق مجازی کے مضامین۔
- ۹- ص ۱۲، غزل۔ اُردو، جدھر جا کے دیکھا ادھر تو ہی تو ہے۔ (پانچ اشعار) وحدت الوجود کا فلسفہ، تصوف، میر درد کا رنگ۔
- ۱۰- ص ۱۳، کچھ تجھے درد میرے دل کی خبر ہے کہ نہیں۔ غزل اُردو (اشعار پانچ)، میر درد کا انداز۔
- ۱۱- ص ۱۴، مرثیہ (بندگی بجناب امام حسین علیہ السلام بطور مرثیہ) اُردو، گیارہ اشعار۔ میری بندگی اسے جا کہو جس پہ شامیوں نے ستم کیا۔
- سراییکی الفاظ، مول، تائیں، تیں، اد نہیں کا استعمال ملتا ہے۔
- ۱۲- ص ۱۶ تا ص ۲۰، مرثیہ۔ اُردو، سرایتیکی الفاظ کا استعمال موجود ہے۔ (۳۰ اشعار)
- ۱۳- ص ۲۱، راجھے دا حُسن کمال فی اماں، گیت سرایتیکی۔
- ۱۴- ص ۲۲، کافی (سرایتیکی)، ۱۰ اشعار۔
- ۱۵- ص ۲۳، ۲۴، گھڑولی (سرایتیکی)
- ۱۶- ص ۲۵، ۲۶، جوگی (سرایتیکی)، ۱۱ اشعار، راجھا سارے جگ داسا بھجا مقامی، رنگ وحدت الوجود کا فلسفہ، راجھا محبوب حقیقی کا استعارہ ہے
- ۱۷- ص ۲۷ تا ۳۰، ڈھولا (سرایتیکی)، ۲۱ اشعار۔
- ۱۸- ص ۳۱، ۳۲، ایضاً لکھا ہوا لیکن یہ ڈھولا نہیں بلکہ مستزاد ہے، سرایتیکی میں ہے۔ (۶ اشعار)

- ۱۹- ص ۳۳ تا ۳۸، سی حرفی (سرائیکی) الف سے ط تک ہے۔ اگلے صفحات خالی ہیں۔
- ۲۰- ص ۲۲، بسنت گیت (سرائیکی)
- ۲۱- ص ۲۲، ہندی (سرائیکی) مقامی اشارے
- ۲۲- ص ۴۵ تا ۵۰، نظم مرزا صاحبان (سرائیکی) مرزا صاحبان کا عشقیہ قصہ منظوم کیلئے اور توجہ وصال کی کیفیت پر دی ہے۔ صوفیانہ علامتیں اور رمزیں موجود ہیں۔ چونتیس اشعار ہیں۔
- ۲۳- ص ۵۱، چھوٹی سی سرائیکی نظم ہے۔ (حضرت جمال اللہ کے لئے)
- ۲۴- ص ۵۲، خیال — سرائیکی نظم ہے۔
- ۲۵- ص ۵۳ تا ۵۴، دو کافیاں - سرائیکی۔
- ۲۶- ص ۵۴، ہجرا، اردو سرائیکی مخلوط (تین سطریں)
- ۲۷- ص ۵۵، دو ہڑے (ملتان) معرفت کا رنگ۔
- ۲۸- ص ۵۶، خیال جوگ، خیال راگنی پیلو۔
- ۲۹- ص ۵۷ تا ۶۵، اٹھارہ دو ہڑے ملتان زبان میں۔
- ۳۰- ص ۶۶ تا ۶۸، کافی (راگنی جوگ)

اس ساری تفصیل کا خلاصہ بنایا جائے تو اردو کی یہ چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

اردو غزلیں — پانچ — ۲۲ اشعار

اردو مرثیے — دو — ۴۱ اشعار

اردو نعت — ایک — ۱۱ اشعار

باقی چیزوں میں کافیاں، گیت، ڈھولے، مستزاد، سی حرفی، جوگی، گھرولی، نظمیں وغیرہ شامل ہیں اور ان تمام اصناف میں "ملتان میں اردو" کے اولین اجزا کا پتہ ملتا ہے۔

اُردو شاعری

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ غلام حسن شہید عربی، فارسی، ہندی، سرائیکی اور اُردو کے پختہ گو شاعر تھے۔ ان کی فارسی شاعری کا جائزہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے۔ فارسی زبان اور اصناف کا عمل دخل جتنا اُردو پر رہا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مغلوں کی آمد سے بھی پہلے عربی فارسی کا اثر برصغیر کی مقامی بولیوں پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مغلوں کے ہاتھوں غیر منقسم ہندوستان کی تسخیر نے زبانوں کے اختلاط کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے زیادہ تر جس زبان کا اثر اُردو پر مرتب ہوا وہ مغلوں کی زبان فارسی تھی۔ فارسی الفاظ، تراکیب، علامتیں، اصناف شعر اُردو زبان و ادب میں اس قدر دخیل ہوئیں کہ اُردو زبان و ادب نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا۔ اور اس رنگ کو "عجمی لے" کا نام دیا جانے لگا۔ اُردو کے بے شمار نامور شعراء کے یہاں اس عجمی لے کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان شعراء میں سودا، غالب، ذوق، داغ اور پھر دورِ جدید میں اقبال قابل ذکر ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سرزمینِ ملتان کے بیشتر صوفی شعراء کے یہاں فارسی کلام موجود ہے۔ ان کے ملفوظات فارسی میں ہیں۔ لیکن وہ جب اُردو میں شعر کہتے ہیں تو ان کے کلام میں "عجمی لے" کم سے کم ہوتی ہے۔ اس میں ہندی یا مقامی زبانوں کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں، حضرت بابا فرید گنج شکر، شمس تبریزی، امیر خسرو، حسن سنجر، حافظ جمال اللہ وغیرہ کی شاعری کے نمونے گذشتہ صفحات میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان سے اس موقف کی تائید ہو جاتی ہے۔ حضرت غلام حسن شہید کے یہاں بھی یہی صورت ہے کہ ان کے فارسی کلام سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف اُردو کلام سامنے رکھا جائے تو اس میں "عجمی لے" کی بجائے مقامی رنگ زیادہ ہے۔ زیادہ تر ڈکشن، ہندی، سرائیکی، پنجابی اور دیگر مقامی زبانوں سے ماخوذ ہے۔ اس کی مثالیں آگے چل کر نظر آئیں گی۔

منشی غلام حسن شہید اُردو اور فارسی کلام میں حسن تخلص کرتے ہیں اور سرائیکی اور اُردو شاعری میں گانمن، ان کا یہ تخلص اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ کچھ عرصے بعد اس کے معنی ایک خاص صنف سخن کے ہو گئے جہاں کہیں دو چار دوست مل بیٹھتے تو فرمائش کی جاتی کہ گانمن سناؤ

یعنی دوہے سنائے جائیں۔ اضلاع ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے مقامی ادب کے مجموعے جب انگریزوں نے گزٹیئر کی صورت میں جمع کئے تو انہوں نے ان دوہوں کو "گامن" کہہ کر پکارا۔ سرایکی اور اردو شاعری کے موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں جو فارسی کلام کے ہیں۔ یعنی معرفت، حقیقت، عشق اور معاملات عشق، وحدت الوجود، معرفت نفس، حسن محبوب کی تعریف و توصیف وغیرہ۔ منشی صاحب کا خیال ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں محبوب حقیقی کا جلوہ موجود ہے: اس کا روپ رنگ فطرت کے مظاہر میں رچا بسا ہے۔ فطرت کا حسن دراصل محبوب کے حسن کا پر تو ہے۔ ساری دنیا میں اسی کا روپ عیاں ہے۔ انسان اور خدا کا رشتہ باپ بیٹے کا رشتہ ہے اس کے وجود نے ہمیں جنم دیا لیکن تمام کائنات کا حاصل حضورؐ کی ذات اقدس تھی۔ جن کو خدا نے اپنے پاس بلایا ان کو معراج کی رفعت نصیب ہوئی۔ حضرت جبرائیل براق پر ان کو لے کر گئے۔ حضورؐ نے خدا کو دیکھا، اس کی ذات کا عرفان حاصل کیا۔ سب حجاب اتر گئے۔ گویا حضورؐ نے گدائی میں زندگی کی معراج پائی۔ ان کا ارشاد "الفقر فخری" انسانیت کو درویشی اور قلندری کا درس تھا۔ غزوات میں حضورؐ امیر سپاہ بھی رہے۔ یعنی ایک طرف درویشی ہے تو دوسری طرف سردری، حقیقت میں وہ خدا کے حسن کا مظہر ہیں۔ غلام حسن شہید گامن ان حقائق کو ان اشعار میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت عشق واکر و نظارہ ہر ہر شان میں روپ تمہارا
سائے جلالت کا روپ سنوارا ہم بیٹے وہ باپ ہمارا
احمد ہو معراج سدھایا، جب اسرائیل براق لیا یا
آپ کو دیکھا آپ کو پایا آپ سے آپ حجاب اتارا
کدی گدا کدی شاہ کہاوے کدی امیر سپاہ کہاوے
کدی جمال اللہ کہاوے گامن کا وہ مہبت پیارا ۱۱

جب معرفت حق دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور چشم بینا مجاز کے پردے میں بھی

۱۔ بحوالہ منتخبات از دیوان حضرت منشی غلام حسن شہید (غزلیات متفرقات بزبان ہندی و بزبان پنجابی و ملتان))

محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھنے کے لائق ہو جاتی ہے تو پھر کثرت و مدت میں سمٹ جاتی ہے اور شش جہت میں اس کا جلوہ منعکس نظر آنے لگتا ہے۔ خواجہ میر درد نے اس مضمون کو اس طرح باندھا تھا کہ

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

حسن نے بھی یہی کیفیت محسوس کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

تجلی تیری ذات کا سو بسو ہے جدھر جا کے دیکھا ادھر تو ہی تو ہے (ص ۱۱)

اور جب وحدت کا جلوہ ہر طرف بکھرا ہوا ہو تو پھر نہ تو دیر و حرم کی تفریق باقی رہتی ہے اور نہ شیخ و برہمن کا اختلاف — اس وقت سالک کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین ہوتا ہے اور وہ ہے محبوب حقیقی کے دیدار کی آرزو، بقول حسن

نہیں کچھ غرض مجھ کو دیر و حرم سے فقط تیرے دیدار کی آرزو ہے (ص ۱۱)

اب کانوں کو ایک ہی آواز کی لگن ہے اور آنکھوں کو اضطراب اور جستجو ہے تو وہ بھی اسی ذات یکتا و بے مثال کی۔

جہاں سنتے ہیں اور تہاں دیکھتے ہیں تیری گفتگو ہے تیری جستجو ہے

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس ذات لطیف کو کس نے دیکھا ہے اور پھر ظاہری آنکھ کے حوالے سے — اب "جمالِ خدا" کا مشاہدہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے اس کے منظر کو دیکھنا، جو حضور کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ بعض صوفیاء اور مفکرین نے انسان کو خدا کا خارجی منظر قرار دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضور کی ذات اس منظر کا کامل ترین نمونہ ہے۔ اس لئے حسن پورے یقین کے ساتھ فرماتے ہیں

جمالِ خدا اگر نہیں تم نے دیکھا محمدؐ کو دیکھو وہی ہو بہو ہے (ص ۱۱)

سلوک کی راہ پر چلنے والوں کو انہیں کلفتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ایک عاشق زار کو آرزوئے وصال یاہ میں پیش آتی ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ محبوب حقیقی شہِ رگ کے بھی قریب

ہے اور ہم خود اپنے دل میں اس کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کی دستوں اور پہنائیوں

کا یہ عالم ہے کہ سدرۃ المنتہا کے آگے تو فرشتوں کے بھی پربلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہاں

تک رسائی تو کیا پیغام کا پہنچنا بھی مشکل ہے۔ عام طور پر عاشق کو صبا کے ہاتھ اپنا حالِ دل

محبوب کو بھجوانا پڑتا ہے۔ خواجہ میر درد نے کہا
یہی پیغام درد کا دینا گر صبا کوئے یار سے گزے
کون سی راہ آن ملے گا دن بہت انتظار میں گزے
لیکن یہ ایک خواہش کا اظہار ہے۔ ضروری نہیں کہ برائے حسن کی تمنا تو ہے کہ محبوب کو ان
کے درد کی خبر ہو جائے۔

کچھ تجھے درد میرے دل کی خبر ہے کہ نہیں
آہ و صد آہ محبت کا اثر ہے کہ نہیں
(۱۳ ص ۱۳)
لیکن انہیں اپنی نارسائی اور مجبوری کا احساس بھی ہے اس لئے وہ پکار اٹھتے ہیں
کوئی ایسا بھی نہیں تجھ کو خبر پہنچا دے
تیرے کوچے میں صبا کا بھی گزر ہے کہ نہیں
(۱۳ ص ۱۳)

چونکہ محبوب کو حال دل کا پتہ نہیں اس لئے وہ اس کے علاج سے بھی غافل ہے۔ دل کی
شاخ تو محبوب کی توجہ سے ہری ہوتی ہے۔ جب اس پر کوئی توجہ نہیں ہوتی اور نہ سیرابی
ہوتی ہے تو وہ پھل کیسے لاسکتی ہے۔ چنانچہ موسموں کے تغیر سے ہر ایک نہال بار آور ہوتا
ہے۔ لیکن شاخ دل کسی موسم میں بھی ثمر نہیں لاتی۔

بارور ہوتا ہے موسم سے تو ہر ایک نہال
شاخ دل کا بھی خدا جانے ثمر ہے کہ نہیں
(۱۳ ص ۱۳)
حسن کے یہاں تصوف کے جو مسائل ادا ہوئے ہیں ان میں وحدت الوجود کا تصور ہی زیادہ
نمایاں ہے۔ جیسا کہ ان کے حالات زندگی میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت غلام حسن شہید
وحدت الوجود کے نظریے سے بے حد متاثر تھے۔ "نور الہدیٰ" میں زیادہ تر اسی مسئلے
کو زیر بحث لائے ہیں اور مختلف مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے اس کی تفصیل سابقہ
صفحات میں درج کی جا چکی ہے۔ وحدت الوجود کا مسئلہ بنیادی طور پر محبت اور عشق کا مسئلہ
ہے۔ سب کچھ ایک ہی وجود ہے۔ دوسرے کو تکلیف دینا خود کو عذاب میں ڈالنا ہے۔ اور
دوسرے سے محبت خود اپنے آپ سے محبت ہے۔ اس لئے وحدت الوجود کے مسئلے میں
محبت اور اخلاص ہی سب سے ابھرتا ہوا اور نمایاں جذبہ ہے۔ محبوب کے ناز و آدا ہوں

اور ان کے راہنما اور نمائندے بھی عوام ہی سے پیدا ہوتے ہیں،

۳۱ صوفیاء کی تعلیمات

یوں تو محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے ساتھ آنے والے سپاہی بھی بلند اخلاق اور اعلیٰ شعائر کے حامل تھے اور جو لوگ یہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے ان کے اثرات یہاں کی معاشرت پر پڑے لیکن برصغیر پاک و ہند میں آنے والے صوفیائے کرام کی تبلیغ اور تعلیم نے تو یہاں کی کایا پلٹ دی۔ انہوں نے نہایت عام فہم اور محبت آمیز انداز میں اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنی سادہ زندگی، درد لیشی، بے ریائی، خلوص اور انسان دوستی کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے لوگوں کے اخلاق کو سنوارا اور نیک اعمال کی طرف مائل کیا دوسری طرف مقامی بولیوں میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش کر کے رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ معین الدین دردانی کا یہ کہنا غلط نہیں کہ

..... دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے

ہم زبانی کے بعد ہی ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ یہ صوفیائے کرام عوام سے انہیں کی بولی میں گفتگو کرتے اور تعلیم و تلقین کی کوشش فرماتے تھے،

اس طرح صوفیاء کی بدولت ہندوستان پر نہایت دور رس اثرات مرتب ہونا شروع ہوتے یہ صوفیائے عظام برصغیر پاک و ہند کے کونے کونے میں پہنچے ملتان تو ان کے لئے ایک مرکزی شہر کی حیثیت رکھتا تھا جہاں صوفیاء زبان تک سیکھنے کے لئے آتے تھے۔ چنانچہ معین الدین چشتی اجمیری کے حالات میں درج کیا جا چکا ہے کہ وہ زبان میں مہارت نامہ حاصل کرنے کے لئے ملتان تشریف لائے۔۔۔ اسی طرح قطب الدین بختیار کاکی امیر خسرو اور حسن دہلوی کو بھی ملتان میں قیام کا موقع ملا اور انہوں نے یہاں کی زبان کے اثرات قبول کئے۔ ملتان کے صوفیاء کا فیض برصغیر سے نکل کر باہر کی دنیا تک پہنچا۔ حضرت غوث بہار الحق زکریا ملتان کے احوال میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کی قائم کردہ درس گاہ کے ستر ہزار تربیت یافتہ

۱- بحوالہ تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۲۲

۲- بحوالہ صوفیائے بہار اور اردو، ص ۲۱، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۲ء

عالم رشد و ہدایت اور تعلیم تدریس کے لئے جاوا، سماٹرا، انڈونیشیا، فلپائن، خراساں اور چین تک پہنچے۔

صوفیائے کرام نے انسانیت کا جو درس دیا وہ انسانی اخلاق کی معراج ہے۔ ان کے نزدیک چھوٹے بڑے، ادنیٰ و اعلیٰ کلمے گورے، امیر غریب اور عربی و عجمی میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہندو مسلم اور شیخ و برہمن میں بھی کوئی امتیاز نہ برتا۔ خواجہ معین الدین اجمیری، قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید گنج شکر، راجو قتال، امیر خسرو، جہانیاں جہاں گشت حافظ جمال اللہ، حضرت سلیمان تونسوی، حضرت موسیٰ پاک شہید، حضرت غلام حسن شہید اور حضرت خواجہ غلام فرید جیسے صوفیاء کے احوال میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم ثقافت میں میل پیدا کر کے اسے فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم اور اہل تکفیر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے۔ اسلام کی طرف غیر مسلموں کو جو رغبت ہوتی وہ صوفیائے کرام کے خلق عظیم کی بدولت ہوتی۔ صوفیائے کرام نے بلا امتیاز رنگ و نسل تمام نبی نوع انسان کو اخوت، محبت امن آشتی اور انسانیت کا درس دیا۔ سید سلیمان ندوی کی مطابق ”جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ کا مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان میں غزنی اور غور کے سلاطین، ملکی فتوحات کے لئے جہاں جہاں بڑھتے تھے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنی اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خاندانِ سچت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا۔“

۴۱، زبان کے تال میل میں صوفیاء کا حصہ

ان روحانی سلاطین میں بیشتر کی مادری

زبان عربی اور فارسی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان صوفیاء کے ملفوظات زیادہ تر فارسی زبان

میں ہیں یہاں تک کہ صوفیاء کا وہ سلسلہ جو خالصتاً مقامی تھا (ملتان کا ہروردیہ سلسلہ اور حافظ جمال اللہ، خواجہ خدابخش، حضرت سلیمان تونسوی وغیرہ) بھی زیادہ تر فارسی زبان بولتا اور لکھتا تھا تاہم تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ یہ صوفیاء کسی ایک زبان تک محدود نہ رہے بلکہ وہ جہاں بھی پہنچتے تھے وہاں کی زبان سیکھتے اور وہاں کے عوام کی زبان ہی میں لوگوں سے گفتگو کرتے تاکہ انہیں اپنی بات سمجھا سکیں اور

زبان یا رمن ترکی و من ترکی نہی دانم

والا معاملہ نہ ہو، شاہ یوسف گردیز، معین الدین اجمیری، بابا فرید گنج شکر، قطب الدین بختیار کاکی، جہانیاں جہاں گشت کے احوال میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ان صوفیاء نے مقامی زبانوں میں گفتگو اور تبلیغ کی۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ بہت سے جملے، ابیات، اقوال بھی منسوب کئے جاتے ہیں اور ان کی تفصیل سابقہ صفحات میں درج کی جا چکی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے بعد کے صوفیاء جن میں حضرت حافظ جمال اللہ، موسیٰ پاک شہید، حضرت سلیمان تونسوی، حضرت خواجہ خدابخش، غلام حسن شہید اور خواجہ فرید وغیرہ شامل ہیں۔ سرایتی اور دیگر علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو زبان بھی بلاتامل بولتے تھے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اپنی تعلیم و تربیت اور علمی فضیلت کے سبب مقامی زبانیں بولتے وقت بھی لاشعوری طور پر عربی اور فارسی زبان کے الفاظ ان کے منہ سے ضرور نکلتے ہوں گے۔ چنانچہ اس طرح مقامی بولیوں میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہونے لگی۔ زبان کا یہ اختلاط کسی ایک علاقے تک محدود نہ تھا کیونکہ صوفیاء کا دائرہ تبلیغ کسی ایک خطے تک محدود نہ تھا بلکہ وہ جہاں جہاں پہنچے وہاں کی مقامی بولیوں سے اثر قبول کیا اور خود بھی انہیں متاثر کیا۔ اس طرح مختلف علاقوں کی بولیوں میں ایک قسم کی غیر محسوس تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی اور چونکہ صوفیاء کی تبلیغ و تلقین کی بدولت لسانی تشکیلات کا یہ عمل برصغیر پاک و ہند کے تمام علاقوں میں یکے بعد دیگرے پھیلتا چلا جا رہا تھا اس لئے ہر جگہ ایک ایسی مشترکہ زبان بھی وجود میں آرہی تھی جو اپنے علاقے کے مقامی اثرات کے امتیاز کے باوصف اپنی شکل و صورت اور رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے ایک تھی۔ اور یہ زبان اردو تھی جو صدیوں کے لسانی تشکیلاتی عمل کی بدولت وجود میں آئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ بیان ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے کہ

..... ” صوفیائے کرام بر عظیم کے مختلف علاقوں میں رشد و ہدایت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ بابا فرید گنج شکر ملتان کے رہنے والے ہیں۔ شیخ حمید الدین ناگوری وسطی ہند کے، بوعلی قلندر پنجاب و ہریانہ کے، شیخ شرف الدین بھٹی منیری بہار و بنگال کے، امیر خسرو دہلی کے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی اودھ کے، جو پنجاب میں تھا اس کی زبان پر وہاں کی بولی کا اثر ہے۔ جو بہار میں تھا اس کی زبان پر ماگدھی کا اثر ہے کسی پر برج بھاشا کا اثر ہے۔ اور کسی پر کھڑی بولی کا۔ کسی پر سرائیکی کا اثر ہے تو کسی پر زبان گجرات کا۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس زبان کا کینڈا، رنگ ڈھنگ بنیادی طور پر ایک ہے۔ اور بھی چونکہ یہ زبان اپنی تشکیل کے عبوری دور سے گذر رہی ہے اس لئے یہ اثرات انگ انگ دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں،

اُردو زبان کے ارتقا میں صوفیائے کرام کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے، عبدالمالک آردی لکھتے ہیں

..... ” حضرت خواجہ معین الدین سبکی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین خالیدی وغیرہ نے ارتقا میں اُردو میں بڑی مدد دی، چونکہ قومی اصلاح اور روحانی ابلاغ و ارشاد کے سلسلے میں عوام الناس کو آپ حضرات کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ خواجہ معین الدین سبکی سلطان التمش کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے خواجہ قطب الدین قصبہ اوش سے تشریف لائے تھے۔ اسی طرح شیخ فرید الدین قصبہ کہتوال سے جو ملتان کے علاقہ میں ہے تشریف لائے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے والد احمد دانیال غزنین سے ہندوستان میں آئے۔ دکن کے اسلامی سلاطین کے عہد میں بھی اولیاء کبار ہندوستان میں آئے۔ اگر ہر شاہی خاندان کے عہد کے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کی جاتے تو پتہ چلے گا کہ ایرانی شعرا کی طرح عراق، عرب و ایران کے صلحاء

صوفیہ بھی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ آئے اور ان کی بیعت و ارشاد نے
عوام الناس کی زبان پر گہرا اثر ڈالا،

۵، اردو زبان و ادب کی ترویج میں صوفیاء کرام کی خدمات

ہم سابقہ صفحات میں خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، شاہ شمس سبزواری اور جہانیاں جہاں گشت، حضرت موسیٰ پاک شہید، حافظ جمال اللہ، حضرت سلیمان ٹونسوی، غلام حسن شہید، حضرت خواجہ فرید اور دیگر صوفیاء کے ضمن میں ان کے جملوں، اقوال اور ادبی و شعری سرمائے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ جملے، اقوال اشعار اردو کی ابتدائی نشوونما میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ ماہرین فن اس کو تسلیم کر چکے ہیں اور ان کی کتابوں میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صوفیائے کرام کے اقوال پر مبنی قدیم نمونے، ان کے ملفوظات اور ان سے وابستہ جملوں، فقروں، اشلوکوں، اشعار و ابیات وغیرہ سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی تشکیل و تعمیر صوفیاء کے ہاتھوں ہوئی۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے یہ نمونے یکجا کئے جائیں تو یہ سب ایک ہی زبان سے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔ اس کو مختلف ادوار میں مختلف نام دیتے گئے لیکن یہ سب دراصل ایک ہی زبان یعنی اردو کے قدیم ہی کے نمونے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے قدیم کے جتنے نمونے ملتے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر صوفیاء کے ملفوظات سے ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بول چال کی حد تک بلکہ تحریر و بیان کے سلسلے میں بھی اردو کو مقبول و مروج کرنے میں صوفیاء کرام کا حصہ ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی تحریریں اور کتابیں بھی زیادہ تر صوفیاء کرام کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں ادب و شعر کے نمونے بھی ملتے ہیں اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ اسی بنا پر پطیر الدین مدنی لکھتے ہیں۔

”اردو کی ادبی تشکیل صوفیوں کے ہاتھوں ہوئی اگرچہ مستقل تصانیف کا دور تو انہیں
صدی ہجری یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں گجرات و دکن کے نفوس قدسیہ

کی ادبی کاوشوں سے شروع ہوا لیکن ساٹویں صدی یعنی تیرھویں صدی عیسوی
 ہی میں اس زبان کا خمیر تیار ہو چکا تھا بلکہ بول چال کی منزل سے آگے بڑھ کر اس نے
 ایوان ادب میں بھی جھکیاں دکھانا شروع کر دیا تھا۔

اردو زبان و ادب کی ترویج کے سلسلے میں صوفیائے کرام کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے سلیمان ندوی
 بھی اعتراف کرتے ہیں کہ

”اب تک اردو کی تاریخ میں اکبر اور شاہ جہاں اور ان کے مینا بازار اور اردو سے
 معنی کو اہمیت دی گئی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے کہیں زیادہ اہمیت صوفیوں کو
 حاصل ہے۔“

حافظ محمود شیرانی بھی کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ

”ہندوستان کے صوفی ہرزمنے میں ملکی زبان سے قریبی تعلق رکھتے تھے وہ بلا لحاظ
 مذہب و ملت عام مہجرات الناس کے مزاج و آداب تھے۔ اس لئے ملکی زبان
 سے واقفیت رکھنا ان کے لئے نہایت ضروری تھا۔ طبقہ صوفیاء کے متعلق یہ کہنا
 بے جا نہیں ہوگا کہ ان بزرگوں نے ارباب سیف و ظلم کے مقابلے میں ابتدا ہی سے
 اردو یا ملکی زبان کی طرف بہت توجہ کی ہے اور اس زبان میں ادب کو روشناس
 کرنے والی درحقیقت یہی جماعت ہے۔“

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ محمود غزنوی کی آمد کے ساتھ ہی صوفیاء کرام اور بزرگ ہستیاں
 بزمِ غیر میں داخل ہوئیں اور مختلف علاقوں میں انہوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ بزمین
 مثنان کے صوفیاء کا فرداً فرداً ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کے ملفوظات، اقوال، ابیات، دوہڑوں
 جملوں اور شعروں کی تفصیلات ان کے حالات کے ذیل میں درج کی جا چکی ہیں۔ ان سے یہ پتہ

۱۔ بحوالہ اردو غزل دل تک، ص ۱۲، سلسلہ مطبوعات بزمِ اشاعت بمبئی، بار اول

۲۔ بحوالہ انقرش سلیمانی، ص ۳۹

۳۔ بحوالہ مقالات حافظ محمود شیرانی، (جلد اول) مرتبہ مظہر محمود شیرانی، ص ۱۳۳، مجلس ترقی اردو

لاہور، طبع اول، جنوری ۱۹۶۶ء۔

چلتے ہیں کہ اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا ابتدائی کام بھی انہیں صوفیائے کرام کے ہاتھوں شروع ہوا کیونکہ اہل علم اور اہل دانش تو اس زبان کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھتے تھے وہ تو فارسی زبان کو اظہار اور ترسیل کا ذریعہ بنا تے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کیمطابق ”ہندی یا اس لومولود زبان میں لکھنا اہل علم اپنے لئے باعث عار سمجھتے تھے اور وہ اپنی عالمانہ تصانیف کو اس حقیر اور بازاری زبان کے استعمال سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ صوفی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے جرات کی اور اس کفر کو توڑا۔ یہ صوفیوں ہی کی جرات کا فیض تھا کہ ان کی دیکھا دوسرے لوگوں نے بھی جو پہلے ہچکچاتے تھے۔ ان کا استعمال شعر و سخن، مذہب و تعلیم اور علم و حکمت کے اغراض کے لئے شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔“

ہم یہ نہیں کہتے کہ اردو کے ان محسن نے شعوری طور پر یا کسی تحریک کے ذریعے اردو زبان و ادب کو ترقی دی یا اس کو پھیلانے کی شعوری کوششیں کیں یا ان کا مقصد زبان و ادب کی خدمت تھا۔ نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد تبلیغ دین اور اشاعت اسلام اور رشد و ہدایت تھا لیکن انہوں نے جس زبان کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا وہ ابتدائی اور قدیم اردو تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ذریعہ ان کی لاشعوری کوششوں کی بنا پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق

”یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس کی زبان کی ترقی نہ تھا۔ نہ اس کا انہیں کچھ خیال تھا۔ ان کی غایت ہدایت تھی لیکن اس ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے نئے اضلاع اور اصلاحیں ہوتی گئیں۔۔۔۔۔ جس سے اس کے ادب میں نئی نشان پیدا ہو گئی۔ گویا یہ ایک بھولی بھری داستان ہے لیکن اردو زبان کا مورخ ان کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔“

۱- بحوالہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام“ از مولوی ڈاکٹر عبدالحق، ص ۸۰

۲- ایضاً ص ۸۱

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت، تہذیب و ثقافت کی ترویج، مساوات اور اخوت کی تلقین اور روحانیت و اخلاق کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے ارتقار کے سلسلے میں بھی صوفیائے کرام کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ معین الدین دردانی کا یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ

”اردو زبان کے اصل خالق ہمارے صوفیاء کرام ہیں جو اسلام کی تبلیغ اور روحانی سرچشموں سے عالم کو فیض یاب کرنے کے لئے ہمہ دم مصروف اور سرگردان رہتے تھے۔ وہ گاؤں گاؤں پھر کر خدا کے بندوں کو اخلاق و مذہب کی باتیں بتاتے ان کے دل سے برائیوں اور جہالت کی کثافتوں کو دور کرنے میں منہمک رہتے تھے وہ جس جگہ جاتے اور جن لوگوں سے ملتے ان سے ان ہی کی بولیوں میں اخلاق و مذہب کی باتوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ یہ عمل صدیوں تک ہوتا رہا اور اب وہی اردو کے قدیم نمونوں کی شکل میں ہمیں دستیاب ہیں۔“

(۶) ملتان کے صوفیاء... تہذیب اور زبان و ادب پر ان کے اثرات

گفتگو کے عمومی رنگ سے ہٹ کر محض خصوصیت کے ساتھ کسی ایک علاقے یا ایک خطے میں تہذیب و زبان کے ارتقار کی بات کی جاتے تب بھی صوفیاء کی خدمات اور ان کے کردار کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ملتان کی معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی و ادبی زندگی میں صوفیاء کرام کو جو دخل رہا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ حضرت شاہ یوسف گردین نے ایک طرف تو لوگوں میں کھوتے ہوئے انسانی وقار کو بحال کیا، ان سے ان کی زبان میں گفتگو کر کے ان کی مقامی زبان (ہندی) کو تقویت بخشی تو دوسری طرف ملتان میں کتب خانے کی بنیاد رکھ کر پہلی مرتبہ ملتان کو علمی خزانے کی اہمیت سے آشنا کیا ان کے پھر کئی تعمیر سے ملتان میں فن تعمیر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ خواجہ معین الدین اجمیری نے ۵ سال ملتان میں رہ کر تصوف کو عوامی تحریک کی صورت دی۔ لوگوں میں ایک فکری انقلاب

صوفیائے بہار اور اردو، از معین الدین دردانی، ص ۳۱، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۷۲ء

یا حُسن و جمال وہ سب وجود واحد کا پر تو ہیں۔ اس کو در بانی کے انداز جس نے سکھائے
ہیں وہ بھی وہی ذاتِ بے ہمتا ہے۔ اس لئے جب حُسن محبوب کے حُسن کی تعریف کرتے
ہیں تو دراصل اس مصوّر کو خراج تحسین ادا کر رہے ہوتے ہیں جس نے اس تصویر کا خاکہ
تیار کیا، اس میں رنگ بھرے اور نقش و نگا بنائے۔ چنانچہ حُسن فرماتے ہیں

اے صنم کیسے مصوّر نے بنایا ہے تجھے
شیوہ ناز و ادا کس نے سکھایا ہے تجھے
جان و دل تیرے معلم پہ کر دوں قربان میں
در بانی کا سبق کیسا پڑھایا ہے تجھے
(ص ۱۱)

جہاں عاشق صادق کے پاس سب سے بڑی متاع اس کا محبت بھرا دل ہے وہاں محبوب
کے پیکر جمال میں حسین ترین چیز اس کی آنکھیں ہیں اور عشق کا مرکز یہی دو رئیس الاعضا ہیں
کسی شاعر نے کہا

بے واسطہ گوش و لب از راہ چشم و دل
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم
حضرت حسن کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے نگاہوں کے حسن کا بیان کیا گیا ہے
اُردو غزل میں بھی انہوں نے اس جادو کا تذکرہ ڈوب کر کیا ہے بلکہ ایک پوری غزل
جس کو غزل مربوط کہنا چاہیے۔ "نینوں" کی تعریف میں کہی ہے اور ان نینوں کے مختلف
اثرات اور اوصاف کی تشریح کی ہے۔ اس غزل میں اُردو ہندی کا مخلوط ڈکشن عجب لطف
پیدا کرتا ہے۔

نین سوں جب نین میں پیارے کیا کیا کرتے ہیں رنج ادا
نین کی گت نین پچھانیں بن نین کے کہو نہ جا
نین پیارے مین عیارے رنگ بھرے اور روپ سواکے
ہتھیارے مدارے کائے کیا کہئے کچھ کہا نہ جا
نین سوالی نین جوانی نین گلابی نین شرابی
یہی جگت مون کرن خرابی بہر و پی کا بھیس بنا

نین فرنگی نین پلنگی نین دورنگی نین ترنگی

گانن نین بہادر جنگی سب کو لیوں رکھو رجا (۴)

اس دیوان متفرق میں دو مرثیے بھی شامل ہیں۔ جن میں سے ایک گیارہ اشعار پر مشتمل ہے اور دوسرا تیس اشعار پر۔ گیارہ اشعار پر مشتمل پہلا مرثیہ جو ص ۱۴ اور ۱۵ پر درج ہے غزل کی ہیئت میں ہے۔ جس میں ستم، قلم، بھسم، شکم، عجم، عجم، قدم، خم، الم، گرم، رقم وغیرہ کا قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ مرثیہ نہایت رواں، سادہ، لیکن تمام فنی محاسن کا حاصل ہے۔ اگرچہ اس کی ہیئت مرثیے جیسی نہیں ہے کہ جس میں چہرہ، رخصتی، جزا، تعریف، شہادت اور بین وغیرہ کا التزام کیا جاتا ہے لیکن اس غزل نما مرثیے میں بلا کی تاثیر موجود ہے۔ شدت جذبات، مرقع نگاری اور الفاظ کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ چند اشعار

ملاحظہ فرمائیے

مری بندگی اسے جا کہو جس پہ شامیوں نے ستم کیا

قلم قضا کوئی بہ گئی شدہ دیں کے سر کو قلم کیا

کبھی آہ سرد کا زور ہے کبھی نالے گرم کا شور ہے

مرے دل سے ایسی اگن اٹھی کہ جلا جلا کے بھسم کیا

دیکھو کیسی امت بے وفا کہ جو شاہزادے حسین کو

کیا اس طرح سے جلا وطن کہ عرب سے رو یہ عجم کیا

کیسی خیرہ چشمی ہے دیکھو کہ صغیر تشنہ دہن کے تئیں

نہ دیا جو قطرہ آب کا نہ تو ایک ذرہ رحم کیا

حن شکستہ وجود کو نہیں کچھ کھتسل درد کا

یو نہی دل کی بے صبری سے یہ دوسرے حرف غم کا رقم کیا (۱۴-۱۵)

دوسرا مرثیہ تریح بند کی ہیئت میں ہے۔ یعنی ہر بند میں چار مصرعے ہیں۔ پہلے بند کے

چاروں مصرعے ہم قافیہ ہم ردیف ہیں۔ قافیہ بلا، عبا، وفا، روا کا ہے جبکہ ردیف ہائے

ہا ہے۔ اس کے بعد ہر بند کے پہلے تین مصرعے مختلف قافیے کے حامل ہیں اور آخری مصرعہ

ٹپ کا ہے جس میں ردیف ہائے ہا اور قافیہ اسی طرح یعنی جفا، خدا، بپا، دعا، بلا، بے لہا

جدا، مبتلا، ماجرہ وغیرہ آیا ہے۔ اسی طرح پورے مرثیے کے پندرہ بند ہیں اور پندرہ بندوں میں تیس اشعار ہیں۔ پہلے مرثیے کی نسبت یہ مرثیہ فنی لحاظ سے زیادہ سچتہ اور جہارت کا نمونہ ہے۔ اس میں خالصتاً اُردو ڈکشن کا استعمال ہے۔ سادگی کے ساتھ حسن بھی ہے۔ چھوٹی بحر ہے لیکن پُر اثر اور شدت احساس کی حامل۔ مرثیے میں اہل بیت پر کوفیوں اور شامیوں کے ظلم و ستم پر اظہارِ افسوس ہے اور مظلومین کرب و بلا کی بے بسی اور بے چارگی کا بیان جذبات کی شدت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ واقعہ تاریخِ اسلام ہی میں نہیں تاریخِ عالم میں بھی ایک ایسے عظیم ایسے کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مثال ایشیا و قربانی اور خیر و شر کی کسی آویزش کی کسی داستان میں نہیں ملتی۔ اسی لئے حسن فرماتے ہیں

ہیں اسی عبادت میں سب جن و ملک

آدم و حوا سے لے کر اب تک

یہ ستم کس نے کیا ہے اے فلک

کچھ تجھے ترس خدا ہے ہائے ہا (ص ۱۶)

حضرت حسین کی پیاس کا ذکر کرتے ہوئے حضور اکرمؐ سے ان کی مدد کے لئے التماس کیا ہے

یا رسول اللہ قدم رنجہ کرو

حال فرزندوں کا دیکھو رُو برو

ہاتھ سے اپنے ذرا پانی دے دو

شاہ بہت پیاسا پڑا ہے ہائے ہا (ص ۱۷)

شامیوں کی سگ دلی اور بے مروتی کا بیان کس سادہ لیکن پُر اثر انداز میں کیا ہے۔

شامیوں کے دل نہیں ہوتا ہے نرم

دل سے رحمت اٹھ گئی آنکھوں سے شرم

موت کا بازار ہے اب سخت گرم

قتل کا عشرِ پیا ہے ہائے ہا (ص ۱۸)

حضرت حسین کے مرتبے کا احساس کرتے ہوئے ان کی شہادت کا ذکر کس غم انگیز انداز میں کیا ہے

دودھ سے پالا جسے خیر النساء

جس کی زلفوں سے کو علی شانہ کیا
 جس کو پیغمبر جگر گوشہ کہا
 آج پانی منہ پڑا ہے ہائے ہا (ص ۱۸)

اسی طرح

جس کے تئیں کہتے ہیں سب اہل صفا
 قَدَّوْا لَعِيْنَ عَسَى الْمُسْتَفْضَى
 اب تو جا کر دیکھیو رخصے میں پڑا

شامیوں نے سرکٹا ہے ہائے ہا (ص ۱۹)
 آخری بند میں حسن اس حادثہ عظیم پر اپنے دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

اے حسن اس درد کا میں کیا کروں
 دل پگھلتا ہے جگر ہوتا ہے خوں
 نہیں مجھے کہنے کی طاقت کیا کہوں

سخت خونی ماجرا ہے ہائے ہا (ص ۲۰)

جیسا کہ پہلے درج کیا جا چکا ہے کہ اس دیوان متفرقات میں ایک اُردو نعت
 بھی ہے جس میں ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے۔ یعنی حضرت سعدی کی مشہور زمانہ نعت
 ”بلغ العلیٰ بکمالہ“ کی تضمین کی گئی ہے۔ ایک مصرع اُردو کا اپنا اور دوسرا مصرع شیخ
 سعدی کا لکایا ہے، یا
 آدھا مصرع اپنا اور آدھا شیخ سعدی کا استعمال
 کیا ہے۔ جیسے

سوہنی ڈھلک میرے پیار کی بلغ العلیٰ بکمالہ
 جگ مگ چمک رخسار کی کشف الدجا بکمالہ
 صاحب منزہ پاک ہے از عیب و ہر نقصان نیز
 افعال سب سوزنڑھیں لگن حنفت جمیع خصالہ
 صورت ضحیٰ وصف جیس وائل و صف مشک زلف
 حیران یوسف از حسن عیسیٰ نخل از تابہ

شمس القحی بدرالدجی لولاک وصف ذات او

یانور و توری سرسری مخبر است از حالہ (۹-۱۰)

جس طرح اُردو اشعار میں سرایتیگی، ہندی اور پنجابی الفاظ کا استعمال عام ہے اسی طرح سرایتیگی شعروں میں اُردو الفاظ و تراکیب بھی شامل ہیں۔ زبان کا یہ مخلوط تجربہ بڑے دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ آج پھر اس قسم کے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ جھنگ کے شاعر شیر افضل جعفری کے یہاں اس قسم کی مثالیں عام ہیں۔ غلام حسن شہید کے یہاں اُردو کا رنگ سرایتیگی اشعار میں بھی موجود ہے بلکہ کہیں کہیں غالب ہے۔ کچھ مثالیں دیکھئے

انما لے فی میرا دلبر رانجھا	رانجھا سارے جگ دا سا رانجھا
رانجھے دامینوں وطن پیارا	وحدت جس دی تخت ہزارا
رانجھا ناہیں مقید کس دا	جوتوں ڈیکھاں تتولے ڈسدا
عش اُتے حق پاک سدا	گھر چو چک دے چاک سدا
رانجھا میرا لامکانی	ناں کوئی اس دا نام نشانی
ہر جہاں مکان اسے دا	ہر ہر نام نشان اسے دا (۲۵)

ثبات قدم داکینویں عشق نقار مار یا اے
 کچلے دیاں نیناں بھنہ کے نیناں ناز دا شکر چاڑھی اے
 اسان توں بیا کیا گھنڈیں ظالم مویاں کوں کیں ماریا اے
 گانمنڑ جاں چاہ صدقے دین ایمان اسی داریا اے (۲۴)

ن ترانی ڈس کے جانی لک چھپ بھاتیاں پاندے ہو
 حسن جمال دکھا کر ماہی گانمن کوں ترساندے ہو (۵۴)

ہادی پیر جمال مجرا ہادی پیر جمال مجرا لیجو
 غوث حقانی قطب ربانی گنج شکرے لال مجرا لیجو (۵۵)

مطلق ذات رنجھٹے والی میگوں چھپ کے روپ دکھایا

یا لباس تعین والا جوگی بننے کے آیا

سر سواہ تے گل جپ مالارنگ بھجوت رمایا

گانمن بٹھ پئے کھڑے بہڑے میگوں راجھڑ رب ملایا (ص ۵۹)

نور مقدس اوس ہو یاد ج لباس بشر دے

جانی میڈے پر دے لکیا میں جانی دے پر دے

میڈی صورت ڈیکھ کے روندی لوک زیارت کر دے

گانمن نام دہرا کے ہو یا ظاہر دج نظر دے (ص ۶۲)

لوکالے کیتے چاک ہسین دا

میں لیکھے حق پاک نی اماں

چاک ہیں کوئی نور حقیقی سے

صورت شمس افلاک نی اماں

گل گلزار تے باغ بہشتی سے

چاک بناں خاشاک نی اماں (ص ۶۴)

ان مثالوں میں اُردو ذخیرہ الفاظ کی نشان دہی کرنے کی ضرورت نہیں اس میں جا بجا اُردو ڈکشن ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس ساری گفتگو کے بعد یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سرزمین ملتان کے صوفیاء میں سب سے پہلے حضرت غلام حسن شہید نے اُردو زبان میں باقاعدہ طور پر شاعری کی اور شعوری سطح پر اُردو اور مقامی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کو مخلوط کر کے اُردو زبان کی وسعت کا باعث بنے۔ اس طرح وہ روایت قائم ہوئی جس نے آگے چل کر اُردو زبان کے دامن کو دیگر پاکستانی زبانوں کے الفاظ سے پُر ثروت اور وسیع کیا۔

منشی غلام حسن شہید کے اردو شعر گوئی کے اس پہلے لیکن کامیاب تجربے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لسانی، ادبی، مذہبی روایات اور سوچ کے مشترکہ سرچشموں نے ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی تھی کہ "اردو" زبان نے یہاں پہنچتے ہی عوام الناس کے دلوں میں گھر کر لیا اور مقبولیت کا تاج سر پر رکھ لیا۔ چنانچہ غلام حسن شہید کے ابتدائی کارناموں کے چند ہی سال بعد اردو کی ترویج میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور یہ درس و تدریس کے ذریعے کے طور پر مدارس میں رائج ہو گئی اور ادب و شعر کی زبان بن گئی۔

خواجہ غلام فرید

سرائیکی شاعری میں خواجہ غلام فرید کو وہی درجہ اور مرتبہ حاصل ہے جو عربی میں امراد القیس، فارسی میں حافظ اور رومی، انگریزی میں ورڈز ورثہ، کیٹس اور شیڈے، اردو میں خواجہ میر درد غالب، اقبال، بنگلہ میں نذر السلام، پنجابی میں شاہ حسین اور وارث شاہ، پشتو میں رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک اور سندھی میں سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کو حاصل ہے جس طرح سرائیکی شعور اور ادب کی تاریخ خواجہ فرید کے ذکر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیانہ شاعری کی تاریخ بھی ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ سرائیکی کے یہ عظیم المرتبت شاعر برصغیر پاک و ہند کی ایک نہایت اہم روحانی شخصیت بھی ہیں جن کے سرمایہ علم و ادب میں سرائیکی کے علاوہ پنجابی، اردو شاعری، اخلاق مذہب، رشد و ہدایت اور صوفیانہ مسک کے بارے میں ملفوظات کا قابل قدر خزانہ موجود ہے۔

سرائیکی اور اردو کے اس مشہور صوفی شاعر کے آباؤ اجداد کئی سو سال پہلے عرب سے آئے تھے۔ مالک بن یحییٰ اس خاندان کے وہ بزرگ تھے جو سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ مقابیس المجالس کے مطابق مالک بن یحییٰ کا نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ لیکن "مقابیس مجربہ" میں لکھا ہے کہ

"محب الہی قدس سرہ کا نام مبارک خواجہ خلد بخش ہے بن حضرت خواجہ احمد علی بن غوث
الغیرت شیخ حضرت خواجہ عاقل محمد بن حضرت خواجہ مخدوم شریف محمد بن حضرت مخدوم محمد یعقوب
بن حضرت مخدوم نور محمد بن مخدوم زکریا قوم قریشی از اولاد سید الکمل بعد الانبیاء حضرت

ص ۱۷۰۔ کپتان واحد بخش سیال نے "مقدمے" میں مالک بن یحییٰ کا سلسلہ نسب دیا ہے وہ اس طرح ہے، "مالک بن یحییٰ
بن محمد بن سلیمان بن ناصر بن عبداللہ بن امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ" بحوالہ "مقابیس المجالس حرم

کپتان واحد بخش سیال، ص ۴، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۷۹ء

ابابکر بن الصدیق معروف کور بجہ ہیں۔

گویا خود خواجہ فرید کے مطابق ان کا خاندان صدیقی ہے۔ نسلاً خواجہ فرید کور بجہ قوم سے بیان کیے جاتے ہیں اگرچہ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق عرب سے تھا کور بجہ سندھی کا لفظ ہے۔ دراصل سندھ میں آباد ہونے کے بعد ان کا خاندان کور بجہ کہلانے لگا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان کے ساتھ کور بجہ کیوں استعمال ہوا اس کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ

”جب اس خاندان کے بزرگوں نے حکومت کے عہدوں کو خیر باد کہہ کر سندھ میں مستقل حکومت اختیار کر لی تھی تو وہاں کی سرزمین سے لٹنے مانوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے سندھیوں کی طرز پر اپنی اولاد کے نام بھی مالک اور یحییٰ کے بجائے شیخ پریا، شیخ پنوں، شیخ کورا اور شیخ تار رکھ لئے تھے۔“

”مناقب فریدی“ کے مطابق

”کور بجہ اصل میں کوراجا“ تھا جو کورزا“ کا سندھی تلفظ ہے اور کورزا مرزا کی طرح ہے جس کے معنی ہیں اولاد کور“

۱۔ بحوالہ ”مناقب محبوبیہ“ تصنیف حضرت خواجہ غلام فرید مترجم شیخ احمد سعید چشتی، ص ۱۹، مطبوعہ انجمن فکر فرید کوٹ مٹھن، باراؤل، جنوری ۱۹۸۳ء۔

۲۔ بحوالہ خواجہ غلام فرید حیات و شاعری، از سعید حسن شہاب، ص ۲۹، ۳۰، مکتبہ جدید پریس لاہور مزید حوالے کے لئے دیکھئے (۱) ”دیوان فرید“ (اردو) مرتبہ صدیق طاہر، ص ۵۵، مکتبہ جدید پریس لاہور (۲) پیر فرید از ایس حمید اللہ شاہ، ص ۵۷، مطبوعہ ملج بکڈ پور لاہور، باراؤل راسد نظامی کی نظامی کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کیا گیا۔

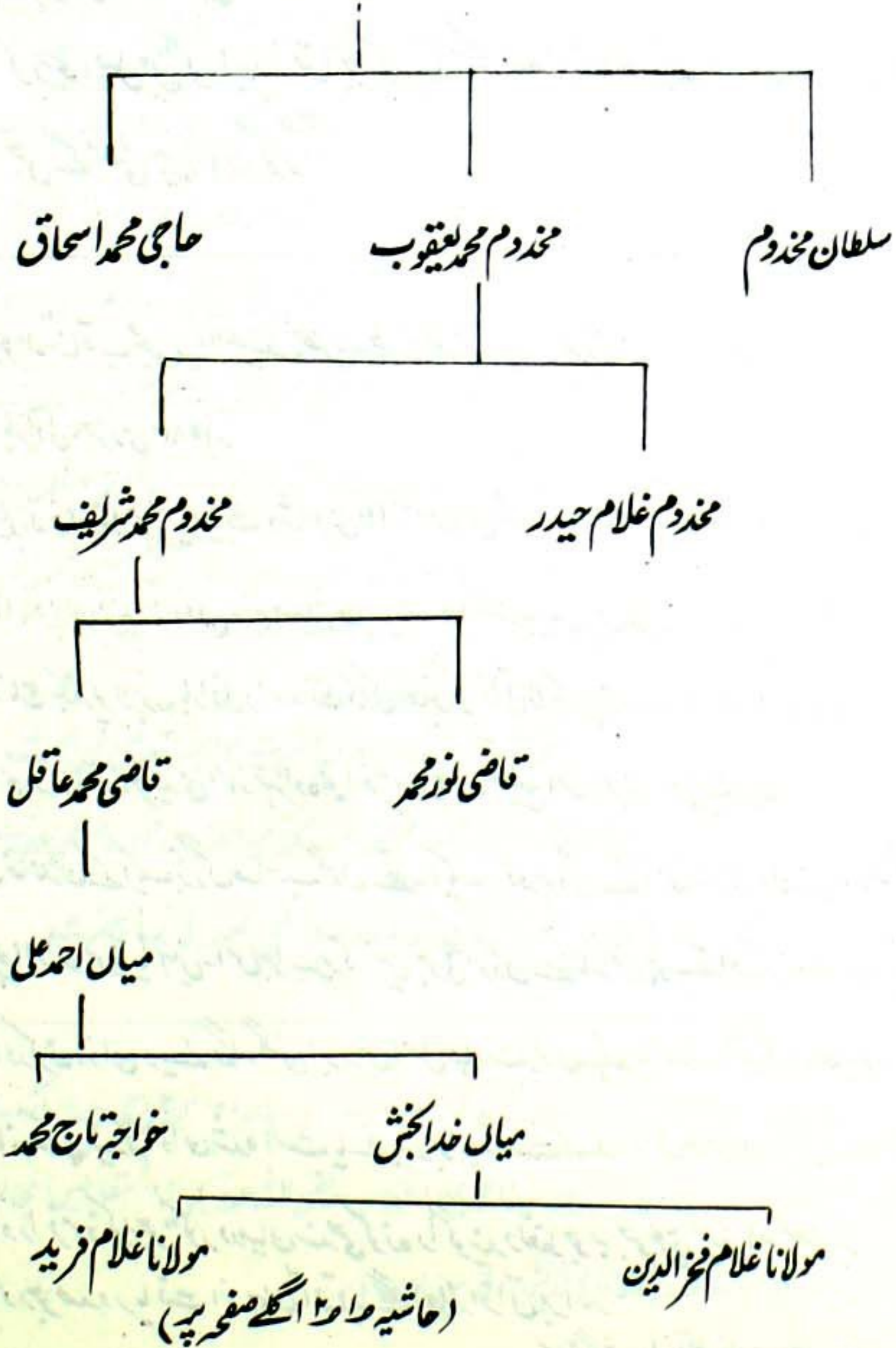
۳۔ بحوالہ ”مناقب فریدی“ از شہزادہ محمد اختر، ص ۴۶، مطبع احمد، دہلی روایت ہے۔

کہ اس خاندان کے ایک بزرگ صاحب کمال تھے۔ ایک دفعہ مؤذن نے اذان نودی دن زیادہ ہو گیا تو مسجد پہنچے کسی سے پوچھا اذان ہوتی یا نہیں۔ اس جواب پر کہ نہیں ہوتی مؤذن سے ناراض ہوئے اور کوزے سے کہا کور جو، (یعنی کوزہ بگو) اور کوزہ اذان دینے لگا، گلشن ابرار میں اصل عبارت یوں ہے: ”روز روشن گردیدہ بود سے یردر مسجد شریف آمدہ از کے پرسید کہ اذان شدہ است یانے بدر جواب گفت کہ نے ازاں یرمودن رنجش نمودہ و کوزہ کہ بر منبر افتادہ بود اورا فرمود کور جو“ کور در میان سندھی کوزہ را گویند و لفظ جو بہ جم عربی صیغہ امر یعنی بگو... چون از زبانش لفظ کور جو صدور یافت از ہماں آفتابہ گلے اچاڑ اذآں برآمد“

بحوالہ گلشن ابرار، علمی فارسی، ص ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳

چنانچہ آپ کے خاندان کے بزرگ کو راجہ کہلاتے تھے۔ شاہجہان کے عہد کے ایک بزرگ شاہ نور محمد کو راجہ کا ذکر ملتا ہے جنہیں شاہ جہان کے عہد میں حکومت کی طرف سے کچھ اراضی دی گئی جس کا ذکر "مناقب فریدی" میں اس طرح ہے۔

"مورخہ بست دینچم شہر ربیع الاول ۷ جلوس مطابق ۱۰۴۲ھ بدیں مضمون کہ دریں زمانہ فرمان سعادت نشان فرخندہ عنوان بعض ایک ہوازی بیخ ہزار بیگہ زمین قابل زراعت از پرگنہ منگلوت سرکار صوبہ دارالامان ملتان دروجہ مدد معاش بنام خادمان کرامت نشان پیرو شد طریقت ہادی راہ حقیقت را ہر راہ شریعت و معرفت، غواص بحر عرفان، زبدہ خداپرستان حضرت قبلہ میاں صاحب مخدوم نور محمد کو راجہ دام اللہ ظلہ و شرفہ معہ فرزند ان از ابتدائے فصل خریف بازگشت اری بہشت ۹۹۹ فصلی مقرر است۔" شاہ نور محمد کو راجہ سے سبب لقب آگے بڑھتا ہوا خواجہ فرید تک پہنچتا ہے نقشہ کے ذریعے اس کو بھی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔



جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ خواجہ فرید کے جد امجد یحییٰ بن مالک عرب لشکر کے ساتھ آئے اور پھر سندھ میں آباد ہو گئے ان کی اولاد گنتی سالوں تک سندھ میں رہی بعد میں انہی سے ایک بزرگ مخدوم زکریا سندھ سے ملتان کے نزدیک بستی منگلوٹ، آگے۔ کپتان واحد بخش سیال کے مطابق

” شیخ کوریا کے بیٹے شیخ حسین سندھ کے علاقہ ٹھٹھ میں حکومت وقت کی طرف سے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن انہوں نے آخر عمر میں ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کی۔ انکی بیعت سلسلہ عالیہ بہروردیہ میں تھی۔ شیخ حسین کے بیٹے مخدوم زکریا سندھ سے ترک سکونت کر کے ملتان کے قریب بستی منگلوٹ میں قیام پذیر ہوئے۔“

انہیں مخدوم زکریا کے بیٹے اور سجادہ نشین مخدوم نور محمد کو ترجمہ بڑے صاحب کمال صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے پوتے مخدوم محمد شریف منگلوٹ سے سیت پور کی بستی یاروالی میں قیام پذیر ہوئے۔ جہاں آپ کے ایک مرید نے آپ کے کہنے پر ایک شہر کوٹ مسٹن آباد کیا مشائخ چشت میں لکھا ہے کہ

” مخدوم محمد شریف صاحب، یاروالی میں آکر آباد ہوئے تو مسٹن خان بلوچ رئیس یاروالی آپ کا مرید و معتقد ہو گیا۔ ایک دن آپ کا گزر اس جگہ سے ہوا جہاں اب مسٹن کوٹ آباد ہے۔ دریا کے کنارہ پر یہ پرفضا مقام دیکھ کر آپ نے خان موصوف سے کہا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے اور وہ اللہ والوں کا مسکن ہو۔ خان نے اس جگہ شہر بسانا قبول کر لیا اور مخدوم سے گزارش کی کہ وہ خود اس مقام کو اپنا مستقر بنائیں اس طرح کوٹ مسٹن، وجود میں آیا۔“

کوٹ مسٹن شریف میں مخدوم محمد شریف اور ان کی اولاد بہت عرصہ تک قیام پذیر رہی۔ یہ لوگ اپنے فیوض و برکات اور علم و عمل سے کافی عرصہ تک لوگوں کو نوازتے رہے۔ مخدوم محمد شریف سے آگے ان کی اولاد میں مسند خلافت کا سلسلہ چلتا رہا اور وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام انجام دیتے رہے۔ مخدوم

۱- بحوالہ مناقب فریدی، ص ۴۷

۲- یہ شجرہ میں نے مختلف کتابوں کے حوالے سے خود تیار کیا ہے۔

۳- بحوالہ مقابیس المجالس، ص ۶۷

۴- بحوالہ تاریخ مشائخ چشت، ص ۵۷۹-۵۸۰

محمد شریف کے بعد ان کے فرزند قاضی محمد عاقل سید خلافت پر متمکن ہوئے وہ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ تھے آپ کی تعلیم و تربیت پر آپ کے والد نے خصوصی توجہ دی۔ آپ نے اپنے والد کے علاوہ شاہ فخر اور خواجہ نور محمد ہماروی سے بھی پڑھا۔ شاہ فخر سے آپ نے شرح عبدالحی اور سوار السبیل کا درس لیا تھا۔ آخری مرتبہ جب آپ کی ملاقات خواجہ فخر الدین سے ہوئی تو انہوں نے آپ کو چار کتابیں عنایت فرمائیں جن میں (۱) مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۲) کتاب مطول (۳) سوار السبیل (۴) ایک مجموعہ جس میں لوائح جامی اور اس کی شرح، قصیدہ نہریہ اور شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح وغیرہ شامل تھیں۔

خواجہ نور محمد ہماروی سے آپ اویح میں بیعت ہوئے۔ اور ان سے آپ نے حدیث کی سند لی شروع میں آپ لوگوں کو بیعت نہیں کرتے تھے لیکن بعد خواجہ ہماروی کے کہنے پر آپ نے لوگوں کو بیعت کرنا شروع کیا۔ تو ہزاروں عقیدت مند آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔^۱
خواجہ محمد عاقل نے علم حاصل کرنے کے بعد کوٹ مٹھن شریف میں مدرسہ قائم کیا جہاں بڑے بڑے عالم درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ خود خواجہ صاحب بھی سو سے زیادہ طلباء کو درس دیا کرتے۔ صاحب تکملہ سیرالاولیاء کے مطابق

درس و تدریس سے آپ کو (خواجہ محمد عاقل) خاص دلچسپی تھی تدریس کے لئے آپ نے متبحر عالم مقرر کر رکھے تھے جو طلباء تعلیم پاتے تھے ان کا وظیفہ مقرر تھا۔ اور انہیں کھانا لنگر سے دیا جاتا تھا۔ جب آپ کوٹ مٹھن سے شیدانی منتقل ہوئے تو دونوں جگہ علیحدہ علیحدہ مدرسے قائم رہے اور لنگر بھی دونوں جگہ جاری رکھا۔ طلباء کو ایک دو سبب خود بھی پڑھاتے تھے۔ جن کتابوں میں سے آپ کا درس سننے کا اتفاق قائم کوہرا ان میں شرح ہدایہ، حکمت میر ہاشم، شرح عقائد، خیالی مولوی بر خیالی، مطول و تلویح و توضیح، شیخ الاسلام نور محمد مدنی بر مقدمات اربع و شرح و فایہ مع حواشی و ہدایہ و شرح موا

۱۔ بحوالہ مناقب المجاہدین، ص ۱۲۹

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "مشائخ چشت" از خلیق احمد نظامی، ص ۵۸۲

۳۔ ایضاً ص ۵۸۶

معہ مولوی وزواہد ثلاثہ - حدیث شریف میں مشکوٰۃ اور احیاء العلوم و بعض صحیح بخاری
اور تصوف میں لوائح و شرح قصیدہ فارسیہ حمزید و سوار السبیل و تسنیم و نفوس الحکم
کتاب حدیث اور تصوف میں راقم یا تو سامع ہوتا یا قاریؑ

آپ نے ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے میاں احمد علی سجاد
نشین ہوئے جو بڑے عالم و فاضل تھے اور علم جفر میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ آپ بھی خواجہ نور محمد
ہمدانی سے بیعت تھے۔ میاں احمد علی بہت سادہ طبیعت کے مالک تھے اور ہر عام خاص کے
ساتھ اچھی طرح پیش آتے آپ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور والد کی وفات کے ایک سال ایک ماہ
اور چند دن کے بعد یعنی ۹ شعبان ۱۲۳۱ھ کو وفات پا گئے۔

خواجہ احمد علی کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے خواجہ خدابخش مسند نشین ہوئے آپ نے اپنے
دادا خواجہ محمد عاقل سے خلافت حاصل کی تھی۔ آپ نے اپنے باپ دادا کے مشن کو اسی طرح جاری
رکھا۔ مدرسہ اور ننگر ویسے ہی جاری رہا۔ بلکہ آپ نے ایک دو خانے کا بھی اہتمام کر رکھا تھا۔
مشائخ چشت میں لکھا ہے کہ

”بیاردوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک طبیب ملازم تھا۔ دو خانہ کا پورا اہتمام تھا،

خود مریضوں کی دیکھ بھال اور عیادت فرمایا کرتے تھے“

آپ کے آستانے پر لوگوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا آپ کے ننگر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
”ان کا ننگر اتنا وسیع تھا کہ صرف مہانوں کے گھوڑوں کے لئے بارہ من غلہ روزانہ آتا تھا“

خواجہ خدابخش کافی عرصہ تک کوٹ مٹھن شریف میں قیام فرماتے رہے۔ بعد ازاں سکھوں کے مظالم سے تنگ
آکر سابق ریاست بہاولپور کی تحصیل خان پور میں چاچڑاں کی طرف ہجرت کر گئے اور وہاں مستقل
سکونت اختیار کی۔ چاچڑاں کی طرف ہجرت اور وہاں قیام کے سلسلے میں نواب بہاولپور صادق محمد

۱۔ بحوالہ ”تکملمیر الادلایار“ از خواجہ گل محمد احمد پوری، مترجم معود حسن شہاب، ص ۱۶۲ مکتبہ الہام

بہاولپور، ۱۹۷۸ء

۲۔ بحوالہ ”مشائخ چشت“، از خلیق احمد نظامی، ص ۵۹۳

۳۔ بحوالہ ”خواجہ غلام فرید۔ حیات و شاعری“، از معود حسن شہاب، ص ۳۲

خان کی خواہش بھی شامل تھی۔

چاچرٹاں شریف میں ہی مخدوم خدا بخش کے ہاں اس صوفی شاعر نے منگل ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کو جنم لیا۔ خواجہ غلام فرید سے کسی نے آپ کی تاریخ ولادت دریافت کی تو آپ نے فرمایا ”میری ولادت روز سہ شنبہ ماہ ذی الحجہ کے آخری عشرہ اور ماہ پلو کے پہلے عشرہ میں عت مشتری میں قبل طلوع آفتاب ہوئی۔“

آپ کا تاریخی نام خورشید عالم رکھا گیا۔ لیکن بعد میں فرید الدین گنج شکر کے نام پر آپ کا نام غلام فرید رکھا گیا۔ خود خواجہ فرید فرماتے ہیں کہ

”جب میں پیدا ہوا تو حضرت محبوب الہی نے مشورہ کیا کہ اس بچے کا نام کیا رکھنا چاہیے اس پر میاں جنبد و خادم نے دست بستہ عرض کی کہ حضور حضرت شیوخ العالم گنج شکر بھی سہ شنبہ کے دن پیدا ہوئے تھے پس ان کا نام ”غلام فرید“ رکھا جائے تو بہتر ہو گا اس سے حضرت محبوب الہی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ اچھا نام ہے اس کے بعد فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی سہ شنبہ کے دن پیدا ہوئے تھے۔“

ص ۱- بحوالہ ”مقابیس المجالس“ حصہ چہارم، ص ۲۰۴ مترجم کپتان واحد بخش سیال، تاریخ ولادت کے سلسلے میں مزید حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) مقدمہ ”دیوان فرید“ از علامہ نسیم طاہر، مرتبہ مولانا عزیز الرحمن، ص ۲ (۲) سر ایسی شاعری از کیفی جاپوری، ص ۲۶۵، مطبوعہ سید ایکٹرک پریس ملتان ۱۹۶۹ء (۳) ”دیوان غلام فرید“ مرتبہ نواز احمد فریدی، ص ۲۳، ان سب نے ”مقابیس المجالس“ کے حوالے سے اس تاریخ پیدائش کو مستند مانا ہے کیونکہ مولانا رکن الدین مرتب ”مقابیس المجالس“ کا خواجہ غلام فرید کے ہاں آنا جانا تھا جبکہ خواجہ فرید کے کئی سوانح نگاروں نے ۲۶ ذی الحجہ کی بجائے ۲۶ ذی القعدہ ۱۲۶۱ھ خواجہ صاحب کی تاریخ ولادت لکھی ہے ان میں (۱) دیوان خواجہ غلام فرید (اردو) مرتبہ صدیق طاہر، ص ۱۸ (۲) پنجابی ادب دی کہانی از عبدالغفور قریشی، ص ۳۸ (۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر از شفیع عقیل، ص ۱۵۶، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، اشاعت اول ۱۹۷۰ء (۴) گوہر شب چراغ از محمد انور فیروز، ص ۳، مطبوعہ کپور آسٹ پرنٹنگ ورکس لاہور، بار اول ۱۹۱۹ء (۵) پنجابی ادب کی مختصر تاریخ از احمد حسین قریشی، ص ۱۰۰ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے خواجہ فرید کی تاریخ پیدائش ۱۸۴۶ء لکھی ہے (ملاحظہ فرمائیے ”پریت ہمار“ ص ۲۸)

خواجہ فرید کی ولادت پر مختلف شعرا نے تصانیف لکھی کہ آپ کے والد گرامی کو پیش کئے صدیق طہار
نے خان بیہ کے مولانا محمد عثمان کے تین اشعار ہفت اقطاب کے حوالے سے لکھے ہیں

شکر للہ کہ گوہر والا

از خدا بخش شد غلام فرید

دوش بر گوش من سر دوش خروش

منظم داد عقد مر و اید

طول اللہ عمرہ، طسراً

جعلہ اللہ کافرید نقیداً

مسعود حسن شہاب نے مناقب فریدی کے حوالے سے ایک تصنیف کا یہ مطلع درج کیا ہے۔

زہے گوہر خاندان فرید

درے یا ہے قدر و عمرش مزید^۲

خواجہ فرید چار برس کے تھے تو والدہ فوت ہو گئیں آٹھ برس کی عمر میں والد ذوات پلگئے۔ آپ
کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا ذمہ آپ کے بڑے بھائی خواجہ فخر الدین نے اٹھایا۔ والد کی وفات
کے وقت جبکہ خواجہ فرید کی عمر آٹھ سال تھی ان کے بھائی خواجہ فخر الدین ۳۵ سال کے ہوئے تھے۔
حضرت خواجہ فخر الدین ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور تعلیم اپنے والد ماجد خواجہ خدا بخش سے حاصل کی
”مقابیس المجالس“ حصہ پنجم (خطی) میں لکھا ہے۔

۱- حوالہ کے لئے دیکھئے۔

(۱) دیوان خواجہ غلام فرید (اردو) مرتب صدیق طاہر ص ۱۸

(۲) خواجہ غلام فرید - حیات و شاعری از مسعود حسن شہاب ص ۳۵

۳- ”خواجہ غلام فرید - حیات و شاعری“ از مسعود حسن شہاب، ص ۳۵۔

۴- اشارات فریدی (فارسی) حصہ دوم ص ۷۱، مطبوعہ مطبع مفید عام اگرہ ۱۳۲۱ھ کے مطابق ”تفتیکہ حضرت“

محبوب الہی ذوات یافتند حضرت صاحب الوصال سی و پنج ۳۵ سالہ بوزند و من ہشت سالہ لودم ۸

مولانا غلام فخر الدین اودھوی جیوازدالد ماجد خود در قلیل عرصہ قرآن کریم و کریمیا، نام
حق، پند نامہ، تحفہ نصائح، گلستان، بوستان، بہار دانش، الزار ہنسی سکندر نامہ بری
بحری، رسائل فقیر یہ، کشف المحجوب عوارف المعارف و کتب عربیہ درسیہ، صرف
ونحو، منطق، اصول، معانی، ادب تفسیر و احادیث، فقہ و علم الکلام و کتب تصوف می
آموختند۔^۱

حصول علم کے بعد خواجہ فخر الدین نے اپنی زندگی درس و تدریس اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر
دی تدریس کے سلسلے میں ان کی ساری عادتیں اپنے والد محترم جیسی تھیں سوائے اس کے کہ خواجہ
خدا بخش تو زیادہ تر مروجہ درسی کتابوں کی تعلیم دیتے تھے جبکہ حضرت فخر الدین اودھوی زیادہ تر احادیث
اور تفسیر کا درس دینا پسند کرتے تھے۔ مقابیس المجالس میں لکھا ہے۔

حضور خواجہ القائل اللہ تعالیٰ بقانہ فرمودند کہ عادات و عبادات و انضباط اوقات
آنحضرت صاحب الوصال مثل حضرت خواجہ محبوب الہی بودند صرف در چند اعمال
فرقے مے نمود۔ اول در وظیفہ درس طلبا کہ حضرت قبلہ محبوب الہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
جمع کتب متداولہ درسیہ را درس میداند و درس کا ایشان کتب و قواعد درسیہ کم و
کتب احادیث شریف مثل صحیح بخاری و مشکوٰۃ و غیر ہما و کتب فقہ و تفاسیر بکثرت
متداول بودند و سبق حدیث شریف فرض بودی۔^۲

اشارات فریدی ہی میں لکھا ہے کہ حضرت فخر الدین شاعری بھی کرتے تھے لیکن والد محترم کے
خوف سے چھپاتے تھے چنانچہ انہوں نے ان مشاہیر شعرا کے تخلص پر اپنا تخلص رکھا جن کے
نام تو بہت معروف تھے لیکن ان کے دیوان یہاں ناپید تھے۔ حضرت فخر الدین نے شیخ اودھوی
اصفہانی کے تخلص پر اپنا تخلص اودھوی رکھا۔ ایک بار جبکہ عرس کی ایک مجلس میں قوال فخر الدین کی
یہ غزل گارہے تھے

شعلہ عشقت چو آتش دل ما سوختہ

زد علم بیرون زد دل کون و مکان را سوختہ

۱۔ مقابیس المجالس، فارسی (تلمی) حصہ پنجم، ص ۱۰۶ (یہ نسخہ جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے حاصل ہوا)

۲۔ بحوالہ اشارات فریدی، حصہ دوم، ص ۷۲

تو آپ کے والد حضرت قبلہ محبوب الہی خواجہ خدابخش نے ان سے دریافت کیا کہ یہ غزل کس کی ہے۔ چونکہ حضرت فخر الدین نے قوالوں کو نام بتانے سے منع کر رکھا تھا اس لئے انہوں نے اوحدی اصفہانی کا نام بتایا اس پر حضرت نے فرمایا

”بیشک کلام شیخ کامل است و من در حق خود دعائے برکت دانستم“

ظاہر ہے کہ اس خراج تحسین کے سزاوار دراصل حضرت فخر الدین تھے کیونکہ یہ غزل شیخ اوحدی اصفہانی کی نہیں فخر الدین اوحدی کی تھی۔ اوحدی کا دیوان بہت عرصے تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس لئے اس کے بہت سے تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نایاب ہے۔ لیکن اسد نظامی نے مکتبہ الجبال جہانیاں منڈی کے زیر اہتمام اسے ”دیوان اوحدی“ کے نام سے شائع کیا ہے یہ دیوان فارسی میں ہے اور کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت فخر الدین اوحدی کو شعر گوئی پر دسترس حاصل تھی۔ حقیقت اور مجاز دونوں قسم کے موضوعات ان کے کلام میں موجود ہیں فارسی زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل تھی مثلاً یہ اشعار دیکھئے، جملہ محاسن شعری ان میں بدرجہ اتم پائے جلتے ہیں

ای حسن جہاںسوز تو غارت گریاں ست
حیران جمال تو ہمہ پیر و جوان است
از زنگس متاپایان تو در شور و فغان اند
گر ساقی دگر ساغر و گریہ مرغیاں است

(دیوان اوحدی، ص ۲۸)

نقاب زلف چو از رخ کشود عالم سوخت
چو برق عشق درخشید جان آدم سوخت
فغان ز زنگس مغمور و فتنہ انگیزت
کہ یک کرشمہ اورخت شادی و غم سوخت
چو شعلہ ز جمال تو در بہشت افتاد
گل و صنوبر و سنبل میان شبنم سوخت

(ص ۳۲)

حادثہ بحوالہ ”..... ایفا“ ص ۵۵

ص ۱۱۲ (۱) مقابیس المجالس، ص ۲۷ کے مطابق آپ کا دیوان موجود ہے یکس ملتا نہیں (۲) فقر فرید“ از محمد بشیر احمد، ص ۲۶، مطبوعہ نقوش پریس لاہور میں لکھا ہے کہ ان کا مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے اس میں نمونے کے طور پر ایک شعر دیا گیا ہے۔

ز سودائی سبب زلف تو من دیوانه خواهم شد
 نقاب زلف گر از روی آتشناک بکشائی
 چو زاهد دید چشم مست تو گفتا که من آخر
 ز افسوس و در چشم مست تو افسانه خواهم شد
 ز دیدارت ز خود و ز دو جهان بیگانه خواهم شد
 خراب از باده آل زگس متاسانه خواهم شد
 (ص ۵۶)

همه عالم شده حیران و مدہوش
 جمال شاہد و ساقیست آفت
 چو فیض حسن خود را عام کردند
 بمستی باده را بدنام کردند
 (ص ۵۷)

نه سردی چون قدر غلامتے تو در بوستان خورد
 نقاب زلف را دکن کہ از شوق جمال تو
 نه ماہی چون رخ زیبایتے تو بر آسمان خیزد
 فغان و ناله در ہر لحظہ از پیرد جوان خیزد
 (ص ۵۸)

با قدنا ز دلبرم چون بچمن خرام کرد
 امی بت سردنا ز ملی کافر چشم مست تو
 سرد بیاش سجدہ ہا از پی احترام کرد
 جو روحنا بمسلمان از چہ علی الدوام کرد
 (ص ۶۷)

ز رویت بر کمن زلف و دوتا را
 کنوں این پردہ پوشیدن چہ باشد
 فغان زیر زگس جاد و فریبیت
 پو تاثیرست یارب آل جمال دلبرما
 فغان زیر زگس مخمور و خواب آلودنت جانا
 بمشتاقان نما حسن دل آرا
 ز حسنت ہر طرف افتاد غوغا
 رلودہ دل ز مشتاقان بے بغیا (ص ۶۸)
 ہر آنکو بکنظر پیشد شود آشفتمہ و شیدا
 کہ بایک غمزہ دیران میکند صد خانہ دہا
 (ص ۱۳)

میگن پردہ زلفت کنوں بر عارض رنگین
 چہ افتاد است از حسنت نگار ہر طرف غوغا
 (ص ۱۴)

دلبر امر و قد جلوه گرا عشوہ نما
 میگلن گاہ گذر در صف ما بہر خدا
 (ص ۱۵)

نسیم زلف اور مجھلت و ہمدردی نافرین / کد باغ غمزہ چشم غارت ملک دل و دین /
ہنہ کس می نماید چہرہ زیبائی خود چون گل / ندانم از چہ پوشد ز من آرزوی رنگین /
اگر چہ عالم افروزند خورشید و قمر لیکن

رخش شرمندہ سازد او حد آزاد ہم این (ص ۱۸)

بیا کہ آتش عشق تو سوخت جان مرا / خراب کرد فراق تو خانماں مرا
شدہ نالہ بھمن سنگلا، بچو موم و لے / چو شد کہ نیست اثر دردش فغاں مرا
گر لیت شمع فزون تر در انجمن از من / چو دید گریہ سپشماں خونفشاں مرا (ص ۲۰)
عشق ہر دم دردم نار دگر پیدا کند / تا کہ غیر خود بسوز خود در آسجا جا کند
درد عشق آن بت رعنا بجانم بس خوش است / تا کہ ہر دم لذت دیگر بدل پیدا کند
اودھی آن ز گس بدست سا ہر زمان / از برائے عاشقان مدفتنہ را بر یا کند (ص ۴۲)

حضرت خواجہ فرید کو اپنے بھائی کے ساتھ بے حد عقیدت، انس اور محبت تھی۔ مقابلیں المجالس میں جا بجا بھائی کا ذکر ملتا ہے ان کے علاوہ ان کے کلام سے بھی فخر الدین اودھی سے عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے اردو دیوان مرتبہ صدیقی طاہر سے چند مثالیں دیکھئے

میں ہوں سگ آستانہ فخر جہاں کا / شیروں سے فوق مرتبہ ہے میری شان کا

(ص ۳۰)

بیان کس طرح ہو گا مجھ سے شان فخر عالم کا / کہ بعد از انبیاء مدہ فخر ہے اولاد آدم کا

(ص ۴۴)

فخر یہ کہ میں فخر دو جہاں کا ہوں غلام / اور نہ تنگ سے مطلب ہے نہیں نام سے کام

(ص ۵۲)

فخر الدین سے عقیدت و محبت کا اظہار صرف اردو کلام میں ہی نہیں ہے بلکہ سرائیکی شاعری میں بھی جا بجا ملتا ہے چند مثالیں یہ ہیں

فخر جہاں قبول کیتو سے / واقف کل اسرار تھیو سے

ہر جا لور جمال ڈھٹو سے / مخفی راز تھے اظہار

فخر جہاں ہک ریت سمجھاتی / ارضی تھیبا یک بار سمانی

ظلمت میں گئی نور و نور

چشماں فخر الدین مشعل دیا
گھول گتھساں میں فخر جہاں کہیں
فخر الدین مشعل دے شوقوں
حسن پرستی گھاٹ اسادی
رمز حقیقی جہات اسادی
اپنی ایک مشہور کافی

بٹن دلبر شکل جہاں آیا
ہر صورت عین عیاں آیا
میں خواجہ فرید نے انبیاء اور شہدا کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا وہاں بھی خواجہ فرید اپنے مرشد فخر
الدین کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں

کتھے حسن حسین شہید بنے
کتھے مرشد فخر جہاں آیا
جب خواجہ فرید کی عمر ساڑھے تین سال کی ہوتی تو آپ کے والد نے خواجہ تاج محمود سے جو
کہ آپ کے چچا تھے آپ کی رسم بسم اللہ خوانی کرائی۔ خواجہ غلام فرید بچپن سے ہی ذہین تھے چنانچہ
آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ مقابلہ مجالس کے مطابق
”مجھے قرآن حکیم میاں جی صدر الدین نے شروع کرایا لیکن ان کی وفات کے بعد میاں
جی محمد بخش نے ختم کرایا۔“

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد عربی اور فارسی تعلیم کے علاوہ درس نظامی کی تکمیل بھی کی۔ اسی

۱۱۔ آپ کی رسم بسم اللہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب آپ کے چچا خواجہ تاج محمود نے رسم ادا کرتے ہوئے کہا
”اکھ فرید الف“ آپ نے اسی طرح یہ الفاظ دہرائے کہ ”اکھ فرید الف“ چچا نے پھر وہی الفاظ دہرائے آپ نے
جب دوسری میسر مرتبہ بھی وہی الفاظ دہرائے تو خواجہ تاج محمود پر جد طاری ہو گیا اور وہ زانو پر ہاتھ مار کر خود
بھی وہی فقرہ دہرانے لگے۔ خواجہ بخش کے کہنے پر قوالوں نے یہ مصرع قوالی کی صورت میں پیش کرنا شروع کر دیا
حاضرین محفل پر کافی دیر رقت طاری رہی۔

۱۲۔ ”مقابلہ مجالس“ ص ۷۷

۱۳۔ بحوالہ ”پیر فرید“ ص ۱۲

دورانِ والی ریاست بہاولپور نواب صادق محمد خان آپ کے بھائی سے آپ کو لے کر تعلیم و تربیت کی غرض سے شاہی محل احمد پور شرقیہ لے گئے آپ کے ساتھ آپ کے ماموں ملک غلام محمد اور استاد مولانا قاتم الدین بھی گئے۔ شیکل نے ان کی مختلف علوم کی تحصیل کے متعلق بھی لکھا ہے

"He received his formal education from several teachers in the Holy Quran from Miyan Sadr-ud-Din and Miyan Muhammad Bakhsh Khoja in works of poetry from Maulavi Khwaja Hafiz, Miyan Ahmad Yar Khoja and Miyan Barkhurdar Muttaqi and in Arabic instructional books from Maulavi Qaim-ud-Din "1

سولہ سال کی عمر تک آپ تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ علامہ نسیم طاہر کا بیان ہے کہ "تھوڑے ہی عرصہ میں علوم دینیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ بچپن ہی سے مجاہدات ریاضات میں لگا دیئے گئے تھے۔ طلب علم اور مطالعہ کتب بھی اگرچہ ایک بہت بڑی ریاضت تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ اوراد و وظائف کا سلسلہ بھی جاری رہا" خواجہ فرید نے تیرہ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی خواجہ فخر الدین کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی محمد بشیر اختر لکھتے ہیں۔

"حضرت فرید رحمۃ اللہ علیہ جب علم ظاہری کی نعمتوں سے مالا مال ہو گئے مستور و نما

1- "The Teachings of Khwaja Farid" by C. Shackle, P-6,7 published by Bazme Saqafat, Multan in 1978.

کا وہ مادہ جو بچپن ہی سے آپ کے رگ پے میں سرایت کر چکا تھا بیک دم ابھرا اور آپ کو حضرت فخر جہاں علیہ رحمۃ جو آپ کے برادر کلاں بھی تھے سے بیعت ہونے کا شوق غالب ہوا۔ اس شوق نے بتیابی و بیقراری کی صورت اختیار کر لی۔ میاں نصیر بخش مہاروی و سردار امام بخش صاحب مہر والہ کے ذریعے استدعا سے بیعت کرائی گئی تو حضرت فخر جہاں علیہ رحمۃ نے شرف قبولیت فرما کر حضرت فرید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دست حق پرست پر بیعت فرمایا۔^۱

اس طرح آپ نے تمام ظاہری و باطنی علوم ان سے حاصل کئے علامہ طالوت کے مطابق "محبت کی گود میں آپ نے آنکھ کھولی اور محبت ہی کے گہوارے میں پرورش پائی بادۂ عرفان آپ کا مورد ثقی مال تھا اور حقیقت و ایقان شاہد حال۔ ابھی آپ سولہ سترہ سال ہی کے تھے کہ علوم ظاہریہ باطنیہ میں کمال حاصل ہو گیا۔^۲

بیعت ہونے کے بعد آپ نے مرشد سے تعلق کو عشق و محبت کی وارفتگیوں میں بدل دیا چنانچہ خود خواجہ صاحب کے کلام سے اس والہانہ عقیدت و محبت کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب خواجہ صاحب نے تعلیم مکمل کرنی تو خواجہ فخر الدین کے ساتھ مل کر علوم ظاہری و باطنی کی تدریس شروع کر دی۔ چنانچہ آپ کے یہاں علوم دینیہ کے شائقین کا دن رات ہجوم رہتا۔ آپ انہیں کتب حدیث، فقہ اور تصوف کا درس دیتے۔ آپ کو ہر موضوع اور مسئلے پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ کسی بھی موضوع پر کھنٹوں بغیر کسی تیاری کے بڑی فصیح و بلیغ گفتگو فرماتے "فقر فرید" کے مطابق

"معارف المعارف، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، سہ مراتب، تحفہ مرسلہ، لواح شریف، نصوص الحکم، جواہر جلالی، جامع العلوم، کشکول حکمی جیسی ادنیٰ کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتیں اور ان کے غوامض بیان کرتے وقت علمائے عہر کو دنگ کر دیتے۔"^۳

۱۔ فقر فرید، ص ۲۹

۲۔ مقدمہ دیوان فرید، مرتبہ عزیز الرحمن، ص ۲۲

۳۔ بحوالہ فقر فرید، از محمد بشیر اختر، ص ۲۸، نقوش پریس، لاہور

خواجه فرید تقریباً دس سال تک اپنے بھائی کی زندگی میں درس دیتے رہے جب آپ ستائیس سال کے ہوئے تو ۵ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ میں آپ کے بھائی کا انتقال ہو گیا چنانچہ مرشد کے انتقال کے بعد آپ مسند نشین ہوئے اس موقع پر نواب صادق محمد خان عباسی نے آپ کی دستاویزی کی رسم ادا کی۔ مسند نشینی سے پہلے ہی آپ اپنے تبحر علمی اور درس و تدریس کے باعث اس قدر شہرت حاصل کر چکے تھے کہ لوگ دھڑا دھڑا آکر بیعت کرنے لگے اور آپ کی درسگاہ میں شائقین علوم کا ہر وقت تانتا بندھا رہنے لگا۔ علامہ طالوت کے مطابق

”آپ کا آستانہ عالیہ جہاں ایک طرف طالبان علوم دینی کا مرجع تھا وہاں دوسری طرف تشنگان طریقت کے لئے سرچشمہ فیوض و برکات تھا۔ بے شمار مخلوق آپ کی ذات تقدس آیات سے اقتباس انوار کرتی رہی اور عوام و خواص آپ کی نظر شفقت اثر سے عشق و محبت حقیقی کے درس لیتے رہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں بندگان خدا حلقہ ارادت میں داخل ہو ہو کر آپ کے دست مبارک پر بیعت ہوتے رہے اور مہندہ سندھ کے عامۃ الناس کا رجوع آپ کے عتبہ عالیہ کی طرف ہو گیا۔“

نور احمد فریدی خواجه غلام فرید کے وقت میں مذہبی جوش و خروش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”حضرت خواجه عاقل محمد صاحب نے کوٹ شریف میں جس دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی اس وقت یہ پوری بہار پر تھا چاچڑاں اغواٹ واقطاب کا شہر تھا۔ اس کے ہر محل کے کونے اور ہر کوچے کے سرے پر کوئی نہ کوئی مسجد ضرور تھی۔ جس میں باجماعت نماز ادا ہوتی تھی۔ فرید محل کی مسجد میں علماء اور طلباء مل کر نماز پڑھتے تھے۔ جامع مسجد محبوبیہ، فخریہ مسجد، نازکی مسجد اور فریدیہ مسجد پانچوں وقت نمازیوں سے بھر جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور مسجد حضرت مولانا تاضی خان محمد صاحب کی تھی دوسری حسن شاہ سائیں کی تھی ان میں نماز کے وقت اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی ہر مسجد میں طلباء درس نظامی کے مطابق تعلیم پاتے تھے۔ ان سب کو فریدی نگر سے دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔ جامع مسجد کے ساتھ مدرسے کی عمارت

تھی جس میں مولانا اللہ رکھا صاحب پڑھاتے تھے۔،

خواجہ صاحب کی خدمت میں لوگ دور دور سے بیعت کرنے آتے جن میں دیار عرب اور دیگر ممالک بھی شامل ہیں اس طرح آپ کے سلسلہ نظامیہ چشتیہ میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی۔ آپ خاص طور پر غریب لوگوں کو جلدی بیعت سے سرفراز فرماتے جبکہ امیر لوگوں کو بیعت کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھتے تھے "فقر فرید" میں لکھا ہے

"نواب فیض خان مگسی والی علاقہ جہل اسی زمانہ میں باریاب خدمت ہو کر استعفاء سے بیعت کر تلہے مگر حضور انکار فرما دیتے ہیں آخر چند بار اصرار کے بعد وہ طے کرتا ہے کہ اگر حضور نے مجھے شرف بیعت نہ بخشا تو میں خود کشی کر لوں گا جب اس کی عقیدت اس حد کو پہنچ گئی تو پھر کہیں جا کر حضرت نے اسے بیعت سے سرفراز کیا۔ اس کے برعکس حضرت فرید علیہ رحمۃً غریبا طبقہ کو اپنے سلسلہ ارادت میں قبول فرما لیتے تھے۔"

مسنشین ہونے کے چار سال بعد (۱۲۹۲ھ میں) آپ نے زیارت بیعت اللہ شریف کا ارادہ کیا چنانچہ آپ ۲۱ شوال ۱۲۹۲ھ کو چاچراں سے سوا فزاد کے ہمراہ حج کی نیت سے بمبئی کے راستے روانہ ہوئے آپ کے سفر حج کی تفصیل جو سیٹھ عبید الرحمن نے نور احمد فریدی کو فراہم کی ہے وہ تاریخ دار اس طرح ہیں۔

(۱) ۲۱ شوال ۱۲۹۲ھ، حضرت ۸۰ رفیقوں کے ہمراہ چاچراں شریف سے روانہ ہوئے (۲) ۲۳، ۲۴ شوال دو یوم ملتان میں قیام رہا اور تمام اکابر اولیاء اللہ کے مزارات پر رفیقوں سمیت حاضری دی (۳) ۲۷ شوال لاہور پہنچے۔ نماز جمعہ داتا صاحب کی مسجد شریف میں ادا فرمائی (۴) یکم ذیقعدہ دہلی پہنچے۔ جامع مسجد میں قیام فرمایا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت محبوب الہی نظام الدین اولیاء اور دوسرے اولیاء اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے لئے مہرولی کی جانب تشریف لے گئے (۵) ۴ ذیقعدہ مہرولی سے دہلی واپس آگئے (۶) ۵ ذیقعدہ جے پور پہنچے وہاں سے اجمیر تشریف لے گئے۔ (۷) ۲ ذیقعدہ بمبئی پہنچے (۸) ۲۱ ذیقعدہ جہاز پر سوار ہوئے (۹) یکم ذی الحجہ جدہ پہنچے اور پھر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے (۱۰) ۲۱ ذی الحجہ تک قیام مکہ مکرمہ اور منیٰ و عرفات میں مناسک حج کی ادائیگی

ص: ۱۱۹-۱۲۰ "دیوان فرید" از نور احمد فریدی، ص: ۱۱۹-۱۲۰

ص: ۵۲ بحوالہ "فقر فرید" ص: ۵۲

۱۰۱، ۲۲ ذی الحجہ - مدینہ شریف کو روانہ ہوئے (۱۱)، ۵، محرم الحرام ۱۲۹۳ھ کو مدینہ طیبہ پہنچ کر حضرت
 بنی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارکہ پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔ (۱۲)، ۱۹ صفر المنظر
 جدہ سے وطن کو روانگی عمل میں آئی۔ (۱۳)، ۱۲ ربیع الاول کو چاچڑاں شریف واپس تشریف لے آئے
 حج کے موقع پر عام طور سے لوگ درود سلام اور عبادات میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ بہت
 سی چیزیں ان کے مشاہدے میں نہیں آتیں لیکن خواجہ صاحب کی حس مشاہدہ اس قدر تیز تھی کہ انہوں نے
 اس موقع پر بھی اس سے بھرپور کام لیا اور کعبہ مشہود کے اطراف و جوانب اور دیگر تفصیلات و جزیئات
 کا مشاہدہ بنظر عمیق کیا چنانچہ حرم کعبہ کے اکتالیس دروازوں کا مشاہدہ کر کے یہ انکشاف کیا کہ ہر دروازہ
 کسی نہ کسی شیخ اور صوفی کا مسکن رہا ہے۔ "مقابیس المجالس" میں لکھا ہے

"... فرمودند کہ ہر ایک مشائخ عظام ایک ایک مسکن دران مقرر است و براسطوانات

نام آں مشائخ کرام کہ آنجا ساکن بودہ اند نوشته شدہ است۔"

خواجہ فرید سیر و سیاحت کے بھی بے حد شوقین تھے۔ آپ نے کئی شہروں میں اولیاء اللہ کے مزارات
 پر حاضری دی اور کئی بزرگان دین سے ملاقات کی محمد انور فیروز کے مطابق

"آپ نے سات بار زیارت روضہ معلیٰ حضرت خواجہ بزرگ کا شرف حاصل کیا۔ تین
 بار میاں محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ احمد آبادی سے ملاقات کی۔ جو بڑی عمر کے درویش
 تھے اور خواجہ کمال الدین صاحب علامہ قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد سے تھے۔ علاوہ ان
 ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اور ہر ایک جگہ کے بزرگان دین سے ملے
 جملہ مزارات اولیاء اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت قطب الدین بختیار
 کاکلی و حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہم کی روحانیت سے
 ایسی طور پر فیضان حاصل کیا۔ سو آدمیوں کے ہمراہ حج بیت اللہ زیارت روضہ رسول
 اللہ سے مشرف ہوئے۔"

۱۔ ملاحظہ فرمائیے "دیوان فرید" مترجم و شارح نورا احمد فریدی، ص ۳۷، ۳۸، مطبوعہ قصر الادب، ملتان

۲۔ بحوالہ مقابیس المجالس، جلد سوم، ص ۵۴

۳۔ بحوالہ گوہر شب چراغ، از محمد انور فیروز، ص ۲۲-۲۳

خواجہ غلام فرید لکھنؤ بھی تشریف لے گئے تھے اور وہاں آپ نے مولوی عبدالحی اور سر سید احمد خان دونوں کو دیکھا تھا۔ "مقابیس المجالس" میں اس کا ذکر اس طرح ملتا ہے

"جب ہم (خواجہ فرید) لکھنؤ گئے تو دل میں خیال آیا کہ مولوی عبدالحی کو جو بڑے متبحر عالم تھے دیکھنا چاہیے جب ہم محلہ فرنگی محل پہنچے تو دیکھا کہ اپنے مکان میں سوتے ہیں۔ ہم نے بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی طرح دیکھ کر واپس آگئے تیس چالیس سال عمر کے جو ان معلوم ہوتے تھے داڑھی سیاہ تھی اور قد کوتاہ... اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے سید احمد خان نیچری کو دیکھا ہے لیکن ان دونوں آدمیوں کو ہم نے بطور اجنبی اور غیر متعارف ہو کر دیکھا ہے اس کے بعد راقم نے عرض کیا کہ حضور مولوی عبدالحی اور سید احمد خان نیچری کے رتبہ علمی میں کیا فرق ہے آپ نے فرمایا سید احمد خان صرف ایک دانا اور عقلمند آدمی ہے اور مولوی عبدالحی صاحب عالم متبحر اور فاضل جلیل تھے جو تمام علوم خواہ صرف ہو یا نحو۔ بدیع ہو یا بیان منطوق ہو یا معقول۔ تفسیر ہو یا حدیث، تمام میں ماہر تھے۔"

یہاں تو خواجہ فرید نے سر سید احمد خان کو دیکھنے بات کی ہے لیکن بعد میں ایک اور محفل میں آپ نے سر سید احمد خان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی محفل میں نواب قیصر خان مگسی نے سر سید احمد خان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ

"نہایت ہی اچھے آدمی تھے اور ان کے چہرے سے برکت طپکتی تھی۔ ان کا اسلام کے کسی فرقے سے اختلاف نہیں تھا اور ہر فرقے کو اچھا کہتے تھے ان کے والد شاہ ابوسعید دہلوی کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ ابوسعید شاہ غلام علی دہلوی کے مرید و خلیفہ تھے۔ وہ مرزا مظہر جان جاناں کے مرید و خلیفہ تھے۔ میں نے سید احمد خان سے پوچھا کہ آپ نے بھی کسی بزرگ کے ساتھ بیعت کی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے کسی شخص کے ساتھ بیعت نہیں کی اگر کسی سے بیعت کی ہے تو ان کے ساتھ کی ہے (یعنی ابوسعید کے ساتھ) جن کی شکل و صورت فراموش نہیں ہو سکتی۔ اس کے

بعد فرمایا کہ جب میں نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر اور اصحاب کرام کی محبت کا ذکر ہوا تو بات کرتے ہوئے وہ رو رہے تھے اور آنکھوں سے اس قدر آنسو جاری تھے کہ ریش تر ہو گئی تھی اور قطرے نیچے ٹپک رہے تھے اور کمال شوق اور جوش سے پاؤں زمین پر اس طرح مارتے تھے کہ جیسے کوئی رقص کے وقت مارتا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی اس کے بعد فرمایا کہ سید احمد کا ۱۳۱۵ھ ہی میں انتقال ہوا۔

نور احمد فریدی کے مطابق خواجہ فرید ہر سال بہار کے موسم میں اپنے خاص خاص احباب کے ساتھ چارپل شریف سے ملتان ٹبری شان کے ساتھ آیا کرتے۔ خواجہ فرید ۱۳۱۴ھ میں ربیع الثانی کے مہینے میں بھی ملتان تشریف لائے تھے اور ۱۴ ربیع الثانی کو اپنے خادمین اور متعلقین کے ہمراہ تین گھٹیوں پر سوار ہو کر شاہ رکن عالم کے مزار پر حاضری دی اور ۲۳ ربیع الثانی کو بھی متعلقین اور خدام کے ہمراہ تین گھٹیوں پر سوار ہو کر حرم دروازہ، پاک دروازہ، دہلی دروازہ اور باغ عام و خاص سے ہوتے ہوئے بہار الدین زکریا کے مزار پر حاضری دی اس کے بعد پاک دروازے جا کر موسیٰ پاک شہید کے مزار پر حاضری دی اور وہاں کے سجادہ نشین مخدوم صدر الدین سے ملاقات کی۔

بہت سی کتابوں کے مطالعے، ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت اور سفر حج کی بدولت آپ کی معلومات میں بھی کافی اضافہ ہوا تھا۔ مقابیس المجالس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کی معلومات خاصی وسیع تھیں مثلاً ایک دفعہ قدیم شہروں کا ذکر ہو رہا تھا تو آپ نے فرمایا "شہر ڈیر اور زمانہ بنوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تعمیر ہوا۔ شہر جیلیر (جواب بھارت میں ہے)۔ بھی عرصہ آٹھ سو سال ہوئے تعمیر ہوا تھا۔ پگل بھی قدیم شہر ہے۔"

۷۱- بحوالہ مقابیس المجالس، حصہ چہارم، مترجم کپتان واحد بخش سیال، ص ۹۵

۷۲- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے مقابیس المجالس، حصہ دوم، مترجم واحد بخش سیال، ص ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷

۷۳- ۳۷- یہ دونوں شہر ہاڈپور کے علاقہ ریگستان میں واقع ہیں۔

۷۴- بحوالہ مقابیس المجالس، حصہ دوم، مترجم واحد بخش سیال، ص ۳۱۲، ۳۱۳

خواجہ صاحب کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ اکثر موقعوں پر فی البدیہہ گفتگو کرتے تھے کہ دوسرے علماء و مشائخ حیران رہ جاتے۔ پھر موقع بہ موقع دنیا کی مختلف اقوام، مذاہب اور جگہوں کے بارے میں تفصیل سے بتاتے۔ اس سے آپ کی ذہانت اور وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آپ فرماتے ہیں کہ

”مغل بھی ترک ہیں اور چنگیز خان کی اولاد ہیں پھر فرمایا کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان بڑے ظالم بادشاہ تھے۔ انہوں نے ماوراء النہر، سمرقند، بخارا، غزنی، بغداد، وغیرہ کو ظلم و ستم سے تاراج کیا اور لوگوں پر بڑے مظالم ڈھلتے اس کے بعد سلطان احمد مسلمان ہوا اس کے بعد فرمایا کہ ساری دنیا میں ترک سب سے زیادہ کثیر تعداد میں ہیں۔ مشرقی ممالک یعنی چین اور صحرائے قبیاق اور حدود تانار اور دیار طبریاچ میں سب یہی لوگ ہیں اور یہی مذہب رکھتے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں۔ حلال و حرام میں تمیز نہیں رکھتے جو کچھ ہاتھ لگتا کھا جاتے ہیں۔ یا جوج ماجوج بھی ان میں سے ہیں۔ سلطان سکند نے ان کے خلاف دیوار بنائی تھی یہ ممالک عرب سے مشرق کی جانب ہیں وہاں سے نکل کر انہوں نے اسلامی ممالک پر قبضہ کر لیا۔“

آپ کی محافل کے بارے میں محمد انور فیروز لکھتے ہیں کہ

”آپ کا حلقہ کچھ ایسا تھا کہ جس میں ہر مذاق کے آدمی اپنی روحانی غذا موجود پاتے تھے ایک وقت اس میں اگر وعظ و نصیحت کے دفتر کھلے ہوتے تھے تو دوسرے وقت تڑپا دینے والی تصوف بھری راگنیاں بھی پڑی گونج رہی ہوتی تھیں۔“

خواجہ فرید کی اس قدر معلومات کا سبب وسعت مطالعہ ہے انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے علماء کرام اور مختلف مذاہب کی کتابوں کو پڑھ رکھا تھا نہ صرف پڑھا تھا بلکہ انہیں حافظے میں محفوظ بھی رکھا تھا اس لئے موقع بہ موقع جہاں کہیں جس قسم کی بات ہو رہی ہوتی خواجہ فرید اسی مناسبت سے کتب کا حوالہ دے کر بات کو ٹھوس اور مدلل انداز میں پیش کرتے۔ آپ کی مجالس میں بے شمار مسائل زیر بحث رہتے اور حضرت خواجہ غلام فریدان موضوعات پر نہایت قابلیت سے گفتگو فرماتے

۱۔ بحوالہ مقابیس المجالس، حصہ پنجم، مترجم واحد بخش سیال، ص ۹۴۵

۲۔ بحوالہ گوہر شب چراغ، ص ۲۹

آپ کی مجلسوں میں دینی و دنیاوی، شرعی، تاریخی ہر قسم کے مسائل زیر بحث آتے اور آپ اپنے علم و فضل کی بدولت کسی موضوع کو تشنہ نہ رہنے دیتے۔ آپ کی محافل جن کا ذکر مولوی رکن الدین نے ”مقابلہ المجالس“ کی صورت میں محفوظ کیا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کتنے وسیع المطالعہ شخص تھے۔ علمائے اکابر کا ذکر ہوتا۔ خواجہ فریدان کی کتابوں اور ان کے نظریات کے حوالے سے بات کرتے، جن علماء، صوفیاء اور مفکرین کا ذکر ان کے یہاں ملتا ہے ان میں منصور حلج، ابن العربی، عبد الکریم الجیلی، یونانی فیلسوف، افلاطون، ارسطو، امام غزالی، عبدالرحمان، معین الدین اجمیری، قطب الدین بختیار کاکی، اور فرید الدین گنج شکر وغیرہ خاص طور قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی مجلسوں کے حوالے سے بہت سی کتابوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جنہیں پڑھ کر آپ لوگوں کو مسائل بتاتے یا انہیں ان کتابوں کے متعلق بتایا کرتے۔ یہ کتابیں زیادہ تر تصوف کے موضوع پر ہیں جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔۔۔۔۔ دلیل العارفین، خزینۃ الاصفیاء، مراۃ الاسرار، اخبار الابخیار، اقتباس اللوار، نفحات الانس، سوار السبیل، شرح گلشن راز (ثنوی)، کلمۃ الحق، مصباح الہدایہ، کتاب فخریۃ النظام، مراۃ العارفین، کتاب ہدایہ، سراجی، فتوح الغیب، کشف المحجوب انسان کامل، انوار الرحمان، کتاب مطلع العلوم وغیرہ۔

آپ صرف کتابیں پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ انہیں جمع بھی کرتے تھے۔ آپ کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ تھا جو صدیوں پہلے آپ کے آباؤ اجداد نے قائم کیا تھا اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں مطبوعہ اور قلمی نسخے بہت زیادہ تھے۔ خواجہ فرید نے ان کی حفاظت کے لئے خصوصی انتظامات کر رکھے تھے۔ نورا احمد فریدی، خواجہ فرید کے کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

”حضور کو کتابیں دنیا کی ہر چیز سے محبوب تر تھیں اس لئے جب فرید محل بن کر تیار ہوا تو بالائی منزل کو کتب خانے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ایک عالم دین لائبریرین اور ایک صاحب جلد ساز تھے جو مستقل طور پر کتابوں کی جلدیں بناتے اور انہیں تیار کرتے تھے۔ کتب خانے سے متصل جانب غرب وسیع و عریض برآمدہ تھا جس میں حضور قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے۔ یہ کتب خانہ حضرت خواجہ قطب الدین بک پورے عروج پر تھا اور اس میں ہر صنف اور ہر موضوع کی ہزاروں کتابیں تھیں۔“

لیکن افسوس اب کتب خانہ تو بجائے خود رہا، لوگ فرید محل کے دروازے اور کھڑکیاں
تک چرلے گئے۔ ہیں۔

کتابیں جمع کرنے کے شغف کے ساتھ ان کے مطالعے کا بھی بے حد شوق تھا۔ ان کا حافظہ اتنا
اچھا تھا کہ انہیں ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ کون سا مسئلہ کس کتاب میں بیان ہوا ہے یا کہاں سے مستند
حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ کتاب کا صفحہ دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کونسی کتاب ہے اور اس کا مصنف
کون ہے مثلاً علمائے نے ایک کتاب کا قلمی نسخہ پیش کیا جس کے ابتدائی اور آخری صفحات غائب
تھے اس لئے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ آپ نے اندرونی صفحات کو دیکھ کر فرمایا کہ
”یہ مولانا جمالی کی سیر العارین ہے۔“

کثرت مطالعہ کے باعث نہ صرف کتاب کو پہچان لیتے بلکہ اس خوبی نے آپ میں محققانہ صلاحیت بھی
پیدا کر دی جو کہ ایک بڑے عالم کی خصوصیت ہے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہوتا جو کسی بات
یا کسی قول کو کتاب سے ٹھہرا کر اندھی عقیدت کی وجہ سے جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں اگر آپ کو اس بار
میں ذرا بھی شک ہو جاتا تو آپ اصل کے کھوج میں لگ جاتے، علامہ نسیم طاہر کے مطابق
”حضور رحمتہ اللہ کو تفحص کا اس قدر شوق تھا کہ اگر کوئی ایسی بات سامنے آجاتی جس
کے متعلق مزید سند یا تفتیش کی ضرورت ہوتی تو جب تک حل طلب معاملہ پوری طرح
حل نہ ہو جاتا حضور کی طبیعت سکون پذیر نہ ہوتی تھی۔“

ایک بار منطق الطیر ملاحظہ فرما رہے تھے، مخدوم غریب شاہ صاحب نے ایک جگہ کے متعلق فرمایا کہ
یہ اشعار ملحقات رد افق میں سے ہیں۔ جس طرح انہوں نے مولانا رومی کی مثنوی رومی میں کچھ بڑے
اشعار شامل کر دیئے تھے۔ اسی طرح منطق الطیر میں بھی چالاکی کی ہے۔ خواجہ غلام فرید کو خلش پیدا ہوئی
کہ اس کی اصل تلاش کی جائے تاکہ صحیح چیز سامنے آئے۔ آخر کار ڈیڑھ سو سال پُرانا ایک قلمی نسخہ تلاش کر
لائے۔ اس قلمی نسخے میں وہ اشعار موجود نہ تھے جن کے بارے میں خواجہ فرید کو شک تھا اور وہ مطبوعہ

۱۱۴۔ بحوالہ دیوان فرید، ص ۱۱۴

۱۱۵۔ ملاحظہ فرمائیے ”مقابلیں المجالس“

۱۱۶۔ مقدمہ دیوان فرید، مرتبہ عزیز الرحمن، ص ۳۳

نحوں میں پائے جلتے تھے۔ اس طرح کی اور کئی مثالیں اشارات فریدی کے حوالے سے ملتی ہیں کہ خواجہ غلام فرید اگر کسی بات یا شعر کے بارے میں مشکوک ہوتے تو اصل کے کھوج میں لگ جاتے اور آخر کار اسے تلاش کر کے چھوڑتے۔

خواجہ فرید کا شمار باعمل صوفیوں میں ہوتا ہے آپ لوگوں کو جو نصیحت فرماتے تھے خود بھی اس پر عمل پیرا ہوتے۔ آپ بہترین اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ سنت نبوی پر چلنا آپ کا شعار تھا غیر شرعی اور فضول رسموں اور توہمات سے آپ نفرت کرتے تھے۔ نہ صرف خود ان سے دور رہتے بلکہ دوسروں کو بھی ایسی باتوں سے بچنے کی تلقین کرتے۔ آپ اہل ظاہر کی طرح شریعت کے پابند بھی تھے اور اہل باطن کی طرح خود پر پابندیاں بھی لگا رکھی تھیں۔ آپ شریعت و طریقت دونوں کے قائل تھے۔ خواجہ غلام فرید کے بارے میں علامہ نسیم طاہر کا کہنا ہے کہ

”وہ آج کل کے صوفیہ کی طرح صرف قوال نہیں تھے بلکہ فعال بھی تھے صرف گفتار کے غازی نہیں تھے بلکہ کردار کے غازی بھی تھے۔“

آپ ہر نفع و نقصان کو خدا کی طرف سے منسوب کرتے تھے خواجہ صاحب کی اسی عادت نے ان میں دنیاوی لذتوں سے بے نیازی پیدا کر دی تھی۔ اسی لئے آپ دولت اور دنیاوی آسائشوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آپ کے یاس جو کچھ آتا آپ اسے جمع کرنے کی بجائے فوراً مستحقین میں تقسیم فرمادیتے۔ سخاوت کا مادہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ کبھی دولت جمع کرنے کو اہمیت نہ دی۔ سارا عمر نواب بہاؤ پور سے ایک روپیہ تک نہ لیا نہ ہی کسی قسم کی زمین اور جاگیر قبول کی۔ آپ کے بڑے بھائی خواجہ فخر الدین نے نواب بہاؤ پور کی طرف سے جاگیر قبول کی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد آپ نے اس زمین میں سے کچھ نہ لیا بلکہ جو کچھ جمع تھا وہ سارا مستحقین میں تقسیم فرمادیا۔ آپ گھر میں کچھ رکھنا گناہ سمجھتے تھے جو کچھ لوگ نذرانے کے طور پر لاتے آپ اسے لوگوں میں بانٹ دیتے۔ آپ نے علماء کے لئے ماہوار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی اور ان کی شادی کے موقع پر انہیں ایک بٹور اور طلائی نٹھ عطا فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے نگر قائم کر رکھا تھا آپ کے ہاں ہر وقت دس پندرہ امیر درمعتبر اشخاص ہوتے اور ان کے علاوہ سینکڑوں مرید اور طالب علم جمع رہتے جو آپ کے نگر سے کھانا کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی مجلس میں آپ کے نگر کے متعلق گفتگو

وایہ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”مقابلہ مجالس“

۲۲۰۔ بحوالہ مقدمہ دیوان فرید، مرتبہ ۶۰، زیر الرحمان، ص ۲۵۔

نے لگی تو آپ نے فرمایا

”کہ دو ہزار روپیہ ننگر کے عہدیداروں کی تنخواہ کی مدد سے میرے پاس فاضل ہے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ یہ غریب مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ننگر میں ہمالوں اور مسافروں کی نان شکمی کے علاوہ صرف ننگر کے خدام کو وظیفہ دینے پر ایک مانی (۲۴ من) گندم تیسرے دن خرچ ہو جاتی ہے اور شالی (چاول) دوسرے روز ایک مانی ختم ہوتا ہے حضرت قبلہ سلطان الاولیاء قدس سرہ کے زلمنے میں اس قدر غلہ صرف ہمالوں اور مسافروں کے گھوڑوں پر خرچ آتا تھا۔“

”مناقب فریدی“ کے مصنف مرزا احمد اختر آپ کے ننگر خالوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”ایک مدرسہ دینی اور ننگر خانقاہ کوٹ شریف میں تھا اور دوسرا ننگر اور مدرسہ چاڑیاں شریف میں جن میں ساڑھے بارہ من غلہ روزانہ صرف ہوتا تیسرا ننگر ہمراہی وہ تھا جو کہ حضور کے ہمراہی فقراء و خدام و سائلین کو ملتا۔ میری عدم موجودگی میں اس کا خرچ سو روپیہ روز کا تھا۔“

خواجہ فرید سلسلہ چشتیہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے سماع اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ ان کے ملفوظات میں جا بجا سماع کے بارے میں اظہار خیال ملتا ہے۔ انہوں نے سماع کو ہر لحاظ سے روا اور جائز تصور کیا ہے البتہ سماع کے لئے مخصوص ماحول، مخصوص آداب اور چند ایک شرائط کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ سماع کے جواز اور آداب وغیرہ کے سلسلے میں یہاں ہم چند باتوں کا ذکر فروری سمجھتے ہیں مثلاً ”فراند فریدیہ“ کے مطابق سلسلہ چشتیہ میں سماع پوری طرح متعارف ہے اور تمام شاخ عظام سماع سنتے رہے۔ کسی کو اس سے انکار کی توفیق نہیں ہوتی۔ سماع اللہ کی عظیم نعمت ہے بلکہ بعض اولیائے اکرام نے سماع سنتے سنتے اپنی جان دے دی۔ جن میں حضرت ابوسعید خرازی، حضرت ابوالحسن نوری ابوالحسن دراج، حضرت ذوالنون مصری، حضرت ابوبکر شبلی، حضرت قطب الدین بختیاراوشی اور شیخ عبدالعزیز ناگوری قابل ذکر ہیں، اصل عبارت یوں ہے۔

۱- بحوالہ مناقب میں المجالس، حصہ پنجم، مترجم کپتان واحد بخش سیال، ص ۳۲۔

۲- بحوالہ مناقب فریدی، از مرزا اختر احمد، ص ۱۰۴، مطبوعہ احمدی، دہلی

”در سلسلہ عالیہ چشتیہ سماع تمام متعارف است و ہمہ مشائخ عظام مے شنوند کے راچہ
توفیق کہ حرف انکار بر زبان راند نعوذ باللہ منھا اگر کے داند سماع نعمت عالی است
از انعام حق جل جلالہ، کہ چند اولیاء اللہ رضی اللہ عنہم بشنیدن سماع جان بد دست
تسلیم کردہ اند چنانچہ حضرت ابوسعید خرازد و حضرت ابواحسن نوری و حضرت ابواحسن دلچ
و حضرت ذوالنون مصری و حضرت ابوبکر شبلی و شیخنا حضرت قطب الدین نختیارا دشتی و
شیخ عبدالعزیز ناگوری چشتی و شیخ ابوالقاسم و شیخ ایوب نجارد غیر ہم رضی اللہ عنہم
لیکن اسی کتاب میں آگے چل کر سماع کے جواز کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ سماع نہ تو پوری طرح حرام
ہے نہ حلال بلکہ اس کی حرمت کا دار و مدار عشق پر ہے۔ یعنی اگر عشق سچا ہے اور خدا اس کے رسول
یا شیخ کے ساتھ ہے تو پھر حلال بلکہ واجب ہے بعض صورتوں میں یہ حرام ہے جبکہ بعض حالتوں میں مباح
..... اصل عبارت یوں ہے۔

”سماع بدانکہ سماع نہ مطلق حرام است و نہ حلال و حرمت اور موقوف بر عشق است اگر
عشق حق است جل جلالہ، یا عشق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یا شیخ حلال است
بالاتفاق بلکہ مستحب است و اگر عشق مملوکہ شرعیہ خود است او نیز جائز است و اگر
عشق غیر مملوکہ کہ شرعیہ است پس اگر وقت سماع خیال شہوت مرفوع است او نیز مباح
است۔ اگر خیال شہوت پیدا کرد حرام است و اگر برائے تفریح قلب شنیدہ شود ہم
درست است بدانکہ ہر قسم سرود چنانچہ دف و جلاب و طبل و شاہین و غیر ہم جائز
سوائے مزامیر و اوتار و طباک،
اس سلسلے میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ

”جہاں تک سماع کا تعلق ہے فی حد ذاتہ یعنی اپنی ذات سے پاک و حلال ہے جس سماع
کو حرام کہا گیا ہے وہ حرام چیزوں کے شامل ہونے سے حرام ہوا ہے۔ مثلاً جب دولت

حاجہ بچوالہ فرامد فریدیہ، (فارسی) از خواجہ غلام فرید، ص ۲۸، مطبوعہ مطبع محمدی مجتہانی، لاہور (۱۳۱۲ھ)

۱۸۹۵ء میں کتاب جناب اسد قحطامی کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی۔

ص ۳۲۔ بچوالہ فرامد فریدیہ، از خواجہ غلام فرید، ص ۳۷

مند لوگ سماع سنتے ہیں تو شراب کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اور مہنسی مذاق اور بے ہودہ باتوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ مجلس سماع میں عورتوں اور بے ریش لڑکوں کے شامل ہونے سے بھی سماع ناجائز ہو جاتا ہے اگر غیر شرع چیزیں نہ ہوں تو سماع حلال ہے چونکہ مشائخ عظام اپنی مجالس میں ان چیزوں کو شامل نہیں ہونے دیتے لہذا ان کا سماع اپنی اصل حالت پر آ جاتا ہے یعنی جائز ہو جاتا ہے۔

”مقابیس المجالس“ جلد پنجم میں سماع کے حلال ہونے کا جواز پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”سماع حلال ہے کیونکہ سماع بالاحوالہ (بذات خود) حرام ہونے کے متعلق کوئی قطعی یا ظنی دلیل قائم نہیں ہوئی جن احادیث میں سماع کے حرام ہونے کا حکم وارد ہوا ہے وہ بالعرض ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ عیش و عشرت کی مجلس منعقد کرتے تھے جس میں شراب اور لہو و لعب و مباشرت تک شامل کرتے تھے چنانچہ جب قرآن مجید میں شراب حرام ہونے کے احکام وارد ہوئے تو ان مجالس میں سماع سمیت تمام چیزوں کی بالعرض حرمت وارد ہو گئی۔ لہذا سماع کی حرمت کا انحصار اس کی وضع و ہیئت پر ہے۔ جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اگر مجلس سماع میں شراب، لہو و لعب وغیرہ ہوں تو بیک یہ سماع حرام ہے۔ بذات خود نہیں بلکہ بالعرض حرام ہے لیکن اگر مجلس سماع حرام چیزوں سے خالی ہے پھر جبکہ صوفیاء کرام کی مجالس سماع ہوں تو اس قسم کا سماع حلال ہے قطعاً حرام نہیں نہ بالاصل نہ بالعرض۔“

”مقابیس المجالس“ حصہ پنجم فارسی، قلمی کی یہ عبارت بھی قابل ذکر ہے۔
 ”حضور فرمودند انہوں نے در زمانہ درہر جا ادب سماع متروک مگر در کوٹ شریف ہچیمان باقی وثابت است بعدہ فرمودند کہ وقتی حضرت سلطان الادلایار بر عرس حضرت شیخ الشیوخ العالم گنج شکر در پاک پٹن شریف بردند چون آنجا مراعات آداب سماع ہرگز نمی باشند تا آنکہ کو دکان و زنان و ہندوان نیز در مجلس سماع حاضر و داخل می باشند پس

۱۔ بحوالہ ”مقابیس المجالس“ از مولانا رکن الدین مترجم کیپٹن واحد بخش سیال، ص ۳۹۹-۴۰۰

۲۔ بحوالہ ”مقابیس المجالس“ از مولانا رکن الدین مترجم کیپٹن واحد بخش سیال، ص ۱۰۳۷، ۱۰۳۸

حضرت ایشان مولوی گل محمد احمد پوری را کہ ہمراہ حضور بودند فرمودند کہ آداب سماع این
جامتزدک اند در مجلس سماع داخل نہ شوی^۱!

”فوائد فریدیہ“ میں آداب سماع کے عنوان سے تین آداب مقرر فرمائے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کھانے
پینے اور نماز کے وقت سماع نہیں ہونا چاہیئے دوسرے جب کوئی جگہ ناپاک ہو یا وہاں ایسی چیز
موجود ہو جس کی طرف دل متوجہ ہو جائے تیسرا اور آخری یہ کہ جہاں کوئی منکر سماع موجود ہو^۲۔ ”فوائد فریدیہ“
ہی میں ان تین آداب کے علاوہ سات دیگر آداب کا بھی ذکر موجود ہے۔ ان میں اہم یہ ہیں کہ
سماع کے شروع میں کچھ سورتوں کا درد کیا جائے سماع کے شرکابا وضو ہوں۔ نشست کا انداز صلوٰۃ
کے قاعدے جیسا ہو تو جراثیم پر ہونی چاہیئے۔ مطربان کو کوئی لالچ نہ ہو جس بیت پر وجد آئے
اس کا تکرار کیا جائے اور سماع کے خاتمے کے وقت پھر اسی طرح سورتوں کا درد کیا جائے^۳۔

خواجہ غلام فرید عرس کے دنوں کے علاوہ بھی قوالی سنتے تھے۔ خصوصاً چاشت کے وقت کبھی کبھی
عشاء کے وقت بھی شوق فرماتے تھے۔ برکت نامی خاص قوال تھا جس سے آپ قوالی سنتے تھے وہ
آپ کی کافیوں کو بھی قوالی کی صورت میں گاتا۔ خواجہ فرید کے ملفوظات میں اکثر جگہ اس کا ذکر ملتا ہے
بحیثیت صوفی خواجہ صاحب سماع میں دلچسپی لیتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بحیثیت ایک شاعر ایک
عاشق صادق اور ایک ذوق جمال رکھنے والے فرد کی حیثیت سے موسیقی اور رقص میں بھی گہری دلچسپی
لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے ملفوظات سے ایسے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ وہ موسیقی اور رقص سے نہ
صرف واقف تھے بلکہ ان کے اسرار و رموز سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ رقص آپ کے نزدیک صہد
میں آجانے کے بعد کی کیفیت ہے۔ جب دل پر قابو نہیں رہتا مقابیس المجالس میں لکھا ہے کہ

”کسی نے عرض کیا کہ حضور یہ وجد و رقص اور جنبش کیا چیز ہے اور کس چیز سے پیدا
ہوتی ہے فرمایا پہلے جنبش دل کو ہوتی ہے اس کے بعد بدن کو ہوتی ہے۔ اگر دل

۱- بحوالہ مقابیس المجالس، حصہ پنجم (فارسی تعلیمی، ص ۲۰۳) جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے

حاصل ہوئی۔

۲- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”فوائد فریدیہ“ ص ۲۸

۳- بحوالہ ”فوائد فریدیہ“ ص ۲۹-۳۰

کو جنبش کہہئے تو اس کا ضبط کرنا آسان ہوتا ہے اس وقت رقص کی لذت نہیں آتی جب جنبش کا دل پر غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کا روکنا ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے وجود میں آتا ہے۔^۱

اسی طرح موسیقی اور راگ و نغمہ کے اثر اور سرور و رموز سے بھی آپ پوری طرح واقف تھے راگ کے موثر ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

”راگ کی طرح دنیا میں کوئی چیز موثر نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ پیر کی ذات مبارک موجود ہو۔“^۲

راگ کی مختلف قسموں کے بارے میں آپ کی معلومات خاصی وسیع تھیں مقابلیں المجالس کے مطابق ”آپ نے سرود اور راگوں کی تعریف کی اور فرمایا کہ اصول راگ جو ہندوستان میں مروج ہیں چھ ہیں اول بھیرمی، دوم سری، سوم مینگھ، چہارم ہندو، پنجم مال کوس، ششم دیکھ چنانچہ تمام راگنیاں ان چھ راگوں سے نکلی ہیں۔۔۔ فرمایا کہ اہل ہند کے یہ راگ منزل نازل شدہ ہیں وہ راگ تمام رشیوں اور اوتاروں پر جو پیغمبر ہیں حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف نازل ہوئے ہیں چنانچہ دید میں جو ایک نازل شدہ اور آسمانی کتاب ہے راگ اور رقص کے نزول کا ذکر آیا ہے۔“^۳

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ کتاب ”مطلع العلوم“ میں تمام راگوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور فرمایا کہ برکت قوال، جو کہ آپ کا خاص قوال تھا، کو چار سو راگنیاں یاد ہیں۔ صرف موسیقی میں ہی نہیں بلکہ شاعر ہونے کی حیثیت سے آپ فن شاعری کے اوزان و بحر میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ علامہ نسیم طاہر کے مطابق

”آپ نے اپنی زبان میں نئے نئے اوزان اور نئی نئی بحریں ایجاد فرمائیں جو قبل ازیں رائج نہیں تھیں اور ان کو رواج دیا۔ سندھی اور ہندی بحر و اوزان کو بھی حضور نے اپنا

۱۔ بحوالہ مقابلیں المجالس، حصہ چہارم از مولانا رکن الدین، مترجم کیپٹن واحد بخش سیال، ص ۲۵۔

۲۔ بحوالہ مقابلیں المجالس، مترجم کیپٹن واحد بخش سیال، ص ۱۰۳۵۔

۳۔ بحوالہ مقابلیں المجالس، مترجم کیپٹن واحد بخش سیال، ص ۲۹۱-۲۹۲۔

کی کوشش فرمائی اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ غرض علم عروض سے پورے واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس کا علم میں اضافہ و ایجاد کا باعث ہوئے ہیں، رقص و موسیقی اور فن شاعری کے علاوہ خواجہ غلام فرید علم جفر، علم رمل اور علم نجوم اور تاریخ نکلنے کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔ تاریخ نکلنے کے فن کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں نے جتنی تاریخیں نکالی ہیں ان میں سے کچھ اہامی ہیں اور کچھ طبعی ہیں۔
خواجہ غلام فرید کسی زبانیں جانتے تھے جن میں اردو، سرائیکی، فارسی، سندھی، ہندی اور پوربی زبانوں میں تو آپ کی شاعری ملتی ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ خواجہ غلام فرید کی اردو اور سرائیکی شاعری میں عربی تراکیب و الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ فرید کو ان زبانوں پر عبور حاصل تھا، اسی بنا پر علامہ نسیم طاہر نے آپ کو "ہفت زبان" کہا ہے علامہ نسیم طاہر کے مطابق

۱۔ "ان سات زبانوں میں تو آپ مہارت تامہ رکھتے تھے اور اس لحاظ سے آپ کو ہفت زبان کہنا کچھ بے جا نہیں ہے۔"

ان سات زبانوں کے علاوہ خواجہ فرید نے ۱۸۵۷ء کے زلزلے میں انگریزی ابجد اور رومن لکھنا سیکھی۔ خواجہ فرید کی انگریزی زبان سے واقفیت کے بارے میں رکن الدین ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ "واندریں اثنا بسوئے میاں صاحب میاں فضل حق صاحب میگرو دی روئے آدرہ فرمودند کہ تو چگونہ خط و کتابت انگریزی قلم نوشتن آموختی وے چنانچہ آموختہ بود عرض کرد آنگاہ ارشاد فرمودند کہ انوں ہم بنویس پس وے چند سطر حروف انگریزی نوشتہ پیش حضور آزا خواندہ فرمودند کہ ایں بیت نوشتی

ع آرزو دارم کہ خاک آں قدم

تو تیاے چشم سازم دم بدم

۱۔ بحوالہ مقدمہ، دیوان فرید مرتبہ مولانا عزیز الرحمن، ص ۳۷

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "مقابیس المجالس" مترجم کپتان واحد بخش سیال، ص

۳۔ بحوالہ دیوان فرید، مرتبہ عزیز الرحمن، ص ۳۸

بعد ازاں حضور خواجہ ابقا اللہ تعالیٰ ببقانہ سبحہ مبارک را نہادہ خود بدولت نوشتہ
میاں صاحب موصوف را دادند وے برخواند و عرض کرد کہ قبلہ این بیت نوشتہ اید

عہ آنا نہ خاک را بنظر کیمیا کنند
سگ را دلی کنند و گس را ہما کنند

حضور خواجہ ابقا اللہ تعالیٰ مسرور شدند.....

بعد ازاں میاں صاحب موصوف چند سطور تقلم انگریزی نوشتہ پیش کرد حضور خواجہ ابقا

اللہ تعالیٰ آنرا برخواندند و فرمودند کہ این مصرع نوشتہ

عہ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را گاہے بنگاہے ط

ان کے علاوہ خواجہ فرید شاستری، مگر مکھی زبان بھی جانتے تھے۔ آپ کی مجالس سے اس کا ثبوت
ملتا ہے۔

”اس وقت آپ شاستری زبان گر مکھی اور انگریزی کے قواعد خود لکھ کر خدام خاص
کو پڑھا رہے تھے کیونکہ آپ کو علم لدنی حاصل ہے اور آپ تمام علوم و فنون اور
حقائق و معارف کے سرچشمہ ہیں اس کے بعد آپ نے اٹھ کر نماز عصر ادا کی۔“

خواجہ غلام فرید نے تین شادیاں کی تھیں نور احمد فریدی کے الفاظ میں
”حضور نے ایک شادی چاچڑاں میں کی تھی جس سے آپ کے فرزند ارجمند خواجہ
محمد بخش صاحب المعروف نازک کریم قدس سرہ تولد ہوئے اور ایک صاحبزادی
بھی تھیں جو حضرت خواجہ فیض احمد صاحب کی والدہ محترمہ تھیں۔ ایک شادی حضرت
نے ملتان میں کی تھی اور تیسری شادی روہی میں فیروزہ کے قریب لاڑخانہ میں
ہوتی۔“

خواجہ فرید کی تین بیویوں میں سے صرف ایک بیوی سے اولاد ہوئی جن میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی

۱- بحوالہ ”مقابیس المجالس“، حصہ سوم، ص ۱۷۲

۲- بحوالہ ”مقابیس المجالس“، حصہ دوم، (اردو ترجمہ)، ص ۲۰۵

۳- بحوالہ ”دیوان فریدی“، مرتبہ نور احمد فریدی، ص ۳۹

ہیں خواجہ فرید نے اپنی اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی مسعود حسن شہاب لکھتے ہیں کہ
 ”خواجہ صاحب نے ایک نیک و بلند کردار خاندان کے علاوہ ایک مشفق باپ کے بھی
 فرانس ادا کئے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ صرف کی اور ان کی شادی بیاہ
 کی ذمہ داریوں سے احسن طریق پر عہدہ برآ ہوئے۔ انکے فرزند خواجہ محمد بخش نازک جو
 بعد میں خواجہ صاحب کے جانشین ہوئے انہی کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے
 اپنے بیٹے کو روحانی تعلیم ہی نہیں دینی و دنیاوی تعلیم بھی خود دی تھی۔“

خواجہ فرید کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں سے پہلے تو آپ کے فرزند خواجہ محمد بخش
 نازک کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ آپ کے چند مشہور خلفاء کے نام یہ ہیں۔ حضرت دیوان ولایت
 شاہ (ادب بنجاری) حضرت خواجہ فضل حق مہاروی، حضرت حافظ محمد، حضرت مولوی احمد بخش، مولوی
 خان محمد، میاں بنی بخش مہر بلوالہ، میاں جی محمد بخش، میاں محمد یعقوب، میاں بلند خان ناگوری، میاں
 عبدالرحمان الہ آبادی، مولانا رکن الدین، مولانا ابو محمد ابراہیم زرگونی وغیرہ مشہور ہیں۔ ان سب کا
 تعلق مختلف علاقوں سے تھا۔ نزدیک و دور سے لوگ بڑے ذوق و شوق سے انہیں ملنے آتے تھے
 انہیں لوگوں میں ایک فقیر محمد عارف ولد قاضی محمد عثمان سکندر بوہنگا محمد رمضان (لال سوہارا کے قریب
 واقع ہے۔) بھی تھے، جو حضرت سلیمان تونسوی کے مریدوں میں سے تھے۔ انہوں نے سرائیکی اور اردو
 زبان میں دو منظوم سفر نامے ۱۳۰۱ھ میں لکھے، جن کو ڈاکٹر مہر عبدالحق سرائیکی اور اردو دونوں زبانوں
 کے جج کے بارے میں سب سے پہلے سفر نامے قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں سفر نامے محمد عارف نے
 اپنے ہاتھوں سے لکھے اور یہ قلمی نسخے جناب صیب فائق کے پاس موجود ہیں اور میں نے ان کی
 لاہور سے استفادہ کیا ہے۔ سرائیکی سفر نامے میں، جس کا نام ”کوہ غم“ ہے فقیر محمد عارف نے
 خواجہ فرید کے ساتھ اپنی عقیدت اور ملاقات کا حال یوں بیان کیا ہے

ترتیباً ماہ محرم کوں جاں ہو یا فضل الہی چھوڑ بہا دلپور کوں ٹریم تھی خفقی سودانی

۱۔ خواجہ غلام فرید۔ حیات و شاعری، از مسعود حسن شہاب، ص ۸۷

۲۔ ملاحظہ فرمائیے ”مزید سانی تحقیقات“، از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۳۸۳، مطبوعہ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان، بار اول

جون ۱۹۸۵ء - ۱۳ - بحوالہ سال ۱۲۹۸، ہجری ہے ”کوہ غم“ ص ۵

درد رسیدہ سنگھڑ آیم پائیم رنج تباہی
 اکتھوں طرف سنگھڑ دے گیوم مرشد چوک لائی
 ہک مہینے تو نے رہم سوزوں خبر نہ کائی
 آیم پھر بہادلوپو روچ داگاں وطن دلائی
 آفر عشق بہادلوپو روچ دُھری بھابھڑ کائی
 شرد غلام فرید صاحب سن چا چڑھاں نظر دلائی
 ڈیکھ صورت من بھادنی صورت شکل فرور کھائی
 ترے جہاڑے چا چڑھاں اندر بہہ اوقت بھائی
 جو طرفوں جڑ بھاگی گیا تن من حب جلائی
 بحر عیشی ڈس چودھا روں ٹھاٹھ غماں پھر آئی
 عارف پڑھ شکرانہ ہر دم یار آرمز گائی
 دپج اخلاص احد کون پڑھیم پائیم صد صفائی
 خواجہ فرید اردو سرائیکی کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ اچھے عطا اور مقرر بھی تھے۔ چنانچہ آپ کے
 ملفوظات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے آپ کا مجموعہ کلام "دیوان فریدی"
 کے نام سے موسوم ہے جس میں اردو کلام بھی شامل ہے جو غزلوں، قطعات، رباعیات اور نعتوں پر مشتمل ہے۔
 آپ کا دوسرا دیوان سرائیکی زبان میں ہے اور کافینوں کی صورت میں ہے۔ آپ کے اردو دیوان کی نسبت
 سرائیکی کلام کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ نثر میں آپ کا ایک رسالہ "فرائد فریدی" (فارسی) ہے جو سولو
 ولایت سے متعلق آپ کے افادات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے
 دستیاب ہوئی جو کہ مطبع محمدی مجتبائی لاہور سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی۔ آپ کی ایک اور کتاب "منائب
 فریدی" ہے جو کہ دستیاب نہیں ہے۔ یہ آپ کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔ آپ کی ایک کتاب "منائب
 محبوبیہ" (فارسی) ہے جو آپ کے والد خواجہ خدابخش کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ احمد سعید چشتی
 نے کیا اور اے انجمن فکر فرید کوٹ مٹھن نے روحانی آرٹ پریس سے شائع کروایا ہے۔

دو دھرجات کا ایک مجموعہ بھی خواجہ فرید سے منسوب کیا جاتا ہے جس کا عنوان "دو دھرجات فریدی"
 ہے لیکن اس بارے میں محققین کا فیصلہ ہے کہ آپ نے دو دھرجے نہیں کہے چونکہ یہ معانی اور سوز و گداز
 کے لحاظ سے آپ کی شاعری کے پائے کا ہے اس لئے اکثر اس کو خواجہ فرید سے منسوب کیا جاتا ہے۔
 خواجہ فرید کے وہ ملفوظات جو آپ مجلسوں میں مریدوں کے سوال و جواب کی صورت میں فرماتے
 تھے اسے ان کے مرید اور خلیفہ مولانا رکن الدین نے اشارات فریدی کی صورت میں فارسی زبان میں
 پانچ حصوں میں مرتب کیا ہے۔ اس کے پہلے چار حصے تو شائع ہو چکے ہیں لیکن پانچواں حصہ ابھی نہیں

حاصل ہے۔ "کوہ غم" در بیان سفر بیت اللہ شریف و مدینہ منورہ تا ۹ (قلمی نسخہ) از فقیر محمد عارف (باقی مآثریہ لکے صفحہ پر)

چھپا۔ مجھے اس کا پانچواں حصہ جناب اسد نظامی کی ذاتی لائبریری سے قلمی صورت میں دستیاب ہوا۔ رکن الدین نے خواجہ فرید کے ملفوظات "اشارات فریدی" المعروف "مقابلہ میں المجالس کے نام سے فارسی میں مرتب کئے۔ انہوں نے موضوعات کے حوالے سے ترتیب قائم نہیں کی بلکہ جیسے جیسے انہوں نے بذات خود سنا انہیں مواقع کے مطابق، درس کے عنوان کے تحت مرتب کر دیا۔ یہ عنوان ہے "مقبوس ہر مقبوس" کے شروع میں وقت، دن، مہینے کو ظاہر کیا گیا ہے۔ "اشارات فریدی" کے آخری چار حصوں کا اردو ترجمہ کپتان واحد بخش سیال نے "مقابلہ میں المجالس کے نام سے کیا ہے۔ جسے اسلاک بک فاؤنڈیشن نے شائع کیلئے اور انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سی شیکل نے کیا ہے جسے بزم ثقافت، ملتان نے شائع کیا ہے۔ خواجہ غلام فرید نے تمام عمر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے فیضان سے منور ہونے کے لئے دور دور سے لوگ چاچراں شریف آتے اور بار بار دہشتے۔ آخری عمر میں آپ کو ذیابیطس ہوا اور کچھ عرصے میں گھٹنے پر دہبل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس مرض نے شدت اختیار کر لی۔ ربیع الثانی کے مہینے میں اس مرض میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ علامہ نسیم طاہر آپ کی زندگی کے آخری دن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"حضرت فرید بوقت سحر چار شنبہ ۲ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ پنگ پر سوئے ہوئے تھے دایاں ہاتھ سینے پر تھا۔ کمال استغراق کی حالت تھی اور شغل اسم ذات میں مصروف تھے۔ ضربات پے در پے جاری تھیں اسی حالت میں سرعت تنفس کا احساس کر کے حاضرین اور رکن الدین بھی روتا رہا۔ صبح کی نماز کے وقت دلاور خان خادم خاص نے دوائی پینے کے لئے عرض کیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھ کر اشارہ فرمایا اس نے دوائی پلائی۔ اشراق کے وقت برکت علی ربانی نے کچھ شعر پڑھنے کی اجازت چاہی تو اوقت آپ نے انکار فرما دیا پھر عرض کیا پھر بھی منع فرمایا۔ ضعف کمال تھا جو بہت جلد بڑھنے لگا حتیٰ کہ دوپہر کے وقت مایوسی کے آثار پیدا ہوئے اور مغرب کے وقت رحلت ہوئی۔ ۱۱۔"

۳۱، اوراق اور ۱۴۶ صفحات) اشعار کی تعداد ۶۸۰، ۱۰۱۳ھ کا تحریر کردہ جناب حبیب فائق کی ذاتی لائبریری

سے دستیاب ہوا۔ مقدمہ دیوان فرید از علامہ نسیم طاہر، ص ۱۰۶

خواجہ غلام فرید نے ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ / ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار کوٹ مٹھن میں ہے۔

خواجہ فرید بختیت شاعر

حضرت خواجہ غلام فرید بنیادی طور پر سرائیکی زبان کے شاعر ہیں لیکن جیسا کہ ان کے سوانحی حالات میں صراحت کی جا چکی ہے کہ وہ ہفت زبان تھے اور بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانیں جانتے تھے۔ اپنی مادری زبان سرائیکی کے علاوہ فارسی، عربی، سندھی، ہندی، اردو، پنجابی اور انگریزی وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ سرائیکی کلام کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں اردو کلام بھی ملتا ہے۔ سندھی اشعار اور ہندی گیت کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب ایک جمالی صوفی تھے۔ اس لئے ذوق و وجدان کی دولت سے پوری طرح مالا مال تھے عشق حقیقی کی تمام منزلوں سے آشنا اور سلوک کی راہوں سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی لذتوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ ان کی زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دوشیزہ کی محبت میں سرشار رہے۔ اس لئے وہ ان تمام لطیف جذبوں سے پوری طرح واقف تھے، جو ایک عاشق کو عشق و محبت کی کشمکش میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ان کے کلام میں عشق مجازی کی گھاتیں، لمحات وصال کی کیفیات، ہجر و فراق کی کلفتیں، محبوب کے ناز و ادا، ظلم و ستم اور تیرنگاہ کے لگائے ہوئے زخموں کی تصویریں ملتی ہیں وہاں عشق حقیقی اور سلوک کی مسافروں کے تمام حوالے بھی پائے جاتے ہیں یہ دونوں پہلو اور ان کی جزئیات محض سرائیکی شاعری تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کی اردو شاعری میں بھی یہی جذبے کا رفرما دکھائی دیتے ہیں۔ ہم یہاں خواجہ صاحب کی سرائیکی شاعری کا محض جائزہ پیش کرتے ہیں اس لئے کہ ان کی سرائیکی شاعری پر بے شمار کتابیں اور مضامین موجود ہیں جن میں نہ صرف ان کے سرائیکی کلام کی وضاحت اور شرح کی گئی ہے بلکہ اس شاعری کے مختلف موضوعات اور مضامین پر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔

۱۔ تاریخ وفات کے بارے میں تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) روح فرید از رفیق خاور جگانی (۲) خواجہ غلام فرید (حیات و شاعری)

از مسعود حسن شہاب -

سرائیکی شاعری

خواجہ فرید کی شاعری کے کئی رنگ ہیں۔ ایک رنگ وہ ہے جس میں تصوف، مسک طریقت، رشد و ہدایت، انسان دوستی اور اخلاق کا انمول خزانہ موجود ہے اسکو حقیقت کا رنگ بھی کہا جاسکتا ہے اور اسی بنا پر خواجہ صاحب کو صوفی شاعر، تسلیم کیا گیا لیکن اس شاعری میں خواجہ صاحب کا رویہ تنگ نظر ملا یا خشک زاہد کا نہیں بلکہ ایک وسیع المشرب، انسان دوست اور قول و فعل میں یک رنگ انسان کا ہے۔ انہوں نے شریعت، طریقت اور روحانیت کو سماجی زندگی سے ماورا تصور نہیں کیا بلکہ ان کو ہم رنگ بنا دیا۔ پھر تصوف کے باعد الطبیعیاتی مسائل، معجزات اور اورائے عقل و قوعات کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا بلکہ تصوف کے اس صحیح مفہوم کو موضوع شعر بنایا جس نے صوفیائے کرام کو انسان دوستی، محبت، اخلاص، شرافت، خدمت اور ریاضت کے عظیم جذبوں سے آشنا اور ہمکنار کیا۔ تصوف میں بلاشبہ بے ثباتی کا ثبات، جبرِ مہمیت، احساس فنا، نفی ذات اور آرزوں کی پائمالی جیسے سلبی اور منفی رویوں کو تقویت ملی۔ معدومیت کے مقابلے میں داخلیت کا رجحان عام ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان رویوں کے پیچھے ملوکیت اور آمریت کے نظاموں کے تحت مظالم، سیاسی خلفشار، سماجی بد نظمی، انسانی خون کی ارزانی، فکری انتشار اور عدل و انصاف کے فقدان جیسے اسباب و عوامل کار فرما تھے۔ تاہم کسی بھی صورت میں تصوف کو فرار، مردم بیزاری اور رہبانیت کے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ صوفیاء کی انسان دوستی، حلم و شرافت، مردت و اخوت انکساری، خدمت گزاری اور وسیع المشرب کو بہر طور زندگی کے مثبت رویوں اور شریف جذبوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ خواجہ فرید کے یہاں یہی جذبے اور یہی رویے عام ہیں اور یہی ان کے کلام کا نمایاں رنگ ہے۔

کچھ طے راز انوکھیاں گھاتاں

بہسی خوب بتایاں باتاں

لمن الملک دا دورہ آیا ہا

گم تھیاں کوڑیاں ذات صفاتاں

ترجمہ: پیر و مرشد نے مجھے عجیب و غریب باتیں بتائی ہیں جس میں پوشیدہ راز اور مخفی مقامات شامل ہیں۔ دنیا کے بھانت بھانت کے فرقے اور گروہ سب مٹ گئے اور عالم العینب عالم

حصہ: دیوان فرید جلد اول مرتبہ نورا احمد فریدی، کافی نمبر ۲، ص ۱۵۹، مطبوعہ قطر الادب، جگودالہ، ملتان۔

شہود میں تبدیل ہو گیا، یعنی ہر وقت حضورِ صوری حاصل ہے۔

خمر طہروں پی پیلے

تھیو سے عاشق مست یگانے

بھل گئے صوم صلوٰۃ دو گانے

زندہ مشرب ساگ رسایا (کافی نمبر، ص ۱۵۹)

ترجمہ :- پاکیزہ محبت کی شراب پی کر ایک بے مثال عاشق بن گئے اور مشاہدہ جمال بے مثال سے اس قدر مدہوش ہوئے کہ بے خودی اور محویت طاری ہوئی ہے کہ نماز گزارنے کا ہوش تک نہیں رہا اور زندگی مسک کا ساگ رسایا ہے۔

دل آزاد ڈٹھم تعلیدوں

جب ہک رمز ملی توجیدوں

سرسی روحی وعظ سنٹیا (کافی نمبر، ص ۱۶۰)

تھی کہ فرد فرید، فریدوں

ترجمہ :- جب مست توجید کا ایک راز سمجھ میں آ گیا تو میرا دل دوسروں کے عقائد اور پیردی سے آزاد ہو گیا (غلام) فرید سے جب فرید فرد (قنانی اللہ) ہو گیا تو وہ بھی سرسی روحی کا وعظ سنٹیا لگ گیا۔

سن سمجھ رے زاہد جاہدوں

ہن عشق دے اے کلمات عجب (کافی نمبر، ص ۲۲۶)

ترجمہ :- اے زاہد جاہد انسان! سن اور سمجھ کہ یہ عشق کی باتیں عجیب ہیں۔

رکھ ملت ابن العربی دی (کافی نمبر، ص ۲۴۵)

ٹھپ فقہ اصول عقائدوں

ترجمہ :- فقہ اصول اور عقائد کی کتابوں کو بند کر کے رکھ دے اور ابن العربی کا مسلک توجید و جوری اختیار کر!

اعلام عجب، ابہام عجب (کافی نمبر، ص ۲۵۴)

ادہام رعب، ابہام عجب

ترجمہ :- ادہام، ابہام، اعلام، اور ابہام یہ تمام کیفیات عجیب ہیں۔

جامہ جہاں شو پاک بہ بادہ

سٹ خرقتہ بچھ گھت سجادہ

کردم پیرمغاں تاکید (کافی نمبر، ص ۳۵۴)

ترجمہ :- مجھے مرشد کریم نے تاکید فرمایا ہے کہ درویشی کے لباس کو اتار کر پھینک دے اور سجادہ (مصلیٰ) کو آگ میں ڈال دے۔ دل کے لباس کو شراب محبت سے دھو کر پاک و صاف کر۔

ص ۱۰۰ - ان کا فیوں کا ترجمہ نور احمد فریدی کے ترجمہ شدہ "دیوان فرید" سے لیا گیا ہے۔

ملاں مارن سخت ستاون کچھڑے راز دا بھیت نہ پاون
 بے بس شودے ہن معذور (کافی نمبر ۳۷، ص ۳۸۳)
 ترجمہ: علماء نظر اہر سخت تنگ کرتے ہیں، پوشیدہ اسرار و رموز کو سمجھ نہیں سکتے۔ بے چارے بے بس
 در معذور ہیں۔

ملوانٹے دے وعظ نہ بھانٹے بے شک ساڈا دین ایمانے
 ابن العربی دی دستور (کافی نمبر ۳۷، ص ۳۸۳)
 ترجمہ: ملاؤں کے وعظ پسند نہیں آتے، بے شک ہمارا دین و ایمان ابن العربی کا توحید و جود ہے
 ہم انہی کا مشرب رکھتے ہیں اگرچہ ارباب نظر اہر کم فہمی کے سبب اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔
 حاجت نہ صوم صلوات دی خواہش نہ حج زکوٰۃ دی
 چاہت نہ ذات صفات دی ہک شان وحدت جی مرک (کافی نمبر ۶۴، ص ۵۲۷)
 ترجمہ: ہمیں نہ نماز روزے کی حاجت ہے اور نہ حج اور زکوٰۃ کی خواہش ہے بلکہ وہ ایسے مقام
 رفیع پر فائز ہیں جہاں انہیں بوجہ مشاہدہ الوزار جمال الہی اپنے تن بدن کا ہوش تک نہیں!

پی کر فریدی جام توں نقی زدمست مدام توں
 ڈینہہ ڈینہہ دودھار کھ گام توں واہ واہ کرے ساری خلق (کافی نمبر ۶۴، ص ۵۳۷)
 ترجمہ: فرید کا کیف اور پیالہ پی کر تو مست السرت زدن جا۔ اور روز بروز قدم آگے کوڑھاتا تاکہ
 ساری مخلوق بے اختیار واہ واہ کر لٹھے۔

ابن العربی دی رکھ ملت ٹھپ رکھ فقہ، اصول مسائل (کافی نمبر ۶۴، ص ۵۴۵)
 ترجمہ: اے سانک! فقہ اور اصول کی کتاب بند کر کے رکھ دے۔ صرف ابن العربی کا مسلک اختیار کر
 سٹ سک غیر خدا دی سب شے دہم خیال (کافی نمبر ۶۴، ص ۵۴۶)
 ترجمہ: اللہ جل جلالہ کے سوا سب کچھ بھول جا کیونکہ ان تمام چیزوں کی حقیقت دہم و خیال کے
 سوا کچھ نہیں اور ان کا وجود غیر اعتباری ہے۔

خواجہ فرید کی شاعری کا دوسرا رنگ عشق و محبت کا ہے آپ عشق و محبت کے جذبوں کو عام
 کرنے والے شاعر ہیں اور کائنات میں ہر طرف عشق کا ظہور دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال اور خواجہ
 فرید کے خیالات میں بہت سی اقدار مشترک موجود ہیں۔ مثلاً دونوں شاعر عقل پر عشق کو فضیلت دیتے

ہیں۔ دونوں رجائی اور امید پرست شاعر ہیں۔ دونوں کے یہاں حرکت و عمل کی تلقین ہے۔ دونوں کٹھ ملائیت کے خلاف ہیں۔ دونوں سماع اور معاشرے کی اصلاح کا نظریہ رکھتے تھے۔ دونوں تزغیبات دینی، منافقت اور آلائشوں سے پاک معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں انسان دوستی اور دردمندی کے جذبے فراواں ہیں۔ ان مثالوں میں یہی مضامین ملاحظہ فرمائیے

عشق ہے دکھڑے دل دی شادی عشق ہے رہبر مرشد ہادی

عشق ہے ساڈا پیر، جس کل راز سمجھایا (کافی نمبر ۸، ص ۱۸۷)

ترجمہ:۔ عشق دکھی دل کی خوشی ہے اور عشق ہی ہمارا پیر و مرشد ہے جس نے ہمیں تمام اسرار و رموز آگاہ کر دیا ہے۔

عشق لگا گھر دسریا زرد سری دسریا (کافی نمبر ۱۲، ص ۲۰۷)

ترجمہ:۔ عشق نے وہ محویت طاری کر دی ہے کہ گھر، زرا اور وہ سب بھلا چکی ہوں۔

دیر، کشت، دوارہ، مندر مسجد، منبر دسریا (کافی نمبر ۱۳، ص ۲۰۹)

ترجمہ:۔ دیر و کلیسا اور مسجد مندر، بلکہ منبر تک سب بھول گئے

دل پریم نگر ڈوں تانگھے جتھاں پینڈے نخت اڑانگے

ناں راہ فرید نہ لانگھے ہے پنڈہ بہو مشکل دا (کافی نمبر ۱۵، ص ۲۱۶)

ترجمہ:۔ دل محبت کے شہر کی طرف کھینچا جا رہا ہے جس کا سفر بے حد دشوار گزار ہے۔ اے فرید اس نگر کی طرف جانے کے لئے نہ راستہ ہے، نہ گزرگاہ اور سفر بھی انتہائی کٹھن ہے۔

پڑھ بسم اللہ کھولیم سرکوں چاتم عشق اجارا (کافی نمبر ۱۸، ص ۲۳۲)

ترجمہ:۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر اپنے سر کو یار پر سے تھدق کر دیا اور عشق کا ٹھیکہ لے لیا۔ ہے ہے ظالم نیت مرادی

تھولے کھوٹ کھا (کافی نمبر ۱۹، ص ۲۳۸)

ترجمہ:۔ ہے ہے ظالم! جیسی نیت ویسی مراد۔ میرے ساتھ دھوکہ فریب نہ کر!

چالیس بیچ فریبیں والی

(کافی نمبر ۱۹، ص ۲۳۸)

ڈھولن ریت دٹا

ترجمہ:۔ اے محبوب! یہ سچیدہ، پرکار راہ و رسم محبت تبدیل کر دے۔ (اس سے بہت دکھ ہوتا ہے)

بے ٹھاہی گزران نہ بھلی

(کافی نمبر ۱۹، ص ۲۴۵)

بٹھ پیا کوڑ بٹھا

ترجمہ :- نا اتفاقی اور مخالفت کی گزران اچھی نہیں۔ جھوٹے نباہ کو تو بھاڑ میں ڈال دینا چاہیے۔

چاڑھیں توڑ نہ راہ وچ روئیں

(کافی نمبر ۱۹، ص ۲۴۶)

رکھنا یاد وفا

ترجمہ :- اے محبوب! آخری منزل تک میرا ساتھ دینا، راستے میں چھوڑ نہ دینا، اور میری وفا یاد رکھنا۔

گچھ راز دا بھیت نہ پاؤں

ملاں مارن سخت ستاؤں

(کافی نمبر ۳، ص ۳۸۳)

ترجمہ :- عطاے ظواہر سخت تنگ کرتے ہیں، پوشیدہ اسرار و رموز کو سمجھ نہیں سکتے بے چارے بے بس اور معذور ہیں۔

اور معذور ہیں۔

بے شک ساڈا دین ایچلنے

طوائے دے وعظ نہ بھانٹے

(کافی نمبر ۳، ص ۳۸۳)

ترجمہ :- ہمیں ملاؤں کے وعظ پسند نہیں آتے۔ بے شک ہمارا دین و ایمان ابن العربی کا توحید

وجودی ہے۔ ہم انہی کا مشرب رکھتے ہیں۔ اگرچہ ارباب ظواہر کم نہی کے سبب اس حقیقت کو

سمجھ نہیں سکتے۔

خواجہ صاحب عشق کو رہبر مانتے ہیں۔ عقل کی حجت بازی، لیت و لعل، خود پرستی اور خود غرضی

سے بے نیاز عشق کی سرمستی اور بے خودی میں ڈوب جلتے ہیں۔

لیت و لعل دی ارکھر کوں

پیش کیتا جس نہم فکر کوں

(کافی نمبر ۶، ص ۱۹۶)

کر کر شکر نہ ڈتوں سر کوں

ترجمہ :- جس نے (عشق الہی میں) عقل کی توجیہات اور فلسفیانہ علم سے کام لیا۔ تہات کی اگر مگر میں

پر گیا۔ اس کی عطا کردہ زندگی پر شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی خوشی اپنا سر راہ حق میں پیش نہ کیا تو

ایسا شخص راتے ہی میں ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا، عشق کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

عشق ہے ڈکھڑے دل دی شادی

عشق ہے رہبر مرشد ہادی

(کافی نمبر ۸، ص ۱۸۷)

ترجمہ:۔ عشق دکھی دل کی خوشی ہے اور عشق ہی ہمارا پیر و مرشد ہے جس نے ہمیں تمام اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا ہے۔

عشق لگا گھر و سریا زرد سری و سریا (کافی نمبر ۱۳، ص ۲۷)

ترجمہ:۔ عشق نے وہ محبت طاری کر دی ہے کہ گھر، زرا اور در سب بھلا چکی ہوں :-

دیر، کشت، ڈوارہ، مندر مسجد، منبر و سریا (کافی نمبر ۱۳، ص ۲۰۹)

ترجمہ:۔ دیر و کلیسا اور مسجد مندر، بلکہ منبر تک سب بھول گئے۔

عشق نہیں ہے تیر بلا دا نظلیں چوٹ چلیندا (کافی نمبر ۱۴، ص ۲۱۱)

ترجمہ:۔ یہ عشق نہیں ہے بلکہ کوئی بلا کا تیر ہے جو ظالمانہ چوٹ لگاتا ہے۔

ناز ادا کچھ کرے نہ ٹالا حکمیں برہوں بھیندا (کافی نمبر ۱۴، ص ۲۱۱)

ترجمہ:۔ محبوب کے ناز و ادا بالکل باز نہیں رہتے۔ حکما و عشق کو ہمارے تعاقب میں لگتے ہیں۔

سوز و فراق تے درد اندیشے تن من پھوک جیندا (کافی نمبر ۱۴، ص ۲۱۲)

ترجمہ:۔ سوز و فراق اور درد اندیشے تن بدن اور دل کو پھونک کر جلا دیتے ہیں۔

بجر فرید کیتی دل زخمی دوست نہ مرہم لیندا (کافی نمبر ۱۴، ص ۲۱۲)

ترجمہ:۔ اے فرید! بجر نے دل کو زخمی کر دیا ہے اور دوست کی سرد مہری کا یہ عالم ہے کہ مرہم تک نہیں لگاتا۔

قسم خدادی، قسم نبی دی عشق سبے چیز لذت عجیب (کافی نمبر ۱۴، ص ۳۰۸)

ترجمہ:۔ فرمایا! مجھے خدا اور رسول کی قسم ہے کہ عشق عجیب اور لذت چیز ہے۔

خواجہ صاحب کا عشق محض لذت وصال کا طالب نہیں رہتا اس میں ذوق سفر، پانے کی آرزو

اور طلب کا جذبہ زیادہ نمایاں ہے۔ روہی کی علامت ان کے یہاں وسعت طلبی، وقت طلبی،

شوق سفر اور امکانات کے منکشف کرنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ تھل اور روہی کا یہ سفری تجربہ

ان کے یہاں تخلیقی تجربہ بھی بنتا ہے۔ اور ان کے حوصلوں کو استقامت اور جذبول کو عزم آتما

بھی کرتا ہے۔

تھل مارو پینڈا سارا تقسیم سک بلہانک (کافی نمبر ۱۸، ص ۵۴۸)

ترجمہ:۔ مگر اے دل! تو گھبرا نہیں، اگر جذبہ عشق صادق ہے تو اس خونِ صحر کی مسافت ایک

قدم سے زیادہ نہیں ہے۔

تتی تھی جو گن چودھار پھراں
ہند سندھ، پنجاب تے ماڑ پھراں
سج برتے شہر بازار پھراں
متاں یارلم کہیں سانگ سبب (کافی نمبر ۲۲، ص ۲۲۲)
ترجمہ ۱۔ میں سوختہ جگر، محبوب کی تلاش میں ہر طرف ماری ماری پھر رہی ہوں۔ کبھی ہند، سندھ،
پنجاب اور مار واڑ کے جنگل چھانتی ہوں اور کبھی شہروں کے بازوؤں میں ڈھونڈھتی ہوں کہ شاید کسی
بہا محبوب کا کسی لباس میں دیدار ہو جائے۔

سجڑھی سستی کوں جلیں رلایا
ہے پیلے پھیرا نہ پایا (کافی نمبر ۱۶، ص ۲۲۱)
ترجمہ ۱۔ نامراد سستی کو پہاڑوں میں آوارہ پھرایا اور افسوس کہ پیل خان نے پھر ادھر کا رخ بھی نہ کیا۔
ادہ ڈنگرتے جنگل بلیا
رولیم شوق آوارہ (کافی نمبر ۱۸، ص ۲۳۱)
ترجمہ ۲۔ محبوب کی تلاش نے مجھے پہاڑوں، دشوار گزار راستوں اور جنگلوں میں آوارہ بھٹکائے رکھا
ہے۔

پیل تھیوں پاندھی یارا
چھڈ کے کھڑی بروچ
ہردم دتاں درماندی یارا
سے سے روگ اندر دچ (کافی نمبر ۲، ص ۳۲)
ترجمہ ۱۔ اے میرے محبوب! تو مجھے بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا اور میں تیرے فراق
میں سینے کے اندر سینکڑوں دکھ درد لئے ہر وقت تھکی ماری اور پریشانی حال پھرتی ہوں۔
مار دتھل دے ڈکھڑے گھاٹے
گپ کھڈ، کھڑ بن کھوب گئے
رات ڈینہا تڑ پھانندی یارا
رولدی روہ ڈونگر دچ (کافی نمبر ۲، ص ۳۳)
ترجمہ ۲۔ جان لیوا ریگستان کے دشوار گزار راستوں میں تھیلیں قدم قدم پر کھڑ، کھڈ دل دلی ناہموار زمین
اور تکلیف دہ رگزار ہیں۔ رات دن تڑپتی اور، بیابان ہو کر لڈ منڈ پہاڑیوں اور بیابانوں
میں آوارہ اور سرگرداں پھرتی رہتی ہوں۔

یار برد چل کاٹ
رلدی روہ ڈونگر دچ
لا لیں جڑ کر باٹ
دلڑی جان جگر دچ (کافی نمبر ۲۸، ص ۳۳۱)
ترجمہ ۳۔ میں اپنے محبوب پنوں کی خاطر پہاڑوں اور دشوار گزار راستوں میں بھٹک رہی ہوں اس نے
دل، جان اور جگر میں خوب تاک کر تیرا رہے۔

تھی راہی تھل مار و جلیساں لائڈمی تے لس بیلہ دلساں

سنج بر، بار کیتیم گھر بار (کافی نمبر ۳۹، ص ۳۹۵)

ترجمہ: مسافرانہ دار آدم خور صحرا میں قطع مسافت کروں گی اور کبھی لائڈمی اور لس بیلہ کی بادیر پیمائی کروں گی کیونکہ جب سے محبوب جدا ہو لہے میں نے دیرالوں جنگوں اور بیابانوں کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔

پنج ڈڈنٹسا، جے تیس جسیاں جے دل دلساں کافر تھسیاں

گل دپج پام پریت مہار (کافی نمبر ۳۹، ص ۳۹۷)

ترجمہ: جب تک زندہ ہوں کچھ جانے کی تگ دو جاری رکھوں گی۔ اگر اس راستے سے لوٹ آئی تو یقیناً کافر سمجھی جاؤں گی کیونکہ میں نے عشق و محبت کی ڈوری کو گلے میں ڈال لیا ہے۔

ادکھیاں گھاٹیاں گاٹیاں چاٹیاں لاهیاں چاڑھیاں سمھاٹھ کاٹھیاں

سجڑوں گھڑوں سو سو غار (کافی نمبر ۳۹، ص ۳۹۸)

ترجمہ: محبوب کی تلاش میں بہت دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر ملی لڑکی سلیں خوفناک منظر پیش کرتی ہیں۔ راتے کے آثار چڑھاؤ بے حد مشکل اور ان کے دونوں پہلوؤں میں سو سو گہرے غار ہیں جنہیں طے کرنا ہفت خوان طے کرنے سے کم نہیں۔

خواجہ فرید کی شاعری کا تیسرا رنگ فطرت اور وسیب کے مناظر کی تصویر کشی اور ان سے حزن اور رومان کی کشید کا ہے۔ خواجہ صاحب نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ ماحول روہی کلبے جہاں پل کیکر، ٹنڈمینڈ، درخت، سائے، سکوت، پرندے، سائیں سائیں کرتی ہوائیں، دور تک پھیلے ہوئے

کھیت، رت بدلتے موسم، مناظر اور کیفیات کا تغیر موجود ہے۔ فطرت کا یہ تلون انسانی مزاج اور جذبوں کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ انسان کی داخلی کیفیت کے آثار چڑھاؤ کے حوالے سے مناظر کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ مناظر کے تلون سے خود انسانی مزاج بھی متاثر

ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی شاعری میں یہ روہی... ایک ایسا صحرا ہے جو عاشقانہ شاعری کے لئے زبردست محرک رہا ہے عشق و جنوں اور صحرا کا تعلق آج کا نہیں صدیوں کا ہے۔ خواجہ فرید کی

شاعری میں روہی کا حوالہ وحشت اور دیوانگی سے بڑھ کر حزن اور دلکشی کا حوالہ بنا ہے اس لئے کہ خواجہ فرید روہی کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک معصوم بچے کی

طرح مچل اٹھتے ہیں۔ یہ مناظر ان کے لئے زبردست تخلیقی تجربہ بن جاتے ہیں۔

تندرے چکین گیرے گھوکن
جوکھاں ترکھاں لونمبر کوکن
گوہیں شوکن سانھے پھوکن
نانگیں دی شوں شوں ہے یار (کافی نمبر ۴۲، ص ۴۱)
ترجمہ :- اے دوست! روہی کی یہ حالت ہے کہ ہر طرف جھینگر کی سیٹیاں سناتی دیتی ہیں۔ فاختاؤں
کی گھوگھو، مگر بگڑا اور لومڑوں کا شور و غل۔ گوہ ساڈوں کی مخصوص آوازیں ساپنوں کا پھنکارنا اور
شوں شوں کرنا۔ انسانی طبیعت پر خوف دہراں طاری کر دیتا ہے۔ اس بھیاںک ویرانے میں سواتے
عاشقان صادق کے اور کون رہ سکتا ہے۔

سوحنیاں ٹھیریاں ٹہڑے ٹھڑے
ناز و والے کھڑے وڑے
باہیں ٹوبھے پاڑے گھڑے
ڈٹھڑیں ڈو کھڑاؤں ہے یار (کافی نمبر ۴۲، ص ۴۱)
ترجمہ :- اے محبوب اس صحرائی ماحول میں خوشنما کھنڈر ٹیلے اور لمبی چوٹیاں، کتنی با عظمت اور پر وقار
معلوم ہوتی ہیں۔ نرم و نازک نہری ریت، زرد رنگ کے روڑے کٹاؤں اور عمیق شکاف، کٹناؤں
منظر پیش کرتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

روہی محض بشارت درسون
مرسوں، بھرسوں مول نہ ڈرسوں
بیدرداں دی دلڑی ترسون
ڈینہہ راتیں گھوں مول ہے یار (کافی نمبر ۴۲، ص ۴۱)
ترجمہ :- اے دوست! صرف روہی ہی وہ مقام ہے جہاں دیدار یار کی بشارت ملتی ہے اس لئے
خواہ ہماری جان کیوں نہ چلی جائے اور ہم مر مٹ کر ریزے ریزے کیوں نہ ہو جائیں وہاں جانے
سے باز نہیں آئیں گے۔ البتہ بے دردوں کے سبب ہم پر تیر مردگی ضرور چھاتی ہوتی ہے اور دل ڈالنا
ڈول ہو رہا ہے۔

سندھڑے رھٹن نہ ڈینڈیاں
لگڑیاں تانگھاں پل پل (کافی نمبر ۴۵، ص ۵۸۶)
ترجمہ :- جب سے روہی کے آباد ہونے کی خبر ملی ہے دل بے اختیار اس طرف کھچا جا رہا ہے اور
روہی کی کشش سندھ میں رہنے نہیں دیتی۔

روہی میگو ملہارٹاں
کھدیاں کھنٹیاں آجکل (کافی نمبر ۴۵، ص ۵۸۶)
ترجمہ :- روہی کے ریگزاروں پر آج کل بادلوں کی گھٹائیں چھاتی ہوتی ہیں اور بجلیاں کوند رہی ہیں
لائٹے پھوگ فرید دے
درد دلیں دے درمل (کافی نمبر ۴۵، ص ۵۸۶)
ترجمہ :- روہی کے لائٹے اور پھوک جیسے پرندے بھی فرید کے درد دل کا علاج ہیں۔

ردہی دھڑی مینگہ ملہاراں
 بڑے بوٹے تھیاں گلزاراں
 شالا موزم دوست ملہاراں
 بھاگ بھاگ دی موسم آئیم (کافی نمبر ۷۶، ص ۶۲)

ترجمہ ۳۔ بارش کے فیضان نے ردہی کو شاداب کر دیا ہے اس پر بادلوں نے سایہ کر رکھا ہے اور ملہار
 گائے جا رہے ہیں۔ ایک ایک بوٹا مجسم گلزار بنا ہوا ہے۔ خدا کرے میرا محبوب بھی اپنے اونٹ کی مہار
 ادھر کو موڑ دے کیونکہ میرے بخت نے پٹا کھایا ہے اور بھاگ بھاگ کا موسم آ گیا ہے۔

پھر انہیں مناظر میں ایک ایسا وسیب دکھائی دیتا ہے جو پتے سامنے تہذیبی اور ارضی تناظر
 لے کر ابھرتا ہے۔ ٹیاں بلوتی ٹیاں، رل مل پیلوں چنتی ہیلیاں، جھمڑا لٹی السھر دوشیزا میں، گل پھل
 سے سنگاری ہوئی ردہی، ردہی کے عاشقانہ ملاپ اور دھڑے، لسی سے خاطر تواضع، بھیر بکریاں
 یلے اور گائیں چرتے ہوئے چر رہے اور چرواہیاں، تھل مارو کی مسافیتیں طے کرتی سستی پھر ویرانے، بیابان
 چوستان قطار در قطار کر ہوں، طے، ... یہ سب جولے ایک مخصوص وسیب اور کلچر کو سامنے کر دیتے
 ہیں۔

دچ ردہی دے رھندیاں
 نازک نازو جٹیاں
 راتیں کرن شکار دیں دا
 ڈینہا دلوزن ٹیاں
 چھڑن بھیراں بکریاں گائیں
 یلے گابے کٹیاں
 کئی میکین مسافر پھاتے
 چور کیتونے ترٹیاں

(دیوان فرید (جلد دوم)، کافی نمبر ۱۳۶، ص ۱۳۹)

آچنوں رل یار
 پیلوں پکیاں فی دے
 کئی بگڑیاں، کئی ساویاں پیلیاں کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں پھلیاں
 کئی ادویاں گلنار کٹیویاں رتیاں فی دے (دیوان فرید (جلد دوم)، کافی نمبر ۱۶۷، ص ۲۷۰)

لیے ردہی یار ملا ڈری دے
 شالا ہوتے ہر دم سا ڈری دے
 دنج بیسون لٹری گا ڈری دے
 گھن اپنے سو معنے ستیں کوں

(کافی نمبر ۹۲، ص ۶۷۲، جلد اول)

وادی ایمن تھل دے چارے
 جتھاں برد چل کر ہوں قطارے

ککڑے ٹیرے صن کوہ طور (کافی ۳۷، ص ۳۸۲، جلد اول)

گزری ڈکھ ڈوھاگ دی داری

دوہی گل پھل نال سنگاری

مدستانی ڈینہہ مہساری

باد شمالی رکے دو

(کافی نمبر ۱۳۹، ص ۱۸۵، جلد دوم)

جاں ڈیکھاں جھڑ مینہ کن ٹمن کوں

دوواں کر کر یاد سخن کوں

اکھیاں بلکن منہ ڈیکھن کوں

گل لانون کوں پھکن باہیں

(کافی نمبر ۸۹، ص ۶۵۳، جلد اول)

خواجہ فرید کا چوتھا رنگ رومانی رویوں کا اظہار ہے یعنی ایک نئی دنیا کی تلاش، روایت سے بغاوت و فرد جذبات، فکر و خیال کی آزادی، منفرد ہونے کا جذبہ اور حسن سے لطف اندوز اور متمتع ہونے کی آرزو ہے۔ ان کا خواب ایک ایسی بستی ہے جو سرسبز و شاداب ہے اس میں سوکھی سڑی بوٹیاں اور خار مکیلاں نہیں ہیں بلکہ نئے نئے شگوفے اور نئی کونپلیں ہیں۔

تھیاں سرسبز فریدیاں جھوکاں

بھجوں خنکی چائی سوکاں

نند نماینو کھیر، مولا ماڑوسایا (کافی نمبر ۸، ص ۱۹۰)

ترجمہ: فرید کے ٹھکانے آباد و شاداب ہو گئے۔ سوکھے سڑے پودوں میں پھر زندگی کے آشنا نظر آنے لگے کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ گھاس کی فراوانی سے شیردار مویشیوں کے تھنوں میں دودھ نہیں سماتا۔ شکر ہے کہ مولا کریم نے اپنے فضل و کرم سے ملک ماڑ (ریگستان) کو آباد کر دیا ہے۔

سو سو چھاں گاں لکھ لکھ چھیرو

دو ٹھڑے دی وہ ڈیون پنہ جھیرو

دوہی تھی آباد جدید (کافی نمبر ۳۱، ص ۳۵۲)

ترجمہ: مسافروں کے ذریعے پتہ چلا ہے کہ دوہی میں خوب بارش ہوئی ہے اور وہ اس قدر سرسبز و شاداب ہے کہ ہر طرف ہر یاد دل ہی نظر آتی ہے اور جگہ جگہ سینکڑوں مویشیوں کے ریوڑ اور لاکھوں چرواہے خوش و خرم نظر آ رہے ہیں۔

سانول آویں نال ترسانویں

موسم چیتیر بہاری دو یار

گھر گھر تھئی گلزاری دو یار (کافی نمبر ۲۶، ص ۲۲۸)

ترجمہ: اسے طبع محبوب! اب مجھے زیادہ نہ ترسا اور اگر گلے لگ جا کیونکہ اب تو بہار کا مہینہ چیت شروع ہو چکا ہے اور ہر گھر میں گل و گلزار نے رنگ جھا رکھا ہے۔

سائفل ڈینہہ سہاگ دے ہر دم مینگھ ملہار (کافی نمبر ۵۴، ص ۴۷۴)
ترجمہ: ساون کے دن عیش و مہرت کے دن ہیں آسمان ہر وقت ابر آلود رہتا ہے۔

پلہریا نٹی پیوں تھیاتھل باغ بہار
ترجمہ: باران رحمت نے روہی کو باغ و بہار بنا دیا ہے آؤ چل کر جو ہڑوں سے برسات کا پانی
پئیں۔

تھیاں سر سبز فرید دیا جھوکاں ہروں سبز تھیاں دل سوکاں
بختی طاگ دلانی دویار (کافی نمبر ۴۴، ص ۴۲۶)
ترجمہ: فرید کی جھوکیں سر سبز ہو گئیں اور خداوند عالم کے فضل و کرم سے سوکھے اور جلے سڑے پودوں میں
پھر جان پڑ گئی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور بخت یاد رہے۔

ساون آیا، روہی و ٹھڑی، بار تھی گلزار (کافی نمبر ۶۱، ص ۵۱۳)
ترجمہ: ساون آیا، روہی شاداب ہو گئی اور جنگل و بیاباں پر پھولوں کی کثرت سے بہشت بریں کا
دھوکہ ہونے لگا۔

خواجہ فرید کے اس خواب نے انہیں ایک نئے دور کی تعبیر دکھائی ہے اور اسی لئے روہی کے
لامحدود مسعود، چولتان کی ویرانیوں اور بنجر زمینوں کی بے آباد بستیوں کو دیکھ کر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ
سے نہیں چھوڑتے یہ گیت گنگناتے صحراؤں کے غیر مختتم سفر پر رواں دواں رہتے ہیں۔

صن تھی فرید اشد دل
موجھاں کوں نہ کریا دل
جھوکاں تھیں آباد دل
ایہا میں نہ دھس ہک منٹریا۔

۱۔ سرائیکی شاعری کی تشریحات اور تنقیدات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) "پریت مہار" مرتبہ کریم تونسوی، ارشد ملتان، ریاض الود، مطبوعہ بزم ثقافت ملتان، بار اول ۱۹۶۱ء۔

(۲) "پیر فرید" از حمید اللہ ہاشمی، مطبوعہ تاج بک ڈپو لاہور، بار اول

(۳) "پنجابی کے پانچ قدیم شاعر" خواجہ غلام فرید، بھردوانی اور درد و عالم کا شاعر، از شیخ عقیل (باقی حصہ اگلے صفحہ پر)

اُردو شاعری

صدیق طاہر نے ۱۹۷۲ء میں خواجہ غلام فرید کا اردو کلام ”دیوان خواجہ غلام فرید (اردو)“ کے نام سے مرتب کیا اور اردو اکیڈمی بہاولپور نے اسے شائع کیا، مرتب لکھتے ہیں۔

”تاریخ بہاولپور کی تدوین کے سلسلے میں بہاولپور دستان کے متعدد ممتاز علمی گھرانوں کے ذخیرہ ہائے کتب سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی تو ساتھ ساتھ یہ دیرینہ خواہش بھی بیدار رہی کہ کسی طرح حضرت خواجہ کے اردو کلام کا مکمل ایڈیشن تیار کیا جائے کیونکہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل شائع ہونے والی کتب اب بالکل نایاب ہیں۔ اس سلسلے میں دستان سے ہمارے ادیب دوست حاجی طاہر غنی، بکچر ارگورنمنٹ نارمل سکول، دستان کی ذاتی توجہ سے حضرت خواجہ کے اردو دیوان کا وہ مکمل نسخہ ملا جو مدرسہ اولیہ حامد آباد بہاولپور کا شائع کردہ ہے۔ اس سے پہلے میرے پاس یہی نسخہ موجود تھا۔ لیکن اس کے ابتدائی اور آخری کسی صفحات ضائع ہو چکے تھے اور صرف ۶۰ نمبریں باقی تھیں۔ محترم حاجی طاہر غنی نے جو نسخہ مہیا کیا وہ کل ۲۸ صفحات پر محیط ہے اور

مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی اشاعت اڈل ۱۹۷۰ء۔

(۴) ”خواجہ غلام فرید“ (حیات و شاعری) از مسعود حسن شہاب مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور، بار دوم ۱۹۷۳ء۔

(۵) پیام فرید، ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر مہر عبدالحق (غیر مطبوعہ)

(۶) گوہر شب چراغ، از ابو سعید محمد نور فیروز، مطبوعہ کپور آڈٹ پرنٹنگ پریس در کس لاہور، بار اول ۱۹۱۹ء۔

(۷) ”نقر فرید“ از محمد بشیر اختر، مطبوعہ نقوش پریس لاہور

(۸) ”دیوان فرید“ مرتبہ عزیز الرحمن

(۹) ”دیوان فرید“ مرتبہ نورا احمد فریدی

(۱۰) Kafes Translated by Gilani Kameran

and Aslam Ansari Published by Bazm-e-

Saqafat, Multan, 1st edition, June

1969. ”روح فرید“ از رفیق غادر حبیبانی، مطبوعہ بزم ثقافت، دستان بار اول ۱۹۷۷ء۔

مولوی فیض احمد اسی مہتمم مدرسہ کے زیر اہتمام پاک ایلیٹرک پریس ملتان میں چھپا ہے۔ اس میں مجموعی طور پر خواجہ صاحب کی ۱۰۴ منظومات شامل ہیں اس پر ملنے کا پتہ مدرسہ عربیہ حامد آباد ڈاکخانہ پکا لاڑاں دکھایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ قیام دن یونٹ کے سال ۱۹۵۵ء کے بعد چھپا ہے صحت الفاظ کا اہتمام نہیں کیا گیا اور متن اغلاط سے پر ہے دوسرا اور زیادہ مکمل نسخہ وہ ہے جو شمس الدین منور الدین تاحران کتب ملتان نے منشی رحیم بخش کے زیر اہتمام لاہور پرنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ سال اشاعت ۱۳۴۳ھ درج ہے گو یا خواجہ فرید کی وفات کے ۲۳ سال بعد چھپا ہے البتہ اس پر بحسن صحت تمام مصنف شیوہ کلام، تحریر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اشاعت کے لئے حضرت خواجہ فرید کا اپنا نسخہ حاصل کیا گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بد قسمتی سے کتابت کے بعد کے پردف نہیں دیکھے گئے کیونکہ دوسری اغلاط کے علاوہ کسی جگہ مصرعوں میں الفاظ کی جگہیں خالی چھوڑی ہوئیں ہیں غالباً ابتدائی قلمی تحریر کو کتابت میں نہیں پڑھ سکے۔ علاقہ طالوت مرحوم کے ملازمین سے بھی بعض اشعار کی صحت میں مجھے بہت مدد ملی۔ اس طرح باہمی موازنہ اور مقابلہ کے بعد حضرت خواجہ غلام فرید کا یہ گلدستہ کلام ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ صاحب کلام کے الفاظ پوری صحت کے ساتھ قارئین تک پہنچائے جائیں اور ان کے اشعار بندش الفاظ کی اسی چاشنی کے ساتھ شائع ہوں جو حضرت خواجہ کے عہد میں اچھی زبان کا کامیاب تھا۔

اس اقتباس سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں

- (۱) مرتب کے دل میں حضرت خواجہ کے اردو کلام کا مکمل ایڈیشن شائع کرنے کی خواہش تھی جس کی تکمیل اس دیوان کو مرتب کر کے ہوئی۔
- (۲) نصف صدی سے زیادہ عرصے قبل شائع ہونے والی کتب (غلام فرید) اب بالکل نایاب ہیں۔
- (۳) اس سے پہلے مرتب ہونے والے کم و بیش تمام نسخے نامکمل، متن کی اغلاط سے پر اور صحت

حادثہ "عذر تقصیر" از صدیق طاہر (دیوان خواجہ غلام فرید اردو) ص ۱۱۲، ۱۱۳، مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور

الفاظ سے عاری ہیں۔

۴) مرتب کا دعویٰ ہے کہ موجودہ نسخے میں صاحب کلام کے الفاظ پوری صحت کے ساتھ طبع ہوئے ہیں۔

مرتب کی کچھ باتیں درست ہیں۔ جہاں تک ان کی پہلی خواہش کا تعلق ہے وہ یقیناً نیک خواہش تھی۔ جس کی تکمیل کر کے انہوں نے ایک علمی خدمت انجام دی ہے۔ ان کی تیسری بات بھی بالکل درست ہے کیونکہ میری نظر سے بھی جتنے نسخے گزرے ہیں وہ سب کے سب ناقص اور نامتوم بھی ہیں اور ان خامیوں سے پُر ہیں جن کا ذکر مرتب نے کیا ہے لیکن جہاں تک دوسرے اور چوتھے دعوے کا تعلق ہے وہ صحیح نہیں ہیں یعنی ایک تو یہ کہ

” نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل شائع ہونے والی کتب اب بالکل نایاب ہیں“

جو مجھے خوش قسمتی سے تین نسخے تو ایسے دستیاب ہوئے ہیں جو خود خواجہ فرید کی زندگی میں شائع ہوئے اور ان کو چھپے ہوئے سو سال سے زیادہ ہوئے ہیں، ان کے علاوہ کسی دیگر نسخے بھی ملے ہیں رہا یہ دعویٰ کہ موجودہ نسخے میں صاحب کلام کے الفاظ پوری صحت کے ساتھ طبع ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی درست نہیں ہے، اس لئے کہ موجودہ دیوان بھی متن کی اغلاط سے پر ہے۔ الفاظ کی املا تک درست نہیں ہے۔ اشعار کے اوزان غلط ہیں۔ کتابت کی بے شمار خامیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ ان سب کی تفصیل آگے آئے گی۔ مختصر یہ کہ یہ نسخہ کسی لحاظ سے بھی قابل رشک نہیں ہے البتہ اسمیں شک نہیں کہ موجودہ دیوان میں صدیق طاہر نے وہ سارا کلام یکجا کر دیا ہے جو مختلف دوادین میں بکھرا ہوا اور منتشر صورت میں تھا اور ان کا یہ کارنامہ قابلِ داد ہے۔

مجھے جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے پہلا دیوان وہ ہے جو ۱۸۸۲ء/ ۱۲۹۹ھ میں مطبع قادری لاہور سے شائع ہوا۔ یاسمین قریشی نے اپنے تحقیقی مقالے میں انکشاف کیا ہے ”دیوان دیوان فرید مراد“ کا قدیم ترین نسخہ ۱۸۸۲ء میں چھپا تھا، ”ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ پہلا مطبوعہ دیوان ۱۸۸۲ء کا ہے جو میرے پاس موجود ہے، ۳۶ صفحاتوں کے اس دیوان میں کل گیارہ اردو غزلیات شامل ہیں، باقی سرائیکی کلام ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ۱۸۸۲ء والا دیوان خالصتاً اردو

۵۔ بحوالہ مقالہ برائے ایم اے اردو ۱۹۸۲ء بعنوان ”خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری“ از یاسمین قریشی، ص ۱۱۶ (غیر مطبوعہ)

کلام پر مشتمل ہے جبکہ ۱۸۸۲ء اور اس کے فوراً بعد والادیلوان مخطوط ہے یعنی اردو اور سرائیکی.....
دوسرا دیوان ہو۔ ۱۸۸۲ء والے دیوان کی نقل ہے جسے اسلامیہ سٹیٹم پریس لاہور نے شائع کیا۔ اس
میں بھی وہی گیارہ غزلیں شامل ہیں۔ البتہ تیسری غزل کا مقطع چھپنے سے رہ گیا ہے، باقی تمام
غزلیں جوں کی توں ہیں، مقطع یہ ہے۔

نہ آج کا کہ ناصح کی پند سے بدلے

کہ ہے ازل سے دل آرام کا غلام فرید

اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے لیکن قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیانی
۶۷ صے میں شائع ہوا کیونکہ ۱۸۸۳ء/۱۳۰۱ھ میں جو دیوان مطبع رونق آگیاں گلزار محمدی سے شائع ہوا
۵۵ء اور اس کے بعد سٹیٹم پریس سے چھپنے والے دیوان سے بالکل مختلف ہے اس میں صرف اردو
کلام ہے۔ ۲، قطعے ۴، رباعیات، ایک مخطوط نظم اور ۹۸، اردو غزلیں ہیں۔

مجھے دیوان فرید اردو کا وہ نسخہ بھی ملا ہے جو مکتبہ اولسیہ، رضویہ الیکٹرک پریس ملتان کا شائع کردہ
ہے اور جس کا ذکر صدیق طاہر نے اپنے غدر تقصیر میں کیا ہے۔ اس پر بھی سن اشاعت درج نہیں ہے
لیکن صدیق طاہر نے اس کا سال اشاعت ۱۹۵۵ء قرار دیا ہے۔ اس میں ۹۳، اردو غزلیں، ۴، رباعیات
ایک سرائیکی اردو مخطوط نظم شامل ہیں۔ ان نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ غلام فرید
کے اردو کلام کی اشاعت کا سلسلہ ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا۔ اس کلام کی اشاعت کے بعد خواجہ صاحب
کم و بیش ۲۰ سال تک زندہ رہے۔ (وفات ۱۹۰۱ء) اور ظاہر ہے انہوں نے سرائیکی شاعری
کے ساتھ ساتھ اردو شاعری بھی کی ہوگی۔ اس لئے ۱۸۸۲ء میں طبع ہونے والی اردو غزلیات کی تعداد
صرف گیا رہے جبکہ صرف دو سال بعد یعنی ۱۸۸۴ء میں چھپنے والے اردو دیوان کی غزلوں کی تعداد ۹۸
ہے۔ صدیق طاہر کے مرتبہ اردو دیوان میں بھی ۹۸، غزلیں، ۹، رباعیات، ۲، قطعے اور ایک سرائیکی اردو
مخطوط نظم ہے۔ گویا ۱۸۸۴ء میں چھپنے والے دیوان اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ
اس دیوان میں سات رباعیات کا اضافہ ہے چنانچہ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ۱۸۸۳ء کے بعد غالباً

۱۲۔ دیوان خواجہ غلام فرید (اردو) مرتبہ صدیق طاہر، ص ۱۲

۱۳۔ ایضاً..... ص ۱۳

خواجہ صاحب نے اردو میں کچھ نہ کہا کیونکہ صدیق طاہر کا مرتب کردہ دیوان بنیادی طور پر وہی ہے جو ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا اور اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہے۔

گویا خواجہ غلام فرید کے اردو کلام کا زمانہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۱ء تک کا ہے اس لحاظ سے خواجہ صاحب داغ (۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء)، جلال اور امیر کے ہم عصر رہے۔ غالب کی وفات ۱۸۶۷ء کے وقت ان کی عمر ۲۲ سال (پیدائش ۱۸۴۵ء) تھی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ صاحب کے زمانے تک اردو غزل کی روایت نہایت پختہ اور مضبوط ہو چکی تھی، دلی اور کھنڈر بستان شاعری اپنے اپنے عروج کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ غزل کا قدیم رنگ تغزل اپنا رنگ جما کر رخصت ہو رہا تھا اور غزل کی اصلاح اور تبدیلی کے لئے حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) کی تجاویز سامنے آچکی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نہ صرف ان تبدیلیوں سے ناواقف تھے بلکہ اردو غزل کے رنگ قدیم سے بھی پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں سودا، ظفر، اور ناسخ کے حوالے موجود ہیں مثلاً

اس ملک میں ہے کون کہ نظم اپنی کو سمجھے
ناسخ کو بھی یہ درد کا نسخہ نہیں آتا (ص ۳۴)

سودا کہے جی دیکھئے غزل تیری اسے فرید
سورنر ہے نہاں ترے اک اک سخن کے بیچ (ص ۵۰)

کس ناسخ خوباں کے ہیں سودے سے یہ اشعار
ہے ناسخ و سودا مرے دیوان پہ قسبان (ص ۷۲)

جل جاتا آگ رشک سے ناسخ بھی آفرید
سنا کسی سے تیرے جو شعر آبدار کو (ص ۸۴)

نظم سنجی کا ترا دیکھ کے اعجاز فرید
آفریں کے لئے دھلی سے ظفر آتا ہے (ص ۹۲)

ان اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل کے اساتذہ کا کلام ان کے مطالعے میں آیا تھا بلکہ منذر

داد۔ اردو شاعری کے جائزے کے لئے صدیق طاہر کا مرتب کردہ "دیوان خواجہ غلام فرید" (اردو) سامنے

دکھا گیا ہے۔

بالا اشعار میں سے پہلے شعر کو پڑھ کر تو محسوس ہوتا ہے کہ خواجہ فرید نے ناسخ کا مطالعہ گہرائی میں جا کر کیا کیونکہ ناسخ کی شاعری واقعی درد سے خالی ہے۔ پھر لکھنؤ دہلی اور علی گڑھ تک ان کے سفر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آچکی ہے۔ اگر وہ سرسید جیسی اہم شخصیت سے ملے تو دوسری کسی ایک چھوٹی بڑی شخصیتوں سے بھی ان کی ملاقات ہوتی ہوگی اور وہاں انہوں نے اردو زبان و ادب کا صحیح محاورہ اور روزمرہ سنا ہوگا لیکن کلام اساتذہ کے مطالعے اور زبان اردو کے مرکزی مقامات تک رسائی کے باوجود ان کے یہاں اردو زبان کا وہ تر شاہوالب و لہجہ اور منجھا ہوا انداز موجود نہیں ہے جو ہمیں اساتذہ قدیم کے یہاں ملتا ہے بلکہ ان کے ایک ہم عصر اور ہم زبان شمس الدین گیلانی کے کلام میں خواجہ صاحب کے کلام کی نسبت کہیں زیادہ ترقی یافتہ لب و لہجہ اور ایسا اسلوب نظر آتا ہے جو اہل زبان کا حصہ تھا مثلاً

یہ تیرے عشق کی تاثیر ہے اللہ اللہ

رات پھر نالہ شکر ہے اللہ اللہ

جان بے لب آئی پر آنے کا نہیں اس کو خیال

سنگدل وہ بت بے مہر ہے اللہ اللہ ط

مہر رکھتا نہیں کچھ وہ میرے تاباں میرا

وحشت دل نے کیا حال پریشاں میرا

چشم مست دکھا کر کے گیا جب وہ شوخ

واسدار تھا ہے یہ دیدہ گریاں میرا ص

یا یاد آتی ہے جب تری گفتار سر ہے اور رنگ یا درد دیوار

تیری فرقت میں اے گل خنداں شور و فریاد ہے بزمگ ہزارہ

ص ۱۰۰۔ شمس الدین گیلانی کا دیوان ۱۸۶۴ء میں تکمیل پاچکا تھا البتہ چھپنے کی نوبت ۱۹۶۶ء میں آئی۔ تفصیل کے

لئے ملاحظہ فرمائیے "ارمغان ادب" ص ۱۳ اور "بہادپور میں اردو" از معود حسن شہاب، ص ۸۴

ص ۱۰۰۔ "ارمغان ادب" مرتبہ سید نذیر علی شاہ، ص ۳۳، مطبوعہ سرائیکی ادبی مجلس بہادپور ۱۹۶۶ء

ص ۳۰۰۔ ایضاً ص ۳۴

زور و زور کچھ نہیں جو وہ آدے نقد دل تھا سو کر چکے ہیں نثار ط
 لیکن خواجہ صاحب کے یہاں اردو غزل کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے۔ جا۔ بجا زبان و بیان، لہجہ
 لہجہ روزمرہ اور محاورے کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ بہت سے مصرعے اور اشعار ذرا ذرا سے خالی
 ہیں۔ فنی کوتاہیاں اور خامیاں بھی موجود ہیں اس میں شک نہیں کہ کچھ کتابت اور طباعت کی کمزوریاں
 اور کوتاہیاں بھی ہیں لیکن کلام کے سقم بھی کچھ کم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض غزلوں کے کچھ اشعار
 معیاری ہیں اور ان میں ایک منجھا ہوا انداز موجود ہے لیکن بحیثیت مجموعی یوں لگتا ہے کہ خواجہ صاحب
 تفسیر طبع کے لئے اردو شاعری کرتے تھے۔ اپنے سچے اور بھرے ہوئے جذبوں کو سراہیگی
 زبان ہی کے حوالے سے ادا کرتے تھے۔ اس کی تفصیل سابقہ صفحات میں آچکی ہے۔ یہاں اردو دیوان
 سے چند ایک غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

فریادِ افتتاحِ دفترِ دیوان کی کججو

کہ تا دیوانے بن جاویں ہزاروں تیرے دیوان سے (ص ۲۷)

مقطع میں "دفترِ دیوان" کی ترکیب غلط ہے۔ یہاں نون کا اعلان جائز نہیں ہے البتہ شعر وزن میں ہے

ارے زاہد تو مست نمازاں ہو اپنے زہد لائے پر

عباداتوں سے ہے فائق بتوں کا پوجنا میرا (ص ۲۸)

شعر میں عبادت یا عبادات کی جمع "عباداتوں" غلط ہے

میں ہوں سگ آستانہ فخرِ جہان کا

شیروں سے فوق مرتبہ ہے میری شان کا

پہلے مصرعے میں "سگ آستانہ" (اضافت کے ساتھ) کی ترکیب سے شعر بے وزن ہو گیا ہے اگر سگ

آستانہ (بغیر اضافت کے) استعمال ہو تو یہ وزن میں ہو سکتا ہے اس طرح آستانہ کی الف کو وصل کیا

جائے گا جو جائز ہے اس مصرعے میں "فخرِ جہان" کی ترکیب بھی غلط ہے نون کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

نہ دیر کی طلب ہے نہ کعبہ سے التفات

ساجد ہوں پنج وقت میں پیرِ مغان کا (ص ۳۰)

اس شعر میں بھی "پیرمغان" کی ترکیب میں وزن کا اعلان درست نہیں۔
 باغ جناں کا پھول ہے زخم اس کے واسطے
 پنخیر جو ہے یار کے نوکِ سنان کا (ص ۳۰)
 دوسرے مصرعے میں "نوکِ سنان" کی ترکیب میں بھی وزن کا اعلان درست نہیں جبکہ وزن غنہ پڑھنے سے
 مصرعے بے وزن ہو جاتا ہے۔

بجر وصال واصل ماجور ہے وہی
 حق الیقین میں شائبہ کب ہے گمان کا (ص ۳۰)
 پہلا مصرعے بے وزن ہے اگر "اصل" کے بعد "ہے" لگا دیا جائے تو مصرعہ وزن میں ہو سکتا ہے دوسرے
 مصرعے میں "حق الیقین" میں وزن کا اعلان کتابت کی غلطی ہے "یقین" کے ساتھ مصرعہ وزن میں ہے۔

دو وزن جہاں میں میرے لئے وہ ہے اے فرید
 خواہ رتبہ ہو مکان کا یا مکان کا (ص ۳۰)
 مقطع کا دوسرا مصرعے بے وزن ہے "خواہ" کی جگہ "جا" پڑھنے سے مصرعہ وزن میں ہوگا۔

طوفِ احرام و مناسک حج کے سب بھولے فرید
 کعبے میں جب وہ بت ایمان شکن یا دا گیا (ص ۳۱)
 مقطع کے دوسرے مصرعے میں "ایمان" میں وزن کا اعلان پر وف ریڈنگ کی غلطی ہے "ایمان" پڑھنے
 سے مصرعہ وزن میں ہوگا۔

اس زلفِ مضطرب کی تاثیر دیکھیو
 اپنی مثال مجھ کو بھی مضطرب بنا دیا (ص ۳۲)
 شعر کا پہلا مصرعے بے وزن ہے اگر لفظ تاثیر سے پہلے "بھی" کا اضافہ کر لیا جائے تو مصرعہ وزن
 میں ہو جائے گا۔

کیا ہی پامال ہوئے جان و جگر اور دل و جان
 عشق کو ایک قومی غضبِ خدا کا دیکھا (ص ۳۵)
 شعر کے دوسرے مصرعے میں غضب کی بجائے غضب استعمال ہوا ہے جو غلط ہے ویسے
 مصرعہ وزن میں ہے۔

- میں نے بیابانی دل اپنی کا نقشہ سمجھا
(۳۶ ص) آسماں پر کبھی جب گرد و بگولہ دیکھا
شعر کے دوسرے مصرعے میں گرد و بگولہ کی ترکیب غلط ہے۔
اتنی کسی پیر کی درگاہ پہ نہیں ہوتی ہے خلق
(۳۷ ص) اپنے بے پیر کے گھر پر جو میں نے میلہ دیکھا
پہلے مصرعے میں اگر کسی "کی بجائے کس" پڑھا جائے تو مصرعہ وزن میں ہوگا، ورنہ بے وزن ہے۔
جس کو ہر دم وصفِ آزادی میں کہتے تھے فرید
(۳۸ ص) آپ ایسے پیش زلف دو تا کیونکر ہوا
اس مقطع کا دوسرا مصرعہ بے وزن ہے۔
بہر کے ایام میں چین جگر جاتا رہا
(۳۹ ص) گلبن آرام دل کا برگ و بر جاتا رہا
پہلے مصرعے میں چین جگر کی ترکیب غلط ہے۔
پھر مری آنکھوں سے اب خون جگر پیدا ہوا
(۴۰ ص) بار درگہ درد کا دل میں شجر پیدا ہوا
اس مطلع کا دوسرا مصرعہ بے وزن ہے۔
ریشک لبِ دلدار سے شیرینی ہوئی تلخ
(۴۱ ص) اور دیکھ کے حال اس کا فرہاد بہت رویا
شعر کا دوسرا مصرعہ بے وزن ہے۔
احوال میرا دیکھ کے جو اس نے کیا مجھ پر
(۴۲ ص) ظلم و ستم و جورا در بیدار بہت رویا
اس شعر کا بھی دوسرا مصرعہ بے وزن ہے۔
جس کی نظر ہے میرے لئے خوں بہا مرا
(۴۳ ص) آنکھوں چھپا کے خون بہا کے چلا گیا
اس شعر کے دوسرے مصرعے میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے "خون" لکھا گیا ہے حالانکہ خون "ہوتا

چاہیے تھا کیونکہ وزن کے اعلان ہی سے مصرعہ وزن میں ہوگا۔

گر عشق نہ ہوتا دشمن عشق نہ ہوتا

پڑ مردہ یہ اتنا دل نمکین نہ ہوتا (ص ۴۸)

دوسرے مصرعے میں "دل نمکین" کی ترکیب غلط ہے۔ یہاں وزن کا اعلان جائز نہیں۔

کیوں نزع میں بھی پیاس کو کو ہے اس کی

گر آب تری تیغ کا شیریں نہ ہوتا (ص ۴۸)

اس شعر میں "شیریں" وزن میں نہیں البتہ تلفظ سے درست ہے۔ اگر "شیرین" ہوتا تو مصرعہ وزن

میں ہوتا۔

پر دیسی جب اس نور نظر رخ کو نکالا

سب کہنے لگے سلک اللہ تعالیٰ (ص ۴۹)

اس شعر میں سلک کو سل مکا پڑھنا پڑتا ہے۔

صیہات وہ کرتا نہیں مشاق پر شفقت

افسوس کہ لیتا نہیں عاشق کا سنبھالا (ص ۴۹)

اس شعر میں "شفقت" سے پہلے "پر" کی بجائے "پہ" ہونا چاہیے۔

آوارہ میں وحشت کے بیاباں کا ہوں اتنا

اک دوجی مریدوں سے ہماری ہے عمالا (ص ۴۹)

اس شعر میں "شتر گریگی" ہے پہلے مصرعے میں "میں" ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں "ہماری" اس

طرح ازالہ کو ع.الا لکھا گیا ہے۔

بتوں کو دیکھ کے بھولا ہے کلمہ اسلام

یہ ابتدائے رسالے مرے کی ہے تمجید (ص ۵۱)

دوسرے مصرعے میں "تمجید" ہے ابتدائے رسالے کی بجائے "ابتدائے رسالہ" ہونا چاہیے اسی

طرح تمہید کی بجائے تمجید" کتابت کی غلطی ہے۔

جو آستانِ جناب بتوں کے ہیں ساجد

ہیں ہے رحمتِ حق ایک آن آن سجے بعید (ص ۵۱)

اس شعر میں "آستان" کی اضافت درست نہیں "غالباً" شاعر "آستانے" لکھنا چاہتا ہے۔

گھنگھٹ نہیں کوئی رخ دلدار کو ہرگز

ہیں پردہ فرید آپ میان سے تو برخیز

(۵۲)

مقطع کا پہلا مصرع بے وزن ہے۔

صفحہ نمبر ۵۵ پر جو غزل ہے۔ اس میں سولے دو قافیوں کے باقی تمام ریز کے قافیے ہیں یعنی کامل، حاصل، ساحل شامل وغیرہ۔ شاعر نے ان میں بادل اور لایعقل کے زیر کے قافیے بھی شامل کر دیئے ہیں۔ آزاد قافیے کا اعلان مطلع میں ہونا چاہیے تھا۔

دھن میں آہ جگر میں شرار دل میں آگ

جمیم سے ہیں بہتر مجھ پر بجر کے ایام

(۵۶)

شعر کا دوسرا مصرع بے وزن ہے۔

فرید اپنے عقیدے کو میں نے کیا ہے میان

جو معتقد ہو اسی کا اسی کو مجھ سے سلام

(۵۶)

مطلع کا پہلا مصرع بے وزن ہے۔

صفحہ نمبر ۶۳ پر غزل میں حال پنہان، خون نشان، خانمان، تینوں میں "ن" کا اعلان کیا ہے جو غلط ہے۔

دو چنداوس سے ہوتا ہے جو اس کا بیشتر

سو بار جان و دل سے اگر ہم دفا کروں

(۶۴)

پہلے مصرعے میں "اس" کی بجائے "اوس" کا استعمال کیا گیا ہے۔ "اس" ہی سے مصرعے وزن میں پڑھے جائیں گے دوسرے مصرعے میں ہم دفا کی بجائے "میں دفا" درست ہوگا۔

جاناں تجھے ستمگر نہ کہوں تو کیا کہوں

تیرمی نگہ کو خنجر نہ کہوں تو کیا کہوں

(۷۰)

اس ساری غزل میں دوسرے شعر کا پہلا تیسرے شعر کا پہلا، چوتھے شعر کا پہلا، پانچویں شعر کا پہلا اور چھٹے شعر کا پہلا مصرع وزن میں ہے، ان کے علاوہ بے وزن مصرعے یہ ہیں۔

تجھ کو خدا کا منظر نہ کہوں تو کیا کہوں

ع

جلوہ کو تیرے محشر نہ کہوں تو کیا کہوں ع

ساجن کے دل کو پتھر نہ کہوں تو کیا کہوں ع

ان کو جہاں کا سرور نہ کہوں تو کیا کہوں ع

میں آپ کو سمندر نہ کہوں تو کیا کہوں ع

منسلک کشاف رسید نہیں غیر اوسکا کوئی ۵-

ان مشکوں میں حیدر نہ کہوں تو کیا کہوں

ہر لحظہ ترے حسن کے سامان یہ قربان

اے جان، مری جان ہے تری جان پر قربان (ص ۷۱)

اس مطلع والی غزل میں دوسرے تیسرے شعر کے پہلے، اور دوسرے اور پانچویں شعر کے دوسرے مصرعے میں تمام تراکیب میں نون کا اعلان وزن کو پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے حالانکہ درست و جائز نہیں ہے

بندۂ زلف بتوں کا میں دل و جان سے ہوں

لوگ ہیں کفر سے آزاد میں ایمان سے ہوں (ص ۷۲)

اس غزل میں چوتھے، آٹھویں اور دسویں مصرعے میں ترکیب کے ساتھ "نون" کا اعلان وزن پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

کوہ طور اور وادی امین کے نوز میں

موسٰی میں مار میں ید بیضا میں ہے عیاں

اس شعر کے پہلے مصرعے میں "کوہ طور" کی بجائے "کو طور" وزن میں درست آتا ہے "ہ" لگانے سے مصرعے بے وزن ہو گیا ہے۔

کہیں ہوں زینت صحرا کہیں ہوں زیب ہامون کا

کہیں خاشاک کو ہستان کہیں ریگ بیاباں ہوں (ص ۸۰)

دوسرے مصرعے میں کو ہستان کی نون وزن میں نہیں آتی۔

خیال زلف و دندان و لبِ خوباں عالم میں

بیابانِ ختن بجز عدن کوہ بدخشاں ہوں

اس شعر کا پہلا مصرعے بے وزن ہے۔

نقیب اپنا نغاں ہے چتر سر پر درد آہوں کا
 بگولہ شامیان کیا قومی سلطان حرماں ہوں (ص ۸۰)
 دوسرے مصرعے میں "سلطان حرماں" ہے اگر سلطان حرماں "کر لیا جائے تو مصرعہ وزن میں ہو جاتا ہے
 وصال دوست جی چاہیں من دے ماگرتارا
 خیال صورت دلدار کو من میں ٹکاتا رہ (ص)
 فراغت پلکے سب اغراض دنیا و دین سے
 صنم کے غم کے بیٹے وادی دل میں جاتا رہ (ص ۸۲)
 دونوں شعروں کے پہلے مصرعے وزن میں نہیں ہیں۔

جماعت کہتی ہے جو عمل صالح تجھ سے سرزد ہو
 ہمیشہ چشم و گوش اغیار سے اس کو چھپاتا رہ (ص ۸۳)
 پہلے مصرعے میں عمل کو وزن پورا کرنے کے لئے عمل باندھا گیا ہے۔
 دردوں کا گر شمار کروں روز حشر میں
 لرزہ پڑے گا خوف سے زور شمار کو
 پہلے مصرعے میں "دردوں" درد کی جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

جل جانا آگِ رشک سے ناسخ بھی لے فرید
 سنا کسی سے تیرے جو شعر آبدار کو (ص ۸۴)
 اس قطع میں آگِ رشک، کی ترکیب غلط ہے۔

اے دل تصور ان کا ہے ان کی جا بجا
 گر خور نہیں ماہ ہے کافی لیا ل کو (ص ۸۵)

اس شعر کے دونوں مصرعے بے وزن ہیں۔

صفحہ نمبر ۹۰ پر پوری غزل میں مجنون، مفتون، میگون اور موزوں کے الفاظ وزن کے اعلان کے
 ساتھ ہیں جو جائز نہیں بس وزن پورا کیا گیا ہے۔

میری خوشی نہ بگڑی کسی طرح دیسے جب
 پیک صبا کے اہل سب سے بگڑ گئے، (ص ۹۳)

اس شعر میں ”پیک صبا“ اور ”اہل صبا“ کی ترکیب ناقابل فہم ہیں۔

بہر کرم وہ آئے مگر یوں ستم شعار

لاٹھے مرے کو خاک میں خون میں رولا چلے (ص ۹۴)

دوسرے مصرعے میں ”خون“ میں نون کا اعلان پر وف کی غلطی ہے، وزن میں ”خون“ آتا ہے اسی طرح رلا کی بجائے ”رولا“ ہے وزن میں ”رلا“ ہی آتا ہے۔

آوارہ اک جنون کے چکل کا ہوں فرید

جس جائیں آئے اس سے مثال صیلا چلے (ص ۹۴)

مقطع میں ”جنون“ میں نون کا اعلان وزن کی مجبوری کے باعث کیا گیا ہے۔

اس کو کیا اطمینان اور اثر بہ سے لذت ہو

جو کہ درد و غم و حسرت کی غذا کھاتا ہے (ص ۹۶)

دوسرا مصرعہ وزن سے خارج ہے۔

زلمنے میں دیکھا غیر ماتم

مری دل ہے مشابہ کر بلا کے (ص ۱۰۹)

اس شعر میں دل کو مونث اور ردیف کو پر وف کی غلطی کے باعث ”کی“ کے بجائے ”کے“ کر دیا گیا ہے۔

تصور بتوں کا جب آیا ہمیں

رہ دیں بھی سب بھلایا ہمیں (ص ۱۰۱)

اس شعر میں ”رہ دیں“ کی ترکیب درست ہے مگر وزن کے اعتبار سے ”رہ دیں“، آنا چاہیے۔

میں مر جاؤں اس بت کے پاؤں کے بیچ

یہی آرزو ہے خدایا ہمیں (ص ۱۰۱)

اس شعر میں شتر گرجی ہے پہلے مصرعے میں اور دوسرے میں ہمیں ہے۔

ہم کو پسند یا رکی بانگی ادانگی

دل میں لگی، جگر میں لگی، جان پہ لگی (ص ۱۰۳)

دوسرے مصرعے میں تافیہ نہیں ہے۔

وہ کس طرح سے پاتے مزہ زندگانی کا
 جس کو ازل سے عشق دل میں بلا لگی (ص ۱۰۳)
 دوسرے مصرعے میں "عشق کے بعد" کی "کالفاظ آنے سے مصرعہ وزن میں ہوگا۔
 وہ دل کہ جسکو خانہ حق کہتی ہے خسلق
 روز ازل سے ہو چکی غارت بتوں کی ہے (ص ۱۰۹)
 پہلا مصرعہ بے وزن ہے اگر "خلق" سے پہلے "کہ" یا "تیر" لگا دیا جائے تو مصرعہ وزن میں ہو جائے گا۔
 نہ ہے خواہش بہشتوں کی نہ ہے اغراضِ دوزخ
 جہاں اپنا تقادیلوے وہاں مجھ کو مکالم دیو (ص ۱۱۲)
 اس شعر میں اغراض کی جگہ غرض ہونا چاہیے تھا اور اس غزل کے مقطع میں لفظ "مسک" کی بجائے "مسلخ" درج ہے۔

ان کے علاوہ کتابت کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں لگتا ہے کہ اس دیوان کے مرتب نے چیزیں تو جمع کر دی ہیں لیکن ان کی صحت کا خیال نہیں رکھا اور محنت اور توجہ سے کام نہیں لیا۔ لیکن اگر ان فنی خامیوں اور شعری محاسن کی کمی سے صرف نظر کر کے ان کے کلام کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو ان میں مرکزی موضوع تو عشق و محبت کا ہے۔ عشق و محبت کا یہ موضوع مسک تصوف کا بھی مرکزی موضوع ہے۔ اس لئے ایسے اشعار کو، جن کا موضوع عشق ہے۔ مجاز اور حقیقت دونوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح خواجہ حافظ، اور خواجہ میر درد کے کلام میں مفہوم کی دو تہیں موجود ہوتی ہیں ایک حقیقی اور ایک مجازی... اسی طرح خواجہ فرید کے کلام میں بھی دو تہیں پائی جاتی ہیں ان کی ایک پرت مجازی مفہوم کی ہے اور دوسری حقیقی مفہوم کی مثلاً

کیا کہوں یار کا کیا کیا میں سراپا دیکھا
 اک عجب نوزاہلی کا تم شاد دیکھا
 دل ہر دل میں ترے شور کا غوغا دیکھا
 سر ہر سر میں تمہارا سر سودا دیکھا
 آج دل ایک عجب چاند کا مکھڑا دیکھا
 جس کے آگے مہ و خورشید کو ذرہ دیکھا (ص ۳۵)

- ناتجھے دیکھا ہے میں ناترے نقشے کو کبھی
 (۳۷ ص) ایک یوسف کو ترے نقشے کا خاکا دیکھا
 میں ہوں غلام اس ازل سے ابد تک
 (۴۳ ص) کیا ہی اگرچہ اس نے جفا پر جفا کیا
 بعد مدت کے ہوا دیدار جاناں کا نصیب
 (۴۵ ص) حمد للہ نخل محنت کا ثمر پیدا ہوا
 مری نیاز ہے ان سے اسی لئے دو چند
 (۵۱ ص) کہ اس کے ناز کو ہر لحظہ ہے کمال جدید
 ساجد ہیں خاک کو چہ جاناں کو روز و شب
 (۶۱ ص) موسل کہیں نبی کہیں اور اولیسا کہیں
 میں ہوں اس کا وہ کس کا ہے اے دل
 (۶۳ ص) جا کے اس کا بھی امتحان کرو
 جب مجھے یاد دلا رام کا گھر آتا ہے
 (۹۲ ص) جنت آنکھوں میں جہنم سے تر آتا ہے

خواجہ فرید کے یہاں تصوف کے موضوعات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وحدت الوجود۔ وحدت الشہود
 جزو کل ذات اور صفات، توحید، مرید و مرشد، معرفت حق، شریعت و طریقت جیسے مضامین شامل
 ہیں۔ خواجہ فرید کے اردو کلام میں یہ تمام مضامین کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ عام طور پر چشتیہ مسلک
 سے تعلق رکھنے والے صوفیاء کے یہاں شریعت کی نسبت طریقت کی طرف زیادہ جھکاؤ ہے ان کے
 نزدیک عبادات کی ظاہری پابندی سے زیادہ دل و نگاہ سے پاکیزگی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس
 لئے زہد خشک پر ناز بے فائدہ ہے۔ اس سے نہ تو قلب کی روشنی ملتی ہے نہ روح کو سرورِ ظاہری
 کی عبادت سے بتوں کی وہ پوجا زیادہ بہتر ہے جو خلوص دل سے کی جائے۔ اصل مسکنیت کا
 ہے۔ خواجہ فرید اسی لئے زہدِ لاشے پر بتوں کی پوجا کو فوقیت دیتے ہیں۔

- عباداتوں سے ہے فائق بتوں کا پوجنا میرا
 (۲۸ ص) مرادل پاچکا ہے جیسے اک ہتھاب کی منزل

جناب حضرت خوباں کا ہوں مرید غلام
نہیں ہئے مجھ کو شیوخ اور برہمنوں سے کام

(۵۶)

بتوں نے جس کے دل و دیریں کو کر لیا غارت

خدا نے اس کو کیا شاہ ملک دین اسلام

(۵۶)

میں زاہد سمت کچھ بھی نہیں

یک زندوں کی خاک ہیں ہم

دیر و کعبہ سے دل نہیں لگتا

(۵۸)

یار کے در کے جبہ سا ہیں ہم

زہد سے، تقویٰ سے دیر سے دور رہتا ہوں ولے

(۷۹)

طالب فقر و غنا ہوں غیر سے مطلب نہیں

تو اپنے زہد بے حاصل پر مت نازاں ہو آزاہد

(۱۰۲)

کہ تیرے رشتہ تیسرے سے زنا رہت ہے

خواجہ صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ ذاتِ مطلق کو دیر و عزم یا مسجد و مندر تک محدود نہیں کیا جا
سکتا اس کا جلوہ جہاں تھاں ہے اسی لئے خواجہ صاحب کا سجدہ دیر اور کعبہ کی طلب کے لئے
نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہوتا ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔

نہ دیر کی طلب ہے نہ کعبہ سے التفات

(۳۰)

ساجد ہوں حج و قمت میں پیر مغاں کا

یہاں تک کہ طرفِ احرام و مناسک حج کے وقت بھی اگر وہ بت ایمان شکن یاد آجاتا ہے تو ایک
ایسا سرمدی کیف طاری ہو جاتا ہے کہ ظاہر کے ذکر و فکر سے بے نیاز ہو کر باطن کی منازل طے
ہونے لگتی ہیں۔

طرف احرام و مناسک حج کے سب بھولے فرید

(۳۱)

کعبے میں جب وہ بت ایمان شکن یاد آگیا

نہ غرض کعبے کی ہے مجھ کو نہ احرام سے کام

(۵۷)

یک ہے اس بت کافر، دش و خود کام سے کلام

کس طرح اس پہ نہ ہو کعبے کا احرام حرام
ہوگا جو بادہ پرست اور گھے خویش پرست
(ص ۵۹)

نمازیہ ہے کہ ہوں پنج وقت ساجد بت
صیام بیسے کہ ہوں صبح و شام ہم لب جام
ہزار سالہ عبادت بتوں نے لوٹی ہے
سری طرف سے کہو جا کے واعظوں کو پیام
(ص ۶۰)

نہ مومن ہوں نہ مشرک ہوں مرا شریعت رندانہ
مرا سچو دہے پر مغال کعبہ ہے معنی مانہ
(ص ۸۹)

اس باطنی اور روحانی تجربے کے بعد اس بت کا تصور بھی اتنا مزہ دیتا ہے کہ خواب میں بھی کعبے
کا ارادہ پیدا نہیں ہوتا۔

کیا بت کے تصور نے مزہ خوب دکھایا
رویا میں بھی کعبے کا ارادہ نہیں آتا
(ص ۳۳)

نہ غرض کعبے کی ہے مجھ کو نہ احرام سے کام
یک ہے اس بت کا فردش و خود کام کلم
ساجد یار ہوں میں دیر و حرم سے آزاد
میل کچھ کفر سے رکھتا ہوں نہ اسلام سے کام
(ص ۵۱)

جس نے عشق کی لذت چکھ لی ہے اس کے لئے باقی ہر شے بیکار ہے۔

زاہد نہیں خواہش مجھے فردوس بریں کی
داغ غم عشق اپنے لئے باغ جناب ہے
(ص ۱۳۴)

صوفیانہ تعلیمات میں ایک طرف تو انسان کو ناپیز ذرہ تصور کیا گیا ہے۔ جس کو اپنی حیثیت ختم کر کے
وجود مطلق میں ضم ہو جانا چاہیے مادی وجود ایک گناہ ہے۔ ایک بوجھ ہے، جو کثافت کو لطافت
سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتا۔ انسان ایک قطرہ ناپیز ہے جو اپنے سمندر سے جدا ہو کر بجز فراق
میں تڑپتا ہے اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ اپنے وجود کو مٹا کر وجود بیط کا دائمی حصہ بن جائے
لیکن دوسری طرف اس نظریے میں انسان کو وہ عظمت بھی حاصل ہے کہ جہاں وہ "الناجر" اور "الناحق"

کافرہ بلند کرتا ہے اور اپنے وجود کو وجود حقیقی تصور کرنے لگتا ہے۔ گویا انسان بیک وقت اسفل بھی ہے اور افضل بھی۔ قطرہ بھی ہے اور دریا بھی، جزو بھی ہے اور کل بھی۔ لیکن سلسلہ چشتیہ سے منسلک صوفیاء کا عمومی تصور انسانی نہ صرف مستقبل کی ابدیت کا بلکہ اس دنیا کے فانی میں بھی اس کے مرتبے کی ارفعیت کا قائل ہے۔ بابا فرید گنج شکر ہوں یا حضرت معین الدین چشتی...۔ بختیار و شہا ہوں یا حضرت امیر خسرو، حافظ جمال اللہ ہوں یا حضرت سلیمان تونسوی۔ سب کے سب صوفی نہ صرف انسان کی محبت کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں بلکہ انسان کو دنیا کا محور اور مرکز سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے یہ دنیا تخلیق کی گئی ہے تاکہ وہ اپنے حق عمل سے اس دنیا میں سرخرو ہو کر ابدیت کی زندگی کا مستحق بنے۔ خواجہ فرید کے یہاں انسانی عظمت کا یہ تصور اشعار میں موجود ہے۔

سوائے حضرت انسان نہیں ہے منظر کامل

اس سے تربت حق اب مجھے ہے ہر ماں حاصل (ص ۵۵)

جو نور لم یزل ہے سبھی تجھ میں ہے عیاں

تجھ کو خدا کا منظر نہ کہوں تو کیا کہوں (ص ۷۰)

وحدت الوجود کا مسلک صوفیاء کا دین و ایمان ہے۔ وہ ساری کائنات اور اس کی کثرت کو ایک ہی وجود مطلق کا مرہون منت سمجھتے ہیں اور انسان کو اس وجود بسیط کا ایک ذرہ اور ابن بحر حقیقت کا ایک قطرہ تصور کرتے ہیں۔ ابن عربی کے ہمہ گیر اثرات ملتان کے صوفیاء پر مرتب ہوتے اور اس کا سبب نصوص المحکم کا تعارف ہے جیسا کہ حضرت صدر الدین عارف ملتان کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عراقی نے قونیہ سے نصوص المحکم کا نسخہ اپنے نسبتی بھائی کو روانہ کیا تھا۔ اس زمانے میں مدرسہ بہائیہ میں بھی اس کتاب کو درس میں شامل کیا گیا اور اس کے نسخے دوسرے شہروں میں بھی بھجوائے گئے۔ نصوص المحکم کے اثر سے صوفیاء میں وحدت الوجود کا تصور ان کے ذوق و وجدان کا ناگزیر حصہ بن گیا اور حسین بن منصور حلاج کے اثرات بھی صوفیاء پر کچھ کم نہ تھے خواجہ فرید ابن العربی اور ابن منصور حلاج کے خیالات اور نظریات کے پیروکار دکھائی دیتے ہیں وحدت الوجود کا موضوع ان کی سرائیکی شاعری کا بھی سب سے بڑا موضوع ہے اور اردو شاعری میں بھی اس مضمون کو جا بجا ادا کیا ہے۔ خواجہ فرید محض نظری اور علمی سطح پر ہی اس نظریے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ اس نظریے کو جذباتی اور روحانی سطح پر تسلیم کرتے تھے۔ یہ نظریہ ان کے

لئے ایک زبردست شعری اور تخلیقی محرک ہے کیونکہ وحدت الوجود کا نظریہ بنیادی طور پر محبت کا نظریہ ہے۔ تمام نوع انسانی ایک ہی وجود واحد کا حصہ ہے۔ چنانچہ اس نظریے نے ان کو وہ عرفان اور ذہ کشف عطا کیا جس کی بدولت انہوں نے دنیا کے ذرے ذرے میں محبوب حقیقی کا منہ ہر دیکھا۔ غنچہ دگل ہوں یا سرد لالہ، سنبل ہو یا زنگس تہلا، خوبان ماہ رخ ہوں یا قد طوبی، وادی امین کا نور ہو! ید بیضا موسیٰ، کعبہ ہو یا دیر و کشت... ہر جا اور ہر شے میں وہ عیاں ہے۔

کعبے میں مسجدوں میں کنشٹوں میں دیر میں
مومن میں مشرکوں میں نمازی میں ہے عیاں
ہے کوہ طور اور وادی امین کے نور میں
موسیٰ میں مار میں ید بیضا میں ہے عیاں
غنچے میں گل میں سرو میں لالہ میں داغ میں
سنبل میں اور زنگس تہلا میں ہے عیاں
ڈھوک میں سر میں تال میں تالوں میں راگ میں
خوبان ماہ رخ قد طوبی میں ہے عیاں
مت بات کہ فرید کہ یہ شرک ہے خفی

حاصل کلام کہہ کہ بھی جا میں ہے عیاں (ص ۷۸)

اس نظریے کے تحت تنزیت اور دوئی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ کثرت وحدت میں سمٹ جاتی ہے پھر ساک راہ خدا وحدت کا عرفان حاصل کرتا، وحدت کا فیضان بکھیرتا، وحدت کا طلب خواں ہوتا اور وحدت کا اعلان کرتا نظر آتا ہے ماسوا سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

بے پردہ نور دوست کا جز کل میں ہے عیاں

(ص ۶۲)

غنچے میں گل میں سرو میں سنبل میں ہے عیاں

بت خانے میں کنشٹ میں کعبہ میں دیر میں

(ص ۶۷)

دلدار کے سوا تو کوئی رونما نہیں

عاشق روئے خدا ہوں غیر سے مطلب نہیں

ساک راہ ہدی ہوں غیر سے مطلب نہیں

ایک داں ہوں ایک خواں ہوں ایک جوہوں ایک گو
سب میں اس کو دیکھتا ہوں غیر سے مطلب نہیں

طوف کرتا ہوں میں اپنے کعبہ دل کا مدام

(ص ۷۹)

اپنا خود عابد ہوا ہوں غیر سے مطلب نہیں
تم اپنی چشم دل سے سوچ کر دیکھو رے آگ کو گو

(ص ۱۲۵)

کہ ہر ہر جا میں میرے یار نے ڈیرہ جمایا ہے
ہر رنگ میں ظہور ہے بے رنگ یار کا

(ص ۱۳۷)

پر تو ہے گرزخاں کا تو جلوہ بہار کا

خواجہ فرید کی وسیع المشرنی اور انسان دوستی ضرب المثل ہے۔ وہ زہد کی خشکی ملا کی تنگ نظری
اور سالک کی تفریق سے کوسوں دور تھے۔

نہ مومن ہوں نہ مشرک ہوں مرا مشرب سے زندانہ

(ص ۸۹)

مرا مسجد ہے پیر مغال کعبہ ہے مینخانہ

محبوب کے ظلم و ستم کا مضمون اردو اور فارسی شاعری میں ایک روایتی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے
لیکن محبوب کی جفا کا یہ تجربہ محض دنیاوی یا مجازی نہیں ہے۔ سلوک کے سفر میں بھی سالک کو اس
کا تجربہ کرنا پڑتا ہے اور خواجہ صاحب کو چونکہ دونوں تجربات حاصل رہے اس لئے محبوب کے جو درد
جفا اور ظلم و ستم کا ذکر ان کی غزلوں میں مجاز اور حقیقت دونوں پہلو لے کر آتا ہے۔ خواجہ صاحب
اپنے ستم گار محبوب کی شوخی و بدستی پر اپنا دل اور اپنا دین دونوں قربان کرنے کو تیار نظر آتے
ہیں کیونکہ ایسے ستم گار اور شوخ و بدست محبوب کا نام لینے میں بھی وہ مزہ ہے جو قند و شکر میں
نہیں اور اس کے ظلم و ستم میں بھی دل داری کا پہلو نکلتا ہے۔

یار جیسا کوئی دلدار نہ دیکھا نہ سنا

ایسا بھی ظالم و خونخوار نہ دیکھا نہ سنا

ویسا بیدار سراپا دل و دین کا دشمن

شوخی و بدست ستمگار نہ دیکھا نہ سنا

نام تیر جو مزا دیتا ہے رگ رگ میں مجھے

قدا اور شکر میں اے یار نہ دیکھا نہ سنا (ص ۲۹)

دراصل سلوک کی راہ میں بھی اور عشق مجازی کی راہ میں بھی محب کے مزاج کا تلون کوئی عجیب حادثہ نہیں ہے۔ ساک یا عاشق کے امتحان کے لئے ہو یا سلوک اور عشق کی کیفیات میں تلون و کیف پیدا کرنے کی خاطر..... بہر حال محبوب کے مزاج میں کچھ متضاد خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ کبھی وہ عین دفا دکھائی دیتا ہے تو کبھی بے دفا، کبھی وہ ہر بان دکھائی دیتا ہے تو کبھی نامہربان۔ کبھی وہ متوجہ دکھائی دیتا ہے تو کبھی بے پروا۔ اس کا تلون عشق میں نمکینی کا ذائقہ بھی پیدا کرتا ہے کشش بھی بڑھاتا ہے۔

وہ بت عین دفا پھر بیوفا کیونکر ہوا

لطف و احسان و کرم جو روحفا کیونکر ہوا

وہ بھی دن تھے جب نہوتے تھے کبھی اک پل جدا

اب رقیبوں سے وہ جا کر آشنا کیونکر ہوا (ص ۲۰)

شاغل ہوا نگار رقیبوں کے پیار میں

موسم خزاں کے آگے فصل بہار میں (ص ۷۶)

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بیمار محبت کا میسا کبھی کبھی اتنا کٹھورا اور سنگدل بن جاتا ہے کہ عاشق کے دم واپس پر بھی وہ آنے کا نام نہیں لیتا۔

دم ضعف سے میرا نہیں جاتا نہیں آتا

اس حال پر بھی اٹک میسا نہیں آتا (ص ۳۳)

چنانچہ ہجر میں محبوب کی یاد عاشق کے لئے ویسا ہی تجربہ بن جاتی ہے جیسے ببل کا دور خزاں میں بہا روں کی یاد کا اور ان یادوں میں تلخی اور شدت اس لئے بھی ہے کہ دونوں نے عیش وصال کے لمحات گزارے ہیں اور اس کے لئے سفر بھی کیا ہے۔ ببل نے اپنے آشیانے سے نچن تک کا اور عاشق نے اپنے گھر سے کوچہ دلدار تک کا۔ اب دونوں اپنے ٹھکانوں پر ہیں لیکن دونوں مضطرب اور بے قرار ہیں۔ ایک خزاں کے دور میں متعارف رہ کر آشیانے میں ادا ہے اور دوسرا گھر کے بے زار کن ماحول میں مقید ہے۔ دونوں کو اظہار جنوں کے لئے موسم گل کے ساتھ ساتھ محبوب کا

وطن اور پھولوں کا چمن بھی جا ہیئے۔

اپنے گھر ہوں اب مجھے اس کا وطن یاد آ گیا

گو یا ببل کو خزاں میں گل چمن یاد آ گیا (ص ۳۱)

لیکن آخر دونوں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، سالک کو سلوک کی راہ میں اور عاشق کو عشق کی مسافت میں محبوب کے نقوش پاکی جستجو رہتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی منزل مقصود کو پالے مگر اس کی یہ آرزو، آرزوئے ناممکن رہتی ہے کیونکہ منزل کا ملنا خواہشوں کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے عاشق اور سالک کی حیات طلب میں ہے، پانے میں نہیں۔ حصول منزل کے لئے نقش کف پاکی تلاش میں رواں دواں رہنا ہی عاشق کا مقدر ہے اور غالباً اس کی وجہ حیات بھی۔ اقبال کا تو سارا فلسفہ اسی سعی پیہم کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عمل پیرا رہنے کا ہے۔ خواجہ فرید اس مسجود کے آرزو مند تو نہیں لیکن اس حقیقت تک بھی پہنچ چکے ہیں کہ محبوب کا نقش کف پا ہاتھ آنا بڑا مشکل ہے۔

تاکعبہ سمجھ کر اسے مسجود بناؤں

کیوں ہاتھ تیرا نقش کف پا نہیں آتا (ص ۳۳)

چونکہ دل کا مطالبہ عشق کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا اس لئے اس "سفر نامہ" میں دل کو شکامیتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ حصول کا متمنی ہے۔ جبکہ عشق امتحان کے مراحل کا متقاضی ہے اس کو دصال میں مزہ ملتا ہے جبکہ عشق ہجر و فراق کی لذت ہے۔ خواجہ فرید عاشق کے صبر طلب تقاضوں کو پورا کرنے کے قائل ہیں اس لئے اپنے دل کو مشورہ دیتے ہیں۔

رکھتے ہی قدم دادی غم میں ہوا شاکی

کچھ عشق کا ڈھب اور دل شیدا نہیں آتا (ص ۳۴)

اور جب منزل مراد کے غار زاروں سے گذر کر سالک کو محبوب کے نقش پاکی جھلک دکھائی دیتی ہے تو اس خاک پا کے ذرے ذرے میں اسے امکانات کی ایک وسیع کائنات چھپی ہوئی نظر آتی ہے یہیں اس کا کعبہ بھی پوشیدہ ہے اور افضلی کا نقشہ بھی۔ اس کی کلفتوں کا صلہ اسے اس جگہ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

نقش پا میں ترے میں نقشہ اقصیٰ دیکھا

کوچے کی گرد کے ہر ذرہ میں کعبہ دیکھا (ص ۳۵)

اس منزل پر وحدت و کثرت اور جز و کل کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

ذوق وحدت سے ہر اک چیز کو اعلیٰ سمجھا

چغندر کو مثل ہما، زاغ کو عنقہ سمجھا

میں نے ہر قطرہ کو دریا سے زیادہ سمجھا

ذرہ کے نور کو خورشید سے بالا سمجھا

(ص ۳۸)

بے پردہ نور دوست کا جز کل میں ہے عیاں

چغنیچے میں گل میں سرو میں سنبل میں ہے عیاں

(ص ۶۲)

بت خانے میں کنشت میں کعبہ میں دیر میں

دلدار کے سوا تو کوئی رونما نہیں

واللہ میری چشم خدا ہیں کسی دید میں

کوئی نہیں ہے بت کہ وہ عین خدا نہیں

(ص ۶۷)

اور ساک یا عاشق کو ایک ایسا پندار بھی نصیب ہو جاتا ہے کہ وہ بجا طور پر یہ دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ

مے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو

خم گر دوں کو اک ادنیٰ سا پیالہ سمجھا

(ص ۳۸)

یقین ہے جن کے ہے رہبر خرام خوبوں سے

فریدان کے لئے راہ فقر ہے اک کام

(ص ۶۰)

خواجہ صاحب کے یہاں محبوب کے حوالے سے کبھی کبھی ایسے خوبصورت شعر بھی مل جاتے ہیں جن

میں منجھا ہوا اور پختہ غزلیہ اسلوب اور کلاسیکل رنگ تغزل پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ہی طویل غزل کے

چند شعر ہیں جن میں غزلیہ شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں۔

کیا کہوں یار کا کیا کیا میں سراپا دیکھا

اک عجب نواہلی کا تم سا شا دیکھا

آج دل ایک عجب چاند کا مکھڑا دیکھا

جس کے آگے مہ و خورشید کو ذرہ دیکھا

دیکھ کے خلد بریں دل کو یہ محسوس ہوا

اس کے گھر کا یہ اک ادنیٰ سا نمونہ دیکھا

(ص ۳۵)

ستم و جور و جفا کیونکہ نہ ہو اس پہ تمام
 جس کے قامت کو قیامت سے بھی بالا دیکھا
 کیوں نہ ہو خلق خدا کو وہ دل و جان سے عزیز
 جس کے آگے ملے کنعاں کو زینب دیکھا
 تجھ پہ ہے زنگ کا تمام مجھے داغ کا ختم
 باغ میں تجھ سا نہ گل مجھ سا نہ لالہ دیکھا

(۳۶)

(۳۷)

اور اس قسم کے شعر ایک غزل تک محدود نہیں ہیں بلکہ دیوان کی دوسری غزلوں میں بھی مل جاتے ہیں
 مثلاً

وہ بھی دن تھے جب نہوتے تھے کبھی اک پل جدا
 اب رقیبوں سے وہ جا کر آشنا کیونکر ہوا
 اس کا دل آخر تک میری طرف مائل نہیں
 شاید اس عرصہ میں آہوں کا اثر جاتا رہا
 مے نہیں، ساقی نہیں، شاید نہیں ہے افزہ
 کیا خزاں آئی گل و برگ ڈھس جاتا رہا
 جو دنک کی کیا میں شکایت کروں فرید
 بد نام ہر گل میں مجھے بر ملا کیسا
 گلزارِ دل لالہ زار میں لگتا نہیں ہے دل
 صیا د نے قفس سے مجھے جب رہا کیا
 غم خانہ میں وہ مجھ کو بٹھا کے چلا گیا
 آتشکدہ میں جاں کو جلا کے چلا گیا
 لطف و غضب کا خاتمہ دیکھو اے دوستو
 دل میں جگر جاں میں سما کے چلا گیا
 سب ہے مجھے قبول و لیکن فریاد
 پھر آدے جو کہ دل کو پھنسا کے چلا گیا

(۴۰)

(۴۱)

(۴۲)

(۴۳)

(۴۴)

صیہات وہ کرنا نہیں مشاق پر شفقت
 افسوس کہ لیتا نہیں عاشق کا سنبھالا
 لاشے کو مرے دیکھ کے کہنے لگا ہنس کر
 کیا مگر کا ڈھنگ اس نے نکالا ہے اک اعلیٰ
 ہم تو صیاد کا رخ دیکھتے تھے میں دھلے
 نہ تھی دلنے کی طلب اور نہ تھا دام کے کام
 ببل و قمری بھی مشاق بنے ہیں میرے
 جب پڑا ہے مجھے اس سر و گل اندام کام
 جو راتنا نہ کیجئے ہم پر

(۴۹)

(۵۰)

اے بتو بندہ خدا ہیں ہم
 خواب میں بھی نہیں ہے وصل نصیب
 بے نصیبوں کے پیشوا ہیں ہم
 تیرے سے طرز دیکھے نہ الٹی ادا کہیں
 آفت کہیں غضب کہیں برق و بلا کہیں
 آوارہ جستجو ہیں سراغ نگار میں
 عنقا کہیں ہما کہیں باد صبا کہیں
 اللہ رے فرط حسن کہ اس کی نگاہ ناز
 جادو کہیں ہے سحر کہیں معجزا کہیں
 ہیں مست اک نگاہ سے اس کے فریدوش
 زاہد کہیں، نقیبہ کہیں، پارسا کہیں
 قیس و فرہاد نصیب کے لئے آتے ہیں
 عجب آشفۃ میں وحشت کے بیابان ہوں
 آرام مری جان کو شام و سحر نہیں
 جس دن سے میرے پاس وہ آرام بر نہیں

(۶۱)

(۷۳)

سودا نہیں ہے جس میں ترا، ہے وہ سر کہاں
اور دل کہاں ہے جس میں ترا شور و سر نہیں
مت عرض کر انہیں تو فرید اپنی بے کسی
شکوہ عبت ہے ان کی توجہ ادھر نہیں

(ص ۷۵)

لا تہے جنگ کے لیے سامان نئے نئے
کر تہے قتل گبر و مسلمان نئے نئے
گہ سوز گہ گذار، گہے درد و گاہ غم
آتے ہیں دل کے خانہ میں مہاں نئے نئے
سلطان عشق سے مجھے انعام میں بلا

(ص ۱۰۵)

محرانے نئے ہیں بیا باں نئے نئے
اتنے نہیں فلک پہ تارے زمین پہ حسن
جتنے ہوئے ہیں عاشق جا ناں نئے نئے
اپنی عقل سے اٹھانہ یا را اپنے ہاتھ سے
کہ نہ اس شواہدہ سر کو خوار اپنے ہاتھ سے
ہائے کیا رسم ستم ہے ہائے کیا طرز جفا
اپنا کر کے پھر دیا آزاد اپنے ہاتھ سے

(ص ۱۳۳)

خواجہ صاحب کی اردو شاعری کا مجموعی تاثر فنی لحاظ سے نہیں موضوع کے اعتبار سے متعین
ہوتا ہے یعنی فنی محاسن سے زیادہ آپ نے موضوع کی طرف دھیان دیا ہے تاہم ایک شاعر
کی حیثیت سے وہ شاعری کی فنی خوبیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے کہیں کہیں ان
فنی محاسن کا احساس بھی ہوتا ہے، مثلاً اکثر اشعار میں رعایت لفظی کا خیال رکھا ہے۔

فرقت میں یار کے درد مندوں کی یاد میں

(ص ۳۲)

اشکوں سے چشم عالم کو ہر بہت دیا

سن کر مرے اشعار کہ ہیں مادہ دخت

(ص ۳۴)

کیوں سر میں رے سودا ترا سودا نہیں آتا

طور کے نور کی اور وادی امین کی قسم
 تیری ہندی میں بھی نسخید بیضا سمجھا
 رشک لب دلدار سے شیرینی ہوئی تلخی
 اور دیکھ کے حال اس کا فرہاد بہت بویا
 تکرار الفاظ سے حسن پیدا کرنے کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔
 ہر لحظہ ترے حسن کے سامان پہ قربان

(ص ۴۶)

لے جان، مری جان ہے تری جاں پہ قربان
 تشبیہ و استعارہ کا استعمال شعری تجربات کے لئے ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے زمانہ قدیم میں
 تشبیہ کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ زمانہ مابعد میں استعارہ کو اہمیت حاصل ہوئی اور آج استعارے
 کی ترقی یافتہ صورت یعنی علامت کا استعمال عام ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں زیادہ تر تشبیہات
 کا استعمال ملتا ہے۔

اپنے گھر ہوں اب مجھے اس کا وطن یاد آ گیا
 گویا ببل کو غزاں میں گل و چین یاد آ گیا
 اس زلف مضطرب کی تاثیر دیکھیو

(ص ۳۱)

اپنی مثال مجھ کو بھی مضطرب بنا دیا
 تجھ پہ ہے رنگ کا اتمام مجھے داغ کا ختم

(ص ۳۲)

باغ میں تجھ سا نہ گل مجھ سا نہ لالہ دیکھا
 طور کے نور کی اور وادی امین کی قسم

(ص ۳۴)

تیری ہندی میں بھی نسخید بیضا سمجھا
 ردیف کا حسن ملاحظہ فرمائیے۔

(ص ۳۹)

لاتا ہے جنگ کے کیلے سامان نئے نئے
 کرتا ہے قتل گبر و مسلمان نئے نئے
 گے سوز گے گزار، گے درد و گاہ غم
 آتے ہیں دل کے خانہ میں ہماں نئے نئے

سلطانِ عشق سے مجھے انعام میں ملا
 صحرائے نئے ہیں بیاباں نئے نئے
 اتنے نہیں فلک پر ستارے زمین پر چمن
 جتنے ہوئے ہیں عاشقِ جاناں نئے نئے
 (ص ۱۰۵)

بعض جگہ تلمیحات کا استعمال بھی ملتا ہے۔

خاک کے دگ ناری نے کیا آتش پرست اپنا
 بد بیضا کو شمع طور کو خورشید تاباں کو
 (ص ۸۱)

اور مخلوق ہے کیا بلکہ سلیمان ہے مطیع
 میں نے شاہد کہ کبھی یار کا چھٹلا دیکھا
 (ص ۳۷)

حضرت سلیمان کی انگشتری کی طرف اشارہ ہے۔
 اشک لبِ دلدار سے شیرینی ہوئی تلخ
 (ص ۴۶)

اور دیکھ کے حال اس کا فرہاد بہت رویا
 کھو رہا ہے اس کوہ کو میں نے تو خودی کے
 (ص ۵۲)

شاباش مجھے بھی ہے فرہاد کو شاباش
 ہے کوہ طور اور وادیِ امین کے نور میں
 موسیٰ میں مار میں یہ بیضا میں ہے عیاں

غرض خواجہ فرید کی اردو شاعری کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں موضوعات کی کمی نہیں۔ عشق و محبت اور اس کے متعلقات، تصوف اور اس کے مسائل، مجاز اور حقیقت کا امتزاج اور زندگی کے متنوع تجربات ان کے موضوعات کا معیار قائم کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب اور تغزل بہت معیاری نہیں ہے اور اس کے اسباب بالکل ظاہر ہیں کہ ایک تو اردو خواجہ صاحب کی مادری زبان نہ نضی پھر بقول تالیش الوری

"ان کے دور میں لکھنؤ اور دہلی کے دبستانِ شعری کے نئے اجالے بہادپور کے دور افتادہ صحرائے ادب تک اپنی پوری تابندگی کے ساتھ نہیں پہنچ سکے تھے"

اس لئے اگر ان کی اردو شاعری کا معیار بہت بلند نہیں ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں
تاہم الوری نے درست لکھا ہے کہ

”اگر ہم تہذیبی و علمی مراکز سے دوری، بہادلوپور کی ادبی سنگلاخی اور علاقائی سطح پر
اردو ادب کے ارتقائی عمل کی سست رفتاری کے حقائق کو سامنے رکھ کر فرید کی
شاعری کا تجزیہ کریں تو ہمیں اس میں بھی ان کی انفرادیت و عظمت کی جھلکیاں نظر
آتی ہیں۔“

مختصر یہ کہ خواجہ فرید کی اردو شاعری کا معیار زیادہ بلند نہ ہونے کے باوجود..... سرزمینِ ملتان
اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں اردو زبان و ادب کی ترویج اور تدریجی ارتقار میں اس کے
تاریخی کردار سے انکار ممکن نہیں۔

ان نہایت اہم صوفیائے کرام کے علاوہ، جن کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، مولوی
محمد موسیٰ پاک صدیقی، سلطان احمد قتال، عبدالحکیم، شاہ علی مردان وغیرہ بھی سرزمینِ ملتان کے قابل
ذکر صوفیاء ہیں۔ مولوی محمد موسیٰ پاک صدیقی کا شمار حافظ محمد جمال کے خلفاء میں ہوتا ہے
علامہ طالوت کے مطابق ”آپ کی بیعت حضرت خواجہ غریب نواز حافظ محمد جمال اللہ ملتان سے ہوئی
آپ ایسے قابل، متبحر عالم تھے کہ جب آپ نے حضرت حافظ جمال سے بیعت کی تو وہ اس قدر خوش
ہوئے کہ فرمایا

”میں مبارکباد کا مستحق ہوں کہ میرا متوکل ایک برگزیدہ و کامل انسان ہوا ہے۔ بقول

دیگر فرمایا ”میرے چنگل میں ایک شاہین آگیا ہے۔“

حافظ جمال کے یہ شاہین حافظ محمد حیات کے بیٹے اور شیخ فخر الدین عراقی کی اولاد میں سے تھے جو کہ
خراسان سے ملتان آئے تھے اور بہار الدین زکریا کی دامادی کا شرف حاصل کیا تھا۔ موسیٰ پاک
صدیقی ۱۹۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ علم و فضل میں بے مثال تھے۔ اس دور کی بیشتر علمی کتابیں

۱- مقدمہ، دیوان خواجہ غلام فرید، ص ۲۴

۲- بحوالہ مضمون ”حضرت عراقی کی اولاد“، مطبوعہ تنویر، سائنامہ اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۸

۳- بحوالہ ”ادیائے ملتان“، از بشیر حسین ناظم، ص ۱۱۶

۴- بحوالہ ”ادیائے ملتان“، از فرحت ملتان، ص ۱۶۰

آپ کو یاد تھیں۔ علامہ طلحوت کے مطابق

”مولانا محمد موسیٰ پاک حافظ کلام اللہ اور علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے۔ نام و مقام کی مناسبت سے کلیم اللہ لقب پایا۔“

حضرت موسیٰ پاک نے حصول علم کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ آپ نے ملتان میں ایک مسجد تعمیر کرائی جہاں سو کے قریب طلباء و علماء ہر وقت موجود رہتے تھے جنہیں یہاں کے لوگوں سے ایک وقت کا کھانا بھی ملتا تھا۔ خواجہ موسیٰ پاک پہلے نماز فجر کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک خود ذکر الہی میں مصروف رہتے اور اس کے بعد طلباء کو درس دیتے۔ جن میں مختلف کتب تصوف اور تفسیر شامل ہوتیں۔ درس دیتے ہوئے خود آپ پر بھی کیف و وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کے بعد رات تک آپ کے معمول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرحت ملتانی لکھتے ہیں کہ

”آپ دوپہر کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق قیلولہ فرماتے اور نماز ظہر کے بعد ذکر الہی میں مشغول ہو جاتے۔ تلاوت قرآن کریم، دلائل شریف ختم خواجگان اور وظائف ماثورہ آپ کے معمولات میں شامل تھے۔ مغرب کی نماز سے عشاء کی نماز تک آپ نوافل کے ذریعے قرآن الہی میں مصروف رہتے۔ عشاء کی نماز آدھی رات کے بعد ادا فرماتے اور گھر تشریف لے جاتے۔ تھوڑی دیر کے لئے آرام فرماتے تہجد کے وقت دوبارہ مسجد میں آ جلتے اور نماز تہجد ادا فرما کر ذکر الہی میں مشغول ہو جاتے۔“

دوسرے صوفیاء کی طرح خواجہ موسیٰ پاک بھی اپنے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرنے میں فخر محسوس کرتے اور اس سلسلے میں ہزاروں شاگرد رکھتے ہوئے بھی آپ کسی کو تکلیف نہ دیتے۔ آپ کی درس گاہ میں عام لوگوں سے لے کر امرا اور یہاں تک حاکم ملتان نواب مظفر خان شہید تک سبق پڑھنے آتے، عمر کمال خان کے مطابق

”لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے علوم ظاہری کی تحصیل کی، آپ کے درس میں

۱۔ بحوالہ مضمون ”حضرت عرانی کی اولاد“ مطبوعہ رسالہ تنویر، ملتان، سالنامہ اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۷۸

۲۔ بحوالہ ”ادیلئے ملتان“ از فرحت ملتانی، ص ۱۶۲

نواب، شہزادے، امیر اور غریب طلبا سب شامل ہوئے تھے اور برابر فضیلاب
ہوتے تھے اور آپ کسی سے کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ علوم ظاہری کے علاوہ
آپ علوم باطنی سے بھی مالا مال تھے۔

اولاد علی گیلانی لکھتے ہیں

”حضرت موسیٰ پاک صاحب کا علمی مشغلہ اتنا تھا کہ ہمیشہ آپ کی خدمت میں ستر
اسی طلبا موجود رہتے تھے۔ بسا اوقات تفسیر پڑھتے وقت آپ پر دجھٹاری
ہو جاتا تھا۔“

نواب مظفر خان شہید عقیدت کے طور پر آپ کو تحائف بھجواتا لیکن آپ خود انہیں کبھی استعمال نہ
کرتے بلکہ آگے لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ آپ لوگوں کے مسائل سنتے اور شریعت محمدی کی روشنی
میں ان کا حل فرماتے کبھی خلاف شرح بات پر آپ نے غور نہیں فرمایا
خواجہ موسیٰ پاک صدیقی کو تصنیف و تالیف کے کاموں سے بھی بہت دلچسپی تھی کہا جاتا ہے
کہ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں جنہیں ملتان پر سکھوں کے عہد میں جلا دیا گیا، اب آپ
کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔

موسیٰ پاک صدیقی نے پنیٹھ (۶۵) برس کی عمر میں ۱۱ رجب المرجب ۱۲۶۱ھ میں وفات
پائی۔ اور ملتان میں حسین آگاہی کے اندر محلہ کمانگراں میں آپ کا مزار ہے۔ قطعہ تاریخ وفات
اس طرح ہے۔

چوں شیخ نامور عصر مولوی موسیٰ	کہ عمدہ العلماء ربود صاحب معنی
بروز یازدھم پنجشنبہ ز رجب	ز شوق شاہد معنی برفت از دنیا
بطور قرب خدایافت جا کلیم صفت	ندیم شاہ رسل شدہ بیجنت المادی
سروش غیب بے مسکین بر آتاریخ	بگفت مولوی آمد بطور قرب خدا

۱۔ بحوالہ نواب مظفر خان شہید اور اس کا عہد، از عمر کمال خان، ص ۲۸۴

۲۔ بحوالہ مرقع موتان، از سید اولاد علی گیلانی، ص ۵۹۳

۳۔ آپ کے سن وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

سلطان احمد قتال بھی اہم بزرگ گزرے ہیں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ادچ اہل علم و عرفان کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں دنیائے اسلام کی اہم شخصیات نے جنم لیا، خدمات انجام دیں اور پھر یہیں دفن ہوئے۔ ادچ میں یہ سلسلہ سید جلال الدین سرخ بخاری سے چلتا ہے جو ۶۴۲ھ میں بخارا سے ملتان آئے۔ اور پھر ادچ میں مستقل رہائش اختیار کر لی ان کے بعد ان کی اولاد نے علم و ہدایت کا یہ فیضان جاری رکھا اور یہاں سے نامور صوفیاء نے جنم لیا۔ جن کی خدمات کا اعتراف آج تک زمانہ گزرنے کے باوجود کیا جاتا ہے۔ انہی صوفیاء میں دسویں صدی ہجری کے وسط میں ایک اور عظیم ہستی کا اضافہ ہوتا ہے اور یہ شخصیت سلطان احمد قتال کی ہے۔ آپ سید جلال حسنی اور چوہی کی اولاد میں سے ہیں آپ نے ادچ میں ۹۴۹ھ میں سید علم الدین کے گھر میں جنم لیا۔ حکم چند لکھتے ہیں

پیر سلطان احمد معروف پیر قتال مورث اعلیٰ اس خاندان کا قوم سید حسنی اولاد سید جلال
ادچ والہ سے ہے^۱

پیر سلطان احمد مادر زاد دلی تھے۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ منہ سے نکالتے فوراً پورا ہو جاتا تھا۔^۲

آپ جوان ہوئے تو آپ کا زیادہ تر وقت فقر اور کی صحبت میں بسر ہونے لگا۔ جہاں آپ ریاضت و مجاہدہ کرتے۔ اکیس سال کی عمر میں ۹۷۰ھ میں آپ نے کھڑکی میں پیر علی سردر سے بیعت کی۔ اور آپ کا زیادہ تر وقت ان کی صحبت میں گزرنے لگا۔ پیر علی سردر نے آپ کی کرامت کے باعث آپ کو قتال کا لقب عطا کیا روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ

۱۔ آپ کے سن پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

۲۔ تواریخ ملتان، از لالہ حکم چند، ۱۸۸۰ء، ص ۹۲

۳۔ اس بارے میں کئی روایات مشہور ہیں ملاحظہ فرمائیے (۱) ارض ملتان از اکرام الحق، ص ۶۸

(۲) تواریخ ملتان از حکم چند، ص ۹۲ (۳) مرقع ملتان، از اولاد علی گیلانی، ص ۲۲۳-۲۲۴، (۴) ادیبائے ملتان

از بشیر حسین ناظم، ص ۱۰۱ (۵) ادیبائے ملتان از فرحت ملتان، ص ۱۹۹-۲۰۰

۶۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا ذکر نہیں ملتا۔

۷۔ (۱) ادیبائے ملتان از بشیر حسین ناظم، ص ۱۰۰ (۲) تواریخ ملتان از حکم چند، ص ۹۲

” ایک دفعہ آپ کے پیر سردہے تھے کہ چڑیوں نے جمع ہو کر فل مچانا شروع کر دیا آپ نے یہ سمجھ کر کہ چڑیوں کی چوں چوں آپ کے مرشد کے آرام میں نخل ہے حکم دیا کہ چڑیوں! مرجاد۔۔ مجرد اس ارشاد کے سب چڑیاں مر گئیں۔ جب حضرت پیر صاحب بیدار ہوئے تو آپ نے یہ ماجرا دیکھ کر فرمایا کہ تم قتال ہو۔ اس دن سے آپ کا لقب قتال مشہور ہوا۔“

آپ اپنے مرشد کے ہمراہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور واپسی پر بغداد، کربلائے معلیٰ اور نجار سے ہوتے ہوئے ملتان آئے، حکم چند کے مطابق

”ہمراہ مخدوم علی سردر حج کیا اور بعد زیارت بغداد شریف و کربلا و مدرس نجار شریف کے بمقام ملتان مزار شاہ رکن عالم میں چلہ کشی کر لی۔“

پھر آپ اپنے مرشد کے حکم سے نیلی بار کے جھگل تشریف لے گئے اور وہاں کی دو اقوام مکھویرہ اور سلڈیڑہ آپ کے ہاتھوں مسلمان ہوئیں۔ ۹۹۰ھ میں آپ نے ملتان کے نزدیک جلال پور میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور وفات تک وہیں رہے۔ آپ نے ۱۰۴۱ھ میں بالونے (۹۲) سال کی عمر میں دفن پائی۔ وہیں جلال پور پیر والہ میں آپ کو دفن کیا گیا۔ پہلے آپ کا مزار کچا تھا پھر آپ کی اولاد نے آپ کا پختہ مزار بنوایا۔

آپ نے پچھلے گھر شادی کی جو سیت پور رہتے تھے۔ آپ کے دو بیٹے عالم پیر اور شاہ اسماعیل تھے۔

سلطان عبد الحکیم کا تعلق تحصیل کبیر والہ کے صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد شیخ غلام علی دریلے راوی کے کنارے تلمنبہ کے نزدیک بستی لودی میں رہتے تھے اور لوگوں کے کپڑے دھونے اور رنگنے کا کام کرتے تھے۔ عبد الحکیم کو شروع ہی سے عبادت و ریاضت سے لگا دیا تھا اس لئے آپ اپنے والد کے کام میں مدد کرنے کی بجائے سارا وقت عبادت و ریاضت سے گزارتے

۱- بحوالہ مرقع موتان، از اولاد علی گیلانی، ص ۲۲۳

۲- بحوالہ تواریخ ملتان، ص ۹۲

۳- آپ کے سن ولادت کی طرح سن دفن میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تھے۔ آپ سے بھی کئی کرامات منسوب ہیں۔ کچھ عرصہ آپ بستی لودی میں رہے پھر موضع ملک میں آگے پھر چک راجہ میں منتقل ہوئے وہاں مسجد اور مکان تعمیر کئے۔ اور وہاں اپنے نام سے بستی آباد کی جو آج بھی تحصیل کبیر والہ میں واقع ہے۔ اکرام الحق نے آپ کے ایک تلمی نسخے کا ذکر کیا جو انہیں کہیں سے دستیاب ہوا ہے یہ آپ کے مرید صاحب نے لکھا ہوا ہے فارسی زبان کی شہنوی ہے جس میں تقریباً پندرہ سوا شعرا ہیں اور آپ کے حالات زندگی درج ہیں۔ آپ کی والدہ مائی سپورل ہیں جنہوں نے آپ کی تربیت کی۔ ان کے مطابق

”سلطان عبدالحکیم کو شروع سے ہی قرآن پڑھنے کا شوق تھا، کھیل کود کی طرف رغبت کم تھی جو ان ہوئے تو شریعت کے پابند تھے، یہ بھی رنگ ریزی کا کام کرتے تھے۔ ایک روز ایک شخص گزرے جو صاحب کشف معلوم ہوتے تھے، انہوں نے اپنا نام جلال اللہ بتایا اور سلطان ایوب ازاد لاد مخدوم عبدالرشید سے رجوع کرنے کو کہا،“

آپ کا سن وصال ۱۱۴۵ھ بیان کیا جاتا ہے، آپ کے ملفوظات کو مولوی ثناء اللہ نے ملفوظات حضرت سلطان عبدالحکیم کے عنوان سے پنجابی میں منظوم کیا ہے۔

اسی طرح بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے بزرگوں میں ایک اہم نام شاہ علی مردان کا بھی آتا ہے آپ کا تعلق صوفیاء کے سلسلہ اولیہ سے تھا جو کہ حضرت اولیٰ قرنی سے منسوب ہے دراصل آپ کے مرشد خواجہ محمد مراد اولیٰ کا شمار محکم الدین سیرانی کے خلفاء میں ہوتا ہے جن کا تعلق بیعت سلسلہ اولیہ میں سے تھا۔

۱۔ بحوالہ ارض ملتان، ص ۲۴۴

۲۔ ملاحظہ فرمائیے ملفوظات سلطان عبدالحکیم از مولوی ثناء اللہ مطبوعہ منظر العلوم السلطانی عبدالحکیم سن اشاعت درج نہیں ہے۔

۳۔ فرحت متانی ”ادیائے ملتان“ ص ۱۴۴ پر لکھتے ہیں کہ شاہ علی مردان نے محکم الدین سیرانی سے بیعت حاصل کی تھی جو درست نہیں ہے اس لئے کہ محکم الدین سیرانی کی وفات ۶ ربیع الآخر ۱۱۸۸ھ میں ہوئی جبکہ آپ کا سن ولادت ۱۱۹۶ھ ہے۔ دراصل آپ کے مرشد خواجہ محمد مراد اولیٰ نے محکم الدین سیرانی سے بیعت کی تھی۔

مخدوم شاہ علی مردان ۱۱۹۶ھ میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولانا حافظ علی مدد تھا جن کے جد امجد دادا فقیر عبدالقادر عراقی عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور یہیں رہائش اختیار کر لی تھی۔ مولانا حافظ علی مدد اندرون بوہڑ گیٹ میں بازار کتب فردشان میں رہتے تھے اور درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ حافظ علی مدد نے اپنے بیٹے شاہ علی مردان کو خود تعلیم دی۔ ابتدا قرآن مجید سے کی اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم دی۔ علم حاصل کرنے کے بعد شاہ علی مردان نے اپنے والد کی طرح درس و تدریس کا سلسلہ اپنایا اور بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ آپ سے درس لیتے رہے ہیں۔ ان میں گیلانی، قریشی، پٹھان اور گردیزی خاندان کے لوگ شامل ہیں۔

شاہ علی مردان درس و تدریس کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لئے بہاولپور بھی تشریف لے گئے اور وہاں جامع مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ کیا۔ پھر آپ دوبارہ ملتان تشریف لائے اور یہاں پھر سے درس دینا شروع کر دیا۔ آپ کے زمانے میں نواب مظفر خان شہید حاکم ملتان تھا جو خود بھی آپ کا قدر دان تھا لیکن آپ امرار کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے اس لئے آپ نے اس کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہ رکھا اور ادا علی گیلانی لکھتے ہیں کہ

”آپ مظفر خانی عہد کے ایک بے نظیر عالم تھے۔ طالبان علم و ادب اکناف عالم سے کشاں کشاں یہاں پہنچتے اور آپ سے تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتے۔ ریاضت و مجاہدات میں بھی آپ بے مثال تھے۔ آپ یتیموں اور بیواؤں کی امداد کیا کرتے تھے“

اکرام الحق لکھتے ہیں کہ

”علمیت میں مشہور، فقہ، حدیث و تفسیر کے مدرس تھے، ریاضت کے طور پر پانی بھرتے اور بے نیاز رہتے۔ امرار سے اجتناب اور غبار سے محبت کرتے تھے“

۱۷۱۔ بحوالہ ارض ملتان، از اکرام الحق، ص ۱۵۱ جبکہ فرحت ملتان اولیائے ملتان، ص ۱۴۳ میں آپ کا سن ولادت ۱۱۸۸ھ لکھتے ہیں اور سن وفات ۱۲۸۴ھ لکھتے ہوئے عمر ۸۶ سال لکھتے ہیں، یہاں فرحت ملتان خود تضاد کا شکار ہیں اس لئے کہ ان سنوں کے مطابق تو عمر ۹۶ سال بنتی ہے، جو غلط ہے۔

۱۷۲۔ اولیائے ملتان، ص ۲۶۹، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۶۴ء

ص ۱۳۱۔ ارض ملتان، ص ۱۵۲

شاہ علی مردان نے ۲۵ رجب المرجب ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی آپ کا مزار چوک شہیداں اور حرم گیت کے درمیان والی سڑک پر ہے۔

اولاد علی گیلانی نے اور اکرام الحق نے آپ سے ایک کتاب "لطافت سیریہ" منسوب کی ہے جو کہ غلط ہے "لطافت سیریہ" محمد عبیدون داعلی کی تصنیف ہے۔ شاہ علی مردان نے اس کی تلخیص کی ہے۔

یہاں تک جن صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی بدولت ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں کیا اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔

۱۱۔ آپ کے سن وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱۲۔ "حدیقہ الاولیاء" از غلام سرور لاہوری، ص ۲۰۸، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور

کتابیاب

نمبر شمار	مصنف	کتاب	ناشر دس اشاعت
۱-	ارشدملتانی	پریت مہار	بزم ثقافت ملتان
۲-	اکرام الحق شیخ	ارض ملتان	شعبہ نشر و اشاعت الاکرام ملتان
۳-	اللہ بخش خان بلوچ مولوی	خاتم سلیمانی	اسٹیم پریس لاہور، ۱۳۲۵ھ
۴-	امام الدین، فقیر	نافع السالکین (فارسی)	مطبع مرقوموی دہلی، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲
۵-	امام بخش خواجہ مترجم	گلشن ابرار اردو ترجمہ	صدیقیہ پریس، ملتان
	صالح محمد	حدیقۃ الاسرار	
۶-	ایچ۔ ایف۔ فارسی	فیصلہ مقدمہ دیوانی، مقدمہ نمبر ۱۰۹، ۱۹۱۱ء (خواجہ حامد و محمود)	یونین پرنٹنگ درکس لدھیانہ ۱۹۱۳ء
۷-	ابیس حمید اللہ شاہ	پیر فرید	تاج بک ڈپولہ لاہور، بار اول
۸-	بدایونی عبدالقادر	منتخب التواریخ (جلد سوم)	ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
۹-	پیر ہاروی، عبدالعزیز	گلزارِ جمالیہ، اردو ترجمہ	اداعلائے آگرہ ۱۳۲۵ھ
	مترجم۔ قاضی محمد بر خردار	الذاریہ	
۱۰-	پیر ہاروی، عبدالعزیز	الذاریہ	سرائیکی اردو ریسٹرن گلد آف پاکستان کراچی
۱۱-	مترجم محمد اعظم سعیدی	روح فرید	بزم ثقافت ملتان بار اول ۱۹۷۷ء
۱۲-	جسکانی رفیق خاور	ذکر کرام	مطبوعہ دہلی رجب المرجب ۱۳۵۲ھ
۱۳-	حفیظ الرحمن مولوی	تواریخ ملتان	اس کتاب کا ٹائٹل صفحہ فائبرکے اس لئے مطبع کا پتہ نہیں چلتا
۱۴-	شمار اللہ مولوی	ملفوظات حضرت سلطان	منظہر العلوم الہلانی عبدالحکیم

- عبدالحکیم
- ۱۵۔ رکن الدین اشارات فریدی (فارسی) مفید عام اگرہ ۱۳۲۱ھ
- (پہلی جلد تا چوتھی جلد)
- ۱۶۔ رکن الدین مقابیس المجالس اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۹ء
- ۱۷۔ ساک عبدالمجید مترجم کیپٹن واحد بخش سیال مسلم ثقافت ہندوستان میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور طبع دوم
- ۱۸۔ سرور لاہوری غلام حدیقۃ الاولیاء اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور
- ۱۹۔ سلیمان نجم الدین مناقب المحبوبین اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۹ء
- ۲۰۔ سلیمانی، نجم الدین ایضاً مطبع محمدی لاہور
- ۲۱۔ سیالوی شمس الحق مرآة العاشقین (فارسی) مصطفائی لاہور ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء
- ۲۲۔ سیالوی شمس الحق مرآة العاشقین (اردو ترجمہ) اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور
- ۲۳۔ شفیق عقیل مترجم غلام نظام الدین پنجابی کے پانچ قدیم شاعر انجمن ترقی اردو کراچی، بار اول ۱۹۷۰ء
- ۲۴۔ شہاب، مسعود حسن خطہ پاک اوج اردو اکیڈمی بہاولپور طبع اول ۱۹۶۷ء
- ۲۵۔ شہاب، مسعود حسن اولیائے بہاولپور اردو اکیڈمی، بہاولپور بار دوم
- ۲۶۔ شہاب، مسعود حسن خواجہ غلام فرید حیات و شاعری جدید پریس لاہور
- ۲۷۔ شہزاد، محمد اختر مناقب فریدی مطبع احمد دہلی
- ۲۸۔ صالح محمد، مولوی سیرت سلیمان مطبوعہ لاہور ۱۹۳۵ھ
- ۲۹۔ صالح محمد - مولوی حیات سلیمان تونسوی چشتیہ کتاب گھر لاہور ۱۹۵۲ء (حصہ اول)
- ۳۰۔ صدیق طاہر (مرتب) دیوان فرید (اردو) اردو اکیڈمی، بہاولپور
- ۳۱۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر ملتان میں اردو شاعری سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۵ء
- ۳۲۔ عبدالجبار (مرتب) انتخاب مناقب سلیمانہ حمیدیہ سٹیٹ پریس لاہور ۱۳۲۵ھ

- ۳۳- عبدالحق مہر ڈاکٹر مزیدسانی تحقیقات سرائیکی ادبی بورڈ ملتان بار اول
۱۹۸۵ء
- ۳۴- عبدالحق مہر ڈاکٹر نور جمال سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۱۹۷۲ء
- ۳۵- عبید اللہ ملتان سیر دلبران (فارسی) فیض عام پریس لاہور، ماہ صفر ۱۳۲۲ھ
- ۳۶- ایضاً مترجم واحد بخش سردلبران (اردو ترجمہ) صوفی فاؤنڈیشن، بہاولپور طبع اول
سیال، ۱۴۰۰ھ
- ۳۷- عبدالحق ندوی سید نزعۃ الخواطر جلد ششم دائرہ المعارف حیدرآباد دکن
- ۳۸- عزیز الرحمن، مولوی (ترجمہ) "دیوان فرید" (مقدمہ) مقدمہ از علامہ نسیم طاہر
- ۳۹- عمر کمال خان نواب منظر خان شہید اور فاروقی کتب خانہ ملتان اس کا عہد
- ۴۰- غلام محمد خان مناقب سلیمانی (فارسی) در مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۸ھ
- ۴۱- غلام فرید، خواجہ مناقب محبوبیہ انجمن فکر فرید کوٹ مسٹن اول بار
۱۹۸۳ء
- ۴۲- غلام فرید، خواجہ فوائد فریدیہ (فارسی) مطبع محمدی مجنبتی لاہور ۱۳۱۲ھ
- ۴۳- ایضاً دیوان فرید (اردو) ۱۸۸۲ء در مطبع قادری لاہور
- ۴۴- ایضاً ایضاً ۱۸۸۳ء اسلامیہ سٹیم پریس لاہور
- ۴۵- ایضاً ایضاً ۱۸۸۷ء مطبع گلزار اکیس گلزار محمد
- ۴۶- ایضاً ایضاً مکتبہ اولیہ، بہاولپور
- ۴۷- غلام فخر الدین خواجہ دیوان اوحدی مکتبہ الجمال، جہانیاں منڈی خانیوال
- ۴۸- فرحت ملتان اولیائے ملتان مکتبہ تنویر ادب، ملتان بار سوم
۱۹۸۷ء
- ۴۹- فریدی نورا احمد "دیوان فریدی" قصر الادب ملتان
(حصہ اول و دوم)
- ۵۰- فقیر اللہ تحفہ فقیر مسکے بہ ہدیہ فقیر، مطبع محمد، لاہور

- ۵۱- فیض اللہ خان قصوری مقدمہ تونسہ شریف ایضاً
- ۵۲- قاضی جاوید پنجاب کے صوفی دانشور شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع اول
۱۹۷۹ء
- ۵۳- ایضاً برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار بک ٹریڈرز، لاہور، طبع اول
۱۹۷۷ء
- ۵۴- قریشی عبدالغفور پنجابی ادب دی کہانی لاہور ۱۹۵۶ء
- ۵۵- کیفی جامپوری سرائیکی شاعری سید الیکٹرک پریس ملتان ۱۹۶۹ء
- ۵۶- کتہیا لعل تاریخ پنجاب سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۵۷- گل محمد احمد پوری خواجہ تکملہ سیر الاولیاء (فارسی) نولکھنور کاپنور
- ۵۸- گل محمد احمد پوری خواجہ تکملہ سیر الاولیاء مکتبہ الہام، بہاولپور
- ۵۹- گیلانی، اولاد علی مترجم مسعود حسن شہاب
- ۶۰- ایضاً اولیائے ملتان سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان سے
۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔
- ۶۱- گیلانی، شمس الدین ارمنغان ادب سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور ۱۹۶۶ء
- ۶۲- گیلانی موسیٰ پاک شہید تیسیر الشافعیین مطبع فیروز پور ۱۳۰۹ھ
- ۶۳- لیگر، ایل ولیم انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم لاہور ۱۹۶۱ء
- ۶۴- محدث دہلوی، عبدالحق اخبار الاخبار فی امر الابرار در مطبع مجتبائے دہلی ۱۳۲۲ھ
- ۶۵- مفتی علی الدین خلیف مفتی
- خیر الدین قصر عارفان (فارسی) جلد دوم پنجابی اکیڈمی لاہور
- ۶۶- محمد اکرام، شیخ رود کوثر ادارہ ثقافت اسلامیہ، ساتویں بار
۱۹۷۹ء
- ۶۷- محمد ایاس قیصر خیر البلاد قصر الادب خیر پور (میاہوالی) بہاولپور

- ۶۸- محمد الدین ذکر حبیب مطبوعہ لاہور ۱۳۲۲ھ
- ۶۹- محمد الازفر فیروز گوہر شب چراغ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور،
بار اول ۱۹۱۹ء
- ۷۰- محمد بشیر احمد فقر فرید نقوش پریس لاہور
- ۷۱- محمد حسین بلہی ڈاکٹر خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور
ان کے خلفاء اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور
- ۷۲- ایضاً تذکرہ حضرت خواجہ سلیمان
تونسوی اردو ترجمہ نافع السائین
شعاع ادب لاہور بار اول
- ۷۳- محمد سلیم جمالی، محمد نواز ظہور جمال جمال لائبریری، ملتان
- ۷۴- محمد شفیع، مولوی مقالات دینی و علمی (حصہ
اول) مزدور پرنٹنگ پریس لاہور
- ۷۵- محمد عبدالحکیم شرف قادری تذکرہ اکابر اہلسنت مکتبہ قادر لاہور
- ۷۶- ناظم بشیر حسین اولیائے ملتان سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۷۷- نظامی، خلیق احمد تاریخ مشائخ چشت دارالمولفین اسلام آباد
- ۷۸- تحفۃ الابرار (جدول ثانی) مطبع رضوی دہلی

اخبار

- ۷۹- عبدالحق مہر، ڈاکٹر ملتان کے اسلامی دور حکومت امروز ملتان نمبر جون ۱۹۷۸ء
کے انحطاط کی چار عظیم
شخصیتیں
- ۸۰- محمد اقبال عاصی حضرت منشی غلام حسن
شہید رحمۃ اللہ علیہ امروز، ۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء
- ۸۱- نورا احمد فریدی حافظ محمد جمال الدین امروز (خاص ایڈیشن)، ۳ جون
۱۹۸۳ء
- موسیٰ پاک شہید

رسالہ

۸۲- نسیم طاہرات علامہ "حضرت عراقی کی اولاد" متنویر، ملتان سالنامہ اگست ستمبر

۱۹۵۷ء

غیر مطبوعہ

- ۸۳- عبدالحق، ڈاکٹر پیام فرید
- ۸۴- یاسمین قریشی خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری
- تقلیمی نسخے (چوتھا باب)
- ۸۵- امام الدین، مولانا مرتب، نافع السالکین (فارسی) ملفوظات خواجہ سلیمان تونسوی
- ۸۶- احمد یار، حافظ (مؤلف) منتخب ملفوظ شریف حضرت خواجہ سلیمان تونسوی (فارسی)
- ۸۷- یار محمد بن تاج چشتی الوار سلیمانہ (مرتب)
- ۸۸- امام بخش خواجہ گلشن ابرار (فارسی)
- ۸۹- دزدی تونسوی، میاں مناقب سلیمانی (فارسی) یہ کتاب منتخب ملفوظ شریف کے حاشیے پر لکھی گئی ہے۔
- ۹۰- رکن الدین، مولوی اشارات فریدی (حصہ پنجم) فارسی، ملفوظات خواجہ غلام فرید
- ۹۱- زاہد شاہ مسٹن مخدوم اسرار الکمالیہ (فارسی)، ملفوظات حافظ محمد جمال ملتانی (سید)
- ۹۲- سعید اللہ رضوی (سید) بحر السرار (فارسی)
- خلیفہ محمد امین (کاتب)
- ۹۳- عبدالغفور انصاری، مولوی در تعریف خواجہ خدا بخش (سرائیکی منظوم)
- المنخلص عبداللہ
- ۹۴- غلام حسن شہید، منشی الوار جمالہ (فارسی) سوانح عمری حافظ محمد جمال ملتانی
- ۹۵- ایضاً دیوان حسن (فارسی)
- ۹۶- ایضاً لوزا ہدایت (متنوی فارسی)

- ۹۷- ایضاً رسالہ نورالہدیٰ (فارسی)
- ۹۸- ایضاً کلمات الانصاف (عربی)
- ۹۹- ایضاً دیوان متفرقات راردو، سرائیکی، ہندی اور پنجابی زبان میں مختلف شعری اصناف
- ۱۰۰- غلام فخر الدین (تونسوی) خلاصتہ الفوائد مشتمل بر حالات خواجہ نور محمد مہاروی ۴ ربیع الثانی مولانا حکیم محمد عمر چشتی (مرتب) ۱۳۲۴ھ
- ۱۰۱- یار محمد خلیفہ غلام حسن تذکرہ حضرت محبوب ذوالمنن ۱۳۱۰ھ شہید
- ۱۰۲- فقیر محمد عارف کوہ غم، در بیان سفر بیت اللہ شریف و مدینہ (سرائیکی) ۱۳۰۱ھ
- ۱۰۳- نظام الملک مناقب فخریہ مشتمل بر حالات خواجہ فخر الدین دہلی ۱۲۹۳ھ
- ۱۰۴- یار محمد بن تاج محمد المنتخب ملفوظ فارسی کتاب ۱۴ محرم ۱۳۱۶ھ (مرتب، احمد الدین کاتب)
- ۱۰۵- یار محمد بن تاج محمد انوار سلیمانہ (فارسی) (یہ دونوں منتخب ملفوظ شریف "کے قلمی نسخے ہیں صرف کاتب مختلف ہیں) (کاتب)

B I B L I O G R A P H Y

1. C. Shackle " Nure-Jamal " Baz-me-Saqafat, Multan.
2. C. Shackle "The Teaching of Khwaja Farid " Baz-me-Saqafat, Multan.
3. Translated by Aslam Ansari/Gilani Kameran "Kafees" Baz-me-Saqafat, Multan First Edition 1969.
4. Nazir Ali Shah " Farid " Urdu Academy, Bahawalpur.

ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ

(مجموعی جائزہ)

- (الف) ملتان کے فنون لطیفہ و مفیدہ پر صوفیاء کے اثرات
- (ب) ملتان کی تعلیمی تدریسی اور علمی زندگی پر صوفیاء کے اثرات
- (ج) ملتان کی ادبی اور تہذیبی زندگی پر صوفیاء کے اثرات کا مجموعی جائزہ

ملتان کی ادبی اور تہذیبی زندگی

میں صوفیائے کرام کا حصہ،

(الف)
ملتان کے فنون لطیفہ و مفیدہ پر صوفیاء کے اثرات کا جائزہ

سرزمینِ ملتان کو قرنِ ہاقرن سے انسانی تہذیب و معاشرت کے حامل قدیم ترین شہروں اور خطوں پر جو فضیلت حاصل رہی ہے۔ اس کا سبب محض اس کی قدامت یا بابل، مینوا اور موہنجو دارو کی ہم عصری یا ہمسری نہیں بلکہ اس کا یہ شرف ان صوفیاء اور اولیائے کرام کی بدولت قائم ہوا جنہوں نے اس سرزمین کو اپنا مستقل مستقر بنایا اور یہاں رشد و ہدایت، علم و عرفان، تعلیم و تعلم اور فلسفہ و تصوف کے بیج بوئے بلکہ تہذیب و ثقافت اور ادب و شعر میں مثبت اور تعمیری رویوں کو بھی عام کیا۔ ارضِ ملتان کے کاخ و کوہ، قلعہ کہنہ (موجودہ قاسم باغ) اور قدیم اسلوب تعمیر کی حامل عمارتوں، خانقاہوں اور مسجدوں کے نیچے صدیوں اور قرنوں کی تہذیبی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ جملہ فنونِ لطیفہ و مفیدہ کی نشوونما ارضِ ملتان میں از مرہ قدیم سے تہذیب و ثقافت کے ارتقار کا حصہ رہی ہے۔ فنِ تعمیر، شاعری، موسیقی، آوازِ مصوری، سنگ تراشی، کاشی گری، حلاطی، جلد سازی، طب و حکمت، قالین بافی، ظروف سازی، نقاشی اور دیگر فنون کے لحاظ سے ملتان دنیا کے کسی بھی شہر سے پیچھے نہیں رہا۔ ارتقار کا عمل کسی اتفاقی بالمحاتی حادثے کا مرہونِ منت نہیں ہوتا بلکہ اس میں صدیوں کے انسانی تجربات شامل ہوتے ہیں، انسانی سوچ، انسانی محنت اور انسانی ماسعی کا ثمرہ جہاں روایات کو جنم دیتا ہے وہاں امکانات کو بھی منکشف کرتا ہے۔ ابتدائی انسانوں نے جو ورثہ آئندہ نسل کو منتقل کیا آنے والوں نے اس سے استفادے کے

بعد اس میں اضافہ کیا نئے آفاق تلاش کئے اور پھر اس روایت میں نئی روایت کو تخلیق کر کے عظیم مستقبل کی طرح ڈالی۔

فنون لطیفہ ہوں یا مفیدہ.... ان کی ابتداء انفرادی سطح پر ہوئی کسی ایک انسان نے ایک چیز ایجاد کی لیکن اس کی اختراع نے انسانی زندگی کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور پھر اجتماعی سطح کی محنت و ریاضت نے اسے ایک ایسے ورثے میں تبدیل کر دیا جس نے اجتماعی زندگی کی برکتوں میں اضافہ کیا۔ ملتان میں تہذیب و ثقافت اور ادب و فن کی ترویج کا سہرا زیادہ تر صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے سر جاتا ہے کیونکہ صوفیائے کرام نے شائستہ اور شستہ اعمال کی جو بنیاد ڈالی وہ ان کے ادراک جمال اور تشکیل جمال کے سلسلے کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔ ان فنون کے پیچھے صوفیاء کے عقائد، تصورات اور اظہارات کی توانائی بھی موجود تھی اور ان کے تہذیبی مزاج اور عملی واردات کی قوت بھی۔ فنون لطیفہ ہوں یا مفیدہ.... ان میں افراد اور اقوام کے تہذیبی ردیوں، مذہبی تصورات، ذہنی و قلبی واردات اور نسل خصائص کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ ملتان میں فنون لطیفہ و مفیدہ کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فنون کو تہذیبی اور ثقافتی ورثہ بنانے میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے جن کے لمحات عرفان سے لوگوں کے قلب و نظر مستنیر ہوتے اور پھر انہوں نے بھی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرنے کے لئے اظہار کے نئے نئے وسیلے اختیار کئے۔ کبھی شعر و ادب کو وسیلہ بنایا کبھی عمارتوں کی تعمیر میں عقیدت کا اظہار کیا کبھی نقاشی اور کاشی گری کے ذریعے ان کی تزئین اور آرائش کی کبھی صوفیاء کے ملفوظات کو محفوظ رکھنے کی خاطر خطاطی کے جوہر دکھائے، پھر ان مقدس صفحات کو منقش و مصور کیا۔ کبھی سماع کی وجد اور محفلیں سجائیں کبھی ان صوفیاء کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے مدرسے اور مکتب قائم کئے.... اور یوں ہمارے بیشتر ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا محرک صوفیائے کرام کا وجود مسعود ہی بنا۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے سب سے پہلے ہم فن تعمیر کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ فن تعمیر

کسی بھی قوم کا فن تعمیر اس کی معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی ضرورتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے مذہب نے فن تعمیر کو بہت متاثر کیا ہے۔ مذہب نے عبادت کا تصور دیا جس سے عبادت خانے وجود میں آئے جو اس مذہب کے عقائد کے مطابق تعمیر کئے گئے۔ فن تعمیر پر اسلام کی

گبری پھاپ ہے۔ مساجد اور خانقاہیں مسلم فن تعمیر کے عظیم مظاہر ہیں۔ مسلم فن تعمیر کے بارے میں ڈاکٹر سید اسد علی لکھتے ہیں۔

”رومانی اعتبار سے اسلامی تہذیب و تمدن کی نشوونما ایسے علاقوں میں مورتی تھی جہاں بڑے اور گھنے جنگل نام کو بھی نہ تھے وہاں وسیع و عریض ریگستانی اور نصف بنجر زمین کے ہوتے ہوئے بھی ہر چیز بڑی صاف اور واضح دکھائی پڑتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم فن تعمیر میں صفائی ستھرائی، ہمہ گیریت، اخلاق کی عمدگی اور ساخت کی عظمت صاف دکھائی پڑتی ہے۔ اسلامی ممالک میں بہت مضبوط عمارتی لکڑی بھی زیادہ حاصل نہیں ہو پاتی تھی اور کئی علاقوں میں تو بڑے بڑے پتھر بھی حاصل نہیں ہو پاتے تھے ان تمام خامیوں کے باوجود اسلام کی اجتماعی عبادت، مساوات جیسی صفات کی وجہ سے معمار کافی وسیع رقبوں کو تعمیرات کے لئے منتخب کرتے تھے جن میں بڑے بڑے صحن، محراب، دالان، گول گنبد وغیرہ بنانے پڑتے ہیں۔“

عرب کے مسلمان ہو جانے کے بعد وہاں کی تمام ثقافتی چیزوں کو قرآن کی روشنی میں اسلامی رنگ میں رنگ لیا گیا۔ اس کے بعد اسلام کی اشاعت جہاں جہاں ہوئی، وہاں وہاں رسوم کو اسلامی آدرشوں کے مطابق ڈھال کر مسلم ثقافت کو ترقی دی گئی مسلم فن تعمیر نے کہیں تو غرناطہ کے قصر الزہراء اور قصر احمر، کہیں بغداد کے قصر امین اور قصر بیدہ کے طرز تعمیر کو اسلامی آدرشوں پر ڈھال کر اختیار کیا، کہیں ایرانی ہشت پہلو طرز تعمیر کو اپنایا، کہیں سارسنگ، سریانی اثرات کو قبول کیا۔ اس طرح اسیروں یا سلونیا، مصر، یونان، روم، بازنطین، بغداد، ایران وغیرہ جہاں جہاں بھی اسلامی قوت روحانیت کی اشاعت ہوئی، مسلمانوں نے اسلام کی روشنی میں ڈھال کر وہاں کی ثقافت اور فنون کو اختیار کر لیا۔

محولہ بالا اقتباس میں مسلم فن تعمیر کی چند مجموعی اور امتیازی خصوصیات کا تذکرہ ہے جن میں صفائی،

۱۔ ”ہندی ادب کے لگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات“ مصنفہ ڈاکٹر سید اسد علی مترجمہ ڈاکٹر ماجدہ اسد،

ص ۲۳۹ تا ۲۴۰، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۷۹ء

ہمہ گیریت، ساخت کی عظمت، وسعت، صحن کی فراخی، دالان، گول گنبد وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم فن تعمیر نے دیگر تہذیبوں کے فن تعمیر سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ جب مسلمان برصغیر ہندوپاک میں آئے تو اپنا فن تعمیر بھی ساتھ لائے۔ انہوں نے مقامی فن تعمیر سے بھی استفادہ کیا لیکن اسلامی خصوصیات کو برقرار رکھا۔ دونوں طرز ہائے تعمیر میں واضح فرق موجود ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں۔

”اسلامی اور ہندو دانی فن تعمیر میں نہ صرف صورتی اعتبار سے فرق ہے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی اختلاف ہے اور دونوں میں تعمیر کے علیحدہ علیحدہ طریقے بھی برتے گئے ہیں۔۔۔۔۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف مذہبی و معاشرتی رسوم، نیز ان حالات کے مطالعہ سے جن کے ماتحت وہ زندگی بسر کرتے تھے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے طرز تعمیر کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ مسلمان جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ان کا طریق عبادت بالکل سادہ تھا وہ خدا کو بتوں کے مجازی پیکر میں دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ پادریوں اور پٹوتوں کی طرح ان کے کوئی پیشہ ور مذہبی پیشوا نہ تھے۔ اور نہ وہ پراسرار فضا تھی جو ایسے مذہبی لوگوں کے گرد پیدا ہو جاتی ہے مسلمان مردوں کو دفن کرنے کے معتقد تھے ان میں قبروں پر پامدار مقبرے بطور یادگار تعمیر کرنے کا رواج قائم ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ طریقہ تعمیر میں ایک اور فرق یہ تھا کہ ہندو عمارت کو جوڑنے والے مسالے مثلاً چونے کا استعمال نہیں کرتے تھے اس کے برخلاف مسلمانوں کی عمارتوں میں چوننا بکثرت استعمال ہوتا۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی مسجد کھلی اور وسیع اور نماز باجماعت کے لئے بڑے بڑے دالانوں پر مشتمل ہوتی تھی اس کے برعکس ہندوؤں کے مندر میں صرف دیوتا کی صورت کے لئے ایک چھوٹا کمرہ ہوتا تھا جس تک پہنچنے کے لئے ایک طویل تنگ و تاریک گزرگاہ ہوتی تھی۔۔۔۔۔ ہندو اپنی عمارتوں کو سانچوں میں ڈھلی ہوئی صورتوں وغیرہ سے آراستہ کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کی عمارتیں ہنخطوط، ابھرواتی نقاشی اور خطاطی سے آرائش زیادہ طبیعیاتی اور پرکار ہوتی تھیں لیکن مسلمان اپنی آرائشوں میں بہت اعتدال سے کام لیتے تھے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں نے بعض نئی نئی چیزیں بھی داخل کیں مثلاً مینار اور منارے

گنبد کا کروی مثلث، ڈاٹ دار محرابیں، آویزے، مقننس اور نصف گنبد والے دوہرے پھاٹک وغیرہ بعض اوقات وہ اپنی عمارتوں پر نقاشی اور طلا کاری بھی کرتے تھے اور کبھی بوقلموں رنگوں سے پیدا کرنے اور تعمیر می خصوصیات کو نمایاں کرنے کیلئے مختلف رنگوں کے پتھر بھی کام میں لاتے تھے۔ بعد میں انہوں نے پچی کاری کا استعمال کیا جس نے ترقی کر کے نگینہ کاری کی شکل اختیار کی۔ مسلمان کاشی کار اینٹیں بنانے اور نبت کاری کی صنعتیں بھی اپنے ساتھ لائے تھے لیکن انہوں نے خاکہ کی شان و شوکت، ہیئت کی دلاویزی اور خط نلکی پر زور دیا۔ جو ان تمام لوازمات سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ انہوں نے خطاطی کے پیچ و خم کھلتے مرغولوں کی محور کن خوبصورتی سے فن تعمیر کو چارچاند رنگ لگائے۔

متذکرہ اقتباسات میں ہندو اور اسلامی طرز تعمیر میں واضح فرق بیان کیا گیا ہے۔ یہ فرق اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ دونوں قوموں کی طرز معاشرت اور عقائد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے جہاں مقامی طرز تعمیر سے فائدہ اٹھایا وہاں برصغیر کے فن تعمیر پر گہرا اثر بھی چھوڑا۔ فن تعمیر کی بیشتر مروجہ اصطلاحات کا عربی اور فارسی سے تعلق ہے جو یہاں کی زبانوں میں کھپ گئی ہیں۔ مثلاً راج، قلعی، متری، بارہ درمی، دالان، غسل خانہ، بالاخانہ، دیوان خانہ، قلعہ، مقبرہ، محل وغیرہ مسجد اور خانقاہ مسلم فن تعمیر کے دو بڑے مظاہر ہیں۔ ملتان کی سرزمین میں ان دونوں میں فن تعمیر کے نادر نمونے موجود ہیں۔ ملتان میں فن تعمیر میں جدت اور اختراع کا آغاز بھی صوفیاء کی آمد کے بعد ہوا۔ لوگوں نے ازراہ عقیدت مقبروں اور مزاروں کی تعمیر میں خون جگر کی نمود پیدا کی۔ خانقاہوں اور مساجد و مدارس کی تعمیر کے سلسلے میں کاشی گرمی کا فن چمکا دکش اور دلفریب نقش و نگار سے مزین کاشی سلیم مغل دور میں خصوصاً مقبول ہوئی۔ کاشی گروں کے خاندان ملتان میں اب بھی موجود ہیں۔ اور انہیں یہ فن ورثے میں ملا ہے اب ہم ذیل میں فن تعمیر کے کچھ نمونوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

مساجد | مسجد مسلم فن تعمیر کی آئینہ دار ہے۔ یہ گنبد، محراب، دالان اور میناروں پر مشتمل ہوتی ہے

۱۔ بحوالہ سرسیدین پاکستانی ادب چوتھی جلد، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی، فروری ۱۹۸۲ء ص ۲۹۰ تا ۲۹۲، مضمون بعنوان "برصغیر کے مسلمانوں کا فن تعمیر" از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔

جسے آیات کی خطاطی، نقاشی، کاشی گری سے مزین کیا جاتا ہے۔ قدیم مساجد میں چھوٹی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ جنہیں مسالے سے جوڑا گیا ہے۔ پتھر کی سلیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ مسجد کا طرز تعمیر ریشم اور مقدس ہوتا ہے۔

(۱) ملتان میں سب سے پہلے محمد بن قاسم نے دو مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ایک قلعہ کہنہ پر جسے علم بن شیبان بن جو اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ بنو امیہ کی یادگار سمجھ کر بند کر ڈالا۔ بعد میں محمود غزنوی نے علم بن شیبان کی بنوائی ہوئی مسجد کو بند کر دیا۔ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو دوبارہ آباد کیا۔ آخر کار سکھوں نے اسے مہدم کر دیا۔ دوسری مسجد اندرون ملتان شہر بنوائی جو آج بھی چوڑی سرائے میں خستہ حالت میں موجود ہے۔

(۲) مسجد ولی محمد خان..... یہ مسجد شہر کے وسط میں یعنی چوک بازار میں واقع ہے اسے ۱۷۵۸ء میں ملتان کے والی علی محمد خان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ ایک اُپنچے چبوترے پر واقع ہے اور اس کے پیچھے چاروں طرف دکانیں ہیں جن کا معقول کرایہ وصول ہوتا ہے۔ اس کی دیواروں پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں اور قرآنی آیات اور اسمائے تعالیٰ لکھے گئے ہیں۔ چھت لکڑی کی ہے۔ جس پر نقاشی کا کام کیا گیا ہے۔ منبر و محراب سنگ مرمر کے ہیں۔ صحن کے وسط میں بڑا سا تالاب ہے جو وضو کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا "دالان" عمارت اندر سے ۷ فٹ چوڑا اور چوالیس فٹ لمبا ہے۔ یہ عمارت بقول سید اولاد علی گیلانی "اس علاقہ کی صنعت کاشی گری کا بہترین نمونہ ہے"۔ مسجد کے دروازے پر یہ اشعار درج ہیں۔

بفضل اپزد و لطف نبی آخر زماں	یہ میں حضرت جلیانی و غوث مہر دو جہاں
بہ جائے شیخینہ بازار، بہر نرم و فساد	کہ بد چو تیرہ دار جرم و ظلم عیان
بنائے مسجد و حمام چاہ حوض عجیب	بساخت بر سر بازار ناظم ملتان
برائے بنائش ز غیب ہاتھ گفت	نمود مسجد عالی علی محمد خان

مندرجہ ذیل اشعار بھی مسجد میں درج ہیں۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "تاریخ سندھ" از اعجاز امجد قدوسی، ص

۲۔ بحوالہ ارض ملتان، از شیخ اکرام امجد، ص ۱۷۱، مطبوعہ از شعبہ نشر و اشاعت "الاکرام" ملتان

۳۔ بحوالہ مرقع مولتان، ص ۲۳

زہے عمارت عالی مسجد ملتان
کشید بر سر بازار باد و صد اقبال
بماند در کف سنگھاں بہ سال سی چہار
ظہور نور جیسی رہا ند از بندش
پس از شکستن سنگھاں تیار شد از نو
چو کرد نور محمد کتادہ از بندش
کہ کردہ بود بنائش علی محمد خاں
لو امر دین بنی ہم چو آفتاب عیاں
اسیر و بند کہ جی کرد ماہ و سال فغاں
کہ گشتہ است ظہورش ز نور کون و مکاں
یہ زینہ ہا دستوں ہا ر نقشہ دالاں
تباقت ہچو ستارہ ز ظلمت سنگھاں

ان اشعار میں مسجد کی تاریخ تعمیر بھی درج ہے سکھوں کی شکست کے بعد اسے دوبارہ آراستہ کیا گیا تھا۔
(۳۱) سادی / سبز مسجد... روغنی اینٹوں سے تعمیر کردہ یہ عمارت کوٹلہ تولے خان (تغلق خان) میں واقع ہے عمارت خاصی بلند ہے اندر دیواروں پر یہ اشعار لکھے گئے ہیں۔

جگر خواری از مے گساری بہ است
بیا مٹریا از طرب بگزد و میم
ز چنگ اجل چوں شاید گریخت
شنیدی چوں احوال گیتی تمام
کہ غم دیدہ را آہ وزاری بہ است
ز چنگ طرب تار باید گنجیت
ز چنگ طرب نار ہا بر قسیم
بجز حق منہ دل بکس و اسلام

(۴۱) مسجد پھل ہٹا نوالی... مسجد دلی محمد خان سے شمال حسین آگاہی کی طرف ذرا آگے بڑھیں تو بائیں جانب ایک اونچی مسجد ہے جو مسجد پھل ہٹا نوالی کہلاتی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لئے فرخ سیر تاجدار ہندوستان (۱۲-۱۳ء) نے اسی ہزار روپیہ دیا تھا۔ روایت ہے کہ ایک ملتان فقیہ کی دلع سے (فرخ سیر کو) اولاد نصیب ہوتی۔ اس خوشی میں اس نے اسی ہزار روپے بطور انعام فقیر کو دیئے۔ فقیر نے اس روپے سے یہ مسجد بنوادی۔ اس کی بیڑھیوں پر اور اس پاس گل فروش دکانوں کی رعایت سے یہ نام پڑ گیا۔

(۵) عید گاہ ملتان سے خانیوال کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے عید گاہ واقع ہے یہ مسجد خاصی وسیع و عریض ہے اسے ۱۳۵۷ء میں ملتان اور لاہور کے صوبیدار نواب عبدالعہد خان نے تعمیر کرایا۔ شیخ اکرام الحق کے مطابق یہ وہی عبدالعہد ہے جس کی لڑکی اپنے زہد و ورع کی وجہ

ص ۱۲۰ بحوالہ "ارض ملتان" ص ۱۲۰

ص ۱۲۰ بحوالہ "مرقع ملتان" ص ۳۱۰

سے علامہ اقبال کا مدح بنی۔

”مسجد کا محراب دار مستقف دالان دوسو چالیس فٹ لمبا ہے اور چون فٹ چوڑا ہے
درمیان میں لغز بصورت گنبد سے کلاہ پوش ہے کونوں پر بلند مینار ہیں۔ یا ہر صحن میں
اینٹوں کا فرش ہے۔“

اس مسجد کو بھی سکھوں نے تاراج کیا لیکن بعد میں اس کو دوبارہ مرمت کیا گیا اور اس کی شان و شوکت
دوبارہ بحال ہو گئی، عیدین کے موقع پر یہاں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔

(۶) مسجد غوثیہ.... یہ مسجد اندرون شہر حضرت موسیٰ پاک شہید کے مزار کے ساتھ واقع ہے اس
کی لمبائی ساٹھ فٹ اور چوڑائی تیس فٹ ہے۔ فرش مرمر کلپ ہے اور مصلیٰ سنگ موسیٰ کا بنا ہوا ہے
اس کے تین گنبد ہیں اس کی تعمیر کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہے۔

(۷) مسجد شاکر خان.... نواب شاکر خان ۱۷۵۳ء میں ملتان کے صوبیدار تھے۔ انہوں نے
ابدالی روڈ پر اپنی اقامت گاہ شیش محل کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد صاف ستھری
اور دیدہ زیب ہے۔^۳

(۸) مسجد خدکہ.... قدیر آباد میں خدکوں کے محلے میں واقع ہے۔ اس میں کاشی گری کا کام
نہایت نفاست سے کیا گیا ہے۔

ان مساجد کی تزئین نقاشی قرآنی آیات کی خطاطی اور اشعار سے کی گئی ہے۔ اکثر مساجد میں
فارسی کے اشعار درج ہیں جن میں مسجد کی تاریخ اور اس کے بنانے والے کے نام منظم ہوتے
ہیں یہ مساجد ملتان کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

خانقاہیں

ملتان کی خانقاہیں اپنے انوکھے اور منفرد طرز تعمیر کی بدولت پورے برصغیر میں
مشہور ہیں۔ ان خانقاہوں کی تعمیر زیادہ تر صوفیاء کے وجود مسعود کی مرہون منت رہی ہے۔ ہر
خانقاہ کسی نہ کسی صوفی اور ولی کے ساتھ منسوب ہے۔ اسلامی تصوف میں ان خانقاہوں کو ہمیشہ

۱- ص ۲۲۔ بحوالہ ”ارض ملتان“ ص ۱۷۳

۲- ص ۳۳۔ بحوالہ ”ارض ملتان“ ص ۱۷۵

بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ یہ نہ صرف روحانی فیوض کا مرکز رہیں بلکہ درس و تدریس اور عمل تربیت کے بہترین ادارے بھی تھیں۔ ملتان کی بعض خانقاہیں مسلم فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان خانقاہوں میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

خانقاہ دیوان چاولی مشائخ

آپ کے روضے کی تفصیل آپ کے ذکر میں آچکی ہے حضرت دیوان چاولی مشائخ برصغیر پاک و ہند کے پہلے صوفی ہیں اور اس اعتبار سے ان کا روضہ بھی قدیم ترین ہے۔ مقبرے کو موجودہ شکل میں محمود غزنوی نے تعمیر کرایا اور جہانگیر نے اس کی مرمت کرائی اس مزار کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہاں بڑے بڑے صوفیاء نے چلہ کشی کی اور روحانی طور پر اکتساب فیض کیا۔ پروفیسر محمد امین لکھتے ہیں کہ

”آپ کے مزار پر بڑے بڑے صوفیاء نے چلہ کشی کی اور فیض پایا جن میں بابا فرید گنج شکر، جلال الدین سلمان، بہاؤ الدین زکریا ملتانی، عثمان مروندی، لال شہباز قلندر جیسے صوفیاء کے اسماء شامل ہیں۔۔۔ ہندوؤں نے بھی آپ کے مزار پر چلہ کشی کی جن میں بابا گرو نانک بھی شامل ہیں۔“

موجودہ عمارت دیوان مولراج کے زمانے میں نئے سرے سے تعمیر ہوئی روضے کی تعمیر کے بارے میں لالہ حکم چند لکھتے ہیں۔

”یہ خانقاہ اندر موضع چاولی مشائخ پر گنہ میلسی متصل موضع ساہو کے حد شرقی پر واقع ہے یہ خانقاہ مسجد پختہ اور دروازہ و چار دیواری ہر ایک عمارت پختہ ہے ایک مسجد کہنہ شکستہ جانب شمال روضہ سے ہے جو تعمیر کردہ محمود غزنوی بیان کرتے ہیں۔ دوسری مسجد جانب شرق روضہ کے تعمیر کردہ جہانگیر بادشاہ کی ہے اور اندر روضہ کے ایک تربت دیوان صاحب دوسری مزار کنگن برس ہمیشہ دیوان صاحب کی ہے اور روضہ سے باہر اندر احاطہ ایک اعصاب دیوان صاحب کا پڑا ہوا ہے اور احاطہ روضہ سے باہر مکانات ذیل ہیں۔“

ص ۱۔ بحوالہ مضمون ”مسلم فلسفے میں ملتان کی خدمات“ از پروفیسر محمد امین، مطبوعہ ماہ نو جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۳

ص ۲۔ بحوالہ تواریخ ملتان، از لالہ حکم چند، ص ۱۰۵

خانقاہ کا یہ قدیم ترین نمونہ بڑھی شکستہ حالت میں ہے پھر بھی مساجد اور دروغہ کا فن تعمیر دیدہ زیب ہے اور اس دور کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

خانقاہ شاہ یوسف گردیز

حضرت شاہ یوسف گردیز کا مزار فن تعمیر کا ایک انوکھا اور عمدہ شاہکار ہے۔ یہ قدیم ترین مزاروں میں سے ایک ہے اسے ۱۱۵۰ء میں شاہ یوسف گردیز کی وفات کے بعد تعمیر کیا گیا۔ یہ اندرون بھر گیت محلہ شاہ گردیز میں واقع ہے اس کا ایک نمونہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ فنی لحاظ سے یہ مقبرہ سادہ اور چوکور ہے۔ اس کی لمبائی ۳۲ فٹ اور چوڑائی ۳۲ فٹ ہے اس میں جو اینٹیں استعمال ہوئی ہیں ان کی لمبائی آٹھ اینچ اور موٹائی دو اینچ ہے۔ دروازے کے اوپر چھت کے ہمارے کتے اینٹوں کا قوس نما محراب ہے جو اسلامی طرز کا منظر ہے۔ چھت میں آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر نیلے رنگ کی روغنی اینٹیں لگائی گئی ہیں، شیخ اکرام اعظمی نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

”سقف میں چھوٹے چھوٹے آئینے اور دیواروں کے اندر اور باہر نیلے رنگ کی روغنی اینٹوں کو بیل بوڑوں کی طرح جڑا گیا ہے جس میں منظر دیدنی ہو گیا ہے۔ مربع جسامت کے ٹکڑی کے بلے ٹکڑے کونوں میں مضبوطی پر تشدید کے لئے نصب ہیں۔ چوبیسے نقش کاری کا اولین نمونہ شاہ دروازہ پر کتبہ تاریخ ہے جو اب لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔“

پرسی براؤن کے مطابق شاہ یوسف گردیز کا مزار اپنی طرز تعمیر کے اعتبار سے ملتان کے دوسرے متعارف مزارات سے مختلف اور منفرد ہے۔ اس کی صرف ایک منزل بنائی گئی ہے۔ ریاض احمد ملک اس مزار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”اس قسم کی عمارتیں صرف ایران میں نظر آتی ہیں جبکہ طرز تعمیر میں ان کا اثر صرف اور

صرف بیرونی آرائش میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جہاں مختلف رنگوں کے امتزاج اور اینٹوں کی بناوٹ سے زیبائش و تزئین کا کام لیا گیا ہے۔۔۔ اگرچہ زیادہ تر اینٹوں پر رنگوں سے آرائش کی گئی ہے لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن پر نمونے ڈھلائی سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ گہرائی کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ گونا گوں رنگوں کی یہ آرائش فن کی ابتدائی حالت نمایاں کرتی ہے۔ جس سے مجموعی طور پر ایک لطیف احساس زیبائش اور ایرانی طرز تعمیر کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

روضہ غوث بہار الحق

یہ روضہ قلعہ کہنہ (موجودہ قاسم باغ) پر بجکت پر صلاوہ کے مندر سے متصل ہے۔ شروع سے لے کر آج تک مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ اس مزار میں حضرت غوث بہار الحق زکریا ملتانی کے ساتھ ان کے فرزند اور خلیفہ شیخ صدر الدین عارف بھی مدفون ہیں۔ یہ مقبرہ حضرت بہار الدین زکریا ملتانی نے اپنی زندگی میں خود تعمیر کرایا تھا اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ مزار ۸۴۸ھ کے محاصرے میں تباہ ہو گیا تھا اور مسلمانوں نے اسے دوبارہ بنوایا۔ اس کی تفصیل ہم شیخ اکرام کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

”مقبرہ ساڑھے نو فٹ کے آٹھ چوکور اساس پر تعمیر ہوا ہے مقبرہ اندر ۵۳ فٹ مربع ہے اس طرز کا دوسرا مزار ہندوستان میں فقط ایک اور ہے جو سیونی پت میں ہے۔۔۔ شہتیر نما چوٹی ٹکڑے مختلف کونوں میں مضبوطی پیدا کرنے کے لئے لگائے گئے ہیں دروازوں اور ان کے اوپر پتھروں پر اس قسم کے چوٹی ٹکڑے تہ بہ تہ مختلف اونچائیوں میں نصب کئے گئے ہیں جن سے سطح سطور کا دلآویز نقشہ پیدا ہو گیا ہے مقبرہ کے اندر دنی کمرے کے صدر دروازہ کی کھڑکی پر آیتہ الکرسی خط نسخ میں نمایاں طور پر لکھوائی گئی ہے۔ چوب کاری میں کاری گروں نے صرف اسلامی یا ایرانی روایات

صاحب بحوالہ ملتان کا مخصوص فن تعمیر اور اس کے چند شاہکار ”از ریاض احمد ملک، مطبوعہ امروز ملتان نمبر ۲۸ جون ۱۹۷۸ء اس مضمون کا زیادہ تر مواد پرسی برادری کی کتاب“ سے بغیر

حوالے کے اخذ کیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے

صاحب بحوالہ ملتان قدیم دہلی، ”مرتبہ ارشد حسین ارشد ص ۹ مطبوعہ ہرم ترقی ادب ملتان، بار اول ستمبر ۱۹۶۸ء

کو ہی مد نظر نہیں رکھا بلکہ اپنی فنی صلاحیت اور تخیل سے بھی کام لیا ہے مثلاً دروازہ کی چوکھٹ کے بازوؤں پر جہاں لکڑی میں اس کا نمونہ ابھارا گیا ہے جس کے مجموعی اثر سے خمیرہ کے بنیادی اسلحہ تصور کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ تربت کے گرد چوبی منقش کپڑے بعد میں لگایا گیا۔

یہ مقبرہ ملتان کے مخصوص فن تعمیر کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے جو متناسب اور ہم آہنگی کا شاہکار ہے اسکا منقش محرابی دروازہ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ چالیس فٹ اونچی بنیادی منزل میں کسی قسم کی آرائش نہیں کی گئی۔ لیکن ریاض احمد ملک کے الفاظ میں ”اگرچہ عمارت کا طرز تعمیر سادہ ہے لیکن پہلی نظر میں اس کی مقصدیت سے بھرپور اثر آفرینی اور عظمت اپنی پوری سادگی اور وقار کے ساتھ نظر آ جاتی ہے۔“

موسیٰ پاک شہید | موسیٰ پاک شہید کا مزار اندرون پاک دروازہ واقع ہے۔ پاک دروازے کی طرف بازار صرافہ کے طرف جائیں تو بائیں ہاتھ پر ایک بلند دروازہ آتا ہے جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

سگ درگاہ میراں شو سو خواہی قرب یانی
کہ بر شیراں شرف دارد سگ دربار جیلانی
دروازے کے اندر داخل ہوں تو سارا راستہ چھت سے ڈھکا ہوا ہے پھر ایک بڑا احاطہ آتا ہے جس کے بائیں جانب مزارات اور سامنے منبر رنگ کاروضہ واقع ہے خانقاہ کے اندر کے دروازہ پر پتیل منڈھی ہوئی ہے اور لکڑی پر چاندی کے ٹکڑے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ قبہ کے نیچے ۲۲ فٹ مربع عمارت ہے۔ جس کے اندر ۸ فٹ مربع ممریں چبوترہ ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں

۱۔ بحوالہ ارض ملتان، از شیخ اکرام الحق، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۲۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ بحوالہ ملتان کا مخصوص فن تعمیر اور اس کے چند شاہکار، ص ۴، مطبوعہ امروز ملتان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء

۴۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”ارض ملتان“، ص ۱۴۱

درمیانی قبر حضرت موسیٰ پاک ٹہید کی ہے۔ قبر میں پتھر کی جالی کے بھرو کے ہیں رات کو جب بجلی کے
تمتے روشن ہوتے ہیں تو بڑا حسن پیدا ہوتا ہے۔

روضہ شیخ رکن الدین عالم

اگر کوئی شخص ملتان ٹہر میں داخل ہونے سے پہلے اس کے
کس منظر کا نظارہ کرنا چاہے تو ملتان کے مضافات میں میلوں دور سے ایک حسین و جمیل اور پرشکوہ
گنبد دکھائی دیتا ہے یہ گنبد حضرت شیخ رکن الدین عالم کے مقبرے کا ہے جو قلعہ کہنہ پر واقع ہے
حضرت رکن الدین عالم حضرت بہار الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے اور وفات کے بعد اپنے دادا
کے مزار میں دفن کئے گئے۔ ان کا موجودہ مزار سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا
کیونکہ وہ زیادہ تر ملتان میں قیام پذیر رہتا تھا۔ ۱۳۲۵ء میں وہ دہلی گیا اور وفات پائی تو اسے
دہلی میں دفن کر دیا گیا تھا اور اس کے بیٹے محمد تغلق نے جو حضرت رکن الدین سے گہری عقیدت رکھتا
تھا، یہ مقبرہ ان کے لئے وقف کر دیا۔ چنانچہ شیخ رکن الدین کو بعد میں اسی مقبرے میں منتقل کر دیا گیا
یہ عمارت اپنے مخصوص طرز تعمیر میں تین ثقافتوں کے امتزاج کی حامل ہے، یعنی یہ عربی، ایرانی اور
ہندوستانی فن تعمیر کا مرکب ہے۔ ریاض احمد ملک کے مطابق

” طرز تعمیر میں یہ عمارت تین مختلف ثقافتوں کا اثر ظاہر کرتی ہے۔ یعنی عربی، ایرانی
اور ہندوستانی۔ ان میں سے ہر ثقافت کے بہترین شواہد ہمیں اس عمارت کے فن
تعمیر میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں ماہرین تعمیر کا ایک خصوصی نقطہ منظر کار فرما تھا
جو یقیناً یہ تھا کہ ایک ایسے عظیم فن پارہ تعمیر کی تخلیق کی جائے جو اس علاقے کے
فن تعمیر کی روشن مثال ہو اور جس سے اس کی تخلیق کی مقصدیت، اہمیت اور علاقے
کے لوگوں کے ثقافتی ماحول، ان کی سوچ کے انداز اور بزرگوں کے لئے عزت و

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (۱) ازض ملتان، ص ۱۳۷-۱۳۸ (۲) ملتان قدیم و جدید، ص ۹۰-۹۱ (۳)

امروز ملتان نمبر، ص ۴ (۵)

ص ۲ بحوالہ ” اس کتاب میں ص ۲۲ پر پرسی براؤن نے اسے

ایرانی، عربی (۱) روایت سے وابستہ کیل ہے۔

محبت کا احساس صدیوں تک قائم رہے ہے۔

یہ مقبرہ ہشت پہلو عمارت ہے جو ایرانی طرز تعمیر کا نمونہ ہے لیکن اس کی ترچھی دیواریں ملتانى ..
معماروں کی اختراع ہے اس مقبرے کی ہشت پہلو بنیادیں لوزے بالوزے فٹ گھیر تک پھیلی ہوئی ہیں
مزار کی کل بلندی ایک سو پندرہ فٹ ہے جس کی تقسیم اس طرح ہے

(۱) پہلی منزل = ۵۰ فٹ (۲) دوسری منزل = ۲۵ فٹ (۳) تیسری منزل = (گنبد اپنے
کلس سمیت) = ۲۰ فٹ ... گنبد کا اندرونی گھبراؤ = ۵۰ فٹ ہے۔ دیواروں کی اونچائی ۱۱ فٹ
موٹائی ۱۳ فٹ ہے۔ دیواروں میں جگہ جگہ منقش اور منبت لکڑی کے آرائشی شہتیر نصب ہیں۔

مقبرے کے آٹھوں کونوں پر ڈھلوان، مینار اور اوپر کی منزل پر کسی قدر دبا ہوا گنبد اس عمارت
کے انکھے طرز تعمیر کا مظہر ہیں۔ عمارت میں جگہ جگہ روغنی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں جن کا رنگ زیادہ تر
نیلگوں اور سفید ہے۔ شیخ اکرام الحق کے الفاظ میں

”چھت پر کامل قوس کا گنبد اس چابکدستی اور مصاحت دانی سے شہن کی گردن سے
نصب کیا گیا ہے کہ وجدانی محراب کا یہ کثمد صدیوں گزرنے پر قائم ہے... سارے
برصغیر ہندوستان میں فقط یہی ایک مقبرہ ہے جس میں لکڑیوں کے شہتیر کام میں لائے
گئے ہیں خواہ دیواریں ہوں، خواہ گنبد، تمام تر دو اونچ موٹی پختہ اینٹیں لگائی گئی ہیں
جو مقامی طور پر تیار کی گئیں اور ان کے ضبط میں تشدید پیدا کرنے کے لئے مختلف مقامات
پر منقش چوٹی ٹکڑے لگے ہیں۔ جو ابن بطوطہ سے بھی خراج تحسین وصول کر چکے ہیں“

اس عمارت میں اہرام مصر کی طرح شکوہ پر اسراریت، انفرادیت، تناسب، جمال اور جلال موجود
ہے۔ میرے خیال میں اگر دنیا کی چند عظیم عمارتوں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں شاہ رکن
عالم کے مقبرے کو ایک اہم مقام حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر احمد نبی خان اس عمارت کے بارے میں

۱۲۱- بحوالہ امروزی ملتان نمبر، ص ۲۸، ۲۹ جون ۱۹۷۸ء / ص ۲۱-۲۲ "ارض ملتان" ص ۱۴۱

۱۳۹- بحوالہ "ارض ملتان" ص ۱۳۹

۱۴۲- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) ارض ملتان، ص ۱۳ تا ۱۴۰ (۲) امروزی ملتان نمبر، ص ۲

(۳) ملتان قدیم و جدید، ص ۹۰-۹۱، آئینہ ملتان (۵)

اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

” رکن عالم کے مزار ذیشان کا اسلوب اس قدر دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوا کہ ماہ و سال کی تبدیلیاں اس کی مقبولیت کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکیں۔ حتیٰ کہ مغل دور کا طرز تعمیر بھی خاصے عرصے تک اپنی پوری باریکیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس طرز پر حادی نہ آسکا اور مدتوں تک اس سرزمین پر ایسے مزارات بنتے تھے جو رکن عالم کے مزار سے متاثر ہی نہیں اس کی سراسر نقل معلوم ہوتے ہیں۔“

یہ سے سات میل شمال میں پیر محمد راجن شاہ کا مقبرہ بالکل شاہ رکن عالم کے مقبرے کی طرز کا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی معمار نے دونوں مقابر تیار کئے ہیں۔

شاہ شمس سبز واری کا مزار

بیرون دولت گیٹ باغ عام خاص کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ سبز مونگیا رنگ کی یہ عمارت اپنی دلآویزی اور لکشمی میں فرو ہے۔ ابتدائی طو پر یہ مقبرہ ۱۷۳۰ء (۱۱۳۲ھ) میں تعمیر ہوا۔ بارہویں صدی ہجری میں یہ عمارت خستہ ہو گئی۔ تو شمس سبز واری کے ایک مرید سیٹھ مہر علی نے ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ ایک مربع عمارت ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی ۳۵، ۳۵ فٹ ہے۔ یہ عمارت شیخ اکرام الحق کے مطابق مشمن در مشمن شکل میں شاہ رکن عالم کے روضہ کے تتبع میں تعمیر کی گئی ہے باہر کی طرف ۸ فٹ کی زنجین غلام گرد ہے مقبرے کے اندر گنبد چوبی کٹھرے کے نیچے شاہ شمس کا مدفن ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ فن تعمیر کے ان اسلامی نمونوں میں ہمیں چھوٹی اینٹ کا استعمال نظر آتا ہے۔ ملتان اور پنجاب کے دیگر علاقوں میں اینٹوں کا استعمال اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس میدانی علاقے میں پتھر نایاب تھے چنانچہ پرسی براؤن نے ملتان کی عمارتوں کے بارے میں غلط نہیں کہا کہ

تزیین اور سجاوٹ کے لئے نقاشی، خطاطی اور کاشی گری سے کام لیا گیا ہے اور اینٹوں کو مسلے

۱۰۱۔ پاکستانی ادب (چوتھی جلد) ترتیب و انتخاب رشید امجد و فاروق علی، ص ۳۲۹۔ ۳۳۰، فیڈرل گورنمنٹ

ص ۱۲۰۔ بحوالہ ”ارض ملتان“ ص ۱۲۰

سے جوڑا گیا ہے۔ ماہرین کا یہ خیال ہے کہ مسلے کا یہ استعمال مسلمان ہندوستان میں لے کر آئے۔ برصغیر پاک و ہند کے لوگ اس سے ناواقف تھے جیسا کہ سابقہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ مساجد اور خانقاہوں کی تزئین کے لئے خطاطی اور نقاشی کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ خطاطی میں قرآنی آیات اور اشعار استعمال کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر اشعار فارسی کے ہیں۔ آیات اور اشعار مسجد اور خانقاہ کی مناسبت سے منتخب کئے جاتے تھے۔ بعض جگہ لکڑی، اینٹوں اور پتھر میں الفاظ کھودے گئے ہیں۔ اور بعض جگہ انہیں خوبصورت رنگوں میں لکھا گیا ہے، ان کی ایک تعلیمی اہمیت بھی بنتی ہے۔

خطاطی کے بعد دوسرا طریقہ نقاشی کہلے۔ محرابوں اور دروازوں کو بیل بوٹیوں سے سجایا جاتا تھا۔ تصویر کشی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ یہ مذہبی طور پر ممنوع تھی صرف نقش و نگار سے کام لیا جاتا تھا یہ فن بھی ملتان کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں فیروزی اور نیلے رنگ کی اینٹیں زیادہ استعمال کی جاتی رہیں۔ پھر بتدریج دیگر خوبصورت رنگ ان میں شامل کئے جانے لگے اور انہیں دلکش نقش و نگار سے بھی سجایا جانے لگا۔ ایسی منقش اور رنگین کاشی سلیس مغل دور کے آخر میں یعنی ۱۵۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک منظر عام پر آنے لگیں۔

فن تعمیر میں کاشی گری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے یہ خاص طرح کا شوخ نیلا رنگ ہے جسے خاص نٹوں کے استعمال سے پیدا کیا جاتا تھا۔ مساجد اور خانقاہوں میں کاشی سلیس عام استعمال ہوتی ہیں۔ یہ تو ان عمارتوں کی تزئین کے طریقے تھے ماہرین نے انہی خصوصیات کی بنا پر اس طرز تعمیر کو ملتان کا اسلوب تعمیر کہا ہے۔ ڈاکٹر احمد نبی اپنے مضمون "پاکستانی فن تعمیر کا ارتقا میں لکھتے ہیں۔

"اسی معاشرے نے فن تعمیر کو ایک نیا اسلوب بھی دیا جسے ملتان کا اسلوب تعمیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا یہ اسلوب خالصتاً وسطی ایشیائی فن تعمیر سے مستعار اور متاثر تھا اور اس کی ساری جوہریات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ گو اس کے ابتدائی سوتے ہمیں بلوچستان کے شہر سیلا یا آج کے بہاولپور، رحیم یار خان اور آدم دابان میں ملتے ہیں لیکن اسی سلسلے مہتمم بالشان ابتدا خود حضرت بہار ائمتہ کے مزار سے ہوتی ہے اور انہیں انہیں کے بزرگ پوتے حضرت رکن عالم کے مزار دیشان سے پاکستان کے اسلامی

فن تعمیر کے اسلامی اسلوب میں بہاؤ و محنت کے مزار کو وہی حیثیت حاصل ہے جو وسطی ایشیا کے اسلوب تعمیر میں ساسانیوں کے مقبرے کو حاصل ہے اور مزار رکن عالم کی حیثیت یہاں وہی ہے جو گورامیر اور تاج محل کو یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس قسم کے مزارات کی تعمیر کی روایت برصغیر میں اس عہد سے پہلے کہیں اور کبھی نہیں تھی یہ مزارات ان بزرگ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی میں اپنی آخری آماجگاہ کے طور پر تعمیر کرائے تھے اور پختہ اینٹ سے بنے تھے۔ ان کی تقسیم عام طور سے تین طبقوں میں ہے۔ ڈھلوان دیواروں، مہتمم باشان گنبد، مکڑی کے شہتیروں سے بنے ہوئے دیواروں کے قالب اور بیرونی اور اندرونی سطح پر مختلف سائز کی سادی یا رخنہ رنگدار اینٹوں کی تزئین اس طرز تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ تزئین و سجاوٹ بعض اوقات تقلیدی شکلوں میں ہے۔ یا گل بوٹے میں یا پھر قرآنی آیات جو مکڑی پر کندہ بھی ہیں۔ مزار رکن عالم اس طرز کا شاہکار ہے جہاں اس قسم کی تزئین کے نمونے اپنے انتہائے کمال پر ملتے ہیں۔^۱

م می قیصرانی اپنے مضمون "فن تعمیر" میں ملتان کی فن تعمیر کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ملتان اسلوب تعمیر نے آنے والے ادوار میں پورے برصغیر کے فن تعمیر کو بہت زیادہ متاثر کیا... تعلقوں کے عہد میں دہلی میں تعمیر ہونے والی عمارتیں مثلاً غیاث الدین تغلق کا مقبرہ، بارہ گنبد یا اس کے پاس کی مسجد اس ملتان کی فن تعمیر کا جو بہ تھیں... اس ملتان کی فن تعمیر کا اثر اب تک مزارات کی تعمیر میں کا در ما ہے۔ اب بھی اس علاقے میں مزارات یہاں تک کہ بہاولپور، بہاولنگر اور چولستان میں مساجد بھی اسی طرز پر تعمیر کی جاتی ہیں۔"^۲

(۲) کوزہ گری اور ظروف سازی بھی ایک مفید فن ہے۔ یہ بھی اسلامی فن کے

۱۔ پاکستانی ادب (چوتھی جلد) ترتیب و انتخاب رشید امجد و فاروق علی

۲۔ بحوالہ مضمون "فن تعمیر" از م می قیصرانی، مطبوعہ امروز ہفت روزہ اشاعت، ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۴

حسن و جمال کا منظر ہے اور تمام اسلامی ممالک میں موجود ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مٹی کے ظروف بھی صوفیانہ مسلک کی دین ہیں۔ صوفیاء کی سادگی اور درویشانہ اسلوب زریست نے مٹی کے برتنوں کو مقبول بنایا۔ آنجورے، ڈولیاں (مٹی کی گریباں)، آٹا گوندھنے کے تھاں، فیرنی کی چھوٹی پلیٹیں، گلاب ہانڈیاں، بھکے، صراحیاں، دفنوں کے لئے آستادے (لوٹے) مٹی کے کھلونے..... یہ سب مٹی سے بنائے جلتے تھے۔ یہ سب ظروف ملتان کی گھروں میں بکثرت استعمال میں لائے جلتے تھے اور زمانہ جدید میں بھی ان کا رواج کم نہیں ہوا۔ ملتان میں اب بھی چمکیلے روغنی ظروف گلی، الواح اور اینٹیں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ منہجوار اور ہٹ پرہ کے آثار قدیمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوزہ گری کا فن یہاں بھی موجود تھا۔ ملتان ان دونوں قدیم شہروں کے درمیان میں واقع ہے اور ان کا ہم عصر رہا ہے اس لئے یقیناً یہاں کے لوگ بھی فن کوزہ گری سے واقف تھے لیکن ملتان کے فن کوزہ گری پر ایران کے گہرے اثرات ہیں۔ ایران میں کوزہ گری بہت مقبول رہا ہے۔ سادہ مٹی سے کوزہ گری کی جاتی تھی پھر انہیں پکا لیا جاتا تھا۔ ان پر نقاشی اور خطاطی بھی کی جاتی تھی اور انہیں رنگدار بھی بنایا جاتا تھا۔ تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران اور ملتان کے گہرے مراسم رہتے ہیں اس لئے یہ تیسرا دست ہے کہ ملتانوں نے ایرانی فن کوزہ گری سے اثر قبول کیا ہوگا۔ فن کوزہ گری کے نمونوں اور ان کی نقاشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملتان ایرانی فن کوزہ گری سے متاثر تھے۔ ملتان کے گلدان کاشی گری کا اصلی نمونہ ہیں۔ گلدانوں کے علاوہ صراحی کے فن نے ایک مختلف شکل اختیار کی۔ یہ صراحی مختلف شکلوں میں سادہ پختہ مٹی سے بنائی جاتی ہے۔ مٹی کے اوپر ہی آرائش کی جاتی ہے جس پر بعد میں رنگ بھر دیئے جلتے ہیں۔ صراحی کا یہ انداز ہمیں ملتان اور اس کے گرد و پیش کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ملتان کے فن کوزہ گری میں گلدان اور صراحی کو قابل ذکر نمونے قرار دیا جاسکتے ہیں۔

اس طرح ملتان کے ہر دور میں ادنیٰ کے چمڑے سے تیار شدہ منقش اشیاء یہاں کے مخصوص فن کا منظر رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں خوبصورت کمائیں بنائی جاتی تھیں کیونکہ تیر اندازی کا فن ملتان میں بڑا مقبول رہا۔ صوفیاء کے مدرسوں میں طالب علموں کو تیر اندازی سکھائی جاتی تھی اس کا

حاشیہ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد نمبر ۱۵ (عبدالقیوم)، طبع اول ۱۹۸۰ء

تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ خود حافظ جمال ملتان ماہر تیر انداز تھے۔ گویا یہ اسلحہ سازی کے سلسلے کا اہم کاروبار تھا۔ کمانوں پر نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے جاتے تھے۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق تیر کمان پر لوگ نقاشی کا کام کرتے تھے اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کمان کو ایسی حکمت عملی سے طاقت و ربات تھے کہ اچھا جوان بھی اس پر چلہ نہیں چڑھا سکتا تھا۔ تلوار کی میان پر بھی یہ لوگ سونے کے ورق چڑھا کر نقاشی کا کام کرتے تھے۔ غرض ملتان میں یہ کام تقریباً سات سو برس سے رائج تھا۔ ملتان میں ایک محلہ کننگروں کا آج بھی موجود ہے۔ اونٹ کے چمڑے سے ٹیل پیمپ گلدان، مرتبان اور آرائش کی دیگر چیزیں تیار کی جاتی تھیں۔

ملتان کے قدیم پیشے کاشی گری، کننگر، سوتری وٹ، زین ساز، چوڑی گر، دیکڑ رمٹی اور کاغذ ملا کر اشیا بنانے والے، پونگر (رنگر نیل یا رنگ ساز)، پاؤلی (نور بان)، ہلاری، پٹولی، دریشیم بان، معماڑ، چوب تراش وغیرہ فنون مفیدہ کے موجد اور مروج رہے ہیں اور آج بھی ان کے فن پر کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح مذہبی روایات اور صوفیانہ مسالک کے اثرات مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔

۳۔ قالین بانی و پلاچہ بانی | مساجد اور خانقاہوں کی سجاد و اور تزیین کے سلسلے میں

قالین بانی، دریاں، چادریں، لنگیاں دریائی اور سموی وغیرہ کا مفید کام شروع ہوا۔ زمانہ قدیم میں قالین بانی کا فن بطور خاص عروج پر تھا۔ شیخ اکرام الحق ارض ملتان میں لکھتے ہیں "ایرانی اثرات کے ساتھ یہ صنعت بھی ملتان آئی۔ سوت اور اون کو ملا کر قالین تیار کئے جاتے مگر ایرانی ادنی قالینوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اس لئے ان کو چنداں فروغ حاصل نہ ہوا البتہ تقسیم ملک کے بعد ادنی قالین بننے لگے جو زر مبادلہ کے حصول کے لئے انگلستان کو خاصی مقدار میں برآمد کئے جاتے ہیں اور اچھی قیمت پاتے ہیں۔"

محولہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم سے قبل ملتانوں کو قالین بانی میں اتنی مہارت نہیں

۱۔ بحوالہ ملتان قدیم و جدید، از علامہ عتیق فکری، ص ۶۲

۲۔ بحوالہ ارض ملتان، از شیخ اکرام الحق، ص ۲۸۸

پاک دہند میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے ساتھ عربی رسم الخط کا اجراء ہوا لیکن بعد میں یہاں نسخ کی نسبت نستعلیق کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق جب ہمایوں ۹۲۷ھ میں ایران گیا تو واپسی پر اپنے ہمراہ کسی مصور جلد ساز اور خطاط لے کر آیا، جن سے مقامی فن کار فیض یاب ہوئے اور خط نستعلیق ہندوستان میں بھی رائج ہو گیا۔ یہاں کے ماہرین میں سے ہر نظام اور کاتب الملک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد سید عماد حسنی کے تلامذہ میں سے عبدالرشید دہلی جیسے خوش خط کاتب یہاں آئے جنہوں نے خطاطی میں برصغیر پاکستان و ہند میں بھی ایران و وسط ایشیا کا اسلامی ماحول پیدا کر دیا۔ اس طرز میں لکھنے والے بہت سے نامور کاتب ہر عہد میں ملتے ہیں اور یہ روایت حسن اتفاق سے پاکستان و ہند میں آج بھی موجود ہے۔

مسلمانوں نے فن تعمیر، فن کوزہ گرمی، دہرتن سازی اور قالین، الواح اور کتبات میں بھی خطاطی کو استعمال کیا۔ بعض جگہ اسلامی علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ فن خطاطی کی تربیت بھی دی جاتی تھی صوفیاء نے خاص طور پر اس فن میں دلچسپی لی اسے بطور پیشے کے اختیار کیا اور تصوف کی کتابیں تحریر کیں صوفیاء ملفوظات قلم بند کئے گئے۔ صوفیاء نے مجالس میں ایک نہ ایک مرید خطاط پیدا ہوتا تھا۔ جو مرشد کے ملفوظات رقم کرتا رہتا تھا۔ یوں صوفیاء نے اس فن میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

مستان کے صوفیاء نے فن کتابت کی تردیح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے دور میں خط نستعلیق کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ حضرت نے جو مدرسہ قائم کیا اس میں دینی علوم کے علاوہ خطاطی اور جلد سازی کے فنون بھی سکھائے جاتے تھے ان دنوں شمس الدین بلخی جیسا خطاط بھی مستان میں موجود تھا۔ جس سے بہت سے لوگوں نے فن خطاطی سیکھا۔ علامہ عینی فکرمی "نقش مستان" میں لکھتے ہیں۔

"... مدرسہ میں مختلف فنون بھی سکھائے جاتے تھے ان میں خاص کو خطاطی اور اعلیٰ قسم کی جلد سازی کا کام بھی تھا۔ جیسا کہ ہم نے قباچہ کے علمی دور میں ذکر کیا ہے کہ محمد بلخی جیسا خطاط اس زمانہ میں مستان میں موجود تھا اور اس کے کسی اہل مستان میں سے شاگرد تھے۔ عرفی اپنے تذکرے میں شمس الدین بلخی کی خطاطی کے بارے میں لکھا ہے

جاتی ہے کابل اور پشاور وغیرہ میں بھی جاتی ہیں اور یہ سوائے ملتان کے اور کہیں تیار نہیں ہوتیں۔^۱

ملتان کی درلوں، کھیسوں اور چادروں کو اب بھی ملک بھر میں اور ملک سے باہر بھی شہرت حاصل ہے۔ ان صنعتوں نے کھڑکیوں کو عام رواج دیا۔ اس فن میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ درجہ جدید میں گل ٹیکس، اسٹیکس، علی ٹیکس اور دوسرے کارخانوں کی بنی ہوئی مصنوعات یورپ کی منڈیوں اور نمائندگی میں بے حد مقبول ہوئیں۔

آج گھریلو دستکاری اور فنونِ مفیدہ سے متعلق صنعت وسیع پیمانے پر LARGE SCALE کی انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وجود میں آچکی ہیں... لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج چینیوں سے نکلنے والا دھواں، متحرک اور پیچیدہ مشینوں کی آواز اور لہلہاتے کھیت ملتان کی ترقی یافتہ معاشرے کی گواہی بن چکی ہیں۔ مگر یہ فیض اللہ والوں کا ہے جن کے مقابلے میں ملتان اور اہل ملتان کے سر پر مہربان چادر کی طرح سایہ نکلن ہیں۔

(۴) فنِ خطاطی

مسلمانوں نے ہمیشہ فنِ خطاطی کو بڑی اہمیت دی۔ اس کا ایک سبب قرآن کی کتابت کے ذریعے سعادت کا حصول اور کتاب اللہ کا تحفظ تھا اور دوسری وجہ رسم الخط کے جمالیاتی خصائص تھے۔ عربی زبان خط کے اعتبار سے بہت سی جمالیاتی خوبیوں کی حامل رہی ہے پھر زمانہ قدیم میں پریس کی عدم موجودگی کی وجہ سے زیادہ تر انحصار کتابت پر تھا چنانچہ اس لئے بھی فنِ خطاطی کی اہمیت اور بڑھ گئی اور اسے شعوری طور پر رواج دیا گیا۔ (قرآن مجید کے علاوہ دیگر علمی اور ادبی کتابیں بھی کتابت کی جاتی تھیں۔ چنانچہ فنِ خطاطی کے اصول مرتب کئے گئے اور کئی خطاطی محاذ ہوئے۔ کتنے علماء اور صوفیاء کے علاوہ مسلمان حکمرانوں نے بھی خطاطی میں دلچسپی لی اور بعض مسلمان حکمران تو خطاطی میں بڑا شغف رکھتے تھے) بابر، ہمایوں اور اکبر نے فنِ خطاطی اور خطاطوں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ بابر اور بہادر شاہ ظفر تو خود بھی خطاطی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔^۲

۱۔ بحوالہ "ملتان قدیم و جدید" ص ۶۶

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمادئے "معارف اسلامیہ" جلد ۱۵، ص ۹۵ تا ۱۰۰، دانش گاہ پنجاب لاہور طبع اول

در خط بدرجہ کہ ابن البرباب انگشت بر حرف او تواند نہاد و ابن مقلہ دیدہ از مشاہدہ

دبران خط او بر نتواند داشت ۱

..... اس فن کی سرپرستی سے یہ بھی مطلب تھا کہ طالب علموں میں معاشی ضروریات کو

پورا کرنے کی استعداد پیدا کی جائے تاکہ معاشرے پر بوجھ نہ بنیں۔^۱

علامہ عتیق فکری نے ایک اور جگہ عوفی ہی کے حوالے سے شمس الدین بلخی کا ذکر یوں کیا ہے۔

”شمس الدین بلخی عالم و شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا خطاط تھا۔ اور اپنے دور

کے مشہور و معروف خطاط ابن البرباب اور ابن مقلہ سے فن خطاطی میں بڑھا ہوا ہے۔“^۲

اسی طرح بعد کے زطنے میں بھی اس فن میں بڑی دلچسپی لی جاتی رہی۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق ”ملتان“ میں

لکھتے ہیں۔

”منشی غلام حسن شہید، منشی نور الدین انصاری نے عاشق محمد بوبہت و ڈے خطاط سن

اینہاں تو دکھ عبد الشکور، فداحسین، خلیل الرحمن، صالح محمد جمالی، حبیب اللہ انصاری

سلیم حسینی، طفیل محمد تے شیر محمد مرحوم دانان ہمیشہ صف اول دے کاتبان و پرح کھیاد لسی“^۳

ترجمہ ۱۔ (منشی غلام حسین شہید، منشی نور الدین انصاری اور عاشق محمد بوبہت بڑے خطاط تھے۔ ان کے علاوہ

عبد الشکور، فداحسین، خلیل الرحمن، صالح محمد جمالی، حبیب اللہ انصاری، سلیم حسینی، طفیل محمد اور شیر محمد مرحوم

کے نام ہمیشہ صف اول کے کاتبوں میں رکھے جائیں گے۔)

منشی غلام حسن شہید کے ملفوظات مرتبہ محمد یار میں مرقوم ہے کہ نواب بہادر پور کے منقش قرآن حکیم

کا ایک ورق کسی طرح ضائع ہو گیا۔ ملک بھر کے خطاطوں نے کوشش کی کہ ایسا ورق تیار کیا جائے جو باقی ورق کی خطاطی اور

ادرا راستگی سے انگ دکھائی نہ دے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر منشی صاحب نے کمال مہارت کا مظاہرہ

کیا کہ جدید ورق کو کوئی پہچان بھی نہ سکا کہ اصل ہے یا نقل۔

قرآن مجید کے علاوہ تصوف کی بیشتر کتابیں مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ بعض کتابوں کو صوفیاء اپنے

۱۔ بحوالہ ”نقش ملتان“ ص ۲۵۴

۲۔ بحوالہ ”ملتان قدیم و جدید“ ص ۴۴

۳۔ بحوالہ ”ملتان“ (سرائیکی) ڈاکٹر مہر عبدالحق، ص ۳۷، مطبوعہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور، اگست ۱۹۸۰ء

ہاتھوں سے نقل کر کے دوسرے صوفیاء کو بھیجتے تھے۔ ابن عربی کی "فصوص المحکم"، ان کتابوں میں سرفہرست ہے۔ ملتان میں جب اس کا قلمی نسخہ پہنچا تو صوفیاء نے اس کی نقول ہندوستان کے دیگر شہروں میں پہنچائیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیاء کو فن خطاطی سے کتنی دلچسپی تھی۔ خطاطی کا یہی فن بعد میں مصوری کا سرچشمہ بھی ثابت ہوا۔ مصوری کی ابتداء خانقاہوں کی تصویریں بنانے سے ہوئی اور بعد میں فطرت کی تصویر کشی اور مناظر کی خوبصورت تصویریں بنائی جانے لگیں۔ گویا خطاطی اور مصوری شانہ بشانہ پختی رہیں اور اس فن میں کاغذ کو خاصا دخل رہا۔ ہندوستان میں مسلمانوں ہی نے کاغذ کے استعمال کو رواج دیا۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔

"مغل وبتان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصور اور خطاط دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مغلوں کی تیار کرائی ہوئی کتابوں میں نظم و نثر خوشنویس لکھتا تھا اور تصاویر مصور بناتا تھا یعنی فن تصویر کے ساتھ ساتھ فن خوشنویسی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا ایسی بلندیوں پر پہنچ گیا کہ شاید دنیا کی کسی زبان کا رسم الخط آج تک ان بلندیوں کو نہیں چھوسکا جن پر عربی اور فارسی خطاطی کو ہمارے باکمال خوشنویسوں نے پہنچا رکھا ہے۔ یہ دونوں فن صرف کاغذ کی وجہ سے ترقی پذیر ہوئے۔ اور ہندوستان میں کاغذ درآمد کرنے والے صرف مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی قدامت پرستی کا تو یہ حال تھا کہ جس زلزلے میں ایشیا کے اکثر ممالک کاغذ استعمال کر رہے تھے۔ ہندو اپنا وہی بھوجا پتر لے بیٹھے تھے۔ پندرہویں صدی تک بھی ہندوستان میں کاغذ کا رواج کا عدم تھا۔ صرف مغربی ساحل کے گجراتی تاجر سمندر پار کے تاجروں کے ساتھ کاروبار کرنے کی وجہ سے کاغذ استعمال کر رہے تھے۔"

اسی ضمن میں علامہ عتیق فکری کا بیان ملاحظہ فرمائیے

"طالب علموں کے لئے کاغذ کا بھی انتظام تھا۔ کاغذ بنانے کا کارخانہ بھی تھا جس میں اچھا کاغذ تیار ہوتا تھا۔۔۔۔۔ غرض اسی طرح ملتان میں کاغذ بنانے کا محل قائم ہوا۔"

۱۰۱۔ بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں از عبدالمجید سالک، ص ۳۸۸ تا ۳۸۹، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ

لاہور، طبع دوم۔

اور آج تک کاغذ کٹوں کا محکمہ موجود ہے اور برطانیہ کے دور تک یہ لوگ دیسی چمکیلا کاغذ بناتے تھے۔ یوں ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک ملتان میں اس فن کا عروج رہا۔

فن خطاطی کے ساتھ مسلمانوں نے جلد سازی کی طرف بھی توجہ دی کیونکہ کتاب کو جلد میں ہی محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ جلد سازی میں چمڑا، گتہ، کاغذ اور کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ (جلد پر مختلف طریقوں سے نقش و نگار بھی بنائے جاتے تھے۔ قرآن مجید کی جلد سازی خوبصورت طریقے سے کی جاتی تھی اور بعض اوقات اس پر سونے کے پانی سے خطاطی بھی کی جاتی تھی) ملتان میں خطاطی کا فن آج بھی زندہ ہے علامہ عتیق فکری نے میاں غلام حسین کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور کے بہت بڑے خطاط اور صوفی عالم تھے اور اندرون چین آگاہی محلہ مکنگراں میں رہتے تھے۔ حضرت مولانا مہر علی شاہ صاحب سے انہیں عقیدت تھی اور وہ بھی ان سے خاص انس رکھتے تھے۔ دونوں کا وصال بھی ایک سن میں ہوا ان کے آباؤ اجداد حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا سے پہلے براستہ ایران ملتان آئے تھے، نقاشی خطاطی اور کتابوں کی جلد سازی کا کام ملتان میں انہیں کی وجہ سے اپنے عروج کو پہنچا تھا۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق

”بغداد اور کابل میں ان کے (میاں غلام حسین) کے ہاتھ کے لکھے خطاطی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ حج سے واپسی پر دالی بغداد نے کسی دن انہیں اپنا مہمان ٹھہرایا تھا اور ان سے عربی قطعے لکھوائے تھے“

دور جدید میں ملتان میں خطاطی کے شغف کے بارے میں سجاد حیدر ملک اپنے مضمون ”فن خطاطی“ میں لکھتے ہیں۔

”ملتان فن خطاطی کا مرکز بن گیا ہے جس کی روح رواں وہاں کے نوجوان خطاط ابن کلیم ہیں۔۔۔۔ ان کے والد محمد حسن خان کلیم رقم اور دادا حافظ محمد عبداللہ بھی عمدہ خطاط تھے۔ ابن کلیم نے اپنے چھاپے خانے میں دبستان فردغ خطاطی کے زیر اہتمام خطاطی پر کتابیں شائع کی ہیں انہیں خط نسخ، ثلث اور محقق کے امتزاج سے ایک نیا خط بنام

ملتان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد طب کے فن میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اکثر صوفیاء نے اس فن کو بطور پیشے کے اپنایا اور روحانی و اخلاقی علاج کے ساتھ جسمانی اور مادی عوارض کا علاج بھی کرتے رہے۔ خواجہ معین الدین اجمیری، حافظ محمد اسماعیل، منشی غلام حسن شہید، خواجہ غلام فرید اور کئی ایک صوفیاء طب میں مہارت رکھتے تھے۔

ملتان کے حکیم سلیمان انصاری کا نام بہت مشہور ہے، جنہیں طب میں بڑا کمال حاصل تھا، شیخ اکرام اعن کے مطابق آپ کو "اسطوئے دوراں" کہا جاتا تھا۔

حکیم شیخ محمد سلیمان انصاری اٹھارویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے اور طباعت و حکمت میں معروف ہوئے۔ ان کا مطب اندرون پاک دروازہ محلہ حافظ داؤد میں واقع تھا۔ تشخیص مرض میں خاص طور پر ماہر تھے۔ اس طرح حکیم شاہ بخش بھی دیسی طب میں خاص مہارت رکھتے تھے ان کا مطب محلہ قدیر آباد میں تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار ملتان کے ایک نواب نے حکیم اجمل خان کو اپنے علاج کے لئے بلوایا تو انہوں نے کہلوا بھیجا کہ جب ملتان میں حکیم شاہ بخش موجود ہیں تو پھر میری کیا ضرورت ہے؟ ایلو پیتھی کے علاج سے پہلے ملتان میں طب کا فن ہی مروج تھا اور ملتان کے کئی ایک اطباء جن میں حکیم شیر محمد اعوان، حکیم محمد اسماعیل حکیم بلند خان حکیم رحیم بخش الوری، حکیم قمر دین، حکیم خلیل، حکیم فیروز الدین، حکیم واحد بخش وغیرہ شامل ہیں۔ ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، ملتان میں اطباء کے کئی خاندان موروثی طور پر آج بھی یہی فن اپنائے ہوئے ہیں۔

۶۔ عرس میلے وغیرہ | سرزمین ملتان میں عرس، میلے، کھیل، تماشے بھی مقابرا اور مزارات کی سالانہ تقریبات کے حوالے سے تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے ہیں اس قسم کے بیشتر میلے کسی نہ کسی خانقاہ یا بزرگ کے ساتھ وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ قبل از اسلام

۲۱۔ بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں، از عبد المجید ساک، ص ۲۸۶، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع دوم

۲۲۔ بحوالہ "ارض ملتان" از شیخ اکرام اعن، ص ۲۲۵

۲۳۔ یہ روایت جناب ارشد ملتانی نے بیان کی۔

بھی اس قسم کے میلے ہوتے تھے۔ لوگ دور دراز سے بتوں کی یا ترا کے لگتے تھے، اس کا تفصیلی ذکر پہلے باب میں ملتان کی قدامت کے حوالے سے آچکا ہے۔ بعض میلے غسل میلے (BATHING FAIRS) کہلاتے تھے۔ ان میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا تھا کہ مخصوص تالابوں یا کنوئوں کے پانی سے نہلنے کی بدولت بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں یا جسم پوتر (پاک) ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ملتان کے رام چوٹرا، رام تیرتھ اور سورج گنڈ کے میلے مشہور ہیں۔

مسلمان صوفیاء کے مقبروں میں مخدوم عبدالرشید حقانی کی خانقاہ کا کنواں مشہور ہے جو صرف میلے کے موقع پر چلایا جاتا ہے۔ پیراں عاتب کے میلے میں بچوں کے بال کٹوائے جلتے ہیں۔ پاکپتن شریف میں بابا فرید کے دربار کے بہشتی دروازے سے گزرنے والی عقیدت مندوں کے لئے باعث رحمت اور سعادت ہے چنانچہ یہ دروازہ عرس کے موقع پر کھولا جاتا ہے۔

عرس اور میلے تبلیغ کا ایک ذریعہ بھی رہے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے لوگوں کو متوجہ کرنا زیادہ آسان اور سہل تھا۔ ان میلوں ٹھیلوں میں صحیح معنوں میں مقامی ثقافت کے مظاہرے دیکھنے میں

طاہ۔ یہ مندر دریلے راوی کے کنارے سرائے سدھو کے قریب واقع ہے۔ موجودہ مند ہمارا اجرنجیت سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ بیساکھی کے موقع پر یہاں مید لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رام چند جی کالت بن باس تیرتھوار کے لئے یہاں آئے تھے اور ایشان کیا تھا۔ اس لئے یہ جگہ مقدس ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے موقع موتان)

(۲۳۶ ص)

طاہ۔ رام تیرتھ۔ یہ مند ملتان سے مشرق کی جانب ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے اس میں ایک تالاب اور درہم شالہ ہے، روایت کے مطابق یہاں بھی رام چند جی بن باس کی حالت میں آئے تھے۔ مشہور ہے کہ جو کوئی اس تالاب میں نہلے گا اسے تیرتھ ایشان کا پھل ملے گا۔ (موقع موتان، ص ۲۳۴)

ص ۲۳۵۔ ملتان کا ایک تالاب ہے۔ روایت کے مطابق یہاں سورج دریا کا نزل ہوا اور اس نے یہ بردیا کہ جو کوئی اس تالاب میں نہائے گا وہ پھل پائے گا (موقع موتان، ص ۲۳۵)

آتے ہیں..... ایسی ثقافت جس میں اس مٹی کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ ان میلوں میں کھٹے تیلیوں کے تملشے، تھیٹر اور ان میں دکھائی جانے والے لوک تملشے جو لوک کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ ان تفریحی مشاغل کے علاوہ طاقت کے مظاہرے بھی ہوتے تھے یعنی گھڑ سواری کے مقابلے، نیزہ بازی، کبڈی اور کشتی کے کرتب بھی دکھائے جاتے تھے۔ سید اولاد علی گیلانی کے مطابق

”میلوں اور تماشوں کے موقع پر جواں لوگ پڑ کوڑی، بھمرا، ملیانی، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ وغیرہ کے مقابلے بڑے شوق سے کرتے ہیں اور ایسے موقع پر اس قسم کے کھیل خاص طور پر رونق اور تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔“ (تذوق ملتان ص ۱۹۴)

پہلوانی کا فن بطور خاص ملتان میں مقبول رہا ہے۔ یہاں کے پہلوان برصغیر کی ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کے درباروں میں بڑی عزت پتے تھے۔ کئی پہلوان خاندان آج بھی ملتان شہر میں آباد ہیں۔ ملتان میں شاہ شمس کا مید، شاہ رکن عالم کا عرس اور غوث بہار احمی زکریا ملتان کے سالانہ جلسے ہر سال باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ جن میں ہندی بی اور ثقافتی زندگی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔

۷۔ فن موسیقی اور سماع

یوں تو اسلام کے بعض فقہی مذاہب کے مطابق موسیقی کو ناجائز اور ناپسندیدہ عمل ٹھہرایا گیا اور یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء کے کہنے پر سلاطین وقت نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا۔ ہندوستان میں سلطان التمش (۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) نے بھی اس دباؤ کے تحت موسیقی کو ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن ان فقہاء کے برعکس صوفیاء اور درویشوں کے بعض سلسلوں نے روحانی ترفع اور وجد و حال کی خاطر موسیقی، رقص اور سماع کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ ضروری تصور کیا۔ تاہم رقص و سماع کی محافل کے لئے خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ نے اس کی حلت و حرمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری نے جو ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے بانی مہمانی تھے، موسیقی اور سماع کو پھیلانے میں بڑا حصہ لیا ان کے سارے پیروکار سماع اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔

التمش کے بعد سلطان فیروز شاہ اول رکن الدین (۱۲۳۹ء) نے اس فن کی سرپرستی کی، غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ/۱۲۶۵ء)، خلجی سلاطین اور خاندان سادات نے بھی موسیقی کے بارے میں سرپرستی اور اختیار کیا۔ امیر خسرو جیسا ماہر موسیقی اور نابغہ روزگار انہیں درباروں سے وابستہ رہا۔ افغان سلاطین بھی موسیقی کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بابر نے تو موسیقی کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس کی ساری اولاد (مغل بادشاہ، ماسوائے اوزنگ زیب عالمگیر کے موسیقی کی قدر دان اور سرپرست رہی۔ البتہ اوزنگ زیب کے دور میں موسیقی متروک ہو گئی۔ لیکن اس کے امرار وغیرہ موسیقی کی سرپرستی کرتے رہے چنانچہ اوزنگ زیب کے ایک درباری امیر شاہ قباہ بن عبد الجلیل الحارثی نے موسیقی کے فن پر سترہ مخطوطات نقل کرائے جو اب تک محفوظ ہیں، ان میں الکندی، الفارابی، ابن سینا، ابن منجم، ابن زلیہ، عبدالقادر، ابن فیہی اور دوسرے ماہرین فن کے وضع رسالے شامل ہیں۔ اوزنگ زیب کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول، جہاندار شاہ اور شاہ عالم ثانی نے موسیقی کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے دور میں عملی اور نظری طور پر ایرانی موسیقی کے اثرات غالب رہے۔ برصغیر پاک و ہند میں فن موسیقی میں مسلمانوں کے حصے کے بارے میں ڈاکٹر اسد علی لکھتے ہیں "مسلمان جب ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ ترقی یافتہ نظام موسیقی بھی لاتے اور عرب حکمران بھی فن موسیقی کی سرپرستی کرتے رہے اور رعایا نے بھی ان کی اتباع کی ابن سینا، فارابی اور الکندی جیسے عظیم المرتبت علماء اس کی حمایت کرتے تھے اور انہوں نے موسیقی کے بارے میں عظیم ترین کتابیں لکھیں۔ دھیرے دھیرے دمشق، بغداد اور غرناطہ فن موسیقی کے خصوصی مراکز بن گئے اور عرب موسیقی نے یورپ کو بہت کچھ دیا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت تک عرب، ایران اور وسط ایشیائی باشندے موسیقی کو درانتاً اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس تفصیل کو دینے کی پانچ خاص وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ ایک طرف ہندوستان ایک ترقی پذیر نظام موسیقی رکھتا تھا دوسرے عربوں اور بعد کے صوفیاء نے ایران اور

اور عرب وغیرہ سے تقویت حاصل کر کے اپنی ریاضت میں موسیقی کو بہت اہمیت دی۔ تیسرے ہندوستان کے متعدد مسلم حکمران فن موسیقی کے عظیم سرپرست رہے ہیں۔ چوتھے امیر خسرو میاں تان سین اور شرقی خاندان کے متعدد ایسے عظیم فن کار ہندوستان میں آئے ہیں جنہوں نے مختلف راگ راگینوں کو جنم دیا اور باجے کے آلات کو ایجاد کیا اور اصلاح کی۔ مسلم صوفی شعرا بھی موسیقی سے خوب اچھی طرح واقف تھے؛ چنانچہ اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو موسیقی سے ہمیشہ لگاؤ رہا۔ مسلمان عربی اور ایرانی موسیقی سے واقف تھے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ فن موسیقی عربی، ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کا حسین امتزاج ہے۔ اگرچہ عبدالمالک آردوی کے مطابق

”اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات کا نتیجہ ہے قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا اور مقامی خصوصیات کا پختہ فارسی (اسلامی) موسیقی میں بارہ پردے یا مقامات ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں سات با این ہمہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے۔“

دف، دمامہ، نقارہ اور نغمہ خانی خاقتا عربی ساز ہیں۔ چنگ، ریاب، نشان، رباب، شہنائی، ناؤض ایرانی ساز ہیں (VOCAL ORGANS) پھونک سے بننے والے آلات موسیقی نر، و بھلی، سرلی ہری شہنائی (شرفاہ) گھوگھو وغیرہ خالص ہندھی اور ملتان ہیں۔ بہر حال ہمارے یہاں ایرانی، عربی اور ہندوستانی ساز اور باجے موجود ہیں۔ راگ راگینوں کا فن بھی ہے۔ جس پر ہندی ثقافت کے اثرات نمایاں ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ صوفیاء نے بالخصوص موسیقی سے دلچسپی لی ہے۔ سماع اور قوالی تو ان کی محفلوں کا جوہر و لاینفک بن گئے تھے۔ ملتان صوفیاء کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے صوفیاء نے بھی موسیقی میں گہری دلچسپی لی۔ سماع اور قوالی یہاں کی خانقاہی زندگی کا حصہ رہے ہیں چنانچہ ملتان میں موسیقی کے ارتقا کے بارے میں شیخ اکرام الحق لکھتے ہیں۔

ص ۱۰۰۔ بحوالہ ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات، از ڈاکٹر سید اسد علی مترجم ڈاکٹر ماجدہ اسد، ص

۲۲۸، ۲۲۷، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء، ترقی اردو بورڈ، لاہور

ص ۱۰۰۔ بحوالہ مضامین مالک، ص ۲۴۲ سلسلہ مطبوعات ادارہ طاق بستان آرہ بار اول ۱۹۷۲ء۔

آریاؤں کا شغف موسیقی اور اس کے متعلقات سے رقص نہ صرف معاشرت بلکہ اعتقادی رسوم میں دخیل تھا اور مندروں میں بھی پوجا کے دوران عورتیں جنہیں اپسرائیں کہا جاتا تھا۔ پیشل کے تھالوں میں پھول اور پوجا کی چیزیں لے کر رقص کرتی تھیں۔ اور بھجن گاتے جاتے تھے۔ سنگیت کے ودیلے تھے قلعہ سکہ جو دریائے راوی کے مشرق میں ملتان کا ذیلی حصار تھا وہاں متعدد مندر تھے اور رقص اور سنگیت کی تعلیم کے لئے بہت بڑا دیوالہ تھا۔ صنم کدہ آدیتہ میں..... بت کے سامنے نامور تماصائیں اور موسیقار عام طور پر اور اناؤس کی راتوں کو خصوصاً اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ معرکہ الٹی میں بھی دھریدگانے اور بجانے کا رواج تھا جس طرح جنگ میں بنڈ بلجے اب کام میں لاتے جاتے ہیں۔ عربوں کے عہد کے ماسوا ملتان کے اسلامی دور میں بھی موسیقی میں زیادہ ترقی ہوئی کمی نہیں آتی۔

علامہ عتیق فکری ملتان کی موسیقی کی ترقی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

” ہمیں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ امیر خسرو جیسا ماہر فن موسیقی جسے متفقہ طور پر ناٹک تسلیم کیا گیا ہے ملتان میں ایک عرصہ تک قیام کرے اور ملتان میں فن موسیقی میں ترقی نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ صوفیاء کی مجلس میں سماع لازم ہو۔ امیر خسرو کے فن کا اثر ملتان پر ہوا ہوگا کیونکہ امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں ایک نئے رنگ اور روپ سروپ کا اضافہ کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئے انداز اور اسکول کا اضافہ کیا اور اس نزلے میں یہ فنی ترقی پسندی تھی یقیناً پانچ سال کی مدت میں ملتان کی موسیقی میں بھی اس انداز کا اثر پورے طور پر ہوا ہوگا۔“

یوں تو ملتان میں موسیقی اور لے کاری کا فن زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ جدید تک مسلسل مقبول اور پسندیدہ رہا لیکن صوفیاء کی بدولت موسیقی میں سماع اور قوالی کو خصوصی ترقی ہوئی۔ خانقاہوں اور منارات پر اکثر قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور آج بھی اس کا رواج کم نہیں ہوا۔ عرس کے ایام میں قوالیاں معمولت

ص ۱۔ بحوالہ ارض ملتان، ص ۳۳۵ تا ۳۳۶

ص ۲۔ بحوالہ ”ملتان قدیم و جدید“ ص ۲۸

کا ایک اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں ہم نے صوفیاء کے ذکر میں فرداً فرداً ان کے مشاغل سماع کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ سماع کے جائز اور ناجائز ہونے میں علما کے مختلف گروہوں میں اختلاف رہا ہے لیکن صوفیاء کی اکثریت نے اسے جائز تسلیم کیا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ سماع کے آداب ضرور مقرر کئے گئے جن میں سے چند آداب یہ ہیں۔

- (۱) گردن بھکا کر بیٹھیں
 - (۲) ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں
 - (۳) ہر ایک اپنے آپ کو پوری طرح سماع میں محو رکھے
 - (۴) دوران سماع باتیں نہ کریں
 - (۵) ادھر ادھر دیکھنے سے باز رہیں
 - (۶) ہاتھ پاؤں نہ ہلایں اور تکلف کے ساتھ کسی حرکت کا مظاہرہ نہ کریں
 - (۷) اسی طرح بیٹھیں جس طرح نماز میں تشہد کئے بیٹھتے ہیں۔
 - (۸) دل کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ میں مشغول رکھیں اور منتظر رہیں کہ دیکھئے اس سماع کی برکت سے ان کے لئے پردہ فاتب سے کیا انکشاف ہوتا ہے۔
 - (۹) اپنے آپ کو قابو میں رکھیں تاکہ اختیاری طور پر اٹھ نہ کھڑے ہوں اور نہ حرکت کرنے لگیں ہاں اگر مغلوب الحال ہو کر ان میں سے کوئی اٹھ کھڑا ہو تو اس کی امداد و موافقت کریں۔ اگر اس کی پگھلائی کرنے لگے تو سب کے سب ہاتھ پھیلا دیں!
- چنانچہ سماع کے دوران عام طور پر ان آداب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ تصوف کی کتابیں سماع اور قوالی کے تذکرے سے بھری پڑی ہیں۔

محمد اکرم خان معدن الموسیقی، میں لکھتے ہیں کہ ہر قسم کی قوالی امیر خسرو کی ایجاد ہے انہوں نے موسیقی کے لحاظ سے قوالی کی ان اقسام کا ذکر کیا۔

حصہ ۱۔ بحوالہ پاکستانی موسیقی میں قوالی کی روایت انا شفاق سلیم مرزا، ص ۴۲ تا ۴۳، سرسیدین پاکستانی ادب

جلد چوتھی مرتبہ فاروق علی ورشید امجد، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی

باگیری = گوٹا اور ملا کو ملا کر

سوہنی قوالی = برج کی سنگت سے

بہار قوالی = کانڑا کی سنگت سے

بسنت قوالی = سوہنی اور پنجم بہار کی سنگت سے

تالوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے مستر قوالی ایجا کی جن میں سے سوہنی تال قوالی کی تھی یہ تال سات لفظ کا ٹھیکہ رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ قوالی کی ایجا حضرت امیر خسرو کی مرہون منت ہے یہ درست ہے کہ ایک باکمال موسیقار اور ماہر فن کی حیثیت سے انہوں نے سماع اور موسیقی میں جدتیں پیدا کیں لیکن حضرت امیر خسرو سے پہلے خواجہ معین الدین، قطب الدین نجفی، کاکا بہاؤ الدین زکریا، عبدالرشید حقانی اور بابا فرید گنج شکر کی محافل سماع کا ذکر ان کے احوال میں کیا جا چکا ہے اور ان کے قوالوں کے نام بھی لکھے جا چکے ہیں جو اپنے زمانے میں شہرت رکھتے تھے اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سماع کا رواج امیر خسرو کی بدولت پڑا۔ مختصر یہ کہ موسیقی اور سماع جیسے اہم اور مقبول تہذیبی و ثقافتی مظاہر بھی دراصل صوفیاء ہی کے مرہون منت رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

ص:۱۷ "ایضاً" ص:۱۷

ملتان کی تعلیمی تدریسی اور علمی زندگی پر صوفیاء کے اثرات

۱، مدرسے اور خانقاہیں

تہذیبی اور ثقافتی سطح کے ان مظاہر کے ساتھ ساتھ صوفیاء کی بدولت ملتان میں نہایت وسیع اور قابل قدر تعلیمی، تدریسی اور علمی روایات کی بنیاد بھی پڑی۔ جس کی بدولت ملتان اور اہل ملتان ہی نہیں برصغیر پاک و ہند بلکہ اس سے بھی بڑھ کر باہر کی دنیا والے بھی مستفیض و مستفید ہوئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان مدرسوں اور خانقاہوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی بدولت ملتان میں ایک نہایت مضبوط اور مستحکم نظام تعلیم مروج ہوا۔

ملتان کو بجا طور پر ”مدینۃ الاولیاء“ کہا گیا ہے اولیاء کی اس سرزمین کو ان خانقاہوں کی بدولت شرف حاصل ہوا جو محض عبادات اور صلوٰۃ و درود کا مرکز یا روحانی ترفع کا ذریعہ نہ تھیں، بلکہ علوم و فنون، فلسفہ و فکر اور تہذیب و ثقافت کی ترویج کا ذریعہ بھی تھیں۔ ملتان میں ان خانقاہوں کے ساتھ ایسے مدارس بھی قائم کئے گئے تھے جن میں اسلامی علوم و فنون کی تدریس کی جاتی تھی۔ بعض مدرسے خانقاہوں سے ملحق ہوتے تھے۔ عبدالمجید سائلک لکھتے ہیں۔

”شاہان ملتان میں سے حسین لنگا نے جو خود بھی ذی علم بادشاہ تھا بہت سے مدرسے قائم کئے اور بڑے بڑے علماء کو گراں قدر شاہدے لے کر تدریس و تعلیم پر مامور کیا۔ حقیقتہً الاقالیم میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان نے گجرات بھیجا کہ وہاں کی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھ کر رپورٹ کرے جب اس شخص نے آکر

بتایا کہ آپ اپنی دولت و ثروت کے باوجود گجرات جیسی عمارتیں نہیں بنا سکتے
تو سلطان غمگین ہوا۔ اس پر وزیر نے کہا کہ گجرات عمارتوں کی وجہ سے بڑا ہو گا لیکن
مٹان علم و فضل میں اس پر برتری رکھتا ہے۔^۱

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مٹان میں عمارتوں کی جگہ مدرسے قائم کئے گئے مٹان میں تعلیم
تدریس کا بہتر نظام تھا اور علماء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولوی الوالحسنات ندوی نے
بھی حسین شاہ لنگاہ کے دور کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

”حسین شاہ لنگاہ علوم و فنون کا بہت بڑا مربی گزر رہے مصنفین و ارباب فضل و کمال
کا سرپرست و مددگار تھا۔۔۔۔۔ شاہ لنگاہ نے متعدد مدرسے قائم کئے جن میں
ممتاز مشہور اساتذہ وقت مشغول درس و تعلیم رہتے تھے۔“^۲

ان مدرسوں میں مدرسہ بہائیہ سر فہرست ہے جس کا تفصیلی تذکرہ حضرت بہاؤ الدین زکریا مٹانی
کے احوال میں کیا جا چکا ہے۔ اس مدرسے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں متداولہ علوم و
فنون کی تدریس کے علاوہ روحانی تربیت کا اہتمام بھی تھا اور مبلغین کی جماعتیں دیگر شہروں اور ملکوں
میں بھی بھیجی جاتی تھیں۔ علامہ عتیق فکری لکھتے ہیں کہ

”حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا نے مٹان میں دینی مدرسے کی بنیاد رکھی یہ فقط
مدرسہ ہی نہیں تھا بلکہ بہت بڑی اخلاقی اور روحانی درسگاہ تھی۔۔۔۔۔ مدرسہ میں
مختلف فنون بھی سکھائے جاتے تھے۔ ان میں خاص کر خطاطی اور اعلیٰ قسم کی جلد سازی
کا کام بھی تھا۔۔۔۔۔ قرآنی تعلیم کا تو آپ کے ہاں خاص اہتمام تھا اور ساتوں قرأتوں
میں قرآن مجید کے پڑھنے کی تعلیم دی جاتی خاص طور سے قرآنی تعلیم کا شعبہ علیحدہ
قائم تھا۔“^۳

۱۔ بحوالہ ”مسلم ثقافت ہندوستان میں“ از عبدالمجید سائیک، ص ۲۰۷، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور طبع۔
دوم۔۔۔۔۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (۱) ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۷۱-۷۲
(۲) تاریخ فرشتہ، جلد دوم۔۔۔۔۔ ذکر حسین لنگاہ۔

۳۔ بحوالہ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۷۱، مطبع معارف علم گڑھ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ع
(حاشیہ ۳ اگلے صفحہ)

اس مدرسے کی درسی کتابوں کا نصاب بھی ملاحظہ فرمائیے۔
 ”علم و نحو میں مصباح، کافیه، لب الالباب، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں صناد اور
 اس کی شرح اور اصول بزدادی، بعد میں تفسیر مدارک اور بیضاوی شروع کشف
 بھی مطالعہ میں رہتی تھی لیکن پھر اسے خارج کر دیا اور آپ نے صاحب کشف
 کے معتزل ہونے پر اس کا پڑھنا منع فرمایا تھا اور حدیث شریف میں مشاق الاولاد
 بھی پڑھائی جاتی تھی۔ احیاء العلوم امام غزالی کے مطالعہ کے لئے رائج تھی اس کتاب
 میں فقہ کو تصوف کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور اپنے مرشد شیخ الشیوخ شہاب الدین
 ہروردی کی تصنیف عوارف المعارف بھی پڑھائی جاتی تھی۔ بابا فرید گنج شکر بھی اس
 کتاب کا بڑی خوبی سے درس دیتے تھے۔ بہت سی کتابیں آپ ساتھ بھی لٹے تھے
 ہدایہ سے اہل سندھ و ملتان اور ہندوستان آپ کی بدولت متعارف ہوا تھا۔
 اس نصاب کو ایک منظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درس نظامیہ سے ملتا جلتا تھا اس مدرسے
 کی نمایاں خصوصیت تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی روحانی تربیت بھی تھی۔ یہ مدرسہ حضرات شاہ۔
 رکن الدین عالم کے زمانے تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ کام کرتا رہا، محمد صدیق قادری لکھتے
 ہیں۔

”حضرت شاہ رکن عالم کے زمانے میں حضرت مخدوم حمید الدین حاکم ایسے عظیم دانشور
 اس درسگاہ میں مدرس تھے۔ حضرت شاہ رکن عالم نے بھی تبلیغی جماعتوں کے اس
 سلسلے کو جاری رکھا جس کی بنیاد حضرت غوث العالمین نے رکھی تھی۔ تبلیغی وفد کا
 سلسلہ آپ کی وجہ سے بام عروج تک پہنچا آپ نے دینی تعلیم کے علاوہ اس میں مسلم
 فنون یعنی خطاطی، شاعری، تعمیرات اور تاریخ نویسی وغیرہ کے شعبے بھی قائم فرمائے

۳۳۔ بحوالہ نقش ملتان، ”از عتیق فکری، ص ۲۵۴ تا ۲۵۶، مطبوعہ فکری اکیڈمی ملتان، طبع اول جنوری ۱۹۸۲ء

۳۴۔ بحوالہ نقش ملتان، ”از عتیق فکری، ص ۲۵۵

۳۵۔ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”ہندوستان کی قدیم درسگاہیں، از مولوی ابوالحسنات ندوی، ص ۹

تا ۱۰۲، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء

اور عربی فارسی، سندھی، سرائیکی اور پشتو زبان نے بھی ترقی کی اور اساتذہ نے

اپنی نگارشات کے لئے ان زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔^۱

مدرسہ بہائیہ میں ایک تبلیغی مرکز بھی قائم کیا گیا تھا جس میں تبلیغی جماعتیں تیار کی جاتی تھیں۔ یہ تبلیغی جماعتیں اندرون اور بیرون ملک بھی جاتی تھیں مبلغین تجارت پیشہ ہوتے تھے اور اس علاقے اور ملک کی زبان جانتے تھے، مولانا نور احمد فریدی لکھتے ہیں۔

”حضرت شیخ الاسلام پہلے بزرگ تھے جنہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے ملتان

میں مضبوط مرکز قائم کیا تھا۔ مدرسہ بہائیہ عمارت قاری اور حفاظ پیدا کرتا تھا اور

تبلیغی مرکز حضرات علما کو مبلغ بناتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے لسانی بنیادوں پر

تبلیغی شعبے قائم کر رکھے تھے۔ سنسکرت، بنگالی، سندھی، فارسی، عربی، جاوی، برمی

موہٹی الغرض مشہور زبانوں کے الگ الگ شعبے تھے۔ جو عالم رضا کارانہ طور پر اپنے

آپ کو تبلیغ کے لئے پیش کرتا اسے اسی شعبے میں داخل کیا جاتا تھا جہاں اسے

پہنچنا مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً جو عالم انڈونیشیا میں جاتے اور وہاں تبلیغ کرنے پر

آبادگی کا اظہار کرتا اسے اس شعبہ میں داخلہ ملتا۔ جہاں انڈونیشین علماء اپنے

علاقے کی زبان سکھانے اور اپنے ملک کے طریقے سمجھانے پر مقرر تھے۔“

یہ مبلغین طریقت کے رموز سے بھی واقف ہوتے تھے اس لئے تبلیغ کے ساتھ ساتھ طریقت

کے اسرار بھی سکھاتے تھے۔ انڈونیشیا میں ہر درویشی سلسلے کا تعارف ملتان کے حوالے سے ہوا۔

شیخ الاسلام اندرون ملک تبلیغ کے لئے اپنے مریدین کو بھیجتے تھے جو تبلیغ کا کام احسن طریقے

سے انجام دیتے تھے۔ مدرسہ بہائیہ نے جہاں علوم و فنون کی تدریس کا کام انجام دیا وہاں

اسلام کی اشاعت کا فریضہ بھی ادا کیا۔ علوم کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت، طریقت اور معرفت

کے رموز بھی سکھائے جاتے رہے۔ اس مدرسے سے فیض پانے والوں میں سے دو علماء بہت

بہت مشہور ہوئے۔ عراقی ہمدانی اور سید حسین ہراتی علم و ادب کی دنیا میں ان دونوں حضرات

۱۔ مضمون بعنوان ”عظیم روحانی پیشوا، حضرات شاہ رکن الدین عالم ہروردی“ از محمد صدیق خان قادری

مطبوعہ روزنامہ امروز ۲۸ جنوری ۱۹۸۵ء

۲۔ بحوالہ تاریخ ملتان، از لوز احمد فریدی، ص ۱۴۱ تا ۱۴۲، مطبوعہ قصر الارب، جگوالہ، ملتان بار اول۔

کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

مدرسہ بہائیہ کے علاوہ اس دور میں اس کے عناصر میں سے کاشانی کے مدرسے (دارالعلوم) اور مدرسہ فیروزیہ نے بڑی شہرت پائی۔ کاشانی کا مدرسہ ملتان میں اور مدرسہ فیروزیہ اوج میں واقع تھا۔ مسعود حسن شہاب کے مطابق مدرسہ فیروزیہ تو سومرہ عہد حکومت میں (جو چوتھی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری کے تقریباً ڈھائی سو برس تک پھیلا ہوا تھا) بھی موجود تھا اور قباچہ عہد حکومت میں اسے بے حد ترقی حاصل ہوئی۔ مشہور مورخ علامہ منہاج سراج اس مدرسے کے تدریسی شعبے کے صدر نشین تھے۔ ان کے علاوہ علی بن حامد بن ابو بکر کوفی، نور الدین محمد بن عوفی الخنفی البخاری اور شیخ محمود فاروقی جیسے اہل علم اور اصحاب زہد کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔^۳

اسی طرح مولوی ابوالحسنات مدرسہ فیروزیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

”اچہ میں اس نام کا ایک مدرسہ تھا یہ معلوم نہیں کہ اس کا بانی کون تھا اور یہ کب قائم

ہوا اتنا معلوم ہے کہ ناصر الدین قباچہ کے بعد میں یعنی چھٹی صدی میں یہ مدرسہ موجود تھا۔“^۴

اسلامی علوم و فنون کی تدریس و ترویج میں ان مدارس کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں ”نقش ملتان“ میں عتیق فکری لکھتے ہیں۔

”اس طرح درس گاہ بہائیہ تقریباً ساٹھ برس تک آپ کی زندگی میں ادا آپ کے بعد

۱۔ اعجاز احمق قدوسی لکھتے ہیں کہ مولانا قطب الدین کاشانی اپنے دور کے جید عالم تھے۔ یہ جب تشریف لائے تو مولانا کے تے ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔“

(بحوالہ تاریخ سندھ، جلد اول از اعجاز احمق قدوسی، ص ۳۴۶، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور، بار دوم ۱۹۷۶ء)

۲۔ طبقات ناصری کا مصنف قاضی منہاج الدین سراج غزنی کی تباہی کے بعد ۶۲۴ھ میں اوج پہنچ کر قباچہ کے دربار کی زینت بنا اور اوج کا مشہور مدرسہ فیروزی اس لئے حوالے کیا گیا۔“

(بحوالہ تاریخ سندھ، از اعجاز احمق قدوسی، ص ۳۴۷)

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”خطہ پاک اوج“ ص ۱۶۷-۱۶۶

۴۔ بحوالہ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۷۷

یہ سلسلہ حضرت شاہ رکن الدین قطب عالم کے زمانہ ہتک جاری رہا۔ اس وقت مولانا کاشانی کا مدرسہ بھی جاری تھا اور اچھ شریف میں مدرسہ فیروزیہ بھی طالب علموں کے لئے علم و فضل کا مرکز تھا جس کو ناصر الدین قباچہ نے بنوایا تھا۔^۱

مولانا کاشانی کے مدرسے کے بارے میں ایک اور روایت ہے

”..... کہ جب مولانا قطب الدین کاشانی^۲ ماہ دارالہنر سے ملتان میں تشریف لاتے شاہ ناصر الدین قباچہ والی ملتان نے مجلس ایا مدرسہ ان کے واسطے تعمیر کیا اور مولانا کہ علامہ زمان تھے نماز فجر اس مدرسے میں ادا کر کے درس میں مشغول ہوتے تھے اور شیخ بہاد الدین زکریا کہ ان کا ابتداءتے حال تھا ہر روز صبح کی نماز کے وقت وہاں حاضر ہوتے تھے اور فجر کی نماز مولانا کے پیچھے پڑھتے تھے۔^۳

یہ تو ہے اس دور کے چند بڑے مدرسوں کا احوال جن میں سے اکثر کی تفصیل صوفیائے کرام کے احوال میں بیان کی جا چکی ہے۔ بابا فرید گنج شکر نے ایک جماعت فغانہ قائم کیا جہاں وہ خود تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس طرح اچھ میں سید حلال الدین شیخ بخاری نے خانقاہ بخاریہ اور خانقاہ جلالیہ کی بنیاد رکھی۔ یہ خانقاہیں دراصل علوم و فنون کی درسگاہیں تھیں۔ خانقاہ جلالیہ کو محذوم جہانیاں جہاں گشت کے زمانے میں خاصی شہرت حاصل ہوئی اور مسعود حسن شہاب کے بیان کے مطابق

۱۔ بحوالہ نقش ملتان، ص ۲۵۶ تا ۲۵۷

۲۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا قطب الدین کاشانی کا مزار علمدار حسین کالج ملتان کی دیوار کے واقع ہے جہاں ایک جگہ کھدائی کے دوران میں ایک حوض اور مسجد کے آثار ملے ہیں۔ علامہ کاشانی کو دارالعلوم کے صحن میں دفن کیا گیا تھا اور دارالعلوم قلعہ کہنہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے مضمون بعنوان ”عام خاص باغ اور علامہ کاشانی کا مزار“ مطبوعہ روزنامہ امروز، ملتان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء، ص ۴) علامہ طاہر کا بھی یہی خیال ہے کہ ”مولانا کاشانی کا دارالعلوم پرانے قلعہ پر ہے“ (ملاحظہ فرمائیے مضمون حضرت عراقی کی اولاد مطبوعہ رسالہ تنویر ملتان، سالنامہ اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۷۷)

۳۔ بحوالہ تذکرہ مشائخ کرام، از محمد قاسم فرشتہ، ص ۱۲، احسن برادرز لاہور، جون ۱۹۶۵ء۔

”ہند اور بیرون ہند سے یہاں اس قدر طلباء جمع ہوئے کہ اس کی مثال دہلی کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔“

حضرت سلیمان تونسوی نے تونسہ شریف میں ایک مرکزی درسگاہ کے علاوہ بے شمار چھوٹے بڑے مدرسے قائم کر رکھے تھے۔ یہ اقامتی ادارے تھے جہاں تعلیم کے علاوہ تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ حضرت خواجہ غلام فرید کے آباؤ اجداد کا قائم کردہ مدرسہ بعد کے زمانے تک درس و تدریس کا حق ادا کرتا رہا عام طور پر ان مدرسوں میں تدریس کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک تو یہ کہ علماء فرداً فرداً اپنے گھر پر تعلیم دیتے تھے۔ طلبہ ان کے گھر میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور وہ انہیں وہیں تربیت کرتے۔ دوسرے یہ کہ مسجد یا خانقاہ کے ساتھ باقاعدہ مدرسے منسلک ہوتے تھے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اگر اجماع مطابق

”پندرھویں صدی عیسوی میں حسین لنگاہ نے اس شہر (مٹان) میں متعدد کالج قائم

کئے اور ایک یونیورسٹی بنائی جہاں ماہرین علم متعین تھے۔“

یہ معلوم نہیں کہ شیخ اکرام الحق نے اس سے کونسی یونیورسٹی مراد لی ہے وہ اسی باب میں آگے چل کر ایک دانشگاہ کا ذکر کرتے ہیں، جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

”مٹان میں نہ صرف مختلف انفرادی درس گاہیں جن میں مولانا قطب الدین کاشانی کا مدرسہ

مشہور تھا، کافی تعداد میں تھیں بلکہ ایک دانشگاہ (یونیورسٹی) بھی قائم تھی جو پرانے

قلعہ پرانگہ نیزی تسلط کے یادگار مینار کے عقب میں واقع تھی۔ اورنگ زیب

عالمگیر کے وقت میں حاجی ابوالفتح اس کے معلم اعلیٰ تھے۔“

ان مدارس میں جملہ علوم متداولہ کی تعلیم دی جاتی تھی جن میں علوم دین کے علاوہ فلسفہ و منطق، ہیئت، حساب، الجبرا، جیومیٹری، تاریخ اور طب کی تدریس بھی شامل تھی جبکہ موجودہ دور کے ذہنی مدارس کے نصاب تعلیم میں صرف اسلامی علوم کی تدریس پر زور دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر

۱۔ بحوالہ ”خطہ پاک اچ“ از معوذ حسن شہاب ص ۱۶

۲۔ بحوالہ ”ارض مٹان“ از اکرام الحق، ص ۳۳، شعبہ نشر و اشاعت ”الاکرام“

۳۔ ایضاً ص ۳۳

شمیم ترمذی لکھتے ہیں۔

”اکثر مدارس میں نصابی تنظیم درس نظامیہ کے نمونے پر کی گئی ہے۔ حفظ قرآن، قرآن ناظر، صرف و نحو، اردو، فارسی، عربی، حدیث، فقہ منطوق، فلسفہ وغیرہ اکثر مدارس میں اور چند مدارس میں عام تعلیم سے متعلق مضامین کی تدریس بھی ہوتی ہے لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہے“

موجودہ بڑی بڑی درسگاہوں میں سے چند نام یہ ہیں۔ نجیر المدارس، قاسم العلوم، انوار العلوم، منظر العلوم، باب العلوم، جامعہ عربیہ، محمدیہ، مدرسہ اویسیہ، دار التجوید نعمانیہ، دارالعلوم عبید رحمانیہ، بدر العلوم، ریاض العلوم، مخزن العلوم، اور مدرسہ تعلیم الابرار، گو یا پروفیسر شمیم ترمذی کے الفاظ میں

”شہر مردان خدا ملتان کے تقریباً سو سے زائد مدارس اور مساجد کی موجودگی اور کارکردگی اہل ملتان کے دینی شعف اور اسلام دوستی کا جتنا جاگتا ثبوت ہے“

موجودہ دور میں حکومت نے ان مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کر لیا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدارس میں دینی علوم کے علاوہ دنیاوی اور سائنسی علوم کی تدریس کا انتظام بھی ہونا چاہیے تاکہ یہاں کے تعلیم یافتہ طلباء معاشرے کے لئے مفید افراد ثابت ہو سکیں کیونکہ اگر قدیم دور میں جملہ علوم کی تدریس کی جاسکتی تھی تو اب کیوں نہیں کی جاسکتی۔

(۲) ملتان میں فلسفے کی روایت

اس تدریسی اور تربیتی نظام کی بدولت، جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، ملتان میں علوم عقلیہ و نقلیہ کو خاص ترقی حاصل ہوئی اور تصوف اور مذہبی فلسفے کے ساتھ ساتھ عقلی علوم بھی پروان چڑھنے لگے۔ یوں تو سرزمین ملتان میں فلسفے کی روایت زمانہ قدیم سے موجود تھی۔ ہندوؤں کی کتاب رگ وید کا بیشتر حصہ ملتان کے اردگرد کے علاقوں میں تصنیف ہوا۔ اس کی تفصیل دوسرے باب میں آچکی ہے۔ اسی طرح ہندی فلسفہ ویدانت میں گیتا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علامہ عتیق نگری کے مطابق ملتان کے مندروں اور عام گھروں میں

حصہ ۲:- بحوالہ ملتان کی دینی درسگاہوں، از پروفیسر شمیم ترمذی، ص ۱۹، مطبوعہ امرتسر، ملتان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء

گیتا کا پاٹ ہوتا تھا اور جو اپدیش ارجن کو کرشن نے مہا بھارت کی جنگ کے موقع پر دیا تھا۔ وہ پورا فلسفہ حیات اور اخلاقیات پر مبنی ہے۔ لیکن اسلامی علوم کا آغاز یہاں ابن قاسم کے ہاتھوں ملتان کی فتح کے بعد اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے سندھ اور ملتان میں آباد ہونا شروع کیا۔ بنو منہبہ کے دور میں ملتان نے تہذیبی اور علمی سطح پر بڑی ترقی کی جب حلیم بن شیبان کے ہاتھوں ۳۷۳ھ (۹۷۷ء) میں بنو منہبہ (بنو سامہ) کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہاں اسماعیلی عقائد کی توجیہ فلسفے کے اصولوں پر ہونے لگی۔ علامہ عتیق فکری لکھتے ہیں کہ ان اصولوں کو ”ارسطو اور نوافلٹینس کے نظریات سے تطبیق دیکر قابل فہم بنایا گیا تھا۔۔۔۔۔ اور یوں نئے فلسفے نے ملتان میں اپنے قدم جما لئے۔“

ملتان میں اس دور کی فلسفیانہ سرگرمیوں کے بارے میں شبیر احمد غوری اپنے ایک مضمون ”اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج“ ص ۲۵۳، مطبوعہ رسالہ معارف، اپریل ۱۹۶۳ء میں لکھتے ہیں

”جہاں تک علوم فلسفہ کا تعلق ہے یہ باور کرنے کی وجوہ ہیں کہ سندھ اور بالخصوص ملتان میں خفیہ طور پر ان علوم کی بڑی تیزی سے اشاعت ہو رہی تھی، چوتھی صدی کی ابتداء سے اسماعیلی دعار عالم اسلام میں انقلاب کے لئے زمین ہموار کرتے پھر رہے تھے۔“

ملتان میں فلسفے کی روایت کے تسلسل میں جو بہت سے عوامل ہیں ان میں ایک مشہور فلسفی اور شاعر ناصر خسرو کی ملتان میں آمد بھی ہے۔ حکیم ناصر خسرو کی پیدائش ۳۹۴ھ / ۱۰۰۳ء اور وفات ۴۸۱ھ بتائی جاتی ہے۔ سفر نامہ خسرو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ملتان سے لاہور گیا اور پھر واپس چلا گیا۔ سفر نامے کی عبارت حسب ذیل ہے۔

ص ۲۲۰۔ مضمون ”ملتان میں فلسفہ اور اس کے اثرات برصغیر پر“ از علامہ عتیق فکری، ص ۲ (یہ غیر مطبوعہ مضمون فل کیپ کے چھ صفحوں پر ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے اور میری تحویل میں ہے۔)

ص ۲۳۔ بحوالہ سفر نامہ حکیم ناصر خسرو مترجم مولوی محمد عبدالرزاق کاپوری، ص ۱۰۹، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)، ۱۹۴۱ء

”دمن بدیں ایسوی قوطہ دیدم از صوف گو سفند کردہ کہ مثل آل نہ بہ ہماورد (لاہور)
 دیدم دند بہ متان و شکل پنداشتی حریر است۔“
 وہ بلا سندھ میں بھی رہا۔ اس کے دیوان میں متعدد ہندی اور خالص سنسکرت الفاظ بھی موجود
 ہیں جو سیاحت ہند پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً
 ”پس بطریق تو خدائے جہاں بے شب درماش، وجود لویا ست برہمن در ہند بہ
 چندال ناکس فضل داست

بندہ چوں چندال دون از بہر دیں شد برہمن^۱“

معقولات و فلسفہ پر ناصر خسرو کو دوسرا بوعلی سینا کہا جاتا ہے، وہ متان میں مصر کے فاطمی حکومت
 کا داعی بن کر آیا تھا اور ظاہر ہے متان میں فلسفے کی روایت کے سلسلے میں اس کا نام آنا چاہیے۔
 پھر محمود غزنوی کے عہد میں البیرونی نے برسوں متان میں قیام کیا اور کتاب ”الہند“ لکھی۔ البیرونی
 ایک طرف تو سنسکرت سیکھ کر ہندی فلسفے سے متعارف ہوتے اور دوسری طرف یونانی فلسفے
 سے متان کے لوگوں کو بھی آگاہ کیا۔ شبیر احمد غوری کے مطابق

”اس نے یہاں آ کر ہندو فلسفہ و ہیت ہی نہیں سیکھا بلکہ ہندوؤں کو بھی مسلم ریاضی
 و ہیت سکھائی۔“^۲

محمود غزنوی کے بعد حضرت شاہ گردیز متان تشریف لائے اور درس و تبلیغ کے ذریعے اسلامی
 علوم کی ترویج کی کوششیں کیں۔ ادھر بوعلی سینا کا فلسفہ چھٹی صدی ہجری میں متان میں پہنچ چکا تھا۔
 امام فخر الدین رازی جیسا مفسر اور فلسفی بھی سر زمین متان میں اپنی تقریروں کے ذریعے اسلامی
 فلسفے کی وضاحت کر چکا تھا۔ متان کے جدید علما فضل اور اثیر خراساں جا کر امام رازی سے فیض یافتہ
 ہوئے تھے اور پھر ناصر الدین قیامی کے دربار میں انہیں ندیم خاص کا مقام حاصل ہوا تھا۔
 ۱۰۶۵ھ میں غوث بہاؤ الحق زکریا متانی کی علمی درسگاہ نے مختلف علوم و فنون کی اشاعت

۱۔ سفر نامہ حکیم ناصر خسرو مترجم مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری، ص ۳۰-۳۱

۲۔ مضمون ”اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقیدہ کا رواج“ (قسط دوم)، ص ۱۰، مطبوعہ معارف، فردی
 ۶۳، جلد ۹۱

۳۔ مضمون ”متان میں فلسفہ اور اس کے اثرات برصغیر“ از علامہ عتیق فکری، ص ۳

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آچکی ہے یہ وہ دور ہے جب ناصر الدین قباچہ کا دربار علماء اور فن کاروں کی سرپرستی میں پیش پیش تھا اور متان علوم و فنون کا مرکز بن چکا۔ فضلی متانی جو بخارا میں عونی کے ہم مکتب اور ہم درس رہے اور وہیں دونوں نے امام فخر الدین رازی کی جامع الصغیر حفظ کی، قباچہ کے دربار کے ساتھ وابستہ رہے۔ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ اور قباچہ ان کی شاعری کا قدردان تھا۔

ساتویں صدی کے وسط سے آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک کے عرصے میں متان کے بے شمار علماء برصغیر میں پھیل گئے۔ مولانا بہاؤ الدین متانی نے دہلی میں سکونت اختیار کر کے تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا حجۃ الدین نے بھی علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں دہلی میں درس گاہ قائم کی۔ قطب الدین کاشانی کے فرزند علی گڑھ میں عہدہ قضا پر بھی فائز رہے اور تدریس بھی کرتے رہے۔ متان کے ایک اور صوفی عالم شیخ صدر الدین ظفر آبادی متانی، حضرت رکن الدین عالم سے خرقہ خلافت حاصل کر کے ظفر آباد میں مقیم ہوئے اور علم و فضل سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔ شیخ عثمان داؤد متانی کو فقہ اور تصوف کے علوم پر کامل دسترس حاصل تھی انہوں نے شیخ نظام الدین اولیاء کے حکم سے گجرات میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ قاضی ابراہیم بن فتح اللہ متانی نے دکن کے شہر بیدری میں علم پھیلایا۔

اس ابتدائی دور کے بعد وہ دور آیا جب متان کے علمی و تہذیبی اثرات ہمہ گیر طور پر پورے برصغیر میں پھیلنا شروع ہوئے۔ متان میں صوفیاء کے اثرات کی بدولت نہ صرف روحانی فیوض اور اثرات عام ہوئے بلکہ سوچ اور فکر کے دھارے بھی بدلے اور ایک لحاظ سے اسلامی فلسفے کا احیاء بھی ہوا۔ متان میں تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفے کی بھی ایک بھرپور روایت ملتی ہے۔ فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف کے علاوہ فلسفہ، کلام، اخلاق اور منطق کے میدان میں بڑے

۱- مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے (۱) برصغیر پر متان کے علمی اثرات از عتیق فکری، مطبوعہ اردو متان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء (۲) مسلم فلسفے میں متان کی اہمیت، از پروفیسر محمد امین

SOUVENIOR OF US PAKISTAN PHILOSOPHICAL CONGRESS

مطبوعہ تزکیا یونیورسٹی، متان ۱۹۸۳ء، ۳۰-۲۸ مئی ۱۹۸۳ء

(۳) "بزم معلوکیہ" ص ۳۷۔

بڑے جید علماء پیدا ہوتے فرداً فرداً تمام صوفیاء کے احوال میں ان کی تہذیبی، علمی و ادبی کاوشوں اور خدمات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ان کے علاوہ بھی چند اہم لوگ ایسے ہیں جن کی بدولت فلسفے کی روایت عام ہوئی۔ ان علماء میں مولانا شام الدین ملتانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے قطب الدین رازی کے مشہور شاگرد تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) سے تعلیم پائی تھی۔ وہ علامہ تفتا کے علم و فضل کی شہرت سن کر ان سے کسب فیض کے لئے ایران گئے۔ حصول علم کے بعد واپس آئے تو معقولات کی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کی اور مولانا سمار الدین ملتانی اور مولانا فتح اللہ ملتانی کو تعلیم دی۔ مولانا سمار الدین ملتانی دہلوی (متوفی ۹۰۱ھ) ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ آپ کا تعلق کنبوہ خاندان سے تھا۔ جس کے ایک بزرگ حاجی جمال کنبوہ نے سب سے پہلے حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ مولانا سمار الدین ملتانی اور ان کے بھائی مولانا اسحاق دونوں علم و فضل اور فلسفے میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا سمار الدین حضرت راجو قتال کے مرید تھے۔ لنگاہوں کے زمانے میں دہلی منتقل ہوئے اور دہلوی کہلوائے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں گزار دی اس دور کے بڑے بڑے علماء آپ کے شاگرد تھے۔ "سیر العارفین" کے مصنف مولانا حامد بن فضل اللہ جمالی نے آپ کو "حقائق کے مخزن"، "دقائق کے معنی، ذات اقدس کے جلوے کے سمندر، آسمان ہدایت کے روشن آفتاب اور جہاں تکمیل کے آسمان بھی کہہ کر پکارا ہے۔"

مولانا عبداللہ ملتانی جو عبداللہ تلمبوی بھی کہلاتے ہیں تلمبہ میں پیدا ہوئے لیکن تعلیم ملتان میں پائی بعد میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کی تکمیل کی خاطر عراق تشریف لے گئے اور علامہ عبداللہ نیرودی سے حصول علم کیا۔ ملتان واپس آ کر فلسفہ و منطق کا درس دینے لگے پروفیسر محمد امین کے مطابق "آپ کے دور میں منطق کی کتاب شرح شمسیہ اور کلام میں شرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں مگر آپ نے بہت سی نئی کتابیں بھی شامل نصاب کیں۔ آپ کو منطق و فلسفہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور انہی مضامین کی تدریس میں آپ نے عمر گزار دی"

۱۔ بحوالہ "سیر العارفین"، از فضل اللہ جمالی مترجم محمد ایوب قادری، ص ۲۵۱، مرکزی اردو بورڈ، لاہور

(حاشیہ ص ۲ اگلے صفحہ پر)

بار اول اپریل ۱۹۷۶ء

آپ بھی سمارالدین متانی کی طرح دہلی میں منتقل ہو گئے اس وقت دہلی میں سکندر لودھی کی حکومت تھی۔ اس نے آپ کو ملک العلماء کا اعزاز عطا کیا اور گذر اوقات کے لئے جاگیر بھی مقرر کی۔ اور ان کے سپرد ایک بہت بڑا مدرسہ کر دیا جہاں وہ فقہ اور معقولات کی تعلیم دیتے تھے۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق بدیع المسی انہوں نے لکھی تھی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ نور احمد فریدی کے مطابق

”مولانا کے ویسے تو سیکڑوں شاگرد تھے لیکن چالیس باکمال عالم بنے جن میں مفتی جمال الدین اور ان کے بھائی عبدالغفور میں نصیر الدین دہلوی، میاں شیخ گوالیار اور میراں جمال الدین بدایوں کا بڑا درجہ ہے۔“

مولانا عبداللہ کے دوست اور ساتھی مولانا عزیز اللہ (متوفی ۹۳۲ھ) بھی اپنے وقت کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بھی تلمبہ میں پیدا ہوئے لیکن معقولات کی تعلیم ملتان میں حاصل کی۔ آپ کو علوم متداولہ یعنی اصول، کلام، منطق اور حکمت میں بڑا عبور حاصل تھا سب سے پہلے دہلی میں مولانا عبداللہ کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں بدایوں سے ہوتے ہوئے سنبھل چلے گئے اور وہیں منتقل سکونت اختیار کی۔ سکندر لودھی نے آپ کی قدر دانی کی۔ مولانا عزیز اللہ کے بارے میں علامہ عتیق فکری لکھتے ہیں کہ

”مولانا کا حافظہ بلا کا تیز تھا اور مشکل مسائل حل کرنے میں ید طولی رکھتے تھے بغیر مطالعہ کے کتاب پڑھتے تھے اکثر لوگ مشکل اور پیچیدہ سوالات بطور امتحان پیش کرتے اور مولانا چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔“

شبیر احمد غوری مولانا ابو محفوظ الکریم العصور کے ایک مضمون ”صدر الدین الشیرازی حیات و

-
- ۱۲۔ بحوالہ مسلم فلسفے میں متان کی خدمات، از پروفیسر محمد امین، مطبوعہ ماہ نو، جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۵
- ۱۳۔ بحوالہ تاریخ متان، (جلد اول) از نور احمد فریدی، ص ۲۹۵، مطبوعہ قصر الارب، متان، بار اول
- ۱۴۔ بحوالہ مضمون، ”متان میں فلسفہ اور اس کے اثرات برصغیر پر“ ص ۶
- ۱۵۔ بحوالہ تاریخ متان، (جلد اول) از نور احمد فریدی، ص ۲۹۶
- ۱۶۔ بحوالہ برصغیر پر متان کے علمی اثرات، مطبوعہ امروز متان نمبر، ص ۵

ماثرہ ”مطبوعہ انڈیا ایرانیکا کے حوالے سے عبداللہ متانی اور عزیز اللہ کے بارے میں لکھتے

ہیں

”..... کہ یہ دونوں بادشاہ (سکندر لودھی) کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ

بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا اور انہیں انعامات و تحائف سے نوازا۔

ان دونوں کی علمی کوششیں بار آور ہوئیں اور شمالی ہند میں فلسفہ کی تعلیم کی اشاعت

میں وہ نہایت نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔“

مولانا عزیز اللہ کے استاد مولانا فتح اللہ بھی کوئی کم اہم شخصیت نہیں ہیں انہوں نے

قطب الدین رازی کے مشہور شاگرد تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) کے شاگرد مولانا موسیٰ الجبری

سے دہلی میں تعلیم حاصل کی تھی ان کے علاوہ ثناء الدین متانی سے بھی اکتساب علم کیا۔ وہ

متان کے بہت بڑے فلسفی، معلم، خطاط اور دانشور تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت

زیادہ تھی۔ ان شخصیتوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی علمی اور قد آور شخصیت حافظ

عبدالعزیز پیر ہار دی کی ہے۔ آپ تحصیل کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ کے قصبہ پیر ہار میں حافظ

احمد بن، حافظ محمود کے گھر ۱۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ بارہ

سال کی عمر میں تمام علوم حاصل کر لئے۔ حضرت حافظ جمال اللہ متانی سے فیض حاصل کیا۔ علم

الکلام اور فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ مصر کے علماء بالخصوص ابو زہرہ و جسیا فقہ اور محدث اپنی

کتابوں میں خصوصیت سے عبدالعزیز پیر ہار دی کے حوالے دیتا ہے۔ فلسفہ، تصوف، تفسیر

حدیث، فقہ، طب، حکمت ریاضی اور علم جفر کا یہ ماہر سو سے زیادہ کتابوں کا مصنف تھا۔

۱۔ بحوالہ اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج، ”اچوتھی قسط، معارف، ۱، جلد ۹۱، جنوری

۱۹۶۳، ص ۲۵

۲۔ بحوالہ اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج، ”دوسری قسط، مطبوعہ معارف، فروری ۱۹۶۳

ص ۱۵۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے علامہ عتیق فکری کا مضمون ”برصغیر پر متان کے علمی اثرات“ امرتسر

متان نمبر، ص ۵

۳۔ بحوالہ متان میں فلسفہ اور اس کے اثرات برصغیر پر، از علامہ عتیق فکری، ص ۶

آپ نے بہت کم عمر پائی صرف ۳۲، ۳۳ سال کی عمر میں ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔
غرض سرزمینِ ملتان علومِ فلسفہ کی ترویج کے سلسلے میں پیش پیش رہا۔ شبیر احمد غوری لکھتے
ہیں

”... یہ علاقہ نویں صدی تک معقولات کی تعلیم کا گڑھ بنا رہا۔ یہیں (ملتان)
سے مولانا عبداللہ تہنی اور عزیز اللہ ملتان نے دہلی پہنچ کر معقولات کی گرم
بازاری کو مزید رونق دی۔“

ان علماء کی کاوشوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ملتان کے صوفیاء اور علماء کو حدیث
تفسیر، فقہ کے علاوہ منطق اور فلسفے سے بھی گہرا گام و تختا۔ علمی اور عملی تصوف کی ترویج کے
علاوہ فلسفے اور منطق کی تدریس اور اشاعت کے لئے بھی ان علماء نے اہم کردار ادا کیا
البتہ ملتان میں جس فکر کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ صوفیانہ فکر تھی کیونکہ ملتان صوفیاء کے
ایک بہت بڑے سلسلے کا مرکز رہا یہ سلسلہ ہروردی تھا جو ملتان سے شروع ہو کر پورے
برصغیر میں پھیل گیا۔ اس سلسلے کے صوفیاء اپنے مخصوص اصول و اشغال رکھتے تھے جو انہیں
دوسرے صوفیانہ سلسلوں سے ممیز کرتے ہیں۔ قاضی جاوید اپنی کتاب ”برصغیر میں مسلم فکر کا
ارتقار میں لکھتے ہیں۔

”برصغیر میں ہروردی کے سلسلے کا فروغ زیادہ تر ملتان کے مرکز کے حوالے سے
ہوا۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا برصغیر ہی کے باشندے تھے اور تعلیم کے حصول
کی خاطر بغداد میں شیخ شہاب الدین ہروردی کی خدمت میں پہنچے تھے۔ دارا
شکوہ نے انہیں شیخ شہاب الدین ہروردی کا کامل ترین خلیفہ قرار دیا ہے۔
بغداد سے واپسی کے بعد ان کی زندگی ملتان ہی میں بسر ہوئی تھی... ہروردی
مکتبہ فکر تیرھویں و چودھویں صدیوں کے مسلم برصغیر میں راسخ الاعتقاد ہی کی
نمائندگی کرتی ہے تاہم اس بات کو ایک عام اصول کے طور پر پیش نہیں کیا جا
سکتا۔ اس مکتبہ فکر سے منسوب بہت سے دانشوروں نے برصغیر میں مسلم روحانی

ص ۱۔ ”اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا روح“ مطبوعہ معارف، اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۷

بغاوت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔“

سلسلہ بہروردیہ سلاطین وقت کے ساتھ روابط رکھتا تھا۔ سیاست میں باقاعدہ حصہ لیتا تھا اور جاگیریں اور زندرانے بھی قبول کرتا تھا۔ بہروردی سلسلے میں اہم ترین کتاب شیخ شہاب الدین بہروردی کی عوارف المعارف ہے۔ اس کی صوفیانہ فکر اور آداب و اشغال کا سارا خزانہ اسی کتاب میں بند ہے۔ بہروردیہ نے ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کو رد نہیں کیا بلکہ اختیار کیا۔ متان میں یہ فلسفہ فخر الدین عراقی کی وساطت سے متعارف ہوا۔ عراقی کی خط و کتابت حضرت بہار الدین زکریا کے فرزند اور جانشین حضرت صدر الدین عارف سے تھی۔ عراقی نے انہیں شیخ اکبر بن عربی کے خیالات سے روشناس کرایا کہا جاتا ہے کہ کتاب ”لمعات“ انہوں نے ”فصوص المحکم“ سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ ”سیر العارفین“ کے مطابق

”کتاب لمعات اس طرح تصنیف ہوئی کہ حضرت شیخ الاسلام (بہار الدین زکریا) کی وفات کے بعد جب انہوں نے متان سے بیت اللہ کا ارادہ کیا اور وہاں سے روم پہنچے اور شہر قونیہ میں آئے تو وہاں شیخ محی الدین ابن عربی کے خلیفہ شیخ صدر الدین قونوی تھے کچھ عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور کتاب لمعات قونیہ میں تصنیف فرمائی اور وہاں سے انہوں نے ایک خط شیخ الاسلام صدر الدین عارف کو لکھا کہ جس میں عارفانہ کلمات و نکات تھے اور اس میں تحریر تھا کہ اب ہم کو ایک ایسے صوفی کی صحبت ملی ہے کہ جس کے یہ کلمات ہیں۔“

چنانچہ ظاہر ہے کہ عراقی فصوص المحکم سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ایک نسخہ شیخ صدر الدین عارف کو بھجوا یا جس کی بہت سے نقول آگے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک بھی گئیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے متان اور برصغیر کے صوفیاء ابن عربی کے خیالات

۱۔ بحوالہ برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار، از قاضی جاوید، ص ۵۲-۵۵، مطبوعہ ادارہ ثقافت

پاکستان طبع اول ۱۹۷۷ء

۲۔ بحوالہ سیر العارفین، ص ۱۵۲

سے متعارف ہوتے اور پھر یہ نظریہ مسلم برصغیر میں بہت مقبول ہوا۔ وحدت الوجودی فکر سے محبت اور انسان دوستی کا وہ رویہ پروان چھڑھایا جو ملتان کی صوفیانہ شاعری سے بھی منعکس ہوتا ہے۔ بابا فرید گنج شکر اور خواجہ غلام فرید کی شاعری اسی انسانی دوستی کے رویے کی بہترین مثال ہے۔

(ج) ملتان کی ادبی اور تہذیبی زندگی پر

صوفیائے کرام کے اثرات (مجموعی جائزہ)

ملتان کے فنون مفیدہ اور فنون لطیفہ پر صوفیائے کرام کے اثرات کا جائزہ لینے اور ملتان کی علمی روایات کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم بحیثیت مجموعی ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی پر صوفیائے کرام کے ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۱، مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہند کی عمومی حالت

اب تک کی ساری تفصیل کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں عربوں کی آمد قبل از اسلام بھی ثابت ہے اسلام کے ظہور کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی سے مسلمان کسی کسی راستے سے ہند میں داخل ہوتے رہے اسی ہجری کے اخیر میں مسلمان محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ میں آئے اور آگے بڑھتے ہوئے ملتان پر قابض ہوئے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان میں ضد و ازم کا عروج تھا۔ ہندوؤں میں طبقاتی نظام اور ذات پات کی تقسیم عام تھی۔ اُدینچ پنچ اور ادنیٰ داعلی کی ناروا اقدار ہندوؤں کے مذہب اور معاشرت کا ناگزیر حصہ تھیں۔ برہمن، کھتری، شود اور اچھوت کی تقسیم کے تحت ایک دوسرے سے رشتہ داری

۱۱- ابن خردادبہ نے نویں صدی عیسوی میں ہندوؤں کے سات طبقے بنائے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تعلقات، روابط اور بول چال تک ممنوع تھی۔ مذہب پر اُونچے طبقے کو بالادستی حاصل تھی۔ برہمن نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ مذہبی زبان صرف اسی طبقے کے لئے مخصوص تھی اور دوسروں کے لئے اس کے بولنے سننے تک پر پابندی تھی۔ مساوات اور خواتین کا نام نہیں تھا۔ بتوں کی پوجا کا عام رواج تھا۔ لوگوں نے اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق کئی خداؤں کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ انسانوں کی تفریق کے ساتھ ساتھ خداؤں کی تقسیم اور درجہ بندی بھی اس عہد کا دستور تھا۔ مختلف طبقوں کے لوگوں کے الگ الگ مندر تھے پوجا کے الگ الگ طریقے ایک طبقے کے لوگوں کا دوسرے طبقے کی چیزوں کو چھو لینے سے بہرہ شت ہونے کا تصور موجود تھا عورت کو معاشرے میں نہایت ادنیٰ مقام حاصل تھا، خاوند کی وفات کے بعد بیوی کو تنہا پڑنا تھا یا ساری زندگی بیوگی میں گزارنا پڑتی تھی... خودکشی کی اجازت تھی۔ موت و وفات کے موقع پر عجیب و غریب رسموں کا رواج تھا۔ ضعیف الاعتقادی، ادھام پرستی، چھوٹ چھات، بھوت پرست، ٹونے ٹونکوں کا عام رواج تھا، سود خوری، قمار بازی اور شراب نوشی عام تھی۔

۴) مسلمانوں کی آمد

مسلمانوں کی آمد سے کفر و الحاد کی اس سرزمین میں تہذیب و ثقافت، مذہب و معاشرت اور زبان و بیان کے انداز میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اسلام کی روشن خیالی، رواداری، مساوات پر مبنی نظام اور توحید پرستی نے یہاں کی اصنام پرست اقوام پر بڑے مثبت اثرات مرتب کئے۔ یہاں تک کہ ان غیر مسلم اقوام میں روشن خیالی کی تحریکیں شروع ہوئیں اس سلسلے میں بھگتی اور برہمن سماج تحریک وغیرہ کے نام لئے جا

ہیں یعنی (۱) چھتری (۲) برہمن (۳) کھتری (۴) شودر (۵) ویش (۶) چٹال اور (۷) ڈوم... اسی طرح اس کے مطابق یہاں کے مذہبی فرقوں کی تعداد بیالیس تھی۔ (ملاحظہ فرمائیے الممالک الممالک از خرد اذیہ ترجمہ مولانا مسعود علی ندوی بعنوان "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ص ۲۵-۲۶)۔

ص ۱۰۰ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "مسلم ثقافت ہندوستان میں"، از عبدالمجید سائیک، ص ۲

تا ۲۳۔

(باقی حاشیہ ص ۱۰۱ اور ص ۱۰۲ کے صفحہ پر)

ص ۱۰۱۔ قاضی جاوید کے مطابق

سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

”مسلمانوں کے ساتھ آنے اور پھیلنے والے نئے ہندوہی اثرات نے اس برعظیم میں بت پرستی اور ذات پات کے خلاف ایک ایسا شعور بیدار کیا کہ عوام بھی یہ سمجھنے لگے کہ زردان اور نجات کا راستہ صرف برہمنوں کے قبضے میں نہیں بلکہ جو بھی چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے اس لئے ایسی تحریکیں بہت مقبول ہوئی

”برصغیر کے مسلم فکر کے ارتقار میں جگتی تحریک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے بنیادی طور پر یہ تحریک ہندوستان کی دو عظیم ہندوہیوں کے مابین ترکیب پیدا کرنے کی شعوری کوشش کے طور پر وجود میں آئی تھی لیکن یہ اپنی قسم کی اولین تحریک نہیں تھی۔ اس سے قبل ایسی کئی خود رو تحریکیں برصغیر کی معروضی صورت حال سے جنم لے چکی تھیں اور ان کے نتیجے کے طور پر نچلے طبقات کی سطح پر ہندو مسلم ترکیبی ثقافت جنم لے رہی تھی۔ اس عمل کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس عمل کے ابتدائی دور میں سندھ کے نو مسلموں نے عرب عہد حکومت میں اپنے سابقہ مذہب ہی دیوتاؤں کو اسلامی نام عطا کر دیئے تھے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ دیگر علاقوں میں بھی پھیل گیا۔“

”برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار“ ص ۶۹، مطبوعہ ادارہ ثقافت پاکستان لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء (ص ۲۳۔ اس تحریک کے بارے میں ڈاکٹر قمر تیس لکھتے ہیں

”برہمن سماج کی اس تحریک نے مذہبی تعطل، قدامت پسندی اور تنگ نظری کے اس طلسم کو توڑنے میں مدد دی جس نے ہندوستان کی تمدنی ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ سمجھنا ان کی انتھک کوششوں سے سستی کی رسم ختم ہوئی۔ سماج اور ہندو سماج میں عورتوں کی زبوحالی کے خلاف آواز اور حرکت پیدا ہوئی۔ سماج کی ان سرگرمیوں سے تعلیم یا قبہ طبقے میں بیداری کا ایک صالح احساس پیدا ہوا اور یہی احساس ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کا سنگ میل ہے۔“

”بحوالہ پریم چند۔۔۔ تنقیدی مطالعہ“ ص ۷۶، مطبوعہ سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، طبع۔

چہارم ۱۹۷۷ء (ص

پیدا کیا۔ ذات پات اور طبقاتی تقسیم کے خلاف جہاد کر کے تمدنی زندگی کو ایک نیا رخ عطا کیا اور اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر زبان کو قومی وحدت کا ایک ذریعہ بنایا۔ قطب الدین بختیار کاکی نے موسیقی اور سماع کو جائز قرار دے کر اور خود اس میں شغف کا اظہار کر کے فنون لطیفہ کی ترویج کا سامان کیا۔ بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے ملتان میں ایک عظیم درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ لوگوں کی ذہنی فکری اور جسمانی تربیت کا عملی انتظام کیا حضرت فرید الدین گنج شکر نے وسیع انسانی بنیادوں پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر کی۔ انسانی دوستی کے آدرش کے ساتھ علم و ادب اور فنون لطیفہ کی ترویج ان کی زندگی کا مطمح نظر رہا۔ اردو، سرائیکی اور پنجابی شاعری کے ارتقا اور اردو زبان کی ابتدائی نشوونما کے سلسلے میں ان کو تاریخی تقدیم حاصل ہے۔ حضرت شاہ شمس سبزواری فارسی، کشمیری، ہندی اور سرائیکی زبان کے شاعر تھے۔ شیخ صدر الدین عارف بھی شعر و شاعری میں شغف رکھتے تھے۔ خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے چنانچہ عراقی جیسے شاعر نے ان کی شاعری کی تعریف کی۔ سید جلال الدین سرخ بخاری نے اُچ میں خانقاہ "بخاریہ" کی بنیاد رکھی۔ اس خانقاہ میں علمی اور روحانی طور پر استفادہ کرنے والوں کی تعداد بے شمار تھی۔ خانقاہ جلالیہ بھی انہیں کی یادگار ہے۔ شاہ رکن عالم نے اپنے دادا بہاؤ الدین زکریا کی طرح سیاست اور مذہب کا امتزاج قائم رکھا۔ سماع میں بھی دلچسپی لی۔ شیخ محام الدین ملتانی نے درویشی و قلندری کا درس عملی طور پر دیا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ملتانی، پنجابی، سندھی اور ہندی زبانوں میں نہ صرف گفتگو فرماتے تھے بلکہ درس و تدریس بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اُچ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا۔ فنون لطیفہ اور شعر اور زبان و بیان کے لحاظ سے امیر خسرو کی خدمات تو اظہر من شمس ہیں۔

حضرت مولیٰ پاک شہید کی کتاب "تیسیر الشاعریں" علم و معارف کا خزانہ ہے۔ پُر لطف اور ادبی اسلوب میں لکھی ہوئی فارسی کی یہ کتاب علم و اخلاق اور رشد و ہدایت کی باتوں سے پُر ہے۔ یہ سب باتیں ایک نیک اور باکردار زندگی کے لئے بہترین ضابطے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جا بجا ایسے اقوال درج ہیں جن سے انسانی اعمال کی تہذیب ہوتی ہے۔

حافظ محمد جمال ملتانی نے نہ صرف اپنی علمی، اخلاقی، روحانی اور تدریسی سرگرمیوں سے خلق خدا کو فیض یاب کیا بلکہ انہیں باطل کے خلاف عملی جہاد کے لئے بھی تیار کیا اور خود بھی میدان جنگ میں اترے۔ علم و عمل اور دین و دنیا کا بہترین امتزاج ان کی زندگی کا آدرش رہا۔ امکی

”سی حرفی“ مقصدی اور اخلاقی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اگرچہ اس نظم کی زبان سرائیکی ہے لیکن اس کا ڈکشن یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دور میں بھی سرائیکی اردو کے روابط بڑے مستحکم تھے دونوں زبانیں ایک دوسرے سے نامالوس نہ تھیں۔

خواجہ خدابخش کی مرخبان مرنج، بامروت، تہذیبی اور ادبی سطح پر بڑی قدر تھی۔ آپ کی گفتگو بڑی دلچسپ اور ادبی حسن کی حامل ہوتی تھی، اشاروں اور کنایوں میں بات کر کے عوام و خواص کے دل موہ لیتے تھے۔ توفیقہ، توحید یہ، ذوقیہ کے حوالے سے ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وحدت الوجود کی تشریح و تعبیر انہوں نے اس انداز پر کی ہے کہ اس نظریے کی اشاعت سے محبت اور یگانگی کے جذبات لوگوں میں پیدا ہوتے۔ موقع محل کے مطابق فارسی، اردو اور سرائیکی اشعار، اقوال ضرب الامثال کے استعمال سے انہوں نے زبانوں کو مخلوط کیا اور ظاہر ہے یہ بہت بڑی ادبی و علمی خدمت ہے۔

حضرت سلیمان تونسوی نے تہذیبی سطح پر تونسہ کی پوری آبادی کو متاثر کیا۔ انکے مشاغل پیشہ وراثہ مہارت، رہن بہن، اخلاق و آداب، سوچ کے انداز اور طعام و کلام سب پر ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ علمی اور فکری سطح پر بھی انہوں نے ایک خاص نقطہ نظر کو پھیلایا اور وہ تھا انسان دوستی، فیاضی، مذہبی ترفیع اور فنون لطیفہ و مفیدہ کی ترقی اور ترویج۔

غلام حسن شہید ملتان کے صوفی شعرا میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر اردو میں شاعری کی۔ اگرچہ ان کا کوئی مطبوعہ دیوان اردو موجود نہیں ہے تاہم ان کے سجادہ نشینوں کے پاس قلمی دیوان متفرکات موجود ہے جس میں اردو غزلیں، مریخی لہجے وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت غلام حسن شہید نے اردو، ہندی، سرائیکی اور پنجابی زبانوں کو مخلوط کرنے کا تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا اور اس طرح اردو زبان کو مقامی رنگ میں ڈھلنے اور اس میں دیگر علاقائی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کو شامل کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ ان کا یہ کارنامہ یقیناً اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔

خواجہ غلام فرید دوسرے بہت سے عظیم صوفیاء کی نسبت ادب و شعر کے میدان میں زیادہ معروف اور مشہور ہوئے۔ وہ بلاشبہ ایک صوفی صافی تھے لیکن ان کی شہرت و عظمت کا زیادہ تر دار و مدار ان کے عارفانہ کلام پر ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی سرائیکی اور اردو شاعری میں معرفت کے مضامین بھی باندھے اور اپنے کلچر اور تہذیبی تناظر کو بھی پیش کیا۔ ادب

و شعر کے لحاظ سے وہ سرزمینِ ملتان کی آبرو ہیں۔ وہ ملتان کے خوشحال خان، شاہ حسین، شاہ عبداللطیف، اور سچل سرمست ہیں۔ ان کی کافیاں لوگ ورثے کا انمول خزانہ ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں خواجہ فرید کی کافیاں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا دعویٰ ہے کہ ”دیوان (دیوان فرید) کی ہر کافی گائی جا چکی ہے اور اصول موسیقی کے تحت کہی گئی ہے۔“

ان صوفیاء کی بدولت ملتان کے شعر و ادب میں تصوف کی ایک ایسی مستقل، دیرپا اور مستحکم روایت قائم ہوئی کہ جس کے اثرات آج تک محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی لحاظ سے زیادہ تر ان صوفیاء کی توجہ شاعری جیسے فن لطیف کی طرف رہی۔ نثر میں سوائے ملفوظات کے یا تصوف کے فلسفیانہ مسائل پر تنصیبات کے کوئی ادبی رنگ کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن شعر کی ایک مضبوط روایت البتہ ضرور ملتی ہے۔ دراصل شاعری جذبات کی زبان ہے اس لئے صوفیانہ کیفیات اور عاشقانہ واردات کے اظہار کے لئے شاعری زبان ہی بہترین وسیلہ تھی اور یہی اسلوب صوفیاء نے اختیار کیا۔ یوں بھی تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ”برائے شعر گفتن خوب است“ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تصوف ہماری فکری اور شعری روایت کا حصہ رہا ہے۔ حضرت رابعہ بصری، ابن عربی، اور آئیری وغیرہ نے عربی میں صوفیانہ شاعری کی۔ فارسی میں ابوسعید الہولنجی، فرید الدین عطار، سنائی..... مولانا روم، محمود شبستری سعدی، عراقی، بیدل اور حافظ جیسے شعرا نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اردو میں میر، درد، غالب، ذوق اور اقبال نے صوفیانہ مضامین ادا کئے اور علاقائی زبانوں میں تو صوفیانہ شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ پشتو میں رحمان بابا، خوشحال خان خٹک سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، پنجابی میں شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ اور سلطان باہو اور سرائیکی میں، بابا فرید، حافظ جمال، سچل سرمست، علی منق، خواجہ فرید، غلام حسن شہید، علی حیدر وغیرہ کے نام صوفیانہ شاعری میں اہم ہیں۔ بابا فرید گنج شکر، امیر خسرو، حسن بصری، خواجہ فرید اور غلام حسن شہید وغیرہ کے شعری تجربے

۱۔ پیام فرید از ڈاکٹر مہر عبدالحق ص ۴ (غیر مطبوعہ)

اور مرتے کا ذکر۔ ان کے احوال میں کیا جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند اہم شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے یہاں صوفیانہ مضامین ملتے ہیں اور صوفیانہ روایت سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

الشیخ علی متقی

ان شعراء میں سب سے قدیم شیخ علی متقی ہیں۔ ۸۸۵ھ میں برہان پوری پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن کے مرید تھے۔ انہیں سے سلسلہ چشتیہ میں فرقہ خلافت حاصل کیا۔ ملتان میں شیخ حسام الدین متقی ملتانی کی صحبت سے فیض اٹھایا اور دو سال کے عرصے میں تفسیر بیضاری اور کتاب عین العلم ان سے پڑھی۔ خلیق احمد نظامی کے بقول آپ کے علم و فضل کا سکہ عرب و عجم میں ہر جگہ تسلیم کیا گیا تھا۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق شیخ علی متقی شاعر بھی تھے انہوں نے ان کا یہ شعر درج کیا ہے۔

سن ہیلی پریم کی باتا

یوں مل رہی جیون دودھ بنانا ۳

یہ شعر اخبار الاخبار میں یوں درج ہے اور وحدت اور دوئی کے مسئلے کے سلسلے میں ہے۔

سن ہیلی پریم کے باتا

یوں مل رہی جیون دودھ بنانا ۴

انہوں نے جمادی الاول ۹۷۵ھ میں وفات پائی۔ مسعود حسن شہاب کے مطابق چونکہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ اس لئے وہیں انتقال فرمایا۔

۱۔ بحوالہ اخبار الاخبار فی اسرار الابرار، از عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۷، مطبوعہ در مطبع

مجتبائی دہلی، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ۔ (۱۹۱۴ء)

۲۔ "مشائخ چشت"، ص ۲۱۲

۳۔ "نقوش سلیمانی"، از سلیمان ندوی، ص ۵۵

۴۔ "اخبار الاخبار"، ص ۱۶۵

۵۔ ایضاً ص ۱۶۶

۶۔ "خطہ پاک ایرج"، ص ۳۰۰

۲) علی حیدر ملتانی

۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں ملتان کے ایک مضائقاتی قصبہ چوئترہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ محمد امین تھا۔ خواجہ فخر الدین دھلوی سے بیعت تھے۔ ان کا کلام "ابیات علی حیدر" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ علی حیدر ملتانی نے بھی دیگر صوفی شعرا کی طرح عشق مجازی کے حوالے سے عشق حقیقی کی بات کی ہے اور مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار بیان کئے ہیں۔ مغلوں کے دور زوال میں آپ نے معرفت کے گیت گائے۔ آپ کا سرائیکی کلام سی حرفیوں پر مشتمل ہے، جن کا موضوع فلسفہ و تصوف ہے ان کے علاوہ ان کے سرمایہ شعر میں ہیر، بارہ ماہ اور اردو آمیز اشعار بھی شامل ہیں۔ کلیات علی حیدر کے نام سے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ ان کا سن وفات ۱۱۹۱ھ ہے نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے

الف ادہ جلوہ بیرنگ کسی دلیں ایہ رنگ طرح معنوی نہیں
ایہ کاکل حرف نہیں نے سب کلام خدا مخلوق نہیں
ادہ برق فلک تے لشکر چمکے آتش و چرخ بندوق نہیں
پر ایہ بھی برق انداز اکھیں دے توڑے ایہ مبرق نہیں
ع عنایت ربے دی ہووے تے اینویں فضل کریندا چا
تحت ہزارے توں رانجہن لد کے ہیر سیال بلیندا چا
عشق اسادے دے چھیرن کارن مجھیں کمال چھڑیندا چا
واہ واکم اللہ دے حیدر آپے جوڑ جوڑھندا چا
ہوش نہ چھٹھی عشق تیرے اتے اس وچ بہت دیگر مایاں نی
جہاں عشق دی چوڑی رنگ لئی انہاں چٹیاں چادران چریاں نی وا

۱۔ ان کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، ۱) پنجابی شاعراں دے تذکرہ از مولا بخش کشتہ، ص ۹۱-۹۲
مطبوعہ خرم میاں مولا بخش اینڈ سنز، سی ٹیپل روڈ لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۶۰ء، (۲) ملتان میں اردو
شاعری، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۳۶، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور بار اول ۱۹۸۳ء
(۳) سرائیکی شاعری، از کیفی جام پوری، ص ۲۴۳ تا ۲۴۵

۳، صابر ملتانی

ان کا نام محمد حیر الدین تھا۔ ۱۸۳۵ء میں ملتان ہی میں پیدا ہوئے۔
 طویل عمر پائی۔ زندگی کے آخری دنوں میں بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے مزار کے مجاور بن گئے۔
 طباعت کا کام بھی کرتے رہے اور سرائیکی مرثیوں پر مشتمل کتابیں شائع کیں۔ مولانا کو شاعری کا
 شوق شروع سے تھا۔ آپ کا کلام پیام یا نغمہ بہار، کھنڈ، گلزارِ خلد، فنوج، گل دستہ نازیمینی
 وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں حضرت داغ دہلوی سے بذریعہ خط و کتابت سلسلہ
 نمد حاصل کیا۔ ان کا مجموعہ کلام یادگار صابر کے نام سے ان کے فرزند محمد منیر الدین منیر نے نو بہار
 پریس ملتان سے نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کرایا جو مجھے علامہ عتیق فکری کی لائبریری سے ملا ہے
 ”یادگار صابر“۔۔۔ صابر ملتان کے قصائد، قطعات تاریخیہ، ملتانی کافوں، ملتانی اور اردو
 مرثیوں اور اردو فارسی غزلیات پر مشتمل ہے۔ اردو غزل میں ان کا رنگ پختہ، استادانہ اور
 کلاسیکل شعرا کا سا ہے۔ داغ کے اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔ مجازی اور حقیقی دونوں قسم
 کے اشعار موجود ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

جس طرح تیرے حسن کا شہرہ جہاں میں ہے

چرچا ہمارے عشق کا اب چار سو ہوا

ساتی ہو، مے ہو، ابر ہو، فصل بہار بھی

سب بیچ ہیں بغل گیس نہ گر ماہرو ہوا

(یادگار صابر، ص ۱۰۲)

تیرا سودا ہی نہیں جس میں وہ سر کس کا ہے

درد تیرا کہ نہیں جس میں جگر کس کا ہے

ناگہاں آتے جو گھر میرے تو گھبرا کے کہا

کھینچ کر لایا ادھر مجھ کو اثر کس کا ہے

(ص ۱۰۸)

ص ۱۰۲۔ (۱) بحوالہ یادگار صابر مرتبہ محمد منیر الدین منیر، مطبوعہ نو بہار پریس ملتان، اشاعت اول،

نومبر ۱۹۳۵ء (۲) دیوان عبید اللہ ملتانی (قلمی)، ص ۱۰۸

نظر فلک پہ کر دیا زمیں پر دیکھو
خدا کی ذات کا جلوہ ہے بس جدھر دیکھو
کہا جو میں نے کہ مرنا ہوں اب جدائی میں
وہ بولے مرنے سے ملتے ہیں ہم تو مرد دیکھو

(ص ۱۰۸)

ہم وصف تیری کر سکیں کیا جبکہ یا نبی
وصاف تیرا خالق لیل و نہار ہو
غفار بخشا ہے گنہ اس کے جو کوئی
امیدوار رحمت پروردگار ہو

(ص ۱۱۰)

ہے انتظار مجھ کو کب جائیں سوئے تیرے
بے چین کر رہی ہے اب آرزوئے تیرے
زاہد تجھے مبارک شرب شراب جنت
دل اپنا ہو رہا ہے مست سہوئے تیرے

ذات حق کی ہے ہویدا جا بجا
برزین ہے جلوہ گر ہم برسما

ہے ظہور نور دلیر ہر جگہ
کعبہ و بیت خانہ میں جلوہ کیا

(ص ۱۳۵)

۴، مولوی لطف علی | ملتان کے مضافاتی قصبے بہادر پور میں پیدا ہوئے۔ مولوی نذر محمد
سے تعلیم حاصل کی۔ اور علی حیدر ملتان سے بھی فیض حاصل کیا۔ امیر بہاول پور کے دربار سے

۱۔ ”سرائیکی شاعری“ ص ۲۴۹ - ۲۵۰۔ ”پنجابی شاعراں دا تذکرہ“ ص ۱۳۹

بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے قنوی سیفل نامہ لکھی۔ ان کے دو ہڑے بھی مشہور ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع عشق و محبت ہے۔ صوفی شعرا کا لہجہ مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کھولے ہیں۔

نہیں سیاہ ستر بجن تھے صحن ذوقوں مست مدام ڈوہیں
داراتے سلطان سکندر دروے خاص غلام ڈوہیں
نجل تھے اس سچل ڈھٹیں گل زرگس تے بادام ڈوہیں
یارب لطف علی کوں میل شتابی حسن حسین امام ڈوہیں

۵) طالب ملتانی | خدابخش طالب ملتانی ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۴ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ملتان ہی میں حاصل کی۔ شعر و شاعری میں اصلاح شوق نیوی عظیم آبادی سے بذریعہ ڈاک حاصل کی جس پر ان کو ناز بھی تھا۔

میری نازک خیالی کی نہ ہو کیوں دھوم عالم میں
میں ہوں شاگرد طالب حضرت شوق سخنداں کا
ان کے کلام کا مجموعہ کلیات طالب ملتانی کے نام سے ۱۸۸۹ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔
ہمیں کچھ خوف قیامت کا نہیں اے طالب
شافع عرصہ محشر ہے ہمیں ہر اپنا
لٹاتا ہوں میں گنج شامگاں توحید یزداں کا
مرا سینہ ہے گنجینہ در تصدیق ایتقانے کا

مجنوں کی طرح عمر نہ برباد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے
عشق میں کاوش جگر نہ گتی
یہ خلش اپنی عمر بھر نہ گتی

۶۱، مولوی عبید اللہ ملتانی

مدان میں چشتیہ سلسلے کے صوفیاء میں سے ایک اہم نام مولوی عبید اللہ ملتانی کا ہے۔ آپ مولوی خدابخش مامیوالی کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی زہد و تقویٰ، سادگی اور پرہیزگاری کے ساتھ لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے گزاری۔ تدریس علم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کی کتابوں کی تعداد تقریباً سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں کچھ مطبوعہ ہیں اور اکثر غیر مطبوعہ ان کتابوں میں تحفہ زنان، غیب النفس، سرمد فی المعرفت، رفیقہ بشرح توفیقہ، البولویا والنذر، رسالہ ملا تیرہ، رسالہ نجوم، وصیت نامہ، چراغ عبیدیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ علم میراث میں ایک رسالہ علم میراث کے نام سے لکھا جو کہ درس نظامی میں سداول رکھتا ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "سر دلبران بہت مشہور ہے جو خواجہ خدابخش کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ آپ ذوق لطیف کے حامل تھے۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے لطائف کہنے کا طریقہ دریافت کیا تو فرمایا میں لطف کا طالب ہوں نہ کہ لطائف کا۔ آپ کی وفات ۱۳۰۵ھ میں ہوئی۔ آپ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ آپ کا ایک قلمی دیوان مجھے جناب اسد نظامی سے دستیاب ہوا ہے۔ اس میں ردیف وارفارسی غزلوں کے علاوہ منفرقات میں رباعیات، مثنویات اور ترجیح بند بھی شامل ہیں۔ اردو، فارسی مخلوط غزل کو ہندی غزل کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

اٹھا ہے شوق ملنے کا میرا دلدار کب آوے

حجاب و شہر جل جاوے عیاں وہ یا کب آوے

کمان و تیر کی حاجت نہیں رکھتا نگار حسن

نگاہوں سے کرے بسمل وہی جبار کب آوے

۱- حوالے کے لئے ملاحظہ فرمائیے "ادبیاتے ملتان" از فرحت ملتانی، ص ۱۵۲

۲- اصل عبارت یوں ہے "شخصی زاہد خدمت مولوی عبید اللہ ملتانی رفت و گفتمہ طریقہ لطائف،

ارشاد فرماید مولوی صاحب گفت من طالب لطیف ام نہ طالب لطائف" امراة العاشقین ملفوظات

شیخ شمس الحق سیالوی، ص ۲۲۳، مطبوعہ مصطفائی، لاہور ۱۸۸۵ء/۱۳۰۲ھ

اسی کے کام سب کہنے قصے ہیں انکے من موہے
ارادے ان کے سب ہونے وہی سزا کب آوے

صنم بیدل صنم بیجاں صنم درخون دل غلطاں
صنم درد درد بے درماں شفا بیمار کب آوے

عبیدم من کہ سرگشتہ ہے گردم بکوئے او
بہردم منتظر اس کا شدہ اسرار کب آوے

۷۱) تاج الدین ملتانی

میاں اللہ ڈتہ تاج الدین ملتانی ۱۸۴۴ء میں ملتان میں پیدا ہوئے
لیکن ان کی عمر کا زیادہ حصہ امرتسر میں گزرا۔ پنجابی کے معروف شاعر سید فضل شاہ لاہوری
کے شاگرد تھے۔ سرایتیکی اور پنجابی میں شاعری کرتے تھے لیکن ان کی شاعری اردو کے بہت
قریب ہے۔ ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ش شمع جس دم نمودار ہو گئی تے پردانے نون کسے دی آئی آگئی
کبک ہو کھیا چن دی چاننی دل کیتی چاہ نے جھٹ جدائی آگئی
جس معشوق دی عاشق تلاش رکھے آہدی تضا جانوں بلانی آگئی
تو بہ تاج نے کسے و۔ دیکھیں بن قصور کیوں جگ دی بریلانی آگئی

۸۱) فقیر محمد عارف

فقیر محمد عارف کے والد کا نام قاضی عثمان تھا۔ وہ بہادر پور ڈوژن
کی تحصیل حاصل پور کی ایک چھوٹی سی بستی بونگا محمد رمضان کے رہنے والے تھے جو لال نہارا
کے قریب واقع ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ اور نہ تفصیلی
حالات معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا تاہم ان کے خودنوشت
منظوم سفر نامے (سرایتیکی اور اردو) جناب حبیب فائق کی لائبریری میں قلمی نسخوں کی صورت

۱۔ دیوان عبید اللہ ملتانی (قلمی) ص ۲۴ (کل صفحات ۳۲)

۲۔ پنجابی شاعرانہ تذکرہ ص ۲۶۶

میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فقیر محمد عارف حضرت سلیمان تونسوی کے مرید تھے۔ انہوں نے ۲۰ ماہ شوال ۱۲۹۸ھ میں سفر کا آغاز کیا تھا۔ اور ۱۳ ماہ ذالحجہ ۱۳۰۱ھ میں واپس آئے اور دو سفر نامے لکھے۔ یہ دونوں سفر نامے میری نظر سے گزرے ہیں۔ پہلی سفر نامے کا عنوان "کوہ غم ہے جس کا آغاز حمد، نعت، مناجات اور بیخ بن پاک کی تعریف سے ہوتا ہے اور سفر کا حال لکھا ہے۔ اس قلمی کتاب کے ۷۳، اوراق اور ۱۳۶ صفحات ہیں۔ دوسرا نسخہ اردو زبان میں ہے اس کا نام گلزار عرب در بیان مکہ معظمہ و مدینہ منورہ ہے۔ اس کا آغاز بھی حمد سے کیا گیا ہے۔ پھر سفر کا حال منظوم ہے۔ اس کے ۲۲، اوراق اور ۶۴ صفحات ہیں۔ اشعار کی تعداد ۶۹۸ ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

سوتے مکہ ہوتے راہی بصد شوق	عبیاں دل میں ہوا آخر ایہو شوق
لکھوں بیت اللہ کا احوال سارا	سفر نامہ اندر کر آشکارا
بمبئی سے تا مدینہ تک لکھوں حال	بگر کے خون سے ایسے نیک افعال
بہ گلزار عرب کر اس کو موسوم	کروں جملہ سفر کا حال مرقوم ط

کلینا تھا اس جہاز کا نام	ہوا مکے روانہ بعد از شام
بحر اندر چلا آخر بند چھوڑ	نہایت زور سے کرتا ہوا شور
ہمیشہ ادب سے چڑھ موج آوے	بحر کو دیکھ کر دل تھر تھر آوے
ہوا دریا مخالف تھا سراسر	گزارے روز چھپی اس میں صبر کر
آخر جب ساتواں روز آیا	جبل اس دن عدن کا نظر پایا ص ۲

آئی رستے اندر رحمت الہی	بدل برسا بہت کن من پانی
گیا سب بھیگ جامہ بدن کا	رہا ہر گز نہ کسی کو ہوش نین کا

ص ۱۲۰ "گلزار عرب"، اردو منظوم سفر نامہ از فقیر محمد عارف، (قلمی نسخہ)، ص ۲

ص ۱۲۰۔ ایضاً ص ۳

ہوا چاروں طرف سے سرد آئی زبارش خلق جسدہ تھر تھرائی ط

۹۱، شاہ بخش عاصی ملتانی

مولانا محمد شاہ بخش ملتانی المتخلص عاصی، مولوی محمد موسیٰ پاک کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کا شجرہ نسب عراقی سے جا ملتا ہے۔ آپ ۱۹۰۰ء میں اندرون حسین آگاہی محلہ کنگراں میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اپنے دادا خواجہ نظام بخش اور اپنے والد خواجہ محمد حسین بخش سے حاصل کی۔ حصول علم کے بعد آپ نے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے لئے سخت ریاضت کی۔ اور چلہ کشی بھی کی۔ آپ بغداد بھی تشریف لے گئے اور وہاں حضرت عبدالقادر جیلانی کی درگاہ میں معتکف رہے۔ والد کی زندگی میں ہی والد سے سجادہ نشینی کا منصب پایا۔ اپنے والد کے ماتھے مل کر درس و تدریس بھی کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔ ان کی تلمیذی بیاض ہمیں دستیاب ہوئی ہے جس میں زیادہ تر کلام فارسی میں ہے۔ اس میں مناجات، نعتیں اور غزلیات شامل ہیں۔ ایک فارسی نظم اپنے بزرگ حضرت موسیٰ پاک کی شان میں کہی ہے۔ ایک نظم اپنے ایک بزرگ شاہ حسین بخش کی تعریف میں ہے۔ کچھ سرائیکی کلام ہے اور چند غزلیات اردو زبان میں ہیں، اردو کا نمونہ کلام یہ ہے۔

خدا نگہبان ہو ہمارا یہ جان میری ہو جب لبوں پر
رُخِ نبی ہو میرا سہارا یہ جان میری ہو جب لبوں پر
ہو موت آساں نہ ہو پریشاں میں جاؤں شاداں خدا نگہبان
دعا ہو ذکر جہر تمہارا یہ جان میری ہو جب لبوں پر
سبھی پہ تلخی نزع ہو آساں صلوات جاری ہو ذکر باری
یہی دعا دو مجھے خدا را یہ جان میری ہو جب لبوں پر

ص: — ایضاً — ص: ۳۱

ص: ۱۲۔ مضمون بعنوان حضرت عراقی کی اولاد، از علامہ طالوت، مطبوعہ رسالہ تنویر، ملتان (سالنامہ)

اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، ص: ۵۷

ص: ۳۔ شاہ بخش کے حالات ان کے پوتے جناب پروفیسر عبدالباقی سے حاصل ہوئے۔

گزر رہی، آگ یونہی فراق و الم عاشق زار جل جل کے مرجلے گا
 دے شراب وصال اور لطف و کرم عاشق زار جل جل کے مرجلے گا
 ہند ہے بند و زندان بیت الحزن کاش ہو جائے میرا، مہینہ وطن
 رات دن کی ہیں بتیا بیاں سوز و غم عاشق زار جل جل کے مرجلے گا
 میرا موبدن خار خلیجان ہے گزنگاہ کرم ہو گلستان ہے۔
 دل کباب اور ہے بزم سارا زخم عاشق زار جل جل کے مرجلے گا
 آہ وزاری میری بے قراری میری اٹک باری میری انتظار میری
 آپ کو ہی ہے معلوم شاہ ام عاشق زار جل جل کے مرجلے گا
 اس کے بعد بھی متنصوفا نہ مضامین اس سرزمین کے شعراء کے کلام کا حصہ رہے۔ اور
 دور جدید تک یہ روایت شاعری کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

روحانی اور اخلاقی شاعری کے سلسلے میں مرثیے کی صنف کو ایک خاص اہمیت حاصل
 رہی ہے۔ ملتان میں مرثیے کی ایک عظیم الشان روایت زمانہ قدیم سے نظر آتی ہے یہاں
 تک کہ ملتان کو پنجاب کا لکھنؤ سمجھا جاتا تھا۔ برصغیر میں سب سے پہلا مرثیہ سرانیکلی زبان میں
 کہا گیا ۱۶ سائویں صدی ہجری میں سرانیکلی میں مرثیے لکھنے والوں میں بابا فرید گنج شکر بھی شامل
 ہیں۔ تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے ایران اور عراق کے جو لوگ نقل مکانی کر کے ملتان اور اس
 پاس کے علاقوں میں پہنچے وہ اکثر شیعہ تھے۔ ان کی بدولت ملتان میں عزا داری اور مرثیہ خوانی
 کا رواج عام ہوا۔ عین الحق فرید کوٹی کی تحقیق کے مطابق

”ملتان کا علاقہ جہ کہ اس خطے میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے محمود غزنوی کی
 فتوحات (۱۰۱۰ء تا ۱۰۳۰ء) سے پہلے سے ہی محبان اہل بیت کا مرکز رہا
 ہے۔ کہ بلا کے سانحہ (۶۱۱ھ/۶۸۰ء) کے بعد علویوں کی ایک بڑی تعداد پناہ کی

۱۔ قلمی ”بیاض شاہ بخش“ (عبدالباقی صاحب سے حاصل ہوئی)
 ۲۔ ”سرایکی شاعری میں مقام حسین“ از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مطبوعہ ماہ نو، چودہ سو جشن ولادت
 حضرت امام حسینؑ، جون ۱۹۸۲ء، ص ۸۳

غرض سے دور دراز علاقوں کی طرف ہجرت کر گئی۔ . . . اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب چوتھی صدی ہجری کے اوائل (اندازاً ۳۲۰ھ) میں ابوالحسن مسعودی (وفات ۳۲۶ھ / ۹۰۷ء) متان پہنچا تو یہاں قریشی خاندان کے ایک فرد کی حکومت قائم تھی کہ جو سامہ بن لوئی بن غالب کی اولاد سے تھا۔ . . . جب ۱۰۰۵ء میں محمود غزنوی نے متان پر حملہ کیا تو اس وقت بھی یہاں ایک مسلمان سردار ابوالفتح داؤد کی حکومت قائم تھی۔ اسی طرح متان میں منقبتی، اہل بیت، کی رزادیت، لوئی ایک ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی قرار دی جا سکتی ہے۔

متان کے میاں مسکین اور ان کے دو بھائی میاں حنزیں اور میاں غمگین اٹھارویں صدی کے شروع میں نقل مکانی کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ یہ تینوں بھائی مرثیہ نگار تھے اور اس وقت مرثیہ کہتے تھے۔ جب شمالی ہند میں مرثیے کی کوئی مضبوط یا قابلِ قدر روایت موجود نہیں تھی۔ چونکہ صوفیہ کا مسک صلح کل تھا اس لیے شیعہ سنی میں تفریق نہیں تھی اور دونوں مسک والے مرثیہ کہتے تھے۔ گیارہویں صدی ہجری میں بہت سے جنگ نامے تصنیف کئے گئے مگر موضوع واقعہ کر بلا تھا، مثلاً جنگ نامہ حسین، جنگ نامہ کر بلا جنگ نامہ علی اکبر وغیرہ۔ سید علی حیدر متانی، مولوی عبدالحکیم اوچی اور لطف علی نے سیحری اور دوہڑوں کی شکل میں واقعہ کر بلا کو منظوم کیا۔ تیرہویں صدی ہجری میں مولوی فیروز، غلام حسن شہید، سکندر خان غلام، فیض شہیدی اور صابر متانی نے مرثیے کی صنف پر طبع آزمائی کی۔ امام حسن شہید کے دو اردو مرثیوں کا ذکر ان کے احوال میں کیا جا چکا ہے۔ صابر متانی کے دیوان میں بہت سے فارسی، سرائیکی اور اردو مرثیے موجود ہیں۔ بعد کے شعرا میں مولوی غلام حیدر، خدا، عاشق گل محمد مضطر، آصف، خادم، مولوی صدیق، جلال خان، صادق، مولوی فیروز، کمال خان

۱۔ ذکر حسین پنجابی میں، مطبوعہ ماہ نو، چودہ سو سالہ جشن ولادت حسین، جون ۱۹۸۲ء، ص ۷۸
 ۲۔ "سرائیکی مرثیہ گوئی کے چار سو سال" از خلیش پیر اصحابی، ص ۶، مطبوعہ خلیش منزل پیر اصحاب
 بھکر، مارچ ۱۹۸۰ء - ۳۔ ملاحظہ فرمائیے "یادگار صابر"، ص ۱۵۸ تا ۲۰۸

شوقی، تسکین، نذر حسین، نثار شائق، بہار ملتان، فوق اور غلام حسین منیر کے نام قابل ذکر ہیں۔^۱

۱، صوفیانہ مسلک اور ملتان مزاج

”کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی تمام تخلیقی سرگرمیوں کا مجموعہ اس کی ثقافت ہوتی ہے۔^۲ چونکہ ملتان کی ابتدائی تخلیقی سرگرمیوں کا محور صوفیائے کرام رہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان صوفیائے کرام کی تبلیغی اور تخلیقی سرگرمیوں نے ملتان میں ایک ایسی ثقافت کو جنم دیا جس کو صوفیانہ ثقافت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ صوفیانہ ثقافت صدیوں کے ارتقار کا نتیجہ تھی۔ جس نے ملتان کے تمام تر تہذیبی و ثقافتی مظاہر اور لوگوں کے مزاج پر دیرپا اور مستقل

- ۱۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے سر ایچی شاعری، از کیفی حامپوری
- مرثیوں کے کچھ مجموعے حسب ذیل ہیں (جناب علامہ عتیق فکری کی لائبریری سے دستیاب ہوئے۔)
- ۱، احوال الذاکرین (حصہ اول) مولوی محمد صدیق، مطبع مجتہائی لاہور بار اول حافظ شمس الدین دمنور الدین تاجران کتب ملتان، بوہڑ دروازہ
- ۲، مطلوب الذاکرین (حصہ دوم) ایضاً
- ۳، ناصر الذاکرین ایضاً
- ۴، شمع المجالس مجموعہ مرثیہ محمد جلالی خان، مولوی خیر الدین صابر و محمد فخر الدین تاجران کتب ملتان ۱۳۲۱ھ
- ۵، مرثیہ کمال خان... مطبع الہی اگرہ ایضاً ۱۳۱۸ھ
- ۶، مجموعہ مرثیہ از شائق، گلشن اور فدا ایضاً
- ۷، تحفۃ الذاکرین مصنفہ تسکین، مطبوعہ کتب خانہ حیدری لاہور۔
- ۸، بہار ذوق، مہتاب نورانی، دربار نورانی از عاشق ملتان، مطبوعہ کتب خانہ حیدری لاہور۔
- ۹، اسرار محشر از نذر حسین، مطبوعہ کتب خانہ قریشیہ صادقہ ملتان
- ۱۰، روضۃ الابرار از صادق حسین نثار، مطبوعہ نوبہار ایکٹرک پریس۔
- ۱۱، واقعات غم از شائق فدا، شرف ملتان و گلشن، مطبوعہ نوبہار سٹیم پریس ملتان
- ۲۔ بحوالہ ثقافتی شخص، از شیخ آقا دیوب، ص ۵، مطبوعہ (یونیورسٹی) نومبر ۱۹۸۲ء، جلد ششم

اثرات مرتب کئے۔ ننگان کی تہذیبی ثقافتی اور علمی و ادبی زندگی پر صوفیائے کرام کے اثرات کا تفصیلی جائزہ گذشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔ اخلاقی سطح پر ان اثرات کا نتیجہ متاثرینوں کے مخصوص مزاج کی صورت میں نکلا۔ صوفیاء کے فیض اثر سے اہل ننگان ہمیشہ سادگی، شرافت، مروت، انکساری اور خلوص کے مختلف جذبوں سے سرشار اور ہمکنار رہے۔ وہ ہر دور میں تصوف اور مذہبی علوم کے دلدادہ اور ادب و فن کی طرف مائل رہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں کہ

..... منصورہ کے بعد ننگان دوسرا مرکز تھا جہاں اسلامی علم و فنون اور مسلم تہذیب و ثقافت کی بہاریں صدیوں تک قائم رہیں اور یہاں کے رجال نے بڑے بڑے کام کیے..... یہ حضرات قرآن و حدیث اور اسلامی علوم کی تعلیم و ترویج میں آگے آگے رہے۔^۱

متاثرینوں کا عام لباس نہایت سادہ یعنی تہبند اور چادر تھا ان کی عادات و خصائل نہایت پسندیدہ تھیں۔ وہ مسافروں اور پردیسوں کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے؟ عربوں کی آمد، میل جول اور بوردو باش کے بعد متاثرینوں کے مزاج میں مہمان نوازی اور فیاضی کے جذبات اور زیادہ گہرے ہوئے اور پھر صوفیاء کی تعلیم نے ان کو مزید چمکایا۔ چنانچہ بشاری مقدسی لکھتا ہے

ترجمہ "ننگان کے لوگ، مسافروں سے محبت رکھتے ہیں، جو اکثر و بیشتر اہل عرب ہوتے ہیں۔" آگے چل کر لکھتا ہے -

"لوگ خوش حال، صاحب مروت اور عالی ظرف ہیں۔"^۲

ان میں رواداری، اور برداشت کا مادہ بھی یقیناً صوفیاء کی انسان دوستی، بے ریائی اور

۱۔ "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" از قاضی اطہر مبارک پوری، ص ۲۴۸، مطبوعہ مکتبہ عارفین

کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء

۲۔ ص ۳۳۔ "احسن التقاسیم" اردو ترجمہ از مولانا مسعود علی ندوی، بعنوان "ہندوستان عربوں کی نظر

میں، ص ۳۸۹، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۶۰ء

وسیع المشرقی کے خصائص کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ محرم کے دنوں میں متان کے شیعہ سنی مل جل کر محرم مناتے تھے۔

اور اب بھی مناتے ہیں۔ سید اولاد علی گیلانی متانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں ”یہ بات باعث شکر ہے کہ مذہبی اختلافات کی وجہ سے دونوں فرقوں (شیعہ سنی) میں کسی قسم کی مخالفت یا منافرت نہیں ہے۔ محرم کے موقع پر تعزیرہ داری میں سنی مسلمان بھی کثرت سے شریک ہوتے ہیں“

متان کے زمیندار تو بالخصوص اپنی سادگی، مہمان نوازی اور کشادہ دل کی وجہ سے بہت مشہور ہیں حقیقت یہ ہے کہ دیہاتیوں اور زمینداروں پر صوفیائے کرام کی تعلیم، تبلیغ کے اثرات زیادہ ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ اولاد علی گیلانی لکھتے ہیں

”متانی زمیندار بہت سی خوبیوں کا مالک ہے..... مرخان مرخ، سادہ طبیعت انتہائی مہمان نواز، گفتگو میں صاف اور مذہبی معاملات میں کشادہ دل بلا تعصب عرضیکہ ہر لحاظ سے متانی زمیندار سنی نوع انسان کی مقبول خاصیتوں کا بہترین نمونہ ہے“

(۸) موجودہ دور میں تصوف کی صورت حال | تصوف پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ اس نے خانقاہی زندگی کو رواج دیا۔ اور بے عملی کو عام کیا۔ اس نے بدعتیں پیدا کیں۔ کسی نے تصوف کو دیدانت اور اپنشد سے ماخوذ قرار دیا اور کسی کے مسخیت نوافلاطونیت کو سرچشمہ بتایا۔ کسی نے لے سے ایران پر عربوں کے تسلط کا رد عمل قرار دیا تو کسی نے غیر ملکی اور مشرکانہ نظریات کا حامل بتایا۔ ہمیں تصوف کے ماخذ و منابع سے سرور کار نہیں۔ وہ کوئی بھی ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس مکتب فکر نے لوگوں کے دلوں سے بغض، عناد، کینہ دور کیا۔ باہمی اخوت، ہمدردی اور پیار محبت کی فضا کو قائم کیا۔ دنیا کے

۱۔ ”مرقع مولتان“ ص ۱۹۳

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”لمعات خواجہ“ ص ۲۹ تا ۵۴

لپٹ کے خلاف جنگ کر کے باہمی رقابتوں سے مکدر فضاؤں کو پاک کیا۔ محنت اور دیانتداری کا درس دیا اور مل جل کر رہنے کی تعلیم کو عملی جامہ پہنایا۔ جن لوگوں نے تصوف کے خلاف علمی بحث کی حد تک بات کی ہے ان میں غیر مسلم مفکرین اور مورخین میں پروفیسر نکلس، دان، کریمر، نوڈیکی، جرمن مفکر گولڈ، تہبیر اور پروفیسر براؤن کے علاوہ قاضی عبدالحمید، خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر محمد حبیب ڈاکٹر غنی قاسم زاوہ جیسے مسلمان علماء بھی شامل ہیں۔ تاہم تصوف کی عملی افادیت اور اس کے مثبت اثرات مرتب کرنے کی قوت سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔

ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ اسلام میں تصوف کی ابتدا دراصل ان عوامل اور محرکات کی بدولت ہوئی جو اموی اور عباسی دور کی سیاسی کشمکش انتہائی جذبے، انسانی خون کی ارزانی، خلق قرآن کے عقیدے، دین دار اور سچے علماء و مشائخ کی تباہ حالی، زرو مال کے حصول کے لئے ناجائز استحصالی حربوں، صبر و قناعت کے فقدان، ہوس اقتدار، ظلم و ستم اور مذہبی موٹگافیوں جیسے مسائل نے پیدا کئے۔ انتشار، بدنظمی، بے چینی اور آشوب کے اس دور میں مسک تصوف کی مقبولیت ایک قدرتی امر تھی کیونکہ اس مسک میں انسان دوستی، فلاح، امن، محبت اور احترام کے جذبات عام کئے جلتے ہیں۔ "لمعات خواجہ" میں ہے کہ

"ایسے پر آشوب دور میں ان نیک بندوں نے دینی دنیاوی فلاح اس میں سمجھی کہ اس مسک کے نظریات کو اور وسعت دیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے عامتہ الناس کو اس سیاسی تصادم سے بچا کر ایسے گوشہ میں لے آئیں جہاں ہوس ملک گیری کے بجائے تہذیب نفس موجود تھی، جہاں تفک دم کے عوض حیات انسانی کا احترام تھا، یہاں شاطرانہ چالوں کے بدلے فضائل اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ زرو مال کے حصول کیسے نئے حربوں کے استعمال کے بجائے توکل صبر و قناعت کا سبق دیا جاتا تھا۔ یہ مسک تصوف کے نام سے موسوم ہوا اس طرح ہو یہ محفوظ و مامون گوشہ خانقاہ یا صومعہ کے نام سے مشہور ہوئے اور دینداری خدا ترسی، صبر و رضا، توکل و قناعت کا جو عہد لیا جاتا وہ بیعت کہلاتا یہ بیعت

کوئی نئی چیز نہ تھی خلافت راشدہ کے بعد، خلافت اموی اور عباسی میں جو خلیفہ تخت نشین ہوتا وہ عمائدین سلطنت سے اپنی اطاعت، جان نثاری اور وفاداری کا عہد لیتے اس کو بھی بیعت کیا جاتا بس فرقہ ویزوں میں یہ تھا کہ ایک بیعت ہوتی دنیا کے لئے اور ایک بیعت ہوتی دین کے لئے^۱۔

صوفیائے کرام کے استغناء، قناعت اور درویشی مسلک کے خلاف علمائے ظاہر ہمیشہ صاف آرا دیتے رہے۔ کیونکہ انہیں اپنے دنیوی اقتدار کا حصول اسی مسلک کی موجودگی میں ناممکن دکھائی دیا۔ اس لئے انہوں نے تصوف پر نہ صرف کڑی تنقید کی بلکہ اس پر الزامات بھی عائد کرنے شروع کئے تاکہ لوگوں کو اس سے دور کر کے مذہب کے معاملے پر اپنا دست نگر بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بڑے بڑے اماموں اور بزرگان دین کو اجن میں امام ابوحنیفہ اور امام حنبل کی مثالیں نمایاں ہیں۔) خدا پرستی اور حق گوئی پر سزائیں دی جا رہی تھیں تو درباروں سے وابستہ علمائے سوان کے خلاف فتوے دے رہے تھے۔ لیکن ان نامساعد حالات اور مخالفانہ

۱۔ "لمعات خواجہ" ص ۶۰-۶۱

۲۔ خواجہ فرید نے علمائے ظواہر کے بارے میں کیا خوب کہا ہے

ملا مارن سخت ستادن گچھڑے رازد ابھیت نہ پادن

بے دس شودے صھن معذور

مولٹے دے دغظ نہ بھلٹے بے شک ساڈا دین ایمانے

ابن العربی دس دستور

عاشق مست مدام ملامی کہ سبحانی بٹن بسطامی

آکھ انا الحق تھی منصور

ترجمہ۔ ملا (علمائے ظاہرین)، مارتے اور ستاتے ہیں یہ پوشیدہ اسرار و رموز کی تہہ میں نہیں پہنچ سکتے کیونکہ بیچارے بے بس اور معذور۔ ہمیں ان ملاؤں کے دغظ نہیں بھاتے۔ ہمارا تو دین ایمان بلاشبہ ابن العربی کا نظریہ (یعنی نظریہ وحدت الوجود) مست عاشقوں کو ہمیشہ ملامت کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو بھی "سبحانی" (ایک مرتبہ بایزید بسطامی کے منہ سے نکلا سبحانی اعظم نانی یعنی سبحان اللہ میرا مرتبہ کتنا بلند ہے) کہہ اور بایزید بسطامی بن جایا انا الحق کہہ کہ منصور بن جا۔

پراپیگنڈے کے باوجود یہ مسلک اپنی امن پسندی، انسان دوستی اور محبت کے آدرش کی بدولت زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ نہ صرف عملی سطح پر بلکہ علمی اور تصنیفی سطح پر بھی تصوف نے تبلیغ اسلام کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ برصغیر پاک و ہند میں حضرت داتا گنج بخش حضرت معین الدین اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت بابا فرید گنج شکر، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، شاہ ولی اللہ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت بندہ نواز گیسو دراز، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت رکن الدین عالم، حضرت سلیمان تونسوی، حضرت جمال اللہ ملتانی، حضرت خواجہ فرید اور دیگر صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے علم اور عمل کے ذریعے مسلک تصوف کو پھیلایا اور لوگوں میں تزکیہ باطن، راست گوئی، پاکبازی، نیکی، شرافت اور صبر و قناعت کے جذبات عام کئے۔ دنیاوی جاہ و جلال، سیاسی قلابازیوں، مکرو فریب حصول زر اور حب دنیا جیسے منفی رویوں کو ان صوفیائے کرام نے کم سے کم کرنے کی پوری سعی کی۔ صوفیائے کرام کی زندگی کا نصب العین ترک ذات، ظاہر داری اور نفس پرستی کا استرداد، احیائے دین، رضائے الہی، تصفیہ نفس، تزکیہ باطن اور محبت جوئی رہا۔ ہم نے سابقہ صفحات میں ملتان کے صوفیائے کرام کے احوال میں تفصیل کے ساتھ ایسے واقعات اور شواہد جمع کئے ہیں جن سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دور جدید میں دنیا داری، نفس پرستی، بے عملی، حب زر، حب جاہ اور ظواہر پرستی کے رجحانات نے مسلک تصوف کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس لئے کہ ان صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے بے عمل اور جاہ پرست سجادہ نشینوں نے اپنے بزرگوں کے نیک اعمال اور عظیم ورثے کو دنیاوی ترقیوں اور اقتدار تک پہنچنے کے لئے بیڑیوں کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے نام کو کمائی کا ذریعہ بنایا۔ مذہب میں عجیب و غریب بدعتوں، کفر و شرک اور توہم پرستوں کو رولج دیا تاکہ ان کے تعویذ کٹوں کا دھندہ چلتا رہے۔

ان گدی نشینوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو ان مذہبی اور علمی مراکز کے اصل وارث تو نہ تھے۔ لیکن اپنے حیلوں حوالوں اور سیاسی اقتدار کی بدولت ان گدیوں پر قابض ہو گئے اور وراثت مدعی بن کر اپنے گرد مریدوں اور زر و جواہر کے ڈھیر لگانے لگے۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے اپنی صدی کے علماء کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ

”اگر نمونہ یہ ہو خواہی کہ بینی، علمائے سو کہ طالب دنیا باشند و خو گرفتہ بہ تقلید سلف
و معرض از فصوص کتاب و سنت“^۱

اور شیوخ کے متعلق یہ فرمایا کہ

”اگر خواہی کہ نمونہ ازین فریق (نصاری)، ملاحظہ کنی امروز اولاد مشائخ و اولیاء را
تماشا کن کہ در حق آباء خود چه ظنون دارندہ تا کجا کشیدہ بردہ اند“^۲

لیکن یہ بات اس دور کے علماء اور مشائخ پر بھی صادق آتی ہے۔ ان حقائق کو علامہ اقبال نے
بھی اپنے اشعار میں بیان کیا ہے اور بہت سے موجودہ علماء اور مورخین بھی جانتے ہیں لیکن

ص افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی

خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

”لمعات خواجہ“ میں بالکل درست لکھا ہے کہ ”عصر حاضر کی خانقاہوں میں ان کو وہ گرمی گفٹاؤ
کردار نظر نہیں آتی جو ہمارے اسلاف کا شیوہ تھی۔ پہلے پیر صومعہ کی ایک نگاہ گرم ہی متاع
صبر و قرار چھین لیتی تھی۔ دلوں میں وہ سوز و گداز گھرتا تھا اور وہ اضطراب پیدا ہوتا تھا کہ سر پہ
غور اپنے آپ کو مرشد کامل کے قدموں میں ڈال دیتا تھا اب سب کچھ اس کے برعکس تھا،
بقول علامہ اقبال

ص میرا سبوجہ غنیمت ہے اس زمانے میں

کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

ان حقائق نے اس طبقہ کو دینی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ ان خانقاہوں سے بھی متنفر کر دیا
اور وہ دوہری نفرت کی دلدل میں پھنسے تھے نہ علوم دینیہ میں ان کے لئے کشش تھی اور نہ
مرکز علم و عرفان ان کے لئے جاذبیت رکھتا تھا، اس نفرت اور بے زاری کی یہ خلیج رفتہ
رفتہ اس قدر وسیع ہوتی چلی گئی کہ ان کے ہاتھوں ہی سے اہل مغرب نے ان کے علوم پر چھری
پھر وادی، تنقیص و معایب کے انہوں نے دروازے کھول دیئے اور اس سیلاب میں نیچ

۱۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۱، مطبوعہ دہلی ۱۹۲۷ء

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، از شاہ ولی اللہ دہلوی، ص ۱۱

و دانہ اس طرح بڑھتے چلے گئے کہ ان کو یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، کیا کہنا ہے اور کیا کہنا درست ہے۔ چنانچہ تصوف پر ان کے تخریبی تنقیدات کے یہی اسباب ہیں، لیکن اس ساری صورتِ حال کا الزام تصوف یا صوفیائے کرام کو نہیں دیا جاسکتا کیونکہ صوفیاء اور صوفیانہ تعلیم کا مقصد مثبت رویوں کی ترویج تھا نہ کہ اقتدار یا دولت کا حصول۔ صوفیوں کی درویشانہ زندگی سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے راہبانہ زندگی اختیار کی۔ اور صوفیوں کی عملی تعلیمات کے برعکس وہ ترک دنیا کر کے پہاڑوں کی کھوہ میں جا بسے۔ جو گیوں والا لباس پہنا اور جنت منتر کے ذریعے روٹی کھانا شروع کی۔ یہاں تک کہ عبادت اور شریعت کی پابندی بھی ترک کر دی۔ اگرچہ ان کی یہ روش صوفیانہ روح کے منافی تھی تاہم اس میں ایک لحاظ سے صوفیانہ رنگ موجود بھی تھا۔ یعنی گیر و لباس، ردھی سوکھی پر گزارا، لوگوں کی حاجت روائی کے لئے چارہ جوئی مردم آزاری سے گریز، مستی، مست، ایسی خوبیاں ہیں جو صوفیاء اور جوگیوں میں مشترک رہی ہیں۔ البتہ صوفیاء جوگیوں کی طرح لوگوں سے گریزاں اور تبارک الدنیانہ رہے۔ بلکہ لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی خدمت، تعلیم تدریس اور تبلیغ کا حق ادا کرتے رہے جبکہ جوگی دنیا چھوڑ بیٹھے۔ ملتان میں جوگیوں کا محلہ اب بھی ہے

(۹) دورِ حاضر اور تصوف کے احیاء کی ضرورت

آج دنیا مادی ترقی کے لحاظ

سے اپنے نقطہٴ معروج پر پہنچ چکی ہے۔ انسان ستاروں اور سیاروں کی خبریں لا رہا ہے۔ خلا میں سفر کر رہا ہے۔ اعضاء کی پیوند کاری عام ہے، یہاں تک کہ دل و دماغ تبدیل کے سجا رہے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب بچے تیار کتے جا رہے ہیں۔ مصنوعی بارشوں کے ذریعے سال میں کئی کئی فصلیں حاصل کی جا رہی ہیں۔ روبوٹ کی ایجاد نے انسانی دماغ کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن انسان اس تمام ترقی مادی ترقی کے باوجود اندر سے ٹوٹ چکا ہے وہ غیر مطمئن ہے، بے سکون ہے۔ ہلک ہمتیاء کی ایجاد نے اور حاکم اقوام کے ہاتھوں محکوم اقوام کے استحصال نے انہیں ذہنی طور پر بے سکون اور مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے۔ مروت، شرافت اور بلند کرداری کے اوصاف قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ فریب کاری، مکاری، ہوشیاری اور چالاک کو آج کی دنیا میں کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ فکری

انتشار، ذہنی پریشانی، عدم تحفظ کا احساس ہر دل میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اچھی اقدار بلکہ خود زندگی اور اس کی مقصدیت پر سے ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کا دور دورہ ہے اور اس کا سبب مادیت کا بڑھتا ہوا رجحان اور اخلاق اور انسانیت کا زوال ہے۔ ایسے دور میں صوفیاء کی تعلیمات کو عام کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ آج انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل ضروری ہے کیونکہ انفرادی زندگی کے ثمر ہوں یا اجتماعی زندگی کے شخصیت یا شخصیتوں کی تعمیر اور تربیت کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ اس لئے انسانوں کی تربیت خواہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر ضروری ہی نہیں ناگزیر بھی ہے کیونکہ اس تربیت ہی کی بدولت مشیت خاک آدمی سے انسان بنتا ہے اور کائنات کا محور بننے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ خالق کائنات نے اسی مرکز کائنات، تخلیق کے بعد اس کی تربیت کا اہتمام بھی کیا۔ تاکہ یہ "اسفل" انسان فضیلت کے اس بلند مرتبے پر فائز جہاں سے "انی جا مل فی الارض خلیفہ" اور لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے صحیح منصب کا حق دار تصور کیا جائے۔ شخصیت کی تعمیر کے اس کام کو ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیان کے مطابق

"..... جس اہتمام، جس انہماک، جس خلوص اور جس شیفتگی سے اکابر صوفیہ نے انجام دیا اور جس وسیع پیمانہ پر اس کام کے انجام دینے میں لوگوں کی مدد اور رہنمائی کی اس کی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے کارکنوں سے، ان کے مجاہدوں ان کی خدمتوں، ان کی تعلیمی تربیتی کوششوں سے واقفیت، آج بھی تعمیر شخصیت کے دشوار کام میں موثر معاونت کر سکتی ہے۔ دور انحطاط میں ہم اپنے اکابر کے کارناموں اور ان کی شخصیتوں کو بھی اپنی ہی پست سطح پر لے آتی ہے۔"

چنانچہ ان مردان خدا کے یاد کرنے والے بھی ان کی طرف طرح طرح کے میں گھڑت افسانے منسوب کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کا رتبہ بڑھا رہا ہے ہیں۔ اور انکار و کر دار کے اس انمول خزانہ کی طرف نظر کر کے بھی نہیں دیکھتے جن سے انہوں نے انسانی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔ ناقدرے ہیروں میں کنکر کی خوبیاں نکالتے ہیں مگر زمانے کا رخ بدل رہا ہے نظریں پھر حقیقت کی متلاشی نظر آتی ہیں۔"

دعاشیہ مہرا گلے صفحہ پر

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ ان اکابر صوفیاء کے حالات اور کارنامے اس طرح سے پیش کئے جائیں کہ جس سے بقول ڈاکٹر ذاکر حسین

”ان کی زندگی اور ان کے کام کی صحیح روح آشکارا ہو جائے اور ہم ان بزرگوں کے ارادوں کی قوت، افکار کی صحت، جماعتی حس کی ذکاوت اور طبیعت صیجان پذیری کی وسعت، گیرائی اور پائیداری یعنی سیرت کی تربیت کے ان لوازم کی بھانج دیکھ لیں۔ ایک نقشہ دھندلا سا ہی نہیں، ان کے ثبات قدم کا ان کی خود اعتمادی، ان کے ضبط نفس ان کی بے لوث خدمت، ان کی اخلاقی جرأت یعنی شخصیت کی تعمیر کے گھنیر کام کا نقشہ سامنے آجائے گا“

”یہ کام ہمیشہ ہی ضروری تھا، آج اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ صوفیہ کے حالات زندگی کو کشف و کرامات کے کہرے سے نکال کر صحیح تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت اتنی کبھی نہ تھی جتنی آج ہے“

نفس انسانی کے بارے میں ارشاد ربانی ہے ”والصمبہا فخور ہا و تقواھا“ یعنی ذات انسانی کے اندر یہ صلاحیت بھی رکھ دی گئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو مستحکم، توانا اور مضبوط بنا لے اور اگر چاہے تو اسے توڑ پھوڑ کر ضائع کر دے۔ صوفیائے کرام اسی اندرونی شکست و ریخت کو دکنے کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور ذات انسانی کو نیک اعمال پر گامزن رکھ کر مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں

۱۰، حرفِ آخر

میں نے اس مقالے میں انہیں مقاصد کو سامنے رکھا ہے جن کی طرف ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اشارہ کیا ہے تاکہ صوفیاء کے سلسلے میں میری تحقیق کے مثبت نتائج مرتب ہو سکیں کیونکہ آج جبکہ انسانی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر جاری ہے۔ ان اکابر صوفیاء کی تعلیمات کو نمایاں کرنے اور ان کو نئی نسل کے سامنے لانے کی سخت

- پیش لفظ ”مشائخِ چشت“ از خلیق نظامی ص ۱۷

ص ۱۷- پیش لفظ ”مشائخِ چشت“ ص ۱۷

ص ۲۲- پیش لفظ ”مشائخِ چشت“ از خلیق احمد نظامی، ص ۱۷، اسلام آباد ۱۹۵۳ء

ضرورت ہے تاکہ ایک بار پھر اس انتشار، عدم تحفظ، بے چینی، اضطراب اور خود غرضی کے دور میں ضبط نفس، ایمان و ایقان، شرافت و نجابت، انسانیت و مروت، اخلاص و اخلاق، کے جذبات کو عام کیا جاسکے۔ ہمارے لئے لمحہ فکر یہ ہے کہ آج کے اس دور میں دوسری اقوام اور دوسرے ممالک، مادی ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ میرے خیال میں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی نجل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ اخلاقی لحاظ سے بھی یہ قومیں ہم سے بہت آگے ہیں ہم جو خدا اور رسولؐ کے پیروکار ہیں نہ صرف مادی ترقی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور روحانی اقدار کے لحاظ سے بھی نہایت پیمانہ اور انحطاط پذیر ہیں۔

ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ من حیث القوم بلکہ اس سے بڑھ کر من حیث الملت ہم میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے مشرق و مغرب کی تربیت کی۔ نہ صرف اخلاقی روحانی لحاظ سے انسانیت، کی رہنمائی اور رہبری کا حق ادا کیا بلکہ مادی اور دنیاوی ترقی میں بھی پیچھے نہ رہے۔ فنون لطیفہ ہوں یا مفیدہ، سائنس ہو یا فلسفہ مسائل تصوف ہوں یا مسائل حیات..... ہر میدان میں ہمارے اکابرین اور صوفیائے کرام کی خدمات بے مثال اور بے نظیر ہوں۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہمارے صوفیائے غلام اور اکابرین فلسفہ و فکر نے دنیا کی ظلمتوں اور جہالتوں میں نوز عرفان، رشد و ہدایت اور مادی و دنیاوی ترقیوں کی قندیلیں روشن کیں۔ اگر اس دور میں ایسا ہو سکتا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس دور میں ایسا نہ ہو سکے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں ان صوفیاء جیسا جذبہ، استقامت، صبر، استقلال، ہمت، جرات، دروہندی، ضبط نفس اور خدا خونی کے جذبے بیدار ہو جائیں۔ اس نیک مقصد حصول کے لئے میں نے یہ مساعی کی ہے اگر میری اس مساعی سے اس احساس کی ایک ننھی سی قندیل روشن ہو جائے تو میں سمجھوں گی کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

کتابیات

- ۱- آدی، عبدالمناک مفہمین ماکک سلسلہ مطبوعات ادارہ طاق بستان
آرہ بار اول ۱۹۲۲ء
- ۲- ارشد حسین ارشد (مرب) ملتان قدیم و جدید بزم ترقی ادب ملتان بار اول ستمبر
۱۹۶۸ء
- ۳- اسد علی، سید ہندی ادب کے بھگتی کال پر ترقی اردو بورڈ دہلی، پہلا ایڈیشن
مسلم ثقافت کے اثرات ۱۹۷۹ء
- ۴- اکرام الحق، شیخ ارض ملتان شعبہ نشر و اشاعت الاکرام ملتان
- ۵- جمالی، فضل اللہ سیر العارفین مرکزی اردو بورڈ لاہور، بار اول
اپریل ۱۹۷۶ء
- ۶- جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول
تواریخ ملتان اس کا ٹائٹیل کا صفحہ غائب ہے
- ۷- حکم چند، لالہ سر ایسی مرنیہ گوئی کے چار غلش منزل بھکر مارچ ۱۹۸۰ء
- ۸- غلش پیرا صحابی سوسال
- ۹- دردانی معین الدین صوفیائے بہار اور اردو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
۱۹۷۲ء
- ۱۰- زوار حسین شاخ دیرانہ دل مکتبہ شجر ملتان طبع اول ۱۹۸۵ء
- ۱۱- سالک، عبدالمجید مسلم ثقافت ہندوستان ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور طبع
دوم
- ۱۲- سیالوی، شمس الحق مرآة العاشقین مطبع مصطفائی لاہور ۱۳۰۲ھ/
- ۱۳- ثہاب، مسعود حسن خطہ پاک ادب اردو اکیڈمی بہاولپور طبع اول
۱۹۶۷ء

- ۱۴- شاہ ولی اللہ دہلوی الفوز البکیر فی اصول التفسیر مطبوعہ دہلی ۱۹۲۷ء
- ۱۵- شیرانی، منظر محمود (ترجمہ) مقالات حافظ محمود شیرانی مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۶۶ء
- ۱۶- صباح الدین عبدالرحمان بزم مملوکیہ معارف اعظم گڑھ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۴ء
- (سید)
- ۱۷- طاہر تونسوی ڈاکٹر ملتان میں اردو شاعری سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۵ء
- ۱۸- عبدالحق، مہر، ڈاکٹر پیام فرید غیر مطبوعہ
- ۱۹- عتیق فکری ملتان میں فلسفہ ادراک کے ایضاً اثرات برصغیر پر
- ۲۰- عاشق متانی بحر ذوق مطبوعہ کتاب خانہ حیدری، لاہور
- ۲۱- عبدالحق مولوی (ڈاکٹر) "اردو کی ابتدائی نشوونما میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء
- ۲۲- عبدالحق مہر (ڈاکٹر) ملتان (سرائیکی) صوفیائے کرام کا کام پاکستانی پنجانی ادبی بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۸۰ء
- ۲۳- عتیق فکری، علامہ نقش ملتان (جلد اول) فکری اکیڈمی ملتان طبع اول جنوری ۱۹۸۲ء
- ۲۴- فرحت متانی اولیائے ملتان
- ۲۵- فرشتہ، البراقام تاریخ فرشتہ (جلد دوم) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
- ۲۶- ایضاً تذکرہ مشائخ کرام احسن برادرز لاہور، جون ۱۹۶۵ء
- ۲۷- فریدی، نور احمد تاریخ ملتان قصر الادب، جگودالہ، ملتان
- ۲۸- قاضی اطہر، مبارکپوری ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں مکتبہ عارفین کراچی جولائی ۱۹۶۷ء
- ۲۹- قاضی جاوید برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقار ادارہ ثقافت پاکستان طبع اول ۱۹۷۷ء

۳۰۔ قمر رئیس، ڈاکٹر پریم چند تنقیدی مطالعہ سرسید بک ڈپو علی گڑھ طبع چہارم

۱۹۷۷ء

۳۱۔ کشتہ مولانجش پنجابی شاعرانہ تذکرہ مولانجش اینڈ سنز لاہور، طبع اول

جنوری ۱۹۶۰ء

۳۲۔ کیفی جام پوری سرایچی شاعری

۳۳۔ قدوسی، اعجاز الحق تاریخ سندھ (حصہ اول) مرکزی اردو بورڈ، لاہور

۳۴۔ گلشن، شائق اور فدا مجموعہ مرثیہ مولوی خیر الدین صابر و محمد فخر الدین

تاجران کتب ملتان ۱۳۲۱ھ

۳۵۔ گیلانی، اولاد علی (سید) مرقع ملتان سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان

۱۹۳۸ء میں شائع کی۔

۳۶۔ محدث دہلوی، عبدالحق اخبار الاخیار فی اسرار

الابرار

۳۷۔ مدنی، ظہیر الدین اردو غزل دلی تک سلسلہ مطبوعات بزم اشاعت ممبئی

بار اول

۳۸۔ محمد عبدالرزاق، مولوی سفر نامہ حکیم ناصر خسرو انجمن ترقی اردو ہند (دہلی ۱۹۴۱ء)

(مترجم)

۳۹۔ محمد صدیق ملتان احوال الذاکرین مطبع مجتہبی لاہور بار اول

مطلوب الذاکرین (حصہ دوم) ایضاً

ناصر الذاکرین ایضاً

۴۰۔ محمد جلال خان شمع المجالس مولوی خیر الدین صابر و محمد فخر الدین

تاجران کتب ملتان ۱۳۲۱ھ

۴۱۔ معین الدین احمد حشتی لمحات خواجہ معین الادب کراچی ۱۹۷۸ء

۴۲۔ ندوی، سلیمان (سید) نقوش سلیمانی اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، بار دوم

۱۹۶۷ء

- ۴۳۔ ندوی، مسعود علی، مولانا ہندوستان عربوں کی نظریں دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۰ء
 ۴۴۔ نظامی، خلیق مشائخ چشت دارالمولفین، اسلام آباد
 ۴۵۔ بھجوری، داتا گنج بخش بیان المطلوب ترجمہ اردو فیروز سنٹر لمیٹڈ، لاہور انیسویں بار ۱۹۷۶ء
 کشف المحجوب

رسائل

- ۴۶۔ آفتاب پوپ، شیخ ثقافتی شخص "پیاسی" (یونیسکو) نومبر ۱۹۸۲ء جلد ششم۔
- ۴۷۔ اشفاق سلیم (مرزا) پاکستانی موسیقی میں توالی کی روایت سرسیدین پاکستانی ادب (جلد ۴) فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی فروری ۱۹۸۲ء
- ۴۸۔ سجاد حیدر (ملک) فن تعمیر سرسیدین پاکستانی ادب (جلد ۴) فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی فروری ۱۹۸۲ء
- ۴۹۔ طاہر تونسوی سرائیکی شاعری میں مقام حسین ماہ نو (چودہ سو سالہ جشن ولادت حضرت امام حسین) امام حسین نمبر جون ۱۹۸۳ء
- ۵۰۔ عین الحق فرید کوٹی ذکر حسین پنجابی میں ایضاً
- ۵۱۔ غوری، شبیر احمد اسلامی ہند کے نصف اول "معارف" اعظم گڑھ فروری ۱۹۶۳ء
 میں علوم عقلیہ کا رواج جلد ۹۱
 (دوسری قسط)
- ۵۲۔ قریشی، اشتیاق حسین برصغیر کے مسلمانوں کا فن تعمیر سرسیدین پاکستانی ادب (جلد ۴) فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی فروری ۱۹۸۲ء

- ۵۳- محمد امین پروفیسر مسلم فلسفے میں ملتان کی خدمات "ماہ نو" جولائی ۱۹۸۳ء
- ۵۴- ندوی، ابوالحسنات ہندوستان کی قدیم اسلامی "معارف" اعظم گڑھ ۱۳۰۰ھ/۱۹۳۶ء
- مولوی درسگاہیں
- ۵۵- نسیم طاہت، علامہ حضرت عراقی کی اولاد رسالہ تنویر، ملتان سالنامہ اگست ستمبر ۱۹۵۷ء

اخبارات

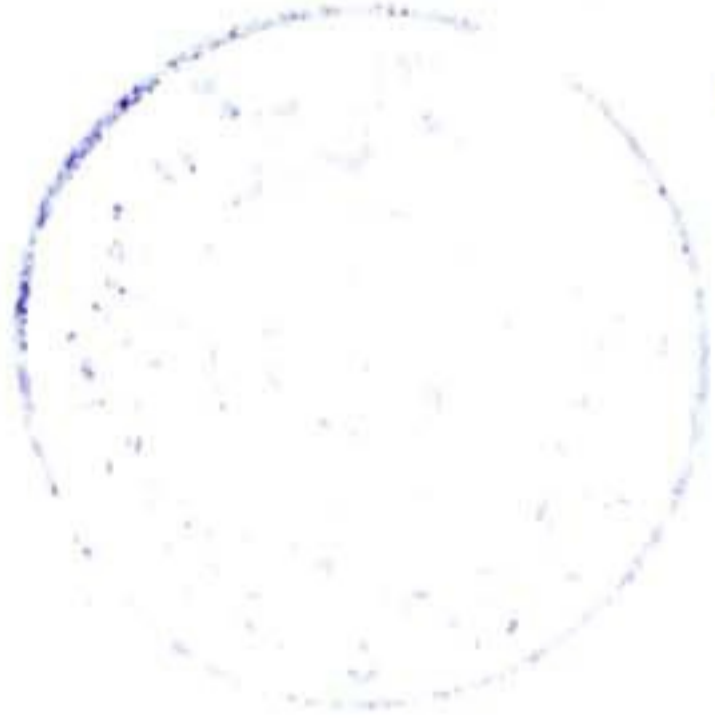
- ۵۶- ترمذی شمیم حیدر ملتان کی دینی درسگاہیں امروز ملتان نمبر ۲۸، جون ۱۹۷۸ء
- ۵۷- ریاض احمد (ملک) ملتان کی مخصوص فن تعمیر اور اس ایضاً کے چند شاہکار
- ۵۸- عتیق فکری، علامہ برصغیر پر ملتان کے علمی اثرات ایضاً
- ۵۹- قادری، محمد صدیق خان "عظیم روحانی پیشوا" حضرت ایضاً شاہ رکن الدین عالم بہروردی
- ۶۰- قیصرانی، م۔ ی فن تعمیر امروز (ہفت روزہ اشاعت) ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء
- ۶۱- اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۵ (ف۔ القیوم) دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۸۰ء

قلمی نسخوں کی فہرست

- ۱۔ امام الدین، مولانا (مرتب) نافع السالکین (فارسی) ملفوظات خواجہ سلیمان تونسوی
- ۲۔ امام بخش (خواجہ) گلشن ابرار (فارسی)
- ۳۔ احمد یار حافظ (مؤلف) منتخب ملفوظ شریف حضرت یہ تینوں ایک ہی کتاب کے الگ
- یار محمد بن تاج چشتی (مرتب) خواجہ سلیمان تونسوی (فارسی) الگ نسخے ہیں۔ ان کے کاتب الگ
- ۴۔ ایضاً المنخب ملفوظ (فارسی) الگ ہیں۔
- احمد الدین کتابت ۱۲ محرم ۱۳۱۶ھ
- ۵۔ یار محمد بن تاج (مرتب) انوار سلیمانہ (فارسی)
- میاں غلام محمد ولد حافظ
- محمد بختیار (کاتب)
- ۶۔ درزی تونسوی، میاں مناقب سلیمانی (فارسی) یہ کتاب منتخب ملفوظ شریف کے حاشیے
- پر لکھی گئی ہے۔
- ۷۔ رکن الدین، مولوی اشارات فریدی (حصہ پنجم) فارسی، ملفوظات خواجہ غلام فرید۔
- ۸۔ زاہد شاہ مٹھٹی، مخدوم اسرار الکمالیہ (فارسی) ملفوظات حافظ محمد جمال ملتان
- (سید)
- ۹۔ زکریا۔ بہار الدین (ملتان) دیوان فارسی
- ۱۰۔ سعد اللہ رضوی، سید بحر السرائر (فارسی)
- خلیفہ محمد امین (کاتب)
- ۱۱۔ شرف الدین قریشی، شیخ منبع البرکات (تذکرہ حقانیہ، فارسی)
- ۱۲۔ ضیاء الدین بن حافظ خلاصۃ العارفین (فارسی) ملفوظات حضرت بہار الدین زکریا
- مولوی عبداللہ قادری ملتان ۲۷ شعبان ۱۲۹۰ھ
- ۱۳۔ عبدالغفور انصاری، مولوی درتعلیف خواجہ خدابخش (سرائیکی منظوم)
- المخلص عبداللہ

- ۱۴- غلام حسن شہید، منشی انوارِ جالبیہ (فارسی) سوانحِ عمری حافظ، محمد جمال ملتانی
- ۱۵- ایضاً دیوانِ حسن (فارسی)
- ۱۶- ایضاً نوراہدایت (مثنوی فارسی)
- ۱۷- ایضاً رسالہ نوراہدی (فارسی)
- ۱۸- ایضاً دیوانِ متنفرات (اردو، سرائیکی، ہندی اور پنجابی زبان میں مختلف شعری اصناف)
- ۱۹- غلام فخر الدین تونسوی مولانا خلاصۃ الفوائد مشتمل بحالاتِ خواجہ نور محمد ہاروی ۲ ریح الثانی
عکیم محمد عمر چشتی (مرتب) ۱۳۲۲ھ
- ۲۰- فرید مسعود اجود مہنی گنج الاسرار (ملفوظات بابا فرید گنج شکر) ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ
- ۲۱- فقیر محمد عارف کوہِ غم، در بیانِ سفر بیت اللہ مدینہ (سرائیکی) ۱۳۰۱ھ
- ۲۲- قادری، داراشکوہ سفینۃ الاولیاء (فارسی) ۳۰ رمضان المبارک ۱۲۸۰ھ
کاتب یار محمد مرید غلام
حسن شہید
- ۲۳- گل محمد، چشتی، مولوی گلزار فریدی (فارسی) ملفوظات بابا فرید گنج شکر
- ۲۴- محمد افضل قریشی خلاصۃ الاحباب (فارسی) ۱۱۶۶ھ
- ۲۵- منور حسین - حیدر گورگانی عقائد و مذاہب
- ۲۶- نظام الملک مناقبِ فخریہ مشتمل بحالاتِ شاہ فخر الدین دہلوی ۱۲۹۳ھ





7

بیکن بکس کے مٹان

بیکن بکس کے مٹان